اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

مجلد سوم: مشتمل بر دلائل و معجزات

اوّلاً مقدمہ میں نفس معجزہ کی حقیقت اور اُس کے امکان و وقوع پر فلسفۂ قدیمہ، علم کلام، فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط بحث و تبصرہ ہے،

اور اس کے بعد

خصائصِ نبوت یعنی مکالمۂ الٰہی، وحی، نزولِ ملائکہ، عالمِ رویا، معراج، اور شرحِ صدر کا بیان ہے، پھر وہ آیات و معجزات مذکور ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے، بعد ازیں وہ ہیں جو مستند روایات سے ثابت ہیں، پھر معجزوں کی نامعتبر روایات کی تنقید کا باب ہے، اور اس کے بعد وہ بشارات نبوی ہیں جو صحفِ سابقہ میں موجود ہیں، اور جن کے حوالے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، اور آخر میں خصائص محمدی کا باب ہے۔

(تالیف)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ

باہتمام: مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف شہر اعظم گڈھ میں مطبوع گردید

طبع چہارم

(مکتبہ اقبال احمد)

۱۳۷۷ھ
۱۹۵۸ء

فہرست مضامین

سیرۃ النبی حصہ سوم

لُبِ لباب
آیات و دلائل
اور
قرآن مجید
۲۱۱ - ۳۲۰

اشیا میں اثر

شفائے امراض

استجابت دعا

معجزات نبویؐ کے متعلق غیر مستند روایات

۷۲۰ - ۷۳۷

مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت

۷۳۷ - ۷۷۷

بشارات

۷۷۸ - ۸۳۰

خصائص محمدی

۸۳۳ - ۸۳۱

خصائص ذاتی

۸۴۰ - ۸۳۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع سوم

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تیسری جلد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت حقیقتِ نبوت اور فضائل ومعجزات پر مشتمل ہے، تیسری دفعہ چھپ کر اب منظر عام پر آرہی ہے، اس اثناء میں بعض مباحث پر جدید تحقیقیں سامنے آئیں، اس لیے پوری کتاب پر نظر ثانی کی گئی، روایتوں اور حوالوں کو اصل ماخذوں سے دوبارہ ملایا گیا، اگر اختلاف نظر آیا تو تصحیح کی گئی، کوئی پہلے سے زیادہ مستند حوالہ ملا تو اس کا اضافہ کیا گیا، کوئی عبارت اگر مشتبہ تھی تو اس شبہہ کو دور کیا گیا، خصوصیت کے ساتھ معراج کے جسمانی و روحانی، یا حالت بیداری یا خواب کے ہونے کے مسئلہ کو صاف کیا گیا،

معجزات کی روایتوں کی اصل سے پھر تطبیق کی گئی اور کہیں کہیں حواشی کے اضافہ سے بعض نئے فوائد بڑھائے گئے، کہیں کہیں عبارت کے اغلاق کو بھی دور کیا گیا ہے،

ایک ظلوم وجہول انسان کی طاقت میں تحقیق کی جو حد تھی، اس نے اپنی وسعت

کے مطابق وہ پوری صرف کی ہے، اس پر بھی عصمت کا دعویٰ نہیں، اہلِ نظر سے التماس ہے کہ اگر اب بھی کوئی قابلِ اصلاح چیز نظر آئے تو مؤلف کو مطلع کر کے جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

حسنِ خاتمہ کا طالب سید سلیمان ندوی

۱۶ رشوال ۱۳۶۶ھ - ۳۱ راگست ۱۹۴۷ء

دارالقضا بھوپال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ اصحبہ اجمعین

خدا کا شکر ہے کہ اُس نے چند در چند مزاحمتوں کے باوجود سیرۃ پاک کی تیسری جلد کی تکمیل وانجام کا سامان بہم پہنچایا اور ایک گنہگار کو توفیق بخشی کہ ان اوراق کو ترتیب دیکر اپنے سیاہ اعمالنامہ کے دھونے کے لیے آبِ رحمت کے چند قطرے فراہم کر سکے، دوسری جلد ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) میں چھپ کر نکلی تھی، چار برس کے بعد یہ ۹۰۰ صفحوں کا مجموعہ مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے، اس مجموعہ کی تالیف وترتیب، واقعات کی تفتیش وتلاش اور مسائل و نظریات کی بحث وتحقیق میں جو محنت وکاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے، اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ صواب کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹا ہوا اور حقیقت کی منزل سے بعد نہ ہوا ہو، والعصمۃ للہ وحدہٗ

ان اوراق کی تالیف میں ہم اپنے ان محسنوں کے شکر گذار ہیں جنھوں نے انکی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا، مشکلات اور غوامض میں مخدومنا مولانا حمید الدین صاحب کے مشوروں نے فائدہ پہنچایا ہے، رفیق کار مولانا عبد السلام صاحب ندوی نے معجزات کے جزئی واقعوں کے فراہم کرنے میں مدد کی ہے، ہماری جماعت میں بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبد الباری ندوی (معلم فلسفۂ جدیدہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) سے بڑھکر فلسفۂ جدیدہ کا

کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ اس باب میں فلسفۂ جدید کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں، اُن سے بھی تعرض کیا جائے، چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے معجزات اور فلسفۂ جدید" کا باب لکھکر عنایت کیا ہے، جو اس کتاب کے ص ۱۱ سے شروع ہو کر ص ۱۰۲ پر تمام ہوا ہے۔

کہیں کہیں آپ کو احادیث کی بعض غیر مطبوعہ کتابوں مثلاً بیہقی، ابو یعلی، ابن راہویہ ابن ابی شیبہ، بزار وغیرہ کے حوالے دوسری مطبوعہ کتب احادیث کے حوالوں کے ساتھ تائیداً ملیں گے، ہم نے ان کے حوالوں میں دوسرے مفسرین، شارحین حدیث اور مصنفین سیرت مثلاً ابن کثیر، ابن حجر، ابن قیم، سیوطی وغیرہ پر بھروسہ کیا ہے، معجزات کے جزئی واقعات میں ایک دو مقام پر قوی روایتوں کے ساتھ اگر ضعیف روایتوں کو جگہ دی گئی ہے تو ان سے مقصود صرف یہ ہے کہ قوی روایتوں سے جس نوع کے معجزات ثابت ہیں، اس نوع کے معجزات کی دوسری تائیدیں بھی گو اس رتبہ کی نہیں، مگر موجود ہیں،

کتاب میں کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں، جن کی آخر میں غلطنامہ کے اضافہ سے تلافی کی کوشش کی گئی ہے۔

اس راہ کی ایک منزل آج اور تمام ہوئی، لیکن قلم کے مسافر کو آرام نہیں کہ اب چوتھی منزل اس کے سامنے ہے، احباب دعا کریں کہ یہ جلد چہارم انکی خدمت میں جلد پیش ہو سکے۔

سید سلیمان ندوی

۱۷ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دلائل و معجزات

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ

اور ہمارے پیغمبر لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لیکر آیا کیے

روحانی نوامیس کا وجود

سیرت نبوی کا یہ حصہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اُن حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق اُس عالم سے ہے جو ہمارے اس مادی عالم اور اس کے مادی قوانین کے حدود سے باہر ہے، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے، مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں، تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے،

آسمانہاست در ولایت جاں   کار فرمائے آسمان جہاں

نبوت کے فطری و روحانی آثار

جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے اور **آفتاب ہدایت** نمودار ہوتا ہے، باغ عالم میں جب برائیوں

کی خزاں چھا جاتی ہے تو موسم بدلتا ہے، اور بہار نبوت[۱] رونق افزا ہوتی ہے۔

اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین فطرت ہیں، جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کی رشد وہدایت، عذاب ورحمت اور نبوت ورسالت کے خاص خاص اصول وقواعد ہیں جن میں تغیر راہ نہیں پاتا۔ انبیاء ورسل اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں۔ اس روحانی جہاد میں انبیاء ورسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں، اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

نبوت کے روحانی قوانین جسمانی قوانین پر حکمراں ہیں

جس طرح ہمارا نفس اور ہماری روح یا ہمارے جسم کی پراسرار مخفی قوت ہمارے کالبد خاکی پر حکمراں ہے اور ہمارے تمام اعضاء وجوارح اس کے ایک ایک اشارہ پر

[۱] خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے پہلے انبیاء کا سلسلہ جاری رہا، حضورؐ کی آمد کے بعد جانشینان نبوت محمدی یعنی مجددین امت اس فرض کو انجام دیتے ہیں، یہ مجددین ملت رسولؐ کے متبع کامل ہوتے ہیں، اور منصب نبوت سے عاری ہوتے ہیں، اسی لیے ان کے انکار سے کفر نہیں لازم آتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف ملکوں میں یا ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں یا جماعتوں میں مختلف مجددین ملت ہوں، ان کی پہچان کا سب سے بڑا معیار عقائد و اعمال، اخلاق اور طرق دعوت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ وقت کے اوہام ورسوم و اعمال کو جو باہر سے آکر دین میں شامل ہو گئے ہوں، دور کریں، اور امور دین میں سے جو امور مٹ گئے ہیں ان کو دوبارہ جاری کریں۔

حرکت کرتے ہیں، اسی طرح نبوت کی روحِ اعظم اذنِ الٰہی سے سارے علمِ جسمانی پر حکمراں ہو جاتی ہے، اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالمِ جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں، اسلیے وہ چشم زدن میں فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک عروج کر جاتی ہے، سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے، چاند اس کے اشارہ سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں، اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں بہتی ہیں، اسکے نفسِ پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں، اور مردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ و بالا کر دیتا ہے، کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکمِ الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں، مگر با ایں ہمہ وہ بندہ اور بشر ہوتا ہے، اور اس سے یہ جو عجائبِ قدرت ظاہر ہوتے ہیں، وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فعل ہوتا ہے، اور اسی کی مشیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں،

نبوت کے روحانی نوامیس کے اسباب و علل سے ہم اسی طرح لاعلم ہیں جس طرح جسمانی قوانین کے

لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول، خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے، فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں، پھول سرخ کیوں ہوتے ہیں، ستارے چمکتے کیوں ہیں، شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے، چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں، تخم، درخت، غذا، خون، گوشت کیونکر بن جاتا ہے، اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیونکر ہوتا ہے، اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال و اعمال بحکمِ الٰہی کیونکر صادر ہوتے ہیں؟ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ

وہ ہوتے ہیں، چنانچہ دنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پراسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات وکیفیات کی ایک دنیا رکھتا ہے، عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات وسوانح غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے تھے جو ہم نہیں دیکھ سکتے، وہ، وہ کچھ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے، وہ، وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جان سکتے، اور ان سے وہ اعمال بھی صادر ہوتے تھے جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے، یہ تاریخی واقعات ہیں، جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سکندر اور نپولین کے فتوحات، اور بدھ اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے وجود سے ہندوستان کی روحانی داستان کا ایک ایک حرف، اسرائیلی نبیوں کے صحیفوں کا ایک ایک باب اور عیسائیوں کی انجیل کا ایک ایک صفحہ اس تاریخ کی مثالیں اور نظیریں ہیں،

انبیا کا اصلی معجزہ خود انکا سرتاپا وجود ہے

گو پیغمبر کا اصلی معجزہ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی کھلی نشانی خود اس کا سرتاپا وجود ہوتا ہے، دیکھنے والوں کے لیے اس کی چشم وابرو میں اور سننے والوں کے لیے اس کے لب ولہجہ میں اور سمجھنے والوں کے لیے اس کے پیام ودعوت میں اعجاز ہوتا ہے، لیکن جو لوگ احساس حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں، ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی، اور وہ مادی اور محسوس نشانیوں کے طلبگار رہتے ہیں، جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں، لیکن انبیا کے متبعین میں سے سابقین اولین اور صدیقین وصالحین نے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا، حضرت ہارونؑ ویوشعؑ نے حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر نہیں تسلیم کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا تھا،

انبیا کے کامل پیرو ان سے معجزہ نہیں مانگتے تھے

حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر نہیں، بلکہ یہ جان کر کہ "آپ غریبوں کے دست و بازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں"[1] حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ اور دیگر اصحاب کبار رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی صداقت اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا، ان کے لیے آپ کا سرتاپا وجود، نفس دعوتِ حق، اور پیامِ اخلاص ہی معجزہ تھا، انھوں نے اسی کو دیکھا، اور اسی سے ایمان کی دولت پائی، مگر نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب جو آتشِ خلیل، طوفانِ نیل، قحطِ مکہ، اور انشقاق قمر کے معجزوں کے طالب تھے، پھر بھی ایمان کی دولتِ عظمیٰ سے محروم رہے، لیکن بایں ہمہ ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے، جس کے بصیرت کے آئینہ پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ جھائیاں پڑی ہوتی ہیں، جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں، اور آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ (طٰہٰ-۳) پکار اٹھتے ہیں، فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا، تو موسیٰؑ و ہارونؑ کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح روم کی پیشین گوئی پوری ہوئی تو قریش کے نیک طبع لوگوں کی چشم باطن کھل گئی، اور حقیقت کا پیکر ان کے سامنے جلوہ نما ہو گیا،[2] یہی طبقہ ہے جس کو معجزات کی ظاہری نشانیوں سے بقدر استعداد حصہ پہنچتا ہے، اس کے علاوہ معجزات کا بڑا حصہ مؤیدات

معاندین معجزوں کے بعد بھی ایمان نہیں لائے

معجزوں سے کن کو فائدہ پہنچتا ہے

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] جامع ترمذی تفسیر سورۂ روم

یعنی تائیدِ حق کے لیے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہوتا ہے، مومنین صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعہ سے تسکین دیجاتی ہے، اور رسوخِ ایمان اور ثباتِ قدم مرحمت ہوتا ہے، ان کی بے سروسامانیوں اور بے توائیوں کی مکافات کی جاتی ہے، اور اس سے اُن کی دولتِ ایمانی کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔

ان واقعات کا اصطلاحی نام | حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے جو یہ مافوق العادۃ کیفیات اور اعمال صادر ہوتے ہیں، ان کے لیے عام طور پر **معجزہ** کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن یہ اصطلاح کئی حیثیتوں سے غلط ہے، اول تو اس لیے کہ قرآن مجید اور احادیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کی جگہ **آیت** (نشانی) اور **برہان** (دلیل) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہیں، قدیم محدثین نے ان کی جگہ **دلائل** اور **علامات** کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو الفاظ قرآنی کے ہم معنی ہیں، دوسرے یہ کہ عام استعمال کی بنا پر لفظ "معجزہ" کے ساتھ کچھ خاص لوازمِ ذہنی پیدا ہو گئے ہیں، جو حقیقت میں صحیح نہیں ہیں، مثلاً اس لفظ سے عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے، جس کا صدور خاص اس کے اعضاء وجوارح سے ہوتا ہے، اور نیز یہ کہ اس لفظ کے سبب سے اس کا معجز ہونا گویا اس کی حقیقت میں داخل ہو گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں خیال غلط ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معجزہ پر عقلی حیثیت سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، ان کا ایک بڑا حصہ خود لفظ معجزہ کے غلط استعمال سے پیدا ہو گیا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو ایک ایسا جا لفظ درکار ہے جس میں نبوت کے تمام خواص، کیفیات، مشاہدات اور اعمال خارقِ عادت اور

غیر خارقِ عادت، سب داخل ہیں، لیکن معجزہ کا لفظ اتنا وسیع نہیں، آیندہ جہاں از روئے قرآن معجزہ کی حقیقت پر بحث آئے گی، وہاں اس کے متعلق مزید تفصیل کی جائیگی جس سے معلوم ہوگا کہ قرآن پاک کی اصطلاح کس قدر صحیح اور موزوں ہے، ان وجوہ کی بنا پر صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اس کتاب میں صرف قرآن کی اصطلاح **آیت**، **برہان**، اور محدثین کی اصطلاح علامات و **دلائل** کو اختیار کریں، تاکہ ہمارا مفہوم زیادہ صحیح طریقہ سے اور زیادہ وسیع طور سے ادا ہو سکے، لیکن چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل گیا ہے، اسلیے اس کو یک قلم ترک بھی نہیں کیا جاسکتا۔

دلائل و براہین و آیات کو تعلق انبیاء کی سیرتوں سے

قرآن مجید اور دیگر صحفِ آسمانی میں انبیائے سابقین علیہم السلام کے جو قصص اور واقعات مذکور ہیں، ان میں ان کے روحانی حالات و کیفیات یعنی دلائل و براہین اور آیات کا ذکر نہایت موثر اور عبرت انگیز طریقہ سے کیا گیا ہے، سیرِ ملکوت، مکالمۂ الٰہی، رویتِ ملائکہ، رویائے صادقہ، استجابتِ دعا، طوفانِ نوحؑ، آتشِ خلیلؑ، عصائے موسیٰؑ، نفسِ عیسیٰؑ، اور اس قسم کے اور بھی بہت سے کیفیات و حالات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے، اور ان کے ساتھ ان کے عواقب و نتائج بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے ہر زمانہ میں ان چیزوں کو خاص تعلق رہا ہے، اور اس وجہ سے وہ ان کے واقعاتِ زندگی کا جزو لاینفک ہوگئے ہیں،

انبیاء علیہم السلام کی زندگی اگرچہ گوناگوں واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے، لیکن نتائج

کے لحاظ سے ان تمام واقعات کا مرکز صرف یہ ہوتا ہے کہ اس خاکدان کو اخلاقِ ذمیمہ کے خس وخاشاک سے پاک کرکے محاسنِ اخلاق کے گل وریحان سے آراستہ کیا جائے، تاکہ برکاتِ آسمانی کا دامن کانٹوں سے الجھنے نہ پائے، اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کو مادی آلات سے بھی کام لینا پڑتا ہے، لیکن وہ لوگ اکثر اپنی روحانی طاقت سے اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں، اور مادی آلات کے استعمال میں بھی ان کے جسمانی دست وبازو سے زیادہ ان کے روحانی دست وبازو کام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعاتِ زندگی میں ان دلائل وآیات کو نہایت اہمیت دی ہے، اور ان کے ذکر سے گویا انبیاء علیہم السلام کے تمام حالاتِ زندگی کو سلسلۂ علل واسباب سے مربوط کر دیا ہے۔

دلائل وآیات کا تعلق سیرۃِ محمدیؐ سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تمام انبیاء علیہم السلام کے واقعاتِ زندگی کا خلاصہ، ان کی تعلیمات کا عطر، اور ان کے حالات ومشاہدات کا برزخ ہے، آپ ایک عالمگیر اور ابدی مذہب لے کر مبعوث ہوئے تھے، اس لیے آپ نے ایک ہی خطاب کے ساتھ ان تمام لوگوں کو مخاطب فرمایا، جن کو طوفانِ نوح دفعۃً بہالے گیا تھا، جن کو دریائے قلزم کی نہریں نگل چکی تھیں، جن کو نفسِ عیسیٰؑ نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا، اور ان سب سے بڑھ کر آپ کا مخاطب ایک گروہ اور بھی تھا جو ان چیزوں کو صرف عجائب پرستی کی نگاہ سے نہیں بلکہ ژرف نگاہی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس بنا پر جس چشمۂ فیض نے اسباطِ موسیٰؑ کو سیراب کیا تھا، وہ ان تشنہ کامانِ روحانیت

سے کیونکر بے پروا ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا، جو علیٰ قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لیے ضروری تھے، آپ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے، آپ کی شریعت معجزہ تھی، آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا، ان کے علاوہ آپ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لیے بستر لگایا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی، کبھی ماکذب الفواد کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا، اور کبھی مازاغ البصر کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزول رحمتِ الٰہی کے لیے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادیِ حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہ سے پانی کے چشمے ابالے، کبھی سنگِ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبانِ الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے، اور آیندہ دنیا کے واقعاتِ غیب بتا کر رہروانِ عالم کو منزلِ حقیقت کے نشان دکھائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ زندگی کا سب سے بڑا جزو، غزوات و محاربات ہیں، ان ہنگامہ خیز واقعات کے تاریخی علل و اسباب اور اُن کے نتائج کا ذکر کتاب کے ایک حصہ میں بہ تصریح گذر چکا ہے لیکن جہاد کے میدان میں آپ کو جو فتوحاتِ عظیمہ حاصل ہوئیں ان میں انسانوں کے لشکر اور سپاہیوں کے تیغ و خنجر سے زیادہ، فرشتوں کے پرے، دعاؤں کے تیر، توکل علی اللہ کے سپر، اعتماد علی الحق کی تلوار کام کرتی نظر آتی تھی، آپ کی زندگی کا سب سے

بڑا فرض اسلام کی اشاعت ہے، اور روے انور نے، نگاہ کیمیا اثر نے، تقریر دلپذیر نے، اخلاق اعجاز نما نے، آیات و دلائل بن کر بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ غرض آپ کی پیغمبرانہ زندگی کے ہر منظر میں یہ دلائل، یہ براہین، یہ آیات، یہ معجزات، اسبابِ ظاہری کے پہلو بہ پہلو، اسبابِ حقیقی بن کر رونما ہوتے رہے ہیں،

دلائل و معجزات اور عقلیت | ان دلائل و معجزات کے الفاظ کو سننے کے ساتھ ہی سب سے پہلے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ ممکن بھی ہیں؟ کیا عقلِ خردہ گیر ان کے وقوع کو جائز بھی رکھتی ہے؟ دنیا میں عقل و نقل اور فلسفہ و مذہب کا جب سے وجود ہے، ان مباحث پر معرکہ آرا بحثیں ہوتی چلی آئی ہیں، لیکن فلسفۂ قدیمہ ہو یا جدیدہ، فلسفۂ یونان ہو یا فلسفۂ اسلام، مشرق کا فلسفہ ہو، یا مغرب کا، ان سب کا حاصلِ بحث یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ فرقے ان کو ممکن بلکہ واقع سمجھتے ہیں تو دوسرے اُن کو محال قطعی تصور کرتے ہیں، عقل و فہم کا یہ اختلاف دنیا میں ہمیشہ سے قائم تھا، قائم ہے، اور قائم رہے گا، لیکن جو لوگ ان چیزوں کے امکان اور وقوع کے قائل ہیں، وہ خود اپنے کج بحث دل اور بدگمان قلب کی تسلی، طمانیت، اور رفعِ شک کے لیے اپنے اپنے فہم و ادراک کے موافق مختلف نظریے قائم کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنی رازجو طبیعت کی تشنہ لبی کو تسکین دے سکیں، ان تمام نظریات کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ان عقل و حواس سے مافوق حقائق کو، اپنے دریافت کردہ معلوم و محسوس قواعد کے مطابق بنا سکیں لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا محسوس و غیر محسوس یا جسمانی و رُوحانی دنیا، دونوں ایک ہی نظام پر چل رہی ہے کہ ایک عالم کے قیاسِ تمثیلی و استقرائی سے

ہم دوسرے عالم کے ثبوت پر شہادتوں کا انبار لگانا چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جو جانا نہیں جاسکتا، اس کو ہم جاننا چاہتے ہیں، اور جو سمجھا نہیں جاسکتا، اس کو سمجھنا چاہتے ہیں، جب ہماری عقل وفہم کی لنگ پائی، محسوسات کے میدان میں صاف نظر آتی ہے، تو ماورائے محسوسات میں اس کی تگاپو کہاں تک منزلِ مقصود کے قریب کرسکتی ہے،

آنانکہ وصفِ حسنِ تو تقریر می کنند خواب نہ دیدہ راہمہ تعبیر می کنند

بہرحال اب تک انسان نے اس "خواب نہ دیدہ" کی جو کچھ تعبیر کی ہے، وہ ذیل کے اوراق میں پھیلائی گئی ہے، اور سلسلۂ بحث میں سب سے پہلے **فلسفۂ قدیمہ** کے نظریات کی تشریح کی گئی ہے، اور اس کے بعد **فلسفۂ جدیدہ** ان چیزوں کی گرہ کشائی جہاں تک کرسکتا ہے، اس کی تفصیل ہے، اور آخر میں خود **قرآن مجید** نے ہمیں اس باب میں جو کچھ تلقین کی ہے، اس کو بیان کیا جائے گا۔

دلائل و معجزات

اور

فلسفۂ قدیمہ و علم کلام

اسلام میں عقائد کی سطح جب تک صاف اور ہموار رہی، دلائل اور معجزات کے متعلق عقلی مباحث نہ پیدا ہو سکتے تھے، اور نہ ہوئے، لیکن دوسری صدی میں جب یونانی علوم کے تراجم مسلمانوں میں پھیلے تو وہ ہمارے علم کلام کے ضروری اجزا ء بن گئے، اور ان کو اس درجہ اہمیت ہو گئی کہ اب ان سے تعرض کیے بغیر گویا موضوع مزید بحث کے لیے تشنہ رہ جاتا ہے۔

اہل یونان کسی شریعتِ الٰہی سے مشرف نہ تھے، اس لیے وہ **نبوت**، خواصِ نبوت، وحی، الہام اور معجزہ وغیرہ سے واقف نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص فلسفہ میں ان مباحث کا وجود نہیں ہے، چنانچہ علامہ **ابن رشد** نے تہافۃ التہافہ میں اس کی خاص تصریح کی ہے اور علامہ **ابن تیمیہ** نے بھی اپنی تصنیفات میں اس کو جا بجا لکھا ہے مسلمانوں میں سب سے پہلا فلسفی **یعقوب کندی** ہے، لیکن چند مختصر رسائل کے سوا اس کی عام تصنیفات ناپید ہیں، کندی کے بعد **فارابی** کا زمانہ ہے، اور اسی نے سب سے پہلے ان مسائل کے متعلق اپنے خاص نظریے قائم کیے، چنانچہ اس نے اپنے رسالہ فصوص الحکم[1] میں نبوت اور خواصِ نبوت کے متعلق بہ ترتیب حسب ذیل خیالات ظاہر کیے ہیں۔

---

[1] فصوص الحکم یورپ اور مصر دونوں جگہ چھپ گئی ہے، اسوقت میرے پیش نظر لیڈن ای جی بریل کا نسخہ مطبوعہ سنہ ۱۸۹۰ء ہے۔

فقرہ ۲۸۔ صاحب نبوت کی روح میں ایک قوتِ قدسیہ ہوتی ہے جس طرح تمھاری روح عالمِ اصغر میں (یعنی اپنے جسم میں) تصرف کرتی ہے اور تمھارا جسم، تمھاری روح کا تابع فرمان بردار رہتا ہے، اسی طرح وہ روح قدسی عالم اکبر میں یعنی تمام جسمانیات میں تصرف کرتی ہے، اور تمام عالم جسمانی اس کا تابع و فرمان بردار ہوتا ہے، اور اسی بنا پر اس سے خارقِ فطرت معجزات صادر ہوتے ہیں، اور چونکہ اس کا آئینۂ باطنی صاف اور زنگ و غبار سے پاک ہوتا ہے، اس لیے لوح محفوظ یعنی اس کتاب میں جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی، اور ملائکہ کی ذاتوں میں جو کچھ ہے، اس کا عکس اس کے آئینہ پر پڑتا ہے، اور وہ قدرت قدسیہ یا رُوح قدسیہ اس کو مخلوقات تک پہنچاتی ہے،

فقرہ ۲۹۔ ملائکہ ان صور علمیہ کا نام ہے، جو بذاتہا قائم ہیں، اس طرح نہیں جس طرح لوح میں نقوش یا ذہن میں معلومات ہوتے ہیں، بلکہ خود معانی قائم بالذات ہیں، اور وہ امرالٰہی سے فیض حاصل کرتے ہیں، عام رُوح بشری تو حواسِ ظاہری کے تعطل یعنی خواب میں اس امرالٰہی سے لگاؤ پیدا کرتی ہے لیکن رُوح نبوی بیداری میں اس سے تخاطب کرتی ہے۔

فقرہ ۴۰۔ عام روح بشری کا حال یہ ہے کہ جب اس کے حواس ظاہری مشغول ہوتے ہیں تو حواس باطنی معطل ہو جاتے ہیں، اور جب حواس باطنی کام کرتے ہیں تو حواس ظاہری بیکار ہو جاتے ہیں، مگر ارواح قدسیہ کا یہ حال ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے حواس ظاہری کی مصروفیت ان کے حواسِ باطن کو، اور ان کے حواسِ باطن کی مشغولیت ان کے حواس ظاہری کو معطل نہیں ہونے دیتی، اور دونوں ایک دوسرے کے فرائض میں مخل نہیں ہوتے بلکہ انکی

تاثیر کا عمل اُن کے اجسام سے متعدی ہو کر دوسرے اجسام تک پہنچتا ہے، اور وہ انسانی تعلیم سے نہیں، بلکہ ارواح و ملائکہ کے ذریعہ سے علم کی تلقی کرتے ہیں۔

فقرہ ۱۴ - عام روحوں کی درماندگی یہاں تک ہے کہ نہ صرف یہ کہ حواسِ ظاہری کی مصروفیت، حواسِ باطنی کو اور حواسِ باطنی کی مصروفیت، حواسِ ظاہری کو اپنے فرائض سے باز رکھتی ہے، بلکہ خود ان کے ایک حِس کی مشغولیت دوسرے حِس کو بیکار کر دیتی ہے، ہم جس وقت غور سے سنتے ہیں، دیکھتے نہیں، جب دیکھنے میں مستغرق ہوتے ہیں تو سنتے نہیں، خوف کا احساس ہو تو اشتہا نہیں پیدا ہو سکتی، اشتہا ہو تو غصہ نہیں پیدا ہو سکتا، جب ہم فکر کرتے ہیں تو ذکر سے غفلت ہو جاتی ہے، اور جب ذکر کرتے ہیں تو تفکر سے خالی ہو جاتے ہیں لیکن ارواحِ قدسیہ کی یہ حالت نہیں ہوتی، ان کے تمام ظاہری و باطنی حواس ایک ساتھ کام کرتے ہیں، اور ان کا ایک حاسہ دوسرے حاسہ کا عائق و مانع نہیں ہوتا۔

فارابی کے یہی چند لفظ ہیں جو **ابن سینا** اور **ابن مسکویہ** تک پہنچتے پہنچتے ایک داستان بن گئے ہیں، اور اب چھوٹی اور بڑی تمام اسلامی فلسفیانہ تصنیفات میں باب النبوت کے نام سے یہ مسائل شامل ہیں، یہاں تک کہ امام **غزالی** و **رازی** کی تصنیفات سے ان ہی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ صوفیہ کے لسان القوم مولانا **رومی** کے سازِ "نے" سے بھی یہی آواز نکلتی ہے۔

فلسفۂ و عقل کی راہ سے جو حکمائے اسلام منزلِ حقیقت کے جویاں ہیں، ان کے نزدیک **نبی** وہ ہے جس میں یہ تین باتیں جمع ہوں،

۱- اول یہ کہ اس کو امورِ غیب پر اطلاع ہو،

۲- دوسرے یہ کہ ملائکہ اس کو نظر آئیں اور وہ اس سے کلام کریں،

۳- تیسرے یہ کہ اس سے خوارقِ عادت ظاہر ہوں،

ان تینوں دعووں کے امکان پر ان کے دلائل بہ ترتیب یہ ہیں،

اطلاعِ غیب "یہ عالمِ کائنات ایک باترتیب اور مسلسل نظامِ فطرت پر قائم ہے جس کا ہر درجہ دوسرے درجہ سے بلند ہے، پہلے جمادات ہیں جن میں نہ حرکت ہے نہ نمو، احساس ہے نہ ارادہ، نطق ہے نہ ادراکِ کلیات کی قوت، اس کے بعد نباتات کا درجہ ہے، جن میں حرکت اور نمو تو ہے لیکن وہ دوسرے صفات سے محروم ہیں، اس کے بعد حیوانات آتے ہیں جن میں حرکت اور نمو کے ساتھ احساس و ارادہ بھی ہے، سب سے آخر انسان کا مرتبہ ہے جس میں ان تمام خصوصیات کے ساتھ نطق اور ادراکِ کلیات کی قوت بھی ہے، کائنات کے ان چاروں طبقوں میں بھی یکسانی نہیں ہے، بلکہ ان میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ایک ترقی محسوس ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کا پست تر نقطہ اپنے پچھلے سے، اور بلند تر اپنے اگلے سے جا کر مل جاتا ہے، لیکن کیا اس ترقی کی انتہا یہیں پر جا کر ختم ہو جاتی ہے، نہیں، ابھی نطق و ادراک اور احساس و تمیز کا مرتبہ کمال کو نہیں پہنچا ہے، انسانوں میں وحشی اور غیر متمدن قبائل سے شروع کرو تو ان سے ترقی یافتہ دہقانی اور گنوار ہیں، اُن سے اعلیٰ شہری اور متمدن ہیں اور ان سے زیادہ بلند تر علماء اور عقلائے روزگار ہیں، جو فکر و نظر اور قیاس و استدلال سے مجہول کو معلوم کرتے ہیں، لیکن انسانوں کی بلند تر صنف وہ ہے جس کی عقل و ہوش کے سامنے

نظریات بھی بدیہیات ہیں، جن کی روحِ قدسی اپنے تمام معلومات کو تجربہ و مشاہدہ سے نہیں، بلکہ براہ راست عالمِ ملکوت سے حاصل کرتی ہے، جن کے حواس کی طاقت عام انسانوں سے اسقدر تیز ہوتی ہے کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے ہیں جو عام انسان نہیں دیکھ سکتے، اور وہ، وہ کچھ سنتے ہیں جو عام انسان نہیں سن سکتے، یہ **قوتِ کمالیہ** اور یہ روح قدسیہ جس صنفِ انسانی میں ہوتی ہیں، وہی انبیاء ہیں۔

رویت ملائکہ | انسان کے علم واحساس کا منبع روح ہے، اور اس کے آلات و ذرائع اس کے باطنی اور ظاہری **حواس** ہیں، اگر اس سطح زمین پر کوئی ایسا انسان ہو جو ان تمام آلات سے معرا ہو، تو وہ کسی شے کا احساس کر سکتا ہے اور نہ کسی چیز کا علم حاصل کر سکتا ہے، لیکن جیسے جیسے علم واحساس کے ان آلات میں ترقی اور تیزی آتی جاتی ہے، اس کے علم واحساس میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک خاص نقطہ پر آکر وہ رک جاتے ہیں اور مادیات ومحسوسات سے آگے نہیں بڑھ سکتے، لیکن خواب کی حالت میں روح کو مادیات اور محسوسات کی زنجیروں سے جب آزادی ملتی ہے، تو غیر مادی چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ روحِ انسانی کے علایق جس قدر مادیات سے پاک ہوں گے اسی قدر اس کے علم واحساس کے قویٰ میں ترقی ہوگی، اور جسقدر اس عالم مادی سے اس کو افتراق ہوگا، اسی قدر عالمِ ملکوت کے ساتھ اسکا اتصال بڑھتا جائے گا، اس بنا پر اگر کسی روح میں اس قدر استعداد اور صلاحیت عطا ہوئی ہو کہ وہ عالم بیداری میں بھی ان مادی تعلقات کو منقطع کر سکتی ہو تو جو کچھ عام روحوں کو خواب میں نظر آتا ہے اس سے بہت بڑھ کر اس کو بیداری میں محسوس ومشاہد ہو سکتا ہے، وہ غیب کی آوازوں کو سن سکتی ہے، فرشتوں کو دیکھ سکتی ہے، اس سے باتیں کر سکتی ہے اور ان کے

رویت وکلام ملائکہ

خوارق عادات

ذریعہ سے علم و معرفت کا فیض حاصل کر سکتی ہے،

خوارق عادات | دنیا کے مادی حوادث جس طرح مادی اسباب و علل کے نتائج ہیں، اسی طرح وہ نفسیاتی اسباب کے نتائج بھی ہوتے ہیں نفس کے اندر مختلف قسم کے جذبات اور حرکات پیدا ہوتے ہیں اور ان سے ہمارا مادی جسم متاثر ہوتا ہے۔ درخت یا دیوار پر چڑھنے والے کو اکثر یہ پیش آتا ہے کہ جہاں اس کے دل میں خوف پیدا ہوا اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اور وہ کانپ جاتا ہے اور گر پڑتا ہے، کبھی خوف سے انسان بیہوش ہو جاتا ہے۔ بیمار پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے، شرمندگی اور خجالت سے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے، غیظ و غضب میں چہرہ تمتما اٹھتا ہے، یہ کمزور نفوس کا حال ہے، اس سے زیادہ قوی نفوس اپنے تاثرات سے دوسروں کو متاثر کر لیتے ہیں، اور اپنی قہر و محبت کی نگاہ سے دوسروں کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصحابِ نفوسِ قدسیہ اور اربابِ قوت کمالیہ اس مادی دنیا میں بہت کچھ تصرف کر سکتے ہیں۔[1]

اکثر متکلمینِ اسلام نے پہلی اور دوسری شقوں کو ایک میں داخل کر دیا ہے۔ اور ہیں بھی وہ درحقیقت ایک ہی، امور غیب کی اطلاع، ملائکہ اور روحانیت کا مشاہدہ، رویت اور ان سے تخاطب، یہ تمام تر وحی و مشاہدۂ روحانیات کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں، اور تیسری چیز کا نام ان کی زبان میں **معجزہ** ہے، ہم ان دونوں پر الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

[1] ابن سینا نے اشارات میں تفصیل سے اور نجات میں اختصار کے ساتھ ان نظریات کو بیان کیا ہے، امام رازی نے مباحث مشرقیہ میں اور ابن مسکویہ نے فوز الاصغر میں اس کو لکھا ہے، دیگر فلسفیانہ تصانیف میں بھی کم و بیش یہی ہے۔

وحی و مشاہدہ

ہمارے حکمائے متکلمین اور صوفیہ نے وحی و الہام اور مشاہدۂ روحانیات کی تشریح میں متعدد نظریے قائم کیے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) **الہام فطری اور الہام نوعی**۔ دنیا میں جتنی چیزیں پردۂ عدم سے منصۂ وجود پر آتی ہیں، وہ اپنے اپنے وجود کے ساتھ مختلف قسم کے خواص اور فطری علم اپنے ساتھ لاتی ہیں، گلاب کا پھول سرخ اور چنبیلی سفید کیوں ہوتی ہے؟ کھجور میٹھی اور اندراین کڑوا کیوں ہوتا ہے؟ ایک ہی زمین اور ایک ہی آب و ہوا میں مختلف پودے اگتے ہیں، مگر ہر ایک کا رنگ۔ مزہ اور بو مختلف کیوں ہوتی ہے، ان کے خواص اور کیفیات میں کیوں اس درجہ اختلاف ہوتا ہے، پرندہ کا بچہ انڈے کے چھلکے سے باہر آنے کے ساتھ زمین سے دانہ چننے لگتا ہے، بط کا بچہ پانی میں تیرنے لگتا ہے، حیوانات کے بچے ماؤں کے تھن میں منہ لگادیتے ہیں، چوہے کے بچہ نے گو کبھی بلی نہ دیکھی ہو، اور بلی کے بچہ نے کبھی چوہا نہ دیکھا ہو، مگر عمر میں پہلی دفعہ جب ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہر ایک سے اس کے فطری حرکات سرزد ہونے لگتے ہیں، ہر حیوان اپنے نفع و ضرر کو سمجھتا ہے، وہ مہلکات سے بھاگتا اور منافع کی طرف لپکتا ہے، یہ تعلیم اُن کو کس نے دی؟ شیر، لومڑی، کتا، بلی ہر ایک کے بچے سے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں، جو اُن کے نوعی خصوصیات ہیں، ان اعمال کا معلم کون ہے؟ کوتے بلبلوں کے جھنڈ میں اور بلبلیں کووں کے غول میں نہیں بیٹھتیں، یہ ہم جنسی کا علم ان میں کہاں سے آیا؟

چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں عظیم الشان اور حیرت انگیز جماعت بندی اور ذخیرہ اندوزی کی قابلیت کیونکر پیدا ہوئی، ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ معلّمِ فطرت نے عطیۂ وجود کے ساتھ ساتھ یہ طبعی خصوصیات اور الہامات بھی ان میں ودیعت کر دیے ہیں،

یہ تو انواع کا حال ہے، ہر نوع کے تحت میں اصناف ہیں، جس طرح ہر نوع کی خصوصیتیں اور قابلیتیں الگ الگ ہیں، اسی طرح ہر صنف کی خصوصیات اور استعدادات بھی الگ ہیں، ایک کبوتر کی کتنی قسمیں ہیں، ایک آم میں کس قدر اقسام ہیں، ایک نوع انسان میں کس قدر طبقات ہیں، ان میں سے ہر ایک صنف، قسم اور طبقہ اپنی مشترک نوعی خصوصیات کے ساتھ کچھ مستقل الگ صنفی اوصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہے، جو دوسرے اصناف میں نہیں پائے جاتے، افریقہ کے ایک وحشی انسان سے لے کر یورپ کے متمدن شہری تک، ایک ناخواندہ جاہل سے لیکر ایک فلسفی اور حکیم تک، کس قدر مختلف انسانی طبقات ہیں، ہر طبقہ اپنے اندر متعدد صنفی خصوصیات اور ادراکات رکھتا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ معلّمِ ازل انسانوں کے ایک اور صنف (انبیاء) کو علوم و معارف اور حقائق و اسرار کے وہ الہامات عطا کرے جن سے دیگر صنف انسانی محروم اور ناآشنا ہیں،

دنیا میں جس قدر علوم و فنون، صنائع و حرف، ایجاد و اختراعات پیدا ہو چکے ہیں، ان کا کوئی نہ کوئی بانی، موجد اور مخترع ہوگا، پارچہ بافی اور خیاطی سے لے کر ریاضیات اور میکنکس تک جس قدر صنائع و ایجادات اور علوم و معارف ہیں، وہ کسی نہ کسی ایک شخص کے ذہن کا نتیجہ ہیں، اسی بانی اور مخترعِ اول کے ذہن میں اس مسئلۂ خاص یا ایجاد خاص کا خطرہ

کیونکر ہو گیا؟ اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسرے سے سیکھے بغیر اس کے نفس میں مسئلۂ خاص اور اس ایجاد خاص کے متعلق ایک خاص قسم کی سوجھ یا فہم پیدا ہو گئی اور اس کے ذہن میں کہیں سے ایسی حقیقت بے پردہ مشہود ہو گئی جو دوسروں کے لیے تمامتر مستور تھی، یہی الہام ہے، اب جس شخص کو فلسفیانہ الہامات ہوتے ہیں وہ فلسفی ہے. جس کو شاعرانہ ہوتے ہیں، وہ شاعر ہے، جس کو آلات اور مشینوں کا الہام ہوتا ہے. وہ آلات ساز اور انجینیر ہے، اور جس نفس قدسی میں اسرار الہیہ، نوامیس ملکوتیہ، عقائدِ حقہ، اعمالِ صالحہ، قوانینِ عادلہ کا الہام ہو وہ پیغمبر ہے، اور اُس کے اس الہام کو **وحی** کہتے ہیں،

(۲) **انقطاع حواس عن المادیات**. انسان کے تمام محسوسات اور مدرکات بواسطہ یا بلا واسطہ اُس کے حواس خمسہ یعنی سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ سے ماخوذ ہیں، جن کے کام بہ ترتیب سننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور ٹٹولنا ہیں، اسی طرح انسان میں پانچ قوائے دماغی بھی ہیں جن کے نام حسّ مشترک، خیال، واہمہ، حافظہ اور متخیلہ ہیں، ان قوائے خمسہ کے متفرق کام ہیں **حس مشترک** تو آلاتِ حواس کا خزانہ یا لیٹر بکس ہے، انسان کو اپنے پانچوں حواس کے ذریعہ سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ سیدھا حسِ مشترک میں جاکر منطبع ہو جاتا ہے، اور پھر وہاں سے منتقل ہو کر **خیال** میں جمع ہو جاتا ہے، اور وہاں محفوظ رہتا ہے، **واہمہ** وہ قوت ہے، جو اپنے اس گذشتہ محفوظ خزانہ مدرکات کا بار بار جائزہ لیتی رہتی ہے اور اس پر احکام جاری کرتی رہتی ہے. مثلاً دور سے ہم نے ایک زرد سیال شے دیکھی پہلے سے ہمارے خیال میں شہد کی صورت محفوظ ہو. اس زرد سیال شے کو دیکھتے ہی ہم نے

کہد یا کہ "یہ شہد ہے اور یہ میٹھا ہوتا ہے" یہ واہمہ کا کام ہے۔ حافظہ میں قوتِ واہمہ کے مخزونات جمع رہتے ہیں، اور متخیلہ جس کا دوسرا نام مفکرہ بھی ہے، اُس قوتِ دماغی کو کہتے ہیں، جو مدرکاتِ خیال کی ترکیب و تحلیل کرتی رہتی ہے، اور ہمیشہ نئی نئی شکلیں اور عجیب عجیب صورتیں، سینما (صورِ متحرکہ) کے تماشے کی طرح ہمارے ذہن کے سامنے لاتی رہتی ہے۔ کبھی دو سر کا انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ کبھی بے سر کا چلتا پھرتا انسان مشاہدہ کراتی ہے، کبھی پرستان کی سیر کراتی ہے اور کبھی عالمِ قدس میں جانے کے لیے پر تولتی ہے، ذہن کو ہزاروں لاکھوں میل کی مسافت دم کے دم میں طے کرادیتی ہے، آنکھیں بند کرتے ہی ہماری دوسری آنکھوں کے سامنے جو ہنگامۂ فکر و خیال برپا ہو جاتا ہے، وہ اسی کا کارنامہ ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری قوت متفکرہ صرف آرام وسکون کے لمحوں میں کیوں یہ تماشے دکھاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا حسِ مشترک ہمیشہ خارج سے آلاتِ حواس کے بھیجے ہوئے محسوسات کی تحصیل و وصول میں مصروف رہتا ہے، اسلیے جب تک بیماری، نیند یا غفلت یا کسی اور سبب سے آلاتِ حواس میں تعطل نہیں ہوتا، ہمارے قوائے دماغی میں آرام وسکون نہیں پیدا ہو سکتا، خواب کی حالت میں جب یہ حواس تھوڑی دیر کے لیے اپنا کام موقوف کر دیتے ہیں، اس وقت ہمارے پراسرار قوائے ذہنی عالمِ بالا کی سیر کرنے لگتے ہیں، اور وہاں کے مشاہدات و مسموعات حس مشترک میں آکر ہماری قوت مفکرہ کو حرکت دیتے ہیں، اور ہم عجیب عجیب چیزیں دیکھنے اور عجیب عجیب آوازیں سننے لگتے ہیں، اب اگر کسی کی روح میں اتنی قوت ہو کہ حالتِ بیداری میں بھی اپنے ظاہری

آلات کو معطّل کر کے عالمِ بالا سے اپنا سلسلۂ تعلق قائم کر سکے تو اس کو سب کچھ اسی عالمِ بیداری میں نظر آسکتا ہے،

(۳) **قوت نبوت** - تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حواس انسانی صرف پانچ کے اندر محدود نہیں ہیں، چنانچہ شیخ الاشراق نے حکمۃ الاشراق میں اس پر دلائل قائم کیے ہیں بعض جمادات میں نباتاتی اوصاف ملتے ہیں بعض نباتات ایسے دریافت ہوئے ہیں جن میں قوتِ حس ہے جس سے دیگر نباتات عام طور سے محروم ہیں، حیوانات کے مختلف انواع میں بعض ایسے قویٰ کا پتہ چلتا ہے جو دیگر حیوانات میں نہیں شہد کی مکھیوں میں ایک ایسی عجیب غریب قوت ہے جس سے ان کو کسی طرح بند کر کے لیجایئے اور کہیں جا کر چھوڑ دیجئے وہ اپنے چھتہ کا راستہ پالیتی ہیں، مکڑیوں کی اقلیدسی اشکال بھی کسی قوت کا نتیجہ ہیں خواہ اس کا نام جبلت یا فطرت ہی کیوں نہ رکھو، اسی طرح ممکن ہے کہ انبیاءؑ میں احساس و ادراک کی وہ خاص قوت ہو جس سے اور اصنافِ انسانی محروم ہیں، وہ اپنی اسی قوتِ قدسیہ کے ذریعہ سے ان چیزوں کا احساس و ادراک کر لیتے ہیں، جن کو عام قوائے انسانی نہیں کر سکتے، مولانا رومیؒ نے مثنوی میں اس خیال کو جا بجا ظاہر کیا ہے،

پنج حسے ہست جز این پنج حس | آن چو زر سرخ و این حسہا چو مس

ان پانچ جسمانی حواسوں کے علاوہ پانچ اور روحانی حواس بھی ہیں، وہ تانبا ہیں اور یہ سونا ہیں

حسِ ابدان قوتِ ظلمت خورد | حسِ جان از آفتابے می چرد

جسمانی حواس تاریکی سے قوت اخذ کرتے ہیں، تو روحانی حواس آفتاب سے۔

ہر کہ از حسِ خدا دید آیتے   در بر حق داشت بہتر طاعتے

حس نے اس خدائی احساس کی کوئی نشانی دیکھ لی ہے، وہ خدا کے سامنے زیادہ مطیع ہو

گر بدیدے حسِ حیواں شاہ را   پس بدیدے گاؤ خر اللہ را

اگر حیوان اپنے احساس سے بادشاہ کا مرتبہ پہچان سکتے تو بیل اور گدھے بھی خدا کو دیکھ لیتے

گر نہ بودے حس دیگر مر ترا   جز حس حیواں ز بیرون ہوا

اگر احساس حیوانی کے علاوہ تم کو اور دوسرے قوائے احساس نہ ملے ہوتے

پس بنی آدم مکرّم کے بُدے   کے بہ حسِ مشترک محرم شدے

تو بنی آدم کا درجہ اتنا بڑھایا کیوں جاتا، اور صرف حس مشترک کی بنا پر وہ محرم راز کیونکر ہو سکتا

فلسفی گو یدز معقولات دُوں   عقل از دہلیز می ماند بروں

فلسفی لغو معقولات کی باتیں کرتا ہے، تو عقل دہلیز کے باہر رہ جاتی ہے،

فلسفی منکر شود در فکر و ظن   گو برو، سر را براں دیوار زن

فلسفی جو صرف اپنی فکر و گمان کے باعث ان حقایق کا انکار کرتا ہو اسکو کہنا چاہئے کہ اپنا سر دیوار پر دے مارے

نطقِ آب و نطقِ باد و نطقِ گِل   ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

پانی، ہوا، مٹی، ان سب کا نطق، اہلِ دل کے حواس کو محسوس ہوتا ہے

فلسفی کو منکرِ حنانہ است   از حواسِ انبیا بیگانہ است

فلسفی جو ستونِ حنانہ کے گریہ کا منکر ہے اس کا سبب ہے کہ انبیا کے حواس سے واقف نہیں ہے

(۴) **حواس کی غیر محدودیت** ۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حواس پانچ ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود نہیں ہے، تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان حواسوں کی وسعتِ احساس، ان کے حدود کے اندر محدود ہے اور چند اشخاص کو جو چیز دکھائی یا جو آواز سنائی دیتی ہے وہ اس لیے غلط ہے کہ عام انسان اس کو دیکھ، سن نہیں سکتے یا جو چیز ہم کو اس وقت دکھائی یا سنائی نہیں دیتی، وہ آیندہ بھی ہم کو دکھائی یا سنائی نہیں دیگی، بالکل ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو دیکھ یا سن نہ سکے، دوسرا انسان اُس کو دیکھ اور سن لے، کوتہ نظر پاس کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتے، لیکن تیز نظر میلوں کی خبر لیتے ہیں، بعض انسانوں اور حیوانوں میں بعض قوائے احساس اوروں سے زیادہ تیز ہوتے ہیں، چیونٹی میں قوتِ شامہ چیل اور کبوتر میں قوتِ باصرہ، سانپ میں قوتِ لامسہ، کتوں اور گھوڑوں میں قوتِ سامعہ معمولی سطحِ حواس سے بہت زیادہ بلند ہوتی ہے، خود انسان کے حواس کے درجے کسقدر متفاوت اور مختلف ہیں، ایک انسان دور سے آواز سنتا ہے، دور کی چیز اس کو نظر آتی ہے، دور کی نہایت نازک خوشبو محسوس کر لیتا ہے لیکن کمزور حواس کے انسان ان کا مطلق احساس نہیں کر سکتے، لیکن کسی طریقہ سے اگر ان کے حواس کی قوت اور تیزی میں اضافہ ہو سکے تو وہ بھی اسی طرح دیکھ سکتے، سُن سکتے اور سونگھ سکتے ہیں،

مقدمۂ بالا سے معلوم ہوا کہ ایک کم نظر انسان یا گراں گوش آدمی جس قدر دیکھتا یا سنتا ہے، اگر اس کی قوتِ بصارت وسماعت کو کسی تدبیر سے ترقی دی جائے تو وہ حیرت انگیز طریقہ سے ترقی کر سکتی ہے، اور پھر جسقدر اس کے حواس میں ترقی ہوتی جائے گی، اس کے احساسات

میں اضافہ اور محسوسات میں وسعت آتی جائے گی، ہمارے ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس ہے، ہم اس کو پینا چاہتے ہیں، اس میں گرد وغبار کا ایک ذرہ بھی ہم کو نظر نہیں آتا لیکن ہم خوردبین لگا کر دیکھیں تو قطرہ قطرہ میں ہم کو کیڑوں کی بستی کی بستی نظر آئے گی، خالی آنکھ سے ہم کو صرف آفتاب، ماہتاب اور کچھ چھوٹے بڑے روشن ستارے دکھائی دیتے ہیں، یہانتک کہ بطلیموس کو ثوابت کی حرکت تک محسوس نہیں ہوئی، اور اس وقت تک صرف تین سو ستارے دریافت ہو سکے، اور اب جب ایک سے ایک طاقتور دوربینیں نکل رہی ہیں تو ہر نئی دوربین کی ایجاد کے بعد پہلے سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ صرف ساتویں درجہ کے ستارے تیرہ ہزار اور آٹھویں درجہ کے چالیس ہزار نویں درجہ کے ایک لاکھ بیس ہزار ہم کو اس فضائے آسمانی پر تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ہرشل کی دوربین سے کل چھوٹے بڑے دو کرور ستاروں کی فوج ہم کو دکھائی دینے لگی ہے۔

یہی حال **سماعت** کا ہے، پہلے ہماری آواز زیادہ سے زیادہ ایک میل جاسکتی ہوگی، ٹیلیفون کی پہلی ایجاد نے اس فاصلہ کو بڑھایا، اور دو چار قدم کے بعد شہر کے ایک گوشہ میں بیٹھکر دوسرے گوشہ کے لوگوں سے باتیں کرنے لگے، چند سالوں میں یہانتک ترقی ہوگئی کہ سوئیزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں بیٹھکر ہم بولتے ہیں اور فرانس میں لوگ اس کو سنتے ہیں، لکھنؤ سے الہ آباد دم کے دم میں آپ کی آواز پہنچتی ہے، اور اب ہندستان سے ہزاروں میل دور لندن میں آپ کی آواز پہنچنے والی ہے۔

ان روزمرہ کی مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حواس کے فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کے دائرہ کی تحدید نہیں کی جاسکتی ہے، اور یہ ممکن ہے کہ صنف انسانی کے حواس اسقدر تیز، سریع اور قوی ہوں کہ ان کو وہ کچھ نظر آئے جو ہم کو نظر نہیں آتا، اور وہ کچھ سنائی دے جو ہم کو سنائی نہیں دیتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی صف کے اندر فرماتے ہیں کہ مجھکو اسی مقام سے دوزخ اور جنت نظر آئی، حضرت یعقوبؑ کو کنعان کی وادی میں بیٹھ کر مصر سے حضرت یوسفؑ کے پیرہن کی خوشبو معلوم ہوتی ہے، مولانا رومیؒ اسی خیال کو ان اشعار میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس حالت میں ایک حس کی تیزی دوسرے حواس کو بھی تیز کر دیتی ہے۔

پنج حس با یک دگر پیوستہ اند ‏ ‏ ‏ زانکہ ایں ہر پنج ز اصلی رستہ اند

حواسِ خمسہ باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ پانچوں حواس ایک ہی اصل سے نکل کر آئے ہیں

قوتِ یک قوتِ باقی شود ‏ ‏ ‏ مابقی را ہر یکے ساقی شود

ایک حاسہ کی قوت، بقیہ حواس کی قوت بن جاتی ہے

دیدنِ دیدہ فزاید عشق را ‏ ‏ ‏ عشق اندر دل فزاید صدق را

دیدارِ چشم، عشق کو ترقی دیتا ہے، اور عشق دل میں سچائی پیدا کرتا ہے

صدق بیداریِ ہر حس می شود ‏ ‏ ‏ حسہا را ذوقِ مونس می شود

سچائی ہر حاسہ کی بیداری کا سبب ہو جاتی ہے اور احساس کو ذوق و وجدان سے مدد ملنے لگتی ہے

(۵) **عالم مثال**۔ علمائے اسلام میں جن کے سینے علم و حکمت کے ساتھ نورِ معرفت سے

بھی منور ہیں، انھوں نے نظر و استدلال سے نہیں، بلکہ ذوق و عرفان سے ایک اور راستہ اختیار کیا ہے۔ حکما، میں دو گروہ ہیں، ایک **وحدیہ** اور دوسرا **ثنویہ**، وحدیہ وہ ہیں جو ایک ہی عالم کے قائل ہیں یعنی ان کے نزدیک مبدُ عالم صرف ایک ہی ہے، ان کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جو مبدء عالم صرف مادہ کو مانتی ہے، اور مادہ کے علاوہ کسی اور چیز کو تسلیم نہیں کرتی، یہاں تک کہ عقل و حیات اور قواے ذہنیہ تک اُس کے نزدیک تمامتر مادہ کی نیرنگیاں ہیں، ان کو **مادیین** اور **طبیعین** کہتے ہیں، اور دوسری جماعت مادہ سے یکسر منکر ہے، وہ صرف نفس و روح کو تسلیم کرتی ہے، اور اس عالم محسوس کو وہم و تصور سے زیادہ رتبہ نہیں دیتی، اس کے نزدیک عالم اور عالم میں جو کچھ ہے وہ نفس و روح کے مظاہر ہیں۔ ان کو **روحانیین** کہتے ہیں،

ثنویہ۔ دو مبدء عالم تسلیم کرتے ہیں یعنی مادہ اور روح، اور عالم کو ان دونوں کا جلوہ گاہ تسلیم کرتے ہیں،

ہم نے اوپر کی سطروں میں جن ارباب معرفت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ تین عالم تسلیم کرتے ہیں، ایک تو یہ **عالم اجساد** یا **عالم شہادت** جس کو تم مادہ اور مادیات کہتے ہو، دوسرا **عالم ارواح** یا **عالم غیب** جو مادی اور مادیات سے منزہ اور مافوق ہے، اور تیسرا **عالمِ مثال** یا **عالمِ برزخ**، یہ وہ عالم ہے جہاں عالمِ اجساد اور عالمِ ارواح، عالمِ شہادت اور عالم غیب دونوں کے اوصاف اور قوانین مجتمع ہو جاتے ہیں، عالم اجساد کی چیزیں وہاں جاکر پیکر مادی سے پاک ہو کر سامنے آتی ہیں، اور غیر مادی مانی اور حقائق

اور عالم ارواح کی مخلوقات وہاں مجسم اور متجسّد ہو کر نظر آتی ہیں، امام ربانی مکتوبات میں لکھتے ہیں،

اے برادر! عالم ممکنات را سہ قسم قرار دادہ اند، عالم
ارواح و عالم مثال و عالم اجساد۔ عالم مثال را برزخ
گفتہ اند درمیان عالم ارواح و عالم اجساد، ونیز گفتہ
اند کہ عالم مثال در رنگ مرآۃ است مر معانی وحقائق
ایں ہر دو عالم را کہ معانی وحقائق اجساد و ارواح در
عالم مثال بصور لطیفہ ظہور می نماید، چہ در آنجا مناسب
ہر معنی وحقیقی صورت وہیئت دیگر است، وآں عالم
فی حد ذاتہ متضمن صور وہیئات واشکال نیست
صور واشکال در وے از عوالم دیگر منعکس گشتہ ظہور
یافتہ است، ورنگ مرآۃ است کہ فی حد ذاتہا
متضمن ہیچ صورت نیست، اگر در وے صورت
کائن است از خارج آمدہ است

(جلد سوم مکتوب سی ودوم)

عالم ممکنات کی تین قسمیں قرار دی ہیں،
عالم ارواح، عالم مثال اور عالم اجسام،
عالم مثال کو عالم ارواح اور عالم اجسام کے
بیچ میں کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عالم مثال
عالم ارواح اور عالم اجسام کے معانی وحقائق
کے لیے آئینہ کے مانند ہے کہ اس عالم مثال میں
اجسام وارواح کے معانی وحقائق لطیف صورتوں
میں ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ اس عالم مثال میں ہر معنی
وحقیقت کی ایک خاص مناسب شکل ہے، اس
عالم مثال میں بذات خود کوئی صورت وشکل وہیئت
نہیں ہے، یہ صور واشکال دوسرے عالموں سے
آکر اس میں عکس انداز ہوتی ہیں، جس طرح
خود آئینہ میں کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ جو
صور واشکال اس میں نمودار ہوتی ہیں، وہ خارج سے آکر اس میں جلوہ گر ہوتی ہیں،

بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان بزرگوں کا عالم مثال وہی **افلاطون** کا عالم مثل
ہے، لیکن افلاطون فرقہ وحدیہ سے تھا، یعنی عالم کا مبدأ صرف ایک تسلیم کرتا تھا، اس لیے
اس کے نظریہ کا منشا صرف یہ ہے کہ اس عالم محسوس میں ہر شے فرداً فرداً جزئی اور مشخص

ہو کر آتی ہے، نفس کلی اور مطلق نوع وجود خارج میں نہیں، مثلاً ہم کہتے ہیں "انسان ہنستا ہے"
"گھوڑا ہنہناتا ہے"۔ "کتا بھونکتا ہے"۔ تو یہ کسی خاص انسان، خاص گھوڑے، یا خاص کتے
کی نسبت حکم نہیں ہے، بلکہ انسان، گھوڑے، اور کتے کی نوع پر حکم لگایا گیا ہے، لیکن
کلی انسان، مطلق گھوڑا، اور مطلق کتے کا وجود تو اس عالم محسوس میں نہیں مگر کہیں نہ
کہیں تو اس کا وجود ہونا چاہیے، پھر کہاں ہے؟ عام جواب یہ ہے کہ ذہن میں، مگر
ذہن جو ہمارے محدود مختصر دماغ کا دوسرا نام ہے، کوئی ایسا ظرف نہیں جس کے اندر یہ
ساری دنیا سما سکے، اس لیے ایک اور عالم ہے جس میں کلیات اور انواع بستے ہیں، اس
عالم محسوس میں جتنی چیزیں ہیں وہ کسی نہ کسی نوع کے تحت میں ہیں، یہ انواع عالم مثل میں ہیں
اور ان کے عکس اور سائے جن کا نام افراد اور جزئیات ہی، وہ اس عالم محسوس میں ہیں،
حقیقی وجود ان ہی انواع یا مثل کا ہے، وہ گویا قدرت کے سانچے ہیں اور ان ہی سے ڈھل ڈھل کر
اس عالم محسوس میں افراد اور جزئیات نمودار ہوتے ہیں، مگر ان افراد اور جزئیات کا کوئی
مستقل وجود نہیں ہے، وہ صرف اپنی اپنی نوع کے آثار اور ظلال (سایہ) ہیں، پھر ان میں
سے ہر نوع کی مستقل روحِ نوعی ہے، جو اس نوع کا خدا ہے، اسی کا نام ان کی اصطلاح
میں ربُ النوع ہے،

یہ ہے مُثلِ افلاطون کی حقیقت، عالمِ مثال کی حقیقت اس سے بالکل الگ ہے۔
اس عالم کے قائلین جیسا کہ ابھی امام ربانیؒ کے مکتوب کے حوالہ سے گذر چکا، تین عالم کے
قائل ہیں، عالمِ جسمانی[۱]، عالمِ روحانی[۲] اور عالمِ مثالی[۳]، عالمِ مثالی جسم و روح کے احکام کا

جامع ہے، اس میں روحانی اشیا متجسم اور جسمانی چیزیں کسی اور مناسب شکل میں متشکل ہو کر نظر آتی ہیں، اور وہ معانی و حقائق جن میں جسم و جان نہیں، مثلاً حیات، موت، علم، عقل، جسمانی رنگ و روپ میں وہاں نمایاں ہوتی ہیں، ارواح، فرشتے، جبریل، جو جسم سے پاک ہیں، اس عالم میں متجسم معلوم ہوتے ہیں، اس کی مثال بالکل خواب کی سی ہے کہ اس میں کبھی روحانیات متجسم ہو کر اور کبھی جسمانیات کسی اور شکل میں نمودار ہو کر جلوہ گر ہوتے ہیں، اور اہلِ معرفت ان کو دیکھ کر ان کی مناسب تعبیر کرتے ہیں، مثلاً کبھی خواب میں علم دریا کی صورت میں، غیظ و غضب آگ کی شکل میں، شجاعت شیر کی ہیئت میں نظر آتی ہے، اسی طرح عالمِ مثال میں بھی معانی و حقائق اور روحانیات و مجردات کسی مناسب جسمانی شکل و صورت میں دکھائی دیتے ہیں، اور اُن کو دیکھ کے اہلِ بصیرت ان رموز و کنایات کی حقیقت کو پا لیتے ہیں، خود عالمِ مثال میں کوئی آبادی نہیں، وہ صرف ایک آئینہ خانہ ہے جس میں عالمِ بالا یا عالمِ زیریں سے جو شکل بھی اس کے سامنے آتی ہے، اہلِ بصیرت کو نظر آجاتی ہے

علمائے اسلام میں سب سے پہلے یہ خیال امام **غزالی** کے ہاں ملتا ہے، لیکن اس کو انھوں نے **عالم** کے لفظ سے نہیں، بلکہ **وجود** کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کسی شے کے وجود کا ثبوت ہمارے پاس اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اس کا احساس یا **تعقل** کرتے ہیں، ہمارے معلومات و محسوسات ذہن میں موجود ہیں اور ان کا یہ وجود بھی اسی طرح ناقابلِ انکار ہے جس طرح عام اشیا کا یہ خارجی وجود، لیکن نہ ہم ان کو دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ چکھ سکتے ہیں، نہ سونگھ سکتے ہیں، نہ ٹٹول سکتے ہیں، اس بنا پر امام صاحب

کے نزدیک وجود کی تین قسمیں ہیں، وجودِ حسّی، وجودِ عقلی اور وجودِ خیالی، اس آخری قسم کی انھوں نے حسبِ ذیل تفصیل کی ہے،

"اور وہ یہ ہے کہ زبان حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آئے، اور یہ خاص انبیاء اور پیغمبروں کی شان ہے، اسکی مثال خواب کی ہے جس طرح خواب میں زبان حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے، اور وہ آوازیں سنتے ہیں مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے، یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے، یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے، یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے، یا اس سے چھینتا ہے، یا یہ دیکھے کہ اسکی انگلی آفتاب، سورج یا چاند گہن بن گئی یا اس کا ناخن شیر ہو گیا ہے، یا اسی قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں، اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں ان سے خطاب کرتی ہیں، ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں، وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے، یا خارجی اور حسّی ہے، خواب دیکھنے والے کو تو یہ فرق اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جاگ جاتا ہے، اور خواب و بیداری کی دونوں حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے،

جن لوگوں کو ولایت تامہ حاصل ہو جاتی ہے، ان کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا، بلکہ اسکا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے، اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے، اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو نظر آتا ہے، اور وہی سنتے ہیں جو صاحب ولایت کو سنائی دیتا ہے" (مضنون بہ علیٰ غیر اہلہ صفحہ ۱۹، مصر)

احیاء العلوم باب عذاب القبر میں بھی امام صاحب نے اس کی تشریح کی ہے، امام خطابی (مشہور امام الحدیث) نے معالم السنن میں اس کو رویا کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، افسوس ہے کہ معالم کا اصل نسخہ موجود نہیں، حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں ان کی رائے نقل کی ہے، شریک بن عبد اللہ کی روایت جس میں معراج میں خدا کے قرب کی تصریح ہے، اس کی شرح میں لکھتے ہیں:-

فمن لم یبلغہ هذا من الحدیث الا هذا القدر مقطوعاً عن غیرہ ولم یعتبرہ باول القصة واٰخرها اشتبہ علیہ وجهہ ومعناہ وکان قصاراہ اما رد الحدیث من اصلہ واما الوقوع فی التشبیہ وهما امران مرغوب عنهما واما من اعتبر اول الحدیث باٰخرہ فانہ یزول عنہ الاشکال فانہ مصرح فیهما فانہ کان رؤیا لقولہ فی اولہ "وهو نائم" وفی اٰخرہ "استیقظ" وبعض الرویا مثل یضرب لیتاول علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ معنی التعبیر فی مثلہ وبعض الرویا لا یحتاج الی ذلک بل یاتی کالمشاهدة[1]

پس جس شخص کو اس حدیث کا اتنا ہی ٹکڑا (کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوا) حدیث کے دوسرے ٹکڑوں سے الگ ہو کر پہنچا، اور اس نے آغاز روایت اور آخر روایت کو باہم ملا کر نہ دیکھا تو اس حدیث کا مطلب اس پر مشتبہ ہو جائیگا، اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ یا وہ اصل حدیث سے انکار کر دے اور یا یہ کہ وہ خدا کی تجسیم کا قائل ہو جائے، اور یہ دونوں باتیں ناپسندیدہ ہیں، لیکن جو شخص اول و آخر حدیث کو ملا کر دیکھیگا تو اس سے اشکال رفع ہو جائیگا، کیونکہ حدیث کے شروع میں اور آخر میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا کیونکہ شروع میں ہے کہ آپ سوئے تھے اور آپ نے دیکھا" اور آخر میں ہے کہ اس کے بعد آپ بیدار ہوئے، بعض خواب بہ رنگ تمثیل ہوتے ہیں، جنکی تعبیر اسی طرح کیجاتی ہے جس طرح اس قسم کے خوابوں کی تعبیر کیجاتی ہے، اور بعض خواب

[1] فتح الباری جلد ۱۳، ص ۴۰۲

امام صاحب کے بعد شیخ الاشراق نے اس کا عالم نام رکھا اور اس کی کچھ کیفیت بیان کی، مگر انھوں نے عالمِ مثال اور مُثل افلاطونیہ کو باہم خلط ملط کر دیا ہے، حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی اپنی بعض تصنیفات میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے، خواجہ حافظ کے ہاں یہ خیال پایا جاتا ہے ع "عالمے ہست کہ ایں عالم ازاں تمثالے است۔" حضرات نقشبندیہ میں نہیں معلوم یہ خیال کب سے قائم ہے، بہرحال امام ربانی شیخ احمد سرہندی کے زمانہ کے بہت سے پہلے یہ خیال ان میں پایا جاتا ہے، کیونکہ امام ربانی کی تحریروں میں متعدد مقام پہ اس کا ذکر ہے، ان کے بعد تو حضرات مجددیہ کی تصنیفات میں اس عالم کی نیرنگی اور بوقلمونی پر نہایت پُر اسرار مباحث ہیں، علمائے متکلمین میں جس کو سب سے پہلے اس نظریہ کو علم کلام میں استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوا، وہ مجدد الف ثانیؒ کے ایک مرید مُلا بدرالدین ہیں، چنانچہ وہ ایک خط میں مجدد صاحب کو لکھتے ہیں:۔

پس عذاب قبر در عالمِ مثال خواہد بود در رنگ آنکہ
در خواب در عالمِ مثال نمایند، و نوشتہ بودند کہ ایں سخن
شاخہائے بسیار دارد و اگر قبول نمایند فروغ بسیار
بریں سخن متفرع خواہد ساخت
(مکتوب سی و یکم جلد سوم)

پس عذاب قبر بھی عالم مثال میں ہوگا، اسی طرح جس طرح
کہ خواب میں مثالی رنگ میں دڑاونی تکلیف محسوس ہوتی
ہے اور یہ بھی انھوں نے لکھا کہ اس مسئلہ سے بہت سی
شاخیں نکل سکتی ہیں اور اگر آپ قبول فرمائیں تو اس سے
بہت سے فروع پیدا ہو سکیں گے۔

یہی چند منتشر خیالات تھے جن کو شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک عالم بنا دیا، چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں عالمِ مثال کا ایک باب باندھا ہے، اور اس کے تمام اصول و فروع بیان کئے ہیں

کیے ہیں، ہم اس موقع پر شاہ صاحب کے اس باب کا پورا ترجمہ درج کرتے ہیں،

"جاننا چاہیے کہ بہت سی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم موجودات میں ایک ایسا عالم بھی ہے جو غیر مادی ہے اور جس میں معانی (اعراض و حقائق) ان اجسام کی صورت میں متشکل ہوتے ہیں، جو اوصاف کے لحاظ سے ان کے مناسب ہیں پہلے اس عالم میں اشیاء کا ایک گونہ وجود ہو لیتا ہے، تب دنیا میں ان کا وجود ہوتا ہے، اور یہ دنیاوی وجود ایک اعتبار سے بالکل اس عالم مثال کے وجود کے مطابق ہوتا ہے،

اکثر وہ اشیا جو عوام کے نزدیک جسم نہیں رکھتیں، اس عالم میں منتقل ہوتی اور اترتی ہیں، اور عام لوگ ان کو نہیں دیکھتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب خدا نے رحم کو پیدا کیا تو وہ کھڑی ہو کر بولی کہ یہ اس شخص کا مقام ہے جو قطع رحم سے پناہ مانگ کر تیرے پاس پناہ ڈھونڈھتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقرہ اور آل عمران قیامت میں بادل یا سائبان، یا صف بستہ پرندوں کی شکل میں آئیں گی، اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت کریں گی جنھوں نے ان کی تلاوت کی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں اعمال حاضر ہوں گے تو پہلے نماز آئے گی، پھر خیرات، پھر روزہ الخ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیکی اور بدی دو مخلوق ہیں، جو قیامت میں لوگوں کے سامنے کھڑی کی جائیں گی، سو نیکی نیکی والوں کو بشارت دے گی، اور برائی برائی والوں کو کہے گی کہ "ہٹو ہٹو" لیکن وہ لوگ اس سے چمٹے ہی رہیں گے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں اور جتنے دن ہیں، وہ معمولی صورت میں حاضر ہوں گے، لیکن جمعہ کا دن چمکتا دمکتا ہوا آئے گا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ قیامت میں دنیا ایک بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی جس کے بال کھچڑی،
دانت نیلے اور صورت بدنما ہوگی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو میں دیکھتا ہوں
کیا تم بھی دیکھتے ہو، میں دیکھ رہا ہوں کہ فتنے تمھارے گھروں پر اس طرح برس رہے ہیں
جس طرح بادل سے قطرے"۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی حدیث میں فرمایا کہ "اچانک
چار نہریں نظر آئیں، دو نہریں اندر تھیں اور دو باہر، میں نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کیا ہے" بولے
اندر کی نہریں تو جنت کی ہیں، اور باہر کی نیل اور فرات ہیں"، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے کسوف کی نماز میں فرمایا کہ بہشت اور دوزخ میرے سامنے مجسم کر کے لائی گئیں، اور
ایک روایت میں ہے کہ میرے اور قبلہ کی دیواروں کے بیچ میں بہشت و دوزخ مجسم
ہو کر آئیں، میں نے ہاتھ پھیلائے کہ بہشت سے انگور کا ایک خوشہ توڑ لوں لیکن دوزخ
کی گرمی کی لپٹ سے رک گیا، اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجیوں
کے چور کو اور ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا جس نے ایک بلی کو باندھ کر مار ڈالا تھا اور
ایک فاحشہ عورت کو بہشت میں دیکھا جس نے کتے کو پانی پلایا تھا، اور یہ ظاہر ہے
کہ بہشت اور دوزخ کی وسعت جو عام لوگوں کے خیال میں ہے وہ اس قدر مسافت
(یعنی کعبہ کی چار دیواری) میں نہیں سما سکتی، اور حدیث میں ہے کہ بہشت کو مکروہات
نے اور دوزخ کو شہوات نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے"،

پھر جبریل کو خدا نے حکم دیا کہ دونوں کو دیکھیں، اور حدیث میں ہے کہ بلا جب نازل
ہوتی ہے تو دعا اس سے کشتی لڑتی ہے، اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ خدا نے عقل کو پیدا کیا

اور اس سے کہا کہ آگے آ، تو وہ آگے آئی، پھر کہا کہ پیچھے ہٹ تو پیچھے ہٹ گئی، اور حدیث میں ہے کہ یہ دونوں کتابیں پروردگار عالم کی طرف سے ہیں، الخ اور حدیث میں ہو کہ "(قیامت میں) موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی، پھر دوزخ اور بہشت کے درمیان ذبح کردیجائیگی"۔ اور خدا نے فرمایا کہ "ہم نے اپنی روح مریم کے پاس بھیجی تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن کر آئی"۔ اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جبریلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے تھے اور آپ سے باتیں کرتے تھے، اور کوئی ان کو نہیں دیکھتا تھا، اور حدیث میں ہے کہ قبر ہفتاد در ہفتاد گز چوڑی ہو جاتی ہو، یا اسقدر سمٹ آتی ہو کہ مردہ کی پسلیاں بھرکس ہوجاتی ہیں، اور حدیث میں ہو کہ فرشتے قبر میں آتے ہیں اور مردہ سے سوال کرتے ہیں، اور مردہ کا عمل مجسم ہوکر اس کے سامنے آتا ہو، اور نزع کی حالت میں فرشتے حریر یا گزی کا کپڑا لیکر آتے ہیں، اور فرشتے مردہ کو لوہے کے گرز سے مارتے ہیں، مردہ شور کرتا ہے اور اس کے شور کی آواز مشرق سے مغرب تک کی چیزیں سنتی ہیں، اور حدیث میں ہو کہ قبر میں کافر کے اوپر ننانوے اژدھے مسلط ہوتے ہیں جو اس کو کاٹتے ہیں تا بہ قیامت، اور حدیث میں ہو کہ جب مردہ قبر میں آتا ہے تو اس کو نظر آتا ہو کہ آفتاب غروب ہو رہا ہو، وہ اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہو کہ ٹھہرو نماز پڑھ لوں، اور حدیث میں اکثر جگہ آیا ہے کہ قیامت میں خدا بہت سی مختلف صورتوں میں لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پاس اس حالت میں جائیں گے کہ خدا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوگا، اور یہ کہ خدا انسانوں سے بالمشافہ بات چیت کریگا، اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

ان حدیثوں کو جو شخص دیکھے گا تین باتوں میں سے ایک نہ ایک بات اسکو ماننی پڑیگی،

یا تو ظاہری معنی مراد لے اور اس صورت میں اس کو ایک ایسے عالم کا قائل ہونا پڑیگا جسکی

کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں (یعنی عالمِ مثال) اور یہ صورت وہ ہے جو اہلِ حدیث کے قاعدے کے

مطابق ہے چنانچہ سیوطی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود میری بھی یہی رائے ہے اور یہی تو ہے نہ

یا اس بات کا قائل ہو کہ دیکھنے والے کے حاسہ میں واقعات کی یہی شکل ہوگی۔ اور اس کی نظر میں

وہ اسی طرح جلوہ گر ہوں گے، گو اس کے حاسہ کے باہر اس کا وجود نہ ہو۔ قرآن مجید میں جو آیا

ہے کہ "آسمان اس دن صاف دھواں بن کر آئیگا" اس کے معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے

اسی کے قریب لیے ہیں یعنی یہ کہ لوگوں پر قحط پڑا تھا تو جب کوئی آسمان کی طرف دیکھتا

تھا تو اس کو بھوک کی وجہ سے آسمان دھواں سا معلوم ہوتا تھا۔ ابن ماجشون (مشہور

محدث تھے) سے مروی ہے کہ جن حدیثوں میں خدا کے اترنے اور مرئی ہونے کا ذکر ہے، انکے

معنی یہ ہیں کہ خدا مخلوقات کی نظر میں ایسا تغیر پیدا کر دے گا کہ وہ خدا کو ایسی حالت میں دیکھیں گے

کہ وہ اتر رہا ہے اور جلوہ دکھا رہا ہے اور اپنے بندوں سے گفتگو اور خطاب کر رہا ہے،

حالانکہ خدا کی جو شان ہے اس میں نہ تغیر ہوگا نہ منتقل ہوگا۔ اور یہ اس لیے ہوگا کہ لوگ

جان لیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ سب باتیں بطور تمثیل کے بیان

کی گئی ہیں جن سے مقصود کچھ اور ہے۔ لیکن جو شخص صرف اسی احتمال پر بس کرتا ہے، میں

اس کو اہلِ حق میں شمار نہیں کرتا۔ امام غزالی نے عذابِ قبر کے بیان میں ان تینوں

مقامات کو بیان کیا ہے، اور کہا ہے کہ کہ ان تمام واقعات کے ظاہری معنی صحیح ہیں

اور ان کے اندرونی اسرار مخفی ہیں، لیکن اربابِ بصیرت کے نزدیک یہ اسرار فاش

اور کھلے ہوئے ہیں، تو جن لوگوں پر یہ اسرار فاش نہ ہوں ان کو ان کے ظاہری معنوں
کا انکار مناسب نہیں ہے کہ ایمان کا آخری درجہ تسلیم اور اقرار ہے"

اس کے بعد دوسرے متفرق ابواب میں وحی، معراج، رویتِ ملائکہ، ملاقاتِ انبیاء، براق، سدرۃ المنتہیٰ وغیرہ سب کی تشریح اسی عالم میں کی ہے، ہم نے آگے چل ایک باب **عالمِ رویا** کا قائم کیا ہے، اُس میں دکھایا ہے کہ اس اصول کی صحت پر آیات و احادیث سے استناد ہو سکتا ہے،

ان تمام نظریات پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا درجہ دلائل و براہین کا نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں ان میں سے ہر نظریہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ بظاہر ان چیزوں کے تسلیم کرنے میں عقل کو جو استحالہ یا کم از کم استبعاد نظر آتا ہے، وہ کم یا دور ہو جائے، اسلیے ہر گروہ نے اپنے اپنے ذوق اور طریق فکر کے مطابق اپنے تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ سے ایک ایسا تمثیلی نظریہ قائم کیا ہے، جس پر قیاس کر کے وہ باتیں جو تجربہ و مشاہدہ سے ماورا ہیں، ان کا کچھ دھندلا سا خاکہ ذہن انسانی میں قائم ہو جائے کہ وہ انکے انکار و استبعاد کی جرأت نہ کر سکے، اور قلبِ بدگمان اور عقلِ نارسا کسی قدر تسلی پا سکے، ورنہ ظاہر ہے کہ شاہد سے غائب پر، محسوسات سے غیر محسوسات پر، تجربات سے ناممکن التجربہ حقایق پر، جسمانی قوانینِ فطرت سے روحانی خصائص پر استشہاد کیونکر کیا جا سکتا ہے،

کو کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمارا

ہمارے متکلمین کے نزدیک معجزہ وہ امر ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کے دعوی کی صداقت کے لیے دنیا پر ظاہر کرتا ہے، اس کے لیے چند شرائط ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ وہ خارق عادت ہو تو گویا معجزہ کی عام تعریف یہ سمجھنی چاہیے کہ معجزہ اس خارق عادت چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے پیغمبر کی تصدیق کے لیے صادر ہو، اب معجزہ کے ثبوت میں اصل اشکال جو پیش آتا ہے، وہ یہ ہے کہ عالم کائنات ایک نظام خاص پر قائم ہے، ہر شے کی ایک علت اور ہر حادثہ کا ایک سبب ہے، علت اور سبب کے بغیر کوئی شے پیدا نہیں ہوتی علت ومعلول کا جو سلسلہ اشیاء میں نظر آتا ہے، ان میں باہم اس قدر لزوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے منفک نہیں ہو سکتے، ہر شے میں ایک خاصیت ہے جو اس سے الگ نہیں ہو سکتی، اور نیز جس شے میں جس چیز کی خاصیت نہیں ہے، اس کا اس سے صدور بھی نہیں ہو سکتا، آگ جلاتی ہے، سمندر بہتا ہے، درخت ساکن ہے، پتھر چلتے نہیں، سورج میں نور ہے، کنکر بولتے نہیں، سنکھیا زہر قاتل ہے، انسان مر کر پھر جیتا نہیں، اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آگ نے جلایا نہیں، سمندر دفعۃً تھم گیا، درخت چلنے لگا، پتھر حرکت کرنے لگا، آفتاب میں سیاہی آگئی، زہر کھا کر آدمی مرا نہیں، اور انسان مر کر ایک اشارہ سے پھر جی اٹھا، تو درحقیقت وہ اس پورے نظام فطرت کو جس پر دنیا قائم ہے، درہم برہم کرنا چاہتا ہے، علل واسباب کے تار وپود کو بکھیر دینا چاہتا ہے، اور اشیا کے ان طبائع اور خواص کے علانیہ انکار پر آمادہ ہے، جو بارہا کے تجربے سے ثابت ہو چکے ہیں، اور جن میں کبھی تخلف نہیں ہوا ہے،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظامِ فطرت، یہ سلسلۂ علل واسباب، یہ طبائع اور خواص اس درجہ ناقابلِ تنسیخ ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تغیر و تبدیل نہیں ہو سکتی۔ فلاسفہ اور حکما کے ایک گروہ کے نزدیک یہ نظام، یہ سلسلہ، یہ اصول ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ **حکماے اسلام** کا گروہ (مثلاً فارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ وغیرہ) اس بات کا قائل ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اس نظامِ فطرت اور سلسلۂ علل واسباب میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا اور نہ دنیا میں کوئی شے بغیر علتِ عادیہ اور سببِ طبعی کے پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ معجزات اس نظام وسلسلہ سے الگ ہیں، اور وہ فطرت کی قانون شکنی کرتے ہیں، بلکہ وہ بھی علل واسبابِ طبعی کے نتائج ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہم ان علل و اسباب کے احاطہ سے ابتک قاصر ہیں، اور وہ ابتک ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں، ممکن ہے کہ تحقیقاتِ انسانی کا دائرہ کبھی اتنا وسیع ہو جائے کہ ان کے علل واسباب ہمارے فہم میں آجائیں۔ **معتزلہ** کہتے ہیں کہ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ عالم میں ایک خاص نظامِ فطرت، موجودات میں سلسلۂ علل ومعلولات اور اشیا میں طبائع وخواص ہیں، لیکن ہم اُن کی اس درجہ ہمہ گیری کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کسی حال میں اور کسی طریق سے شکست نہیں ہو سکتے، آج تک ہمارا علم یہ ہے کہ نباتات دانہ سے، پرندے انڈے سے اور حیوانات نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں، مگر ممکن ہے کہ کل وہ ان کے بیچ کے وسائط اور ذرائع کے بغیر دفعۃً پیدا ہو جائیں، غرض یہ کہ خرقِ فطرت کلیۃً محال نہیں ہے، **اشاعرہ** اپنا عقیدہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ نہ تو عالم میں حقیقۃً قوانینِ فطرت ہیں، اور نہ خود اشیا کے اندر خواص ہیں، بلکہ ہر شے سے جو فعل سرزد ہوتا ہے اس کو درحقیقت اللہ تعالیٰ اسی وقت اس میں پیدا کر دیتا ہے۔ اشاعرہ کے اس عقیدہ کا نہ صرف مدعیانِ عقل نے بلکہ اربابِ ظواہر[1] تک نے مضحکہ اڑایا ہے، لیکن درحقیقت

[1] علامہ ابن تیمیہ نے [illegible] اور ابن حزم نے کتاب الفصل فی الملل والنحل میں بھی [illegible] اشاعرہ کے اس خیال کو حماقت سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۲

یہ خیال ایسا نہیں ہے کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی.

فلاسفہ اور حکما کی وہ جماعت قوانینِ فطرت کے ناقابل شکست ہونے پر ایمان رکھتی ہے، اور اس بنا پر معجزات و خوارق سے قطعی انکار کرتی ہے، امام رازی نے لکھا ہے[1] کہ گو خود ان فلاسفہ کا اصل عقیدہ یہی ہے کہ وہ متعدد ایسے اصول تسلیم کرتے ہیں جن کی بنا پر خوارقِ فطرت کا تسلیم کرنا ان کے لیے لازم ہو جاتا ہے، مثلاً

۱۔ وہ "تولد ذاتی" کے قائل ہیں یعنی یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظام خاص کے ساتھ ہوتی ہے، ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدتِ حمل کے اندر وہ شکم مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں، ایک متعین زمانہ کے بعد وضعِ حمل ہوتا ہے، پھر شیر خوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک تنومند، قوی ہیکل، ذی روح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہ دفعۃً ان بیچ کے منازل کو طے کیے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرۂ آب کے زمانہ سے لیکر اس عالمِ شباب کے عہد تک اس مجموعۂ عناصر کو جو سالہا سال سے صرف کرنے پڑے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لیے ایک خاص قسم کے اعتدالِ ترکیب کی ضرورت تھی، جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا، حیات پیدا ہو گئی، اس بنا پر اگر کسی مجموعۂ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جائے جس میں حیاتِ انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ، حمل، خون، گوشت، وضع حمل، شیر خوارگی، بچپن وغیرہ درمیانی وسائط طبعی کے، اچھا خاصہ ایک نوجوان مٹی کے پتلہ سے بنکر کھڑا ہو سکتا ہے، جیسا کہ

---

[1] مطالب عالیہ بحث معجزات (نسخہ قلمی موجودہ دار المصنفین) و تفسیر کبیر سورۂ اعراف۔

برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہوجانے سے جاندار اور ذی روح بن جاتے ہیں، اسی کا نام "تولدِ ذاتی" ہے۔

اس تفصیل کی بنا پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ذی روح کی پیدائش کے لیے دنیا میں جو سلسلۂ اسباب عادۃً جاری ہے، اس کے خلاف ہوسکتا ہے، تو پھر عصا سانپ بھی ہوسکتا ہے، مردے زندہ بھی ہوسکتے ہیں، پہاڑ سونا بھی ہوسکتا ہے۔ ایک عصا کے سانپ بن جانے کی فطری صورت یہ ہے کہ پہلے وہ سڑ گل کر مٹی ہوجاتا ہے، وہ مٹی غذا کی شکل میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے، تولد ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیچ کے وسائط کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

۲۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو کچھ حوادث ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے مادہ (ہیولیٰ) ہی کے تغیرات کے نام ہیں، مادہ (ہیولیٰ) اس تمام عالم عنصری کا ایک ہی ہے، اس بنا پر عالم میں انواع، اشکال اور خواص کے یہ لاکھوں اور کروروں تنوعات اور اختلافات جو ہم کو نظر آتے ہیں، ان کا سبب مؤثر اگر بالفرض خود مادہ ہی ہوتا تو ضروری تھا کہ تمام دنیا میں ایک ہی شکل، اور ایک ہی خاصیت ہو تو تم کہو گے کہ یہ اختلاف و تنوع مادہ کے اختلافِ استعداد سے پیدا ہوا لیکن استعداد تو تاثر اور انفعال کا نام ہے، علت فاعلہ اور سبب مؤثر کیا ہے؟ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اجرام فلکیہ کی گردش اور رفتار ہے، مگر اس کے ساتھ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اجرام فلکی کی اس گردش و رفتار اور اختلافِ اشکال کی نہ کوئی حد و نہایت ہے، اور نہ کسی

قانون فطری کے ماتحت ہیں، اور نہ اُن کا علم ہم کو ہو سکتا ہے۔ تو اس اصول کے صحیح باور کر لینے پر عجائب قدرت اور خوارق فطرت کی وہ کونسی مثال ہے جسکے محال ہونے کا دعویٰ وہ کر سکتے ہیں

۲۔ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یا تو وہ کسی سبب مُؤثر کی بنا پر ہوتا ہے، یا بلا سبب موثر کے ہوتا ہے، اور دونوں صورتوں میں خرقِ عادت کو تسلیم کرنا پڑے گا، اگر یہ کہیے کہ یہ حوادث بلا سبب موثر کے وجود پذیر ہوتے ہیں تو گویا آپنے خود خرقِ عادت کو تسلیم کر لیا، پھر دنیا میں کوئی عجیب سی عجیب اور مستبعد سے مستبعد بات بھی ناممکن نہیں رہتی، اور اگر یہ کہیے کہ یہ سبب موثر کے نتائج ہیں تو دو حال سے خالی نہیں، یا یہ سبب مُؤثر صاحب اختیار و ارادہ ہے اور یہ تمام حوادث و تاثیرات اس کے ارادہ اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں، یا وہ بے اختیار اور مسلوب الارادہ ہے اور یہ حوادث و تاثیرات اس سے اسی طرح بے ارادہ اور اضطراراً طبعی طور سے سرزد ہوتے ہیں جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک، پہلی صورت میں معجزات اور خوارق کے صدور میں کوئی استحالہ نہیں، کیونکہ اس مدبر و موثر کا جب جیسا ارادہ ہو وہ شی اسی طرح واقع ہوگی، کوئی اس کا مانع نہیں، دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تمام تاثیرات اس بے ارادہ مُؤثر عالم سے زمانۂ قدیم سے ایک ہی طور پر سرزد ہوتی چلی آتی ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، ایسی حالت میں ایک عام واحد قدیم و ازلی سبب و مُؤثر سے یہ ہر نئے آن اور نئے لمحہ میں نئی نئی اور مختلف شکل و صورت اور خواص کی اشیا، کیونکر ظہور پذیر ہوتی ہیں، آپ کہیں گے کہ علت تو بیشک واحد قدیم ہے، مگر علت کے وجود کے ساتھ معلول میں بھی تو استعداد اور قبولیت کا مادہ پیدا ہونا چاہیے، مادہ میں یہ استعداد و صلاحیت گردشِ فلکی کے مختلف اشکال کا نتیجہ ہے لیکن ابھی

یہ کہا جا چکا کہ آپ کے نزدیک اشکال فلکی کی نہ تو کوئی حد و پایان ہے، اور نہ وہ کسی خاص قاعدہ اور اصول کے اندر محدود ہیں، اس بنا پر حوادثِ عالم کے اختلاف اور نیرنگی کا باعث اگر گردش فلکی کا اختلاف اور نیرنگی ہے، تو ایسی صورت میں یہ کیوں نہیں ممکن ہو کہ جو چیز آپ کو بظاہر خلاف فطرت اور خلاف عادت معلوم ہوتی ہے وہ کسی خاص شکلِ فلکی کا نتیجہ ہو،

گذشتہ تقریر کا حاصل یہ ہے کہ **حکماے اسلام** نے معجزات کے امکان پر حسب ذیل دلائل قائم کیے ہیں،

(۱) **تاثیرات فلکیہ**، معجزات کے انکار کی اصلی وجہ یہ ہو کہ اس کے حل کرنے کے لیے کوئی مادی علت ہمارے پیش نظر نہیں ہو اور ہم تمام معمولات کی تشریح مادی اور طبعی علل و اسباب سے کرنا چاہتے ہیں لیکن حکما، کا اس امر پر اتفاق ہے کہ گردش افلاک اور گردش نجوم کا اس دنیا کے حوادث پر بہت اثر پڑتا ہے، اور قواے فلکی اس عالم کے واقعات میں موثر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں اگر کسی بظاہر عجیب و غریب شے کی تعلیل ہم مادی و طبعی علل و اسباب سے نہیں کر سکتے تو یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ اس کے اسباب فلکی و سماوی ہوں،

(۲) **علل خفیہ**۔ یہ ہم کو تسلیم ہے کہ تمام حوادث کسی نہ کسی سبب طبعی کی بنا پر ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سبب طبعی ہمارے علم و فہم میں آجائے، دنیا میں بیسیوں اسرارِ قدرت ہیں، جن کی ابتک تحلیل نہیں ہو سکی ہے، اس بنا پر ممکن ہو کہ معجزات بھی اسباب طبعی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہوں لیکن ان کے اسباب و علل ابتک ہماری نگاہوں سے مخفی ہوں، مثلاً یہ کہ انبیاء نے چالیس دن تک ایک ساتھ روزہ رکھا اور اس مدت میں

ایک دانہ بھی انھوں نے نہیں کھایا، لیکن بایں ہمہ اُن کی قوت جسمانی میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ بظاہر عجیب بات ہے، مگر سبب طبعی سے الگ نہیں ہے، ہم کو کیوں بھوک لگتی ہے؟ اس لیے کہ ہمارے قوائے معدہ غذا کو ہضم کر لینے کے بعد اس کے خون کو جسم کے مختلف حصوں میں پہنچا دیتے ہیں، تو ان کے لیے پھر کوئی کام باقی نہیں رہتا، اور ان کو کام کی تلاش ہوتی ہے، لیکن ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ بیماری کے سبب یا خوف طاری ہو جانے کے باعث سے یا کسی غم کے سبب سے جسم پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کئی کئی روز تک معدہ کے قویٰ معطل ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنا کام انجام نہیں دیتے، اس لیے اس کو بھوک بھی نہیں لگتی، اس بنا پر اگر یہی حالت کسی نفس کی اس بنا پر ہو جائے کہ اس کو روحانیات کے ساتھ شدتِ انہماک، اور جسمانیات سے قطعِ علائق ہو گیا ہے، تو اس کے قوائے جسمانی بھی معطل ہو سکتے ہیں، اور وہ مدت تک فاقہ کر سکتا ہے، اسی طرح دوسرے معجزات کی تشریح بھی کی جا سکتی ہے،

(۳) **قوتِ کمالیہ**، اس عالم میں جس قدر انسان ہیں، ان کے نفسانی خصوصیات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو عجیب و غریب اختلافات نظر آتے ہیں، ایک بلید الفہم اور کودن ہے تو دوسرا زیرک اور ذوفہم ہے، ایک کو بولنے کا شوق ہے، تو دوسرے کو سننے کا، ایک علم کا عاشق ہے تو دوسرا اس کا دشمن، ایک کے علوئے ہمت اور بلند حوصلگی کے سیلاب کے سامنے مشکلات کے بڑے بڑے پہاڑ بھی خس و خاشاک ہیں، دوسرا اتنا پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہے کہ وہ تنکے کو بھی پہاڑ جانتا ہے، ایک اس قدر قوی الحافظہ ہے کہ معمولی سی معمولی بات بھی اس کے ذہن کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتی، دوسرے کو موٹی موٹی بات بھی یاد نہیں رہتی، پھر علم و فن کے

عشاق میں بھی کسی کو ادبیات سے لگاؤ ہے، کسی کو عقلیات کا چسکا ہے، کسی کو منقولات میں مزہ ملتا ہے، قوتِ شہوانیہ کے لحاظ سے دیکھو تو کسی کو سواری کا شوقین پاؤ گے، کسی کو لباس و پوشاک اور وضع و قطع کا، کسی کو کھانے پینے کا، ایک کو صرف دولت جمع کرنے میں مزہ ملتا ہے تو دوسرے کو اس کے اڑانے میں لطف حاصل ہوتا ہے، کوئی طبعاً حلیم ہے تو دوسرا سرتاپا غضب کا شعلہ، ایک خلقی طور سے قانع ہے تو دوسرا حریص اور طامع، کوئی بدزبان ہے مگر بدکردار نہیں، دوسرا بظاہر سنجیدہ اور متین نظر آتا ہے، مگر بباطن نہایت بد اطوار اور خفیف الحرکت ہے، ان میں سے ہر وصف و خاصیت کے بھی سیکڑوں مدارج اور مراتب ہیں، الغرض صفات و خواہشِ نفسانی کے مظہر اسقدر گوناگوں اور بوقلموں ہیں کہ وہ حصر تحدید میں بھی نہیں آسکتے، غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک انسان کے نفس میں جو خصوصیات ہیں ان کے مطابق جو اعمال و آثار اس سے صادر ہوتے ہیں، ان پر اس کو مطلق تعجب نہیں آتا لیکن دوسرے اعمال و آثار جن کے خصائص اسکے نفس میں نہیں ہیں، ان پر اس کو سخت تعجب آتا ہے، بلکہ اگر ان اشخاص کو اس نے خود دیکھا نہ ہو تو اس کو ان خصائص کا یقین مشکل سے آئے گا، ایک بخیل کے نزدیک بذل و کرم کی راہ میں تمام گھر بار لٹا دینا ایک مافوق البشریۃ کارنامہ ہے، ایک دنیادار جاہ پسند اور حریص آدمی کو ایک زاہد قانع اور متواضع آدمی کو دیکھ کر تعجب آتا ہے، معمولی حافظہ والوں سے کوئی کہے کہ امام بخاری کو ۶ لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اور اندلس کے ایک نابینا ادیب کو اغانی کی ۲۰ جلدیں نوک زبان تھیں، تو اس کو یقین نہیں آئے گا، تیمور، بابر، ہنیبال، اور نپولین کی قوت عزم و ارادہ کے قصے کمزور اور ضعیف ارادہ کے آدمیوں کو معجزہ معلوم ہوں گے، ایک کمزور ارادہ کا

آدمی خود اپنی اولاد و اعزہ و خدام کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتا، لیکن غیر معمولی عزم و ارادہ کے لوگ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں پر اس طرح استیلا حاصل کر لیتے ہیں کہ وہ اس کے ہاتھ میں پیکرِ بے جان بن جاتے ہیں، یہی حال دوسرے خصائص کے اختلافات کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تمام نفوسِ انسانی کے اتحادِ ماہیت کے باوجود یہ اختلافات کہاں سے آئے؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ہر نفس کی جوہریت دوسرے سے مختلف ہے، اس لیے ایک سے جو خصوصیات اور افعال صادر ہوتے ہیں، وہ دوسرے سے نہیں ہوتے، یا یہ کہ ہر جسم کی ترکیب عنصری میں اختلافِ مزاج ہے، جس کے سبب سے ایک کی خصوصیات دوسرے سے نہیں ملتیں، بہرحال ان دو میں سے جو پہلو بھی اختیار کیجئے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ممکن ہے کہ بعض ایسے نفوس بھی ہوں، جن کی روحانی یا جسمانی قوت میں کوئی خاص ایسی بات ہو جس کی بنا پر ان سے عجیب و غریب اعمال اور تصرفات صادر ہوتے ہیں، جن کا صدور عام انسانوں کی روحانی و جسمانی قوت سے باہر ہے، اور اس لیے وہ ان کو مستبعد اور ناقابلِ فہم نظر آتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک بلید کو ایک ذی فہم کے افعال پر، ایک ضعیف الحافظہ کو ایک قوی الحافظہ کی قوت پر، ایک طماع و حریص کو ایک قانع و زاہد کے حالات پر، ایک کمزور اور ضعیف الارادہ کو قوی الارادہ اور مستحکم العزم پر تعجب آتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نفوس جن میں معجزات کی یہ قوت ہے، نادر الوجود ہیں، اس لیے عموماً ان کے خصائص اور آثار پر تعجب اور استبعاد بھی معمول سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۳) **قوتِ نفسیہ**، ہر انسان اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو جس طرح چاہتا ہے حرکت دیتا ہے

گویا ایک قوت ہے، جو اس کے تمام قالب جسمانی پر مسلط ہے، اور یہ جسم اس کے امر و ارادہ کے تحت اس کے حکم کو اس طرح بجا لاتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا، یہ تصرف اور عمل ہر نفس انسانی اپنے جسم کے اندر کرتا ہے، اور یہ معمولی اور ادنیٰ نفوس کی قوت کی نیرنگی ہے، لیکن جو نفوس ان سے زیادہ طاقتور ہیں وہ اپنے جسم کے باہر دوسرے نفوس اور اجسام کو بھی اپنا مطیع فرمان کر لیتے ہیں، یہانتک کہ ان میں سے جن کو کمال کا معجزانہ حصہ ملا ہے، ان کے لیے یہ سارا مادی عالم مثل جسم کے ہوتا ہے، اور وہ اسی طرح اس عظیم الشان جسم میں تصرف کرنے لگتے ہیں جس طرح معمولی انسان اپنے جسم میں کرتے ہیں۔

(۴) **تاثیرات نفسانیہ**، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ نفس انسانی میں جو جذباتی تغیرات پیدا ہوتے ہیں، وہ اس کے جسم مادی کو متاثر کر دیتے ہیں، رات کو کوئی چیز دیکھی اور اس کا ہیبتناک تصور کیا اور گھبرا کر چیخ اٹھا، یا بیہوش ہو کر گر پڑا کسی درخت کی پتلی شاخ پر چڑھتے یا چھت کے منڈیر یا پتلے تختہ کے پل پر سے گذرتے ہوئے خوف طاری ہوا، ہاتھ پاؤں میں لغزش ہوئی اور آدمی گر پڑا، غصہ سے آدمی کا چہرہ سرخ اور خجالت و شرمندگی سے زرد پڑ جاتا ہے، آدمی نے کسی ناگوار واقعہ کا تخیل کیا، غصہ آگیا، غصہ سے بدن میں گرمی پیدا ہو گئی، اور گرمی سے پسینہ آگیا، محض وہم سے آدمی ڈر جاتا ہے، بلکہ بیمار پڑ جاتا ہے، یہانتک کہ کبھی کبھی مر جاتا ہے، ان تمام واقعات میں دیکھو کہ نفسانی اثرات مادی جسم کو متاثر کر دیتے ہیں، یہ تو کمزور نفوس کا حال ہے، لیکن جو لوگ کہ ارباب نفوس قدسیہ ہیں، وہ اپنے نفسانی اثرات سے دوسرے اجسام کو متاثر کر سکتے ہیں، اور ان میں عجیب عجیب تغیرات اور تصرفات کر سکتے ہیں۔

یہ آخری دلیلیں بعینہ وہی ہیں جو آج ہیپنوٹزم (تقویم مقناطیسی) اور مسمرازم کے نام سے لوگ پیش کرتے ہیں،

معتزلہ اور **اشاعرہ** دونوں فطرت شکنی اور خرقِ عادات کو تسلیم کرتے ہیں، جہانتک ہم ان کی عبارتوں سے سمجھ سکتے ہیں. اس نتیجہ میں دونوں کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اصل نظریہ میں ہے، معتزلہ یہ سمجھتے ہیں کہ خاصیت واثر، علیت ومعلولیت وسببیت نفس اشیا میں ہے، یعنی خود اشیا کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی بات ہے جو ایک علت و سبب اور دوسرے کو معلول و مسبب بناتی ہے، آگ کی طبیعت میں جلانا اور برف کی طبیعت میں ٹھنڈک پیدا کرنا ازل سے اللہ تعالیٰ نے رکھدیا ہے، اسی کا نام طبیعت ہے، جس سے اس خاصیت کا ظہور ہوتا ہے، اس لیے معتزلہ سمجھتے ہیں کہ آگ سے سوزش اور برف سے ٹھنڈک کا جو صدور ہوتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ نفس آگ یا برف کی طبیعت میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے آگ میں سوزش اور برف میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے، اور جب کوئی معجزۂ نبوی ظاہر ہوتا ہے تو یہ طبیعت یا اس کی خاصیت تھوڑی دیر کے لیے بدل دیجاتی ہے، یا روک لی جاتی ہے،

اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ خود اشیاء کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ایک علت وسبب اور دوسرا معلول ومسبب ہو، نفس آگ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو ہم گرمی کا سبب قرار دیں، اور نہ نفس برف کے اندر ٹھنڈک طبیعت کے طور پر موجود ہے بلکہ مختلف اشیا کے متعلق ہم کو جو مختلف احساسات ہوتے ہیں، مثلاً کسی سے گرمی کسی سے سردی،

کسی سے سختی کسی سے نرمی کسی سے جلن، کسی سے ٹھنڈک کا، یہ ہمارے ذاتی احساسات ہیں، جن کو ہم حسب ارادۂ الٰہی اشیا میں محسوس کرتے ہیں، ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ ہم ایک شے کے بعد دوسری شے کو ہوتے ہوئے جب دیکھتے ہیں تو ہم ایک کو علت اور دوسری کو معلول سمجھنے لگتے ہیں، ورنہ حقیقت میں علت و معلول میں لزوم کا کوئی طبعی تعلق نہیں، اگر ارادۂ الٰہی بدل جائے تو ہم آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی محسوس کرنے لگیں، نفس آگ اور برف کی طبیعت میں کوئی ایسی شے نہیں جو اس تغیر کو محال قرار دے، اور اسلیے حسب ارادۂ الٰہی معجزات کا صدور ہوا کرتا ہے

علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطقیین میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا اصل بانی جہم ہے جس کے انتساب سے فرقۂ جہمیہ قائم ہوا تھا، اس کے بعد ابوالحسن اشعری نے اس کی پیروی کی، علامۂ موصوف نے مسئلۂ مذکور کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے،

لکن من لا یثبت الاسباب العلل من اھل	لیکن متکلمین میں جو لوگ اسباب و علل کے منکر ہیں، جیسے جہم اور
الکلام کالجھم ومن وافقہ فی ذلک مثل ابی	اس مسئلہ میں جہم کے جو موافق ہیں، جیسے ابوالحسن اشعری اور
الحسن الاشعری واتباعہ یجعلون المعلوم	انکے پیرو، وہ یہ مانتے ہیں کہ ہم کو صرف یہ معلوم ہو کہ ایک چیز کا
اقتران احد الامرین بالآخر لمحض مشیئۃ	دوسری چیز کیساتھ ایک لگاؤ اور علاقہ ہے، اور یہ لگاؤ اور علاقہ
القادر المرید من غیر ان یکون احدھما	صرف اس قادر ذی ارادہ کی مشیت سے ہے، بغیر اس کے کہ
سببا للآخر ولا مولد الہ	ایک دوسرے کا سبب ہو یا ایک دوسرے کو پیدا کرتا ہو۔
واما جمھور العقلاء من المسلمین وغیر المسلمین	جہمیہ اور اشاعرہ کے علاوہ وہ تمام عقلاء مسلمان یا

اھل السنة من اھل الکلام والفقہ والحدیث	غیر مسلمان، مسلمانوں میں اہل سنت ہوں خواہ وہ متکلم ہوں،
والتصوف، وغیر اھل السنة من المعتزلة	اہل فقہ ہوں، اہل حدیث ہوں، اہل تصوف ہوں اور غیر اہل سنت
وغیرھم فیثبتون الاسباب ویقولون کما یعلم	میں معتزلہ ہوں یا کوئی اور فرقہ ہو، یہ سب لوگ اسباب کے قائل ہیں
اقتران احدھما بالآخر یعلمان فی النار	اور کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کو یہ معلوم ہو کہ ایک کا دوسرے سے لگاؤ
قوة تقتضی الحرارة وفی الماء قوة تقتضی	اور علاقہ ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہو کہ آگ میں ایک قوت ہے
البرودة وفی العین قوة تقتضی الابصار	جو گرمی کو چاہتی ہے، اور پانی میں ایک قوت ہو جو ٹھنڈک
وفی اللسان قوة تقتضی الذوق ویثبتون	کو مقتضی ہے، اور اسی طرح آنکھ میں ایک قوت ہو جو رویت
الطبیعة التی تسمی الغریزة والنحیزة والخلق	کا باعث ہے، اور زبان میں ایک قوت ہو جو مزہ پیدا
والعادة ونحو ذلک من الاسماء	کرتی ہے، یہ لوگ طبیعت کو ثابت کرتے ہیں جس کا دوسرا
	نام فطرت، خلقت، عادت وغیرہ ہے،

اوپر خرقِ عادت کے امکان اور عدم امکان کے متعلق چار مذہب ہم نے نقل کیے ہیں، یہی مذاہب آج بھی فلسفہ کی مملکت میں قائم ہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس باب میں صرف دو ہی مذہب ہو سکتے ہیں، ایک ان لوگوں کا جو کسی نہ کسی طرح سے باری تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اور دوسرا ان لوگوں کا جو اس کے یکسر منکر ہیں، دوسرا گروہ حکمائے طبیعین کا یا مادہ پرستوں کا ہے، جن کے نزدیک عالم مادی کے باہر کچھ نہیں ہے، اور تمام کائنات ذراتِ مادہ کے باہمی تاثیر و تاثر کی جلوہ انگیزیاں ہیں، اور سلسلۂ علل و معلول اور اسباب و مسببات اور آثار و خواص کے مظاہر اور نتائج ہیں، ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کی

جماعت معجزہ اور خرقِ عادت پر کیونکر ایمان لاسکتی ہے، جو لوگ ان کے سامنے فلسفیانہ حیثیت سے براہ راست معجزہ اور خرقِ عادت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک بے سود کوشش کرتے ہیں، اور عقلی حیثیت سے خرقِ عادت کا ثبوت بھی بہم پہنچ گیا، تو جب وہ اس بنیاد کو جس پر نبوت اور شریعت کی عمارت قائم ہے، یعنی ایک برتر **خالق قوت** کا وجود تسلیم نہیں کرتے تو اس خرقِ عادت کے ثبوت سے اربابِ مذاہب اور پیروانِ شرائع کی کیا مقصد برآری ہو سکتی ہے؟

اشاعرہ نے اثباتِ مدعا کا طریقہ اختیار کرنا چاہا کہ پہلے معجزہ اور عادت کا امکان اور وقوع ثابت کیا جائے اور اس معجزہ اور خرق عادت سے **نبوت** پر استدلال کیا جائے، نبوت کے ثبوت سے ایک قادر مطلق کا ثبوت ہاتھ آئے گا، اور پھر اس کے احکام شریعت کا ثبوت بہم پہنچے گا، اس طریقۂ استدلال کو اختیار کرنا درحقیقت الٹی گنگا بہانا ہے ع این رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است، صحیح راستہ ان کے مقابلہ میں یہ ہے کہ پہلے **باری تعالیٰ** کے وجود کا اثبات کیا جائے، اس کے بعد **نبوت**، شریعت، خرقِ عادت، معجزہ سب کچھ ثابت ہو جائیگا، جب تک اس چٹان پر بنیاد قائم نہ ہوگی عمارت مستحکم نہیں ہو سکتی،

اسباب خفیہ کی توجیہ بیکار ہے

دوسرا فرقہ باری تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے، اور معجزہ کو تسلیم کرتا ہے، خواہ وہ اس کے وقوع کے کچھ ہی اسباب بیان کرے، وہ درحقیقت خرقِ عادت کو بھی تسلیم کرتا ہے، یا اس کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے، اور اس سے اس کو کوئی چارہ نہیں کہ حکمائے اسلام فارابی اور ابن سینا وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ معجزہ اسبابِ خفیہ کی بنا پر صادر ہوتا ہے، اور اسکے

اندرونی طبعی علل واسباب ہوتے ہیں، اس لیے خرقِ عادت لازم نہیں آتا، اور معمولی نظامِ عالم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی،

حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو راستہ میں بحرِ قلزم (ریڈسی) حائل تھا، حکم ہوا کہ اپنی لکڑی سے دریا کو مارو، دفعۃً دریا خشک ہوگیا، اور راستہ پیدا ہوگیا، حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر اتر گئے، لیکن جب فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ دریا میں قدم رکھا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب کر مر گیا، وہ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ دریا میں مد وجزر تھا، جب حضرت موسیٰؑ پہنچے تو جزر تھا اور دریا پایاب ہوگیا تھا، اور جس وقت فرعون دریا میں داخل ہوا، مد شروع ہوگیا، اور ڈوب گیا، ہم ان اعتراضات کو جو نقلی حیثیت سے اس توجیہ پر وارد ہوتے ہیں، کہ توراۃ اور قرآن مجید نے اس معجزہ کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی یہ صحیح نقل نہیں ہے، نظر انداز کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ پہنچے تو جزر تھا، اور جب فرعون آیا تو مد ہوگیا، آیا یہ اتفاقی امر تھا، اور ممکن تھا کہ اسکے برعکس ہوتا، یعنی فرعون بچ جاتا اور حضرت موسیٰؑ ڈوب جاتے، اور یا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کیلیے جزر اور فرعون کے لیے مد خاص طور سے پیدا کیا گیا تھا، یا ایسے اسباب بہم پہنچائے گئے کہ حضرت موسیٰؑ جزر کے وقت پہنچیں، اور فرعون مد کے وقت پہنچے، اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس خطرناک دریا میں بے سمجھے بوجھے قدم رکھے، پہلی صورت میں تو معجزہ کیا، نبوت کی بھی تشکیک لازم آتی ہے، اور دوسری صورت میں خرقِ عادت کی تسلیم سے چارہ نہیں، اور خرقِ عادت کے تسلیم کر لینے بعد خدا کی قدرتِ مطلقہ پر بھی ایمان لانا ہوگا،

حکماے اسلام کی غلطی کا سبب

اصل یہ ہے کہ حکماے اسلام نے ارسطو کی تقلید کی ہے، اور مسئلۂ علت میں تمام تر مشائیہ کے نظریہ کو قبول کرلیا ہے کہ ذات واجب الوجود علت اولیٰ یا عقل اول کی علت تامہ ہے اور علتِ تامہ سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا، اور اضطراراً اس سے پیدا ہو جاتا ہے، اس میں اس کے ارادہ اور قصد کو دخل نہیں ہوتا، اس کی صحیح مثال آفتاب اور روشنی کی ہے کہ آفتاب کی روشنی علت تامہ ہے، جب آفتاب نکلے گا روشنی کا ظہور ہوگا، خواہ وہ موانع کی وجہ سے کبھی ہم کو نظر نہ آئے، اور آفتاب سے اس روشنی کا صدور آفتاب کے قصد اور ارادہ سے نہیں ہے، بلکہ اس سے مجبوراً اور اضطراراً یہ روشنی پیدا ہو رہی ہے، عقل اول کے پیدا ہونے کے بعد عالم کائنات کا تمام کارخانہ باہمی سلسلۂ علل و معلول سے خود بخود پیدا ہونے لگا، اور تمام عالم ایک ایسے نظام میں بندھ گیا کہ اب خالقِ اول کو اس میں دست اندازی کی مطلق قدرت ہی نہیں،

ظاہر ہے کہ اس مذہب کا پیرو سلسلۂ علل و معلول کو نہیں توڑ سکتا، اور اس لیے وہ خرقِ عادت کو بھی تسلیم نہیں کرسکتا، لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی توجیہ ظاہری سلسلۂ علل و معلول سے نہیں ہوسکتی، اور نہ ان کے وقوع سے کوئی انکار کرسکتا ہے، اس لیے ایک طرف اس کو لا محالہ ان واقعات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے[1]، اور دوسری

---

[1] حکماے اسلام میں مسئلۂ خرق عادت کا سب سے بڑا منکر بو علی سینا اشارات میں لکھتا ہے:-

ولکنہا تجارب لما ثبتت طلب اسبابہا... ثم انی لو اقتصصت جزئیات ہذا الباب فیما شاہدناہ وفیما حکی عمن صدقناہ لطال الکلام

لیکن یہ تجربے ہیں جب ثبوت کو پہنچ گئے تو انکے اسباب کی تلاش ہوئی اور اگر اس قسم کے جزئیات کا تتبع کریں جو ہم نے خود مشاہدہ کیا یا ان لوگوں سے جن کو ہم معتبر سمجھتے ہیں سنا ہے تو بہت طول ہو جائیگا،

طرف چونکہ وہ خدا کو مضطر اور مجبور مان چکا ہے، اس لیے براہ راست ان واقعات کو اس کی طرف منسوب نہیں کرسکتا، اور چونکہ بلا سبب اور بے علت کے کوئی شے ہو نہیں سکتی، اس بنا پر اسباب وعللِ خفیہ کے سایہ کے سوا اس کو اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی، مگر آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ یہ مورچہ بھی محفوظ نہیں، اور خدا کو سوائے **قادرِ مطلق** ماننے چارہ نہیں،

اشاعرہ اور معتزلہ میں نتیجہ کا اختلاف نہیں

اشاعرہ اور **معتزلہ** کے درمیان جو اختلاف ہے، وہ صرف نظریہ کا فرق ہے، اس سے نفسِ خرقِ عادت اور معجزہ کے ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ امر کہ اشیا کے طبائع میں فی نفسہٖ خواص اور آثار ودیعت ہیں، یا اللہ تعالیٰ بروقت ان کو پیدا کردیتا ہے، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے کسی پہلو کے اثبات اور دوسرے کی نفی پر کوئی دلیل نہیں قائم کی جاسکتی، اور معجزہ کے سلسلہ میں ہم کو اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں، اس کا کوئی پہلو بھی صحیح ہو، بہرحال دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی کبھی اشیاء کی عادتِ جاریہ کو اللہ تعالیٰ توڑ دیتا اور بدل دیتا ہے،

خرقِ عادت سے انکار کا اصلی سبب سلسلۂ اسباب وعلل پر یقین ہے

الغرض معجزہ یعنی خرقِ عادت سے صرف اس فریق کو انکار ہے جو یا خدا کا قطعاً منکر ہے، یا یہ کہ وہ خدا کو قادر و ذی ارادہ نہیں مانتا، اور ناقابلِ شکست سلسلۂ علل ومعلول کے گورکھ دھندے پر یقین کامل رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام نظمِ کائنات باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے، غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اپنے اس عقیدۂ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باتوں کو بھی بلا دلیل تسلیم کیے بیٹھے ہیں اور اس لیے خرقِ عادت کے قبول کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی،

سلسلۂ اسباب علل پر علم انسانی کو احتوا نہیں

(۱) گویا انھوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء کے جو خواص انھوں نے دریافت کر لیے ہیں وہ نظامِ کائنات کے چلانے کے لیے کافی ہیں، اس کے لیے کسی اور کی دست اندازی کی ضرورت نہیں،

(۲) کائنات کے چہرۂ اسرار کو انھوں نے تمامتر بے نقاب کر لیا ہی، اور ہر شے کی علت اور خاصیت انھوں نے دریافت کر لی ہے،

حالانکہ انسانی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلہ میں بہت کم حیثیت ہیں، اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں زمین تمام ایک آبادی کے چوتھائی خشک حصے کے بعض اجزاے کائنات تک فقط ان کی رسائی ہو سکی ہے، اس مبلغ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زیب نہیں دیتا،

جن چیزوں تک ان کی رسائی ہوئی بھی ہے، ان کے متعلق جو کچھ انھیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ چیز اس طرح چل رہی ہے، لیکن یہ حقیقت کہ وہ کیوں چل رہی ہی اور اگر اس کے خلاف چلے تو کیا استحالہ لازم آئے گا، یہ ایک معما ہے، اور ہمیشہ معما رہی گا، اجرام فلکیہ اور طبقات ارضیہ کو چھوڑ دو کہ وہ دور ہیں، تم یہ کہتے ہو کہ بجلی میں یہ قوت ہی، سنکھیا میں یہ اثر ہے، مقناطیس کا یہ خاصہ ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کیوں ایسا ہی؟ اور نزدیک آؤ، اپنے جسم کی دنیا کو دیکھو، تم صرف یہ جانتے ہو کہ سانس کی آمد و رفت ہمارے پھیپھڑوں کی حرکت سے ہے، نبض کی رفتار قلب کی قبض و بسط کی ڈوری سے وابستہ ہے، تمھارا نفس یا ذہن لمحوں میں ہزاروں میل کی خبر لیتا ہے، اور خدا جانے عجائبات نفسانی کے کیا کیا تماشے دکھاتا ہی لیکن

کوئی یہ حل کر سکا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دل کو کس نے مضطرب بنا رکھا ہے، پھیپھڑوں کی دھونکنی کس طرح روز و شب مصروفِ عمل ہے، دماغ کے ذہنی افعال کیونکر سرانجام پاتے ہیں، جب اتنے قریب کی چیز تمہارے فلسفۂ علل و اسباب کے دائرہ سے باہر ہے تو دور دور کی اشیاء کی نسبت تمہارا دعوائے علم کس قدر تمسخر انگیز ہے۔

حکماء یعنی سائنٹسٹ علانیہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ صرف "کیسے" کا جواب دے سکتے ہیں "کیوں" کا جواب ان کے موضوع بحث سے خارج ہے، فلاسفہ کا یہ حال ہے کہ وہ فلسفی بھی ایک نظام خیال پر متفق نہیں ہیں، بلکہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے "منطق" میں لکھا ہے:-

"فلاسفہ کوئی ایک متحد الخیال جماعت نہیں جس کا علم الٰہیات و طبعیات وغیرہ میں کوئی ایک مذہب ہو، بلکہ وہ مختلف الخیال فرقے ہیں، اور ان کے اندر آراء اور خیالات کا اتنا اختلاف ہے کہ اس کا احاطہ بھی مشکل ہے، ان کے باہمی اختلافات تو اس سے بھی زیادہ ہیں، جس قدر کسی ایک آسمانی مذہب کے مختلف فرقوں کے اندر ہیں"

اس اختلاف رائے اور اس اختلاف خیال کی بنا پر کسی فلسفی کا یہ دعویٰ کہ مذہب کا فلاں مسئلہ فلسفہ کے خلاف ہے، اس لیے ناقابل قبول ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ یہ مسئلہ ہماری رائے یا ہماری جماعت کی رائے کے خلاف ہے، اس لیے ناقابل تسلیم ہے، تو یہ مذہب ہی پر کیا موقوف ہے، ہر نظام فلسفہ کا قائل دوسرے نظام فلسفہ کے بطلان پر اسی زور و قوت سے اس استدلال کو کام میں لاسکتا ہے، غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ کے جس قدر فرقے (اسکول) اور نظامات (سسٹم) ہیں، درحقیقت وہ اسرار کائنات کے متعلق

ایک مرتب خیال کی کڑیاں ہیں، ان مرتب خیال کی کڑیوں کو مان کر جس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے، وہ اس کا فلسفہ ہے، اسی طرح مذہب بھی اپنا ایک نظامِ خیال رکھتا ہے، اور جو لوگ اس نظامِ خیال پر یقین رکھتے ہیں، ان کی اس سے تشفی ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں اگر معجزہ کا امکان یا وقوع کسی نظامِ خیال کے خلاف ہو تو نفس یہ اختلاف اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہو سکتا، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ ہر فلسفیانہ مسئلہ اس لیے باطل ہے کہ دوسرے نظامِ فلسفہ کے وہ خلاف ہے،

نظامِ عالم کے چلانے کے لیے علل و اسباب کے کافی ہونے کے فلسفہ پر یقین رکھنے کے لیے سب سے پہلی بحث آغازِ آفرینش کی آتی ہے، آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ شے اس سبب سے پیدا ہوئی اور اس شے کی پیدائش کا سبب یہ ہے، لیکن کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ یہ مادہ کہاں سے آیا؟ اور اس کے حدوث کا سبب کیا ہوا؟ عناصر کیونکر اور کیوں وجود میں آئے؟ یہ نوع بنوع چیزیں کیونکر بن گئیں؟ ہمارے جواب میں ان نظریات کا ذکر نہ کیجئے، جن کا نام اصولِ ارتقاء اور انتخابِ طبعی وغیرہ ہے کہ ان کی علمی حیثیت مفروضات اور وہمیات سے زیادہ نہیں، اور ان کی اخیر سرحد بالآخر لاعلمی اور جہالت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے، مادہ کی ابتدائی بنیاد چاہے اربعہ عناصر کو بتائے، یا جواہر فردہ کو، یا سالمات کو، یا ایتھر کو، یا برق پاروں کو جن کو بھی بتاؤ لیکن ان کے حدوث کی علت نہیں بتائی جا سکتی؟ اور نہ بتا سکتے ہیں کہ بالآخر وہ کہاں سے آئے؟

اب تو حیوانات نطفہ سے، پرندے انڈے سے، اور درخت گٹھلی سے پیدا ہوتے ہیں؟ اور بغیر ان کے ان کا پیدا ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کا پہلا حیوان

پہلا پرندہ اور پہلا درخت بغیر کسی نطفہ کسی انڈے اور کسی گٹھلی کے پیدا ہوا یا نہیں؟ اگر ہاں کہتے ہیں تو آپ نے اپنے دعویٰ کے خلاف ایک شہادت قبول کرلی، اور اگر انکار کرتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلا نطفہ، پہلا انڈا اور پہلی گٹھلی، انسان، پرندہ اور درخت کے بغیر پیدا ہوئی، غرض اس گتھی کو آپ اپنے ناخنِ حکمت سے کسی طرح سلجھا نہیں سکتے، اور ناچار آپ کو سلسلۂ علل اسباب کے مذہب سے برگشتہ ہونا پڑے گا،

حقیقی علت خدا کی قدرت اور ارادہ ہے

جہاں آپ اپنے سلسلۂ اسباب و علل کو چند قدم بڑھا سکتے ہیں، وہاں بھی بالآخر سپر افگن ہونے سے چارہ نہیں، پانی بادل سے برسا، بادل بخارات سے بنے، بخارات پانی سے اٹھے، جو سورج کی تپش سے گرم ہوکر یہ صورت اختیار کرلیتے ہیں، غرض پانی بخارات سے پیدا ہوا، اور بخارات پانی سے پیدا ہوئے۔ اس دور کے عقدۂ لاینحل کو آپ حل کرسکتے ہیں یہ ناممکن ہے، اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک قادر و ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجئے، جس کی مشیت اور ارادہ سے سارا کارخانہ چل رہا ہے، اسباب و علل صرف اس کی مشیئت و ارادہ کے مظاہر ہیں، اور اپنی عادت کے مطابق ایک طریق خاص پر اس کو چلا رہا ہے، لیکن وہ اس کا پابند نہیں ہے، صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لیے **عادت** کے خلاف کوئی بات ظہور پذیر کردی، علت و معلولیت کا تعلق جو بظاہر نظر آتا ہے، ہم نے اس کی **عادت جاریہ** کی یکرنگی اور یکسانی سے اس کو سمجھ لیا ہے کہ اگر اس کی عادت جاریہ یہ یکرنگی اور یکسانی اختیار نہ کرتی تو مخلوقات اپنے منافع کے حصول اور مضرتوں کے دفع کے لیے پہلے سے کوئی تیاری نہ کرسکتیں،

مولانا روم اور اسباب و علل اور معجزہ کی حقیقت | عارف روم نے اسی حقیقت کو ان اشعار میں ادا کیا ہے،

سنتے بنہاد و اسباب و طرق
طالبان را زیر ایں ازرق تتق

اللہ تعالیٰ نے آسمان کے ان نیلے پردوں کے نیچے
کام کرنے والوں کیلئے علل اسباب اور عادات مقرر کر دیئے ہیں

بیشتر احوال بر سنت رود
گاہ قدرت خارق سنت شود

دنیا کے زیادہ تر واقعات ان ہی عادات جاریہ کے مطابق ہوتے ہیں
لیکن کبھی کبھی قدرت الٰہی اس عادات کو توڑ بھی دیتی ہے

سنت و عادت نہادہ با مزہ
باز کردہ خرق عادت معجزہ

طرق و عادات (یعنی اسباب و علل) کو اس نے خوش آیند بنایا ہے
لیکن پھر معجزہ سے خرق عادت بھی کر دیتا ہے

اے گرفتار سبب! بیروں مپر
لیک عزل آں مسبب ظن مبر

اے وہ جو اسباب و علل کی زنجیر میں گرفتار ہو حد سے زیادہ نہ اڑ
اور یہ خیال نہ کر کہ ان اسباب و علل کے بنا دینے والے (علۃ العلل اور مسبب الاسباب) بیکار ہو گیا

ہر چہ خواہد او مسبب آورد
قدرت مطلق سببہا بر درد

وہ حقیقی مسبب الاسباب جو چاہے کرے
اور اس کی قدرت علی الاطلاق اسباب کو توڑ دے

لیک اغلب بر سبب راند نفاذ
تا بداند طالبے جستن مراد

لیکن بیشتر وہ اسباب ہی کے مطابق دنیا کو چلاتا ہے
تاکہ کام کرنے والوں کو اپنے حصول مقصد کا راستہ معلوم ہو

چوں سبب نبود چہ رہ جوید مرید
پس سبب در راہ می آید پدید

اگر اسباب معلوم نہ ہوں تو کام کرنے والوں کو راہ کیونکر ملے
یہی اسباب تو نشانات بن کر نمودار ہوتے ہیں

ایں سببہا بر نظر ہا پردہ ہاست
کہ نہ ہر دیدار صنعش را سزا است

یہ ظاہری اسباب نگاہوں کے پردے ہیں
کیونکہ ہر آنکھ اس کی صنعت کو نہیں دیکھ سکتی

دیدهٔ باید سبب سوراخ کن — تا حجب را بر کند از بیخ و بن

اسکے لئے ایسی آنکھ چاہیے جو اسباب کا پردہ چاک کر دے — تاکہ حجابات اٹھ جائیں

از مسبّب می رسد هر خیر و شر — نیست اسباب و وسائط را اثر

درحقیقت ہر نیک و بد اسی اصلی مسبب الاسباب کے یہاں سے پہنچتا ہے — اور اس میں ان درمیانی اسباب و وسائط کو دخل نہیں

باد و خاک و آب و آتش بنده اند — با من و تو مرده، با حق زنده اند

ہوا مٹی، پانی اور آگ سب خدا کے محکوم ہیں — یہ ہمارے تمہارے سامنے تو بیجان مگر خدا کے سامنے جاندار ہیں

سنگ بر آهن زنی بیرون جهد — هم به امرِ حق قدم بیرون نهد

جب پتھر لوہے پر مارو تو اس سے آگ نکلتی ہے — یہ خدا ہی کے حکم سے اپنا قدم باہر نکالتی ہے

آهن و سنگ از ستم برهم مزن — کاین دو می زایند همچو مرد و زن

لوہے اور پتھر کو بے قاعدہ ایک دوسرے پر مت مارو — کہ یہ دونوں نر و مادہ ہیں جو آگ کا بچہ پیدا کرتے ہیں

سنگ و آهن خود سبب آمد و لیک — تو به بالاتر نگر اے مرد نیک

پتھر اور لوہا گو یہ دونوں آگ کا سبب ہیں — لیکن ذرا اس سے آگے بڑھ کر غور کرو

کاین سبب را آن سبب آورد پیش — بے سبب کے شد سبب هرگز ز خویش

کہ اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب (خدا) نے آگے کر دیا — یہ ظاہری سبب خود بخود بلا سبب کے پیدا ہوا ہے

آن سبب را آن سبب عامل کند — باز گاهے بے بر و عاطل کند

اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب نے دنیا میں مؤثر و عامل بنا دیا ہے — پھر جب چاہے وہ اس کو بے اثر اور بیکار کر دے سکتا ہے

واں سببہا کانبیا را رہبر است — آں سبب ہا زیں سببہا برتر است

جو سبب کہ انبیاؑ کے کاموں میں پیش پیش ہوتے ہیں — وہ ان ظاہری دنیاوی اسباب سے بلند تر اور برتر ہیں

ایں سبب را محرم آمد عقلِ ما — واں سببہا راست محرم انبیاءؑ

ان ظاہری علل و اسباب کی محرم تو ہماری انسانی عقلیں ہیں — لیکن ان حقیقی اسباب کے محرم انبیاء علیہم السلام ہیں

چونکہ ظاہر بیں انسان ان اسباب و علل کو دیکھ کر اصل علۃ العلل اور مسبب الاسباب کو بھول جاتے ہیں اور وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اس لیے انبیاء علیہم السلام اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیتے ہیں، اور ظاہری علل و اسباب ان کے لیے بیکار کر دیے جاتے ہیں،

ہست بر اسباب، اسبابِ دگر — در سبب منگر دراں افگن نظر

ان ظاہری اسباب کے اوپر حقیقی اسباب بھی کارفرما ہیں — ان ظاہری اسباب کو نہ دیکھو حقیقی اسباب پر غور کرو

انبیا در قطعِ اسباب آمدند — معجزاتِ خویش بر کیواں زدند

انبیا قطعِ اسباب کے درپے ہیں اور — اپنے معجزات کا جھنڈا انھوں نے مریخ میں گاڑ دیا ہے

بے سبب مر بحر را بشگافتند — بے زراعت چاشِ گندم یافتند

بغیر کسی سبب ظاہری کے انھوں نے سمندر کو شق کر دیا — اور کھیتی کے بغیر گیہوں کا خوشہ حاصل کیا

جملہ قرآں ہست در قطعِ سبب — عزِ درویش و ہلاکِ بولہب

تمام قرآن قطعِ اسباب کے بیان سے بھرا ہے — آنحضرتؐ کا غلبہ اور ابولہب کی بربادی بھی اسی طرح ہوئی

مرغ بابیلے دو سہ سنگ افگند — لشکرِ زفتِ حبش را بشکند

پرندے کنکریاں پھینکتے ہیں اور — حبش کے سیاہ لشکر کو شکست دیتے ہیں

پیل را سوراخ سوراخ افگند | سنگ مرغ کو بپا لہ بر زند

یہ کنکریاں جو اوپر سے آتی ہیں ہاتھیوں کے بدن میں چھید کر کے ڈال دیتی ہیں،

ہمچنیں ز آغاز قرآں تا تمام | رفض اسباب است علت والسلام

اسی طرح شروع سے آخر تک قرآن | اسباب علل کے مؤثر حقیقی ہونے کا منکر ہے

علت، خاصیت اور اس کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل علت، خاصیت اور اثر کی تحقیق پر مبنی ہے، اور اشیا میں جو خواص اور آثار ہیں، ان کا علم ہم کو کیونکر ہوتا ہے؟ محض تکرار احساس سے جس کا دوسرا نام تجربہ ہے،

جب ہم آگ کے پاس جاتے ہیں تو گرمی اور سوزش کا احساس کرتے ہیں، اور پھر جب جب ہم آگ کے پاس گئے تو ہم کو اسی قسم کا احساس ہوتا رہا، اس سے ہم میں یہ یقین پیدا ہوا کہ آگ کا خاصہ اور اثر گرمی اور سوزش ہے، فرض کرو کہ اگر تکرار احساس سے یہی تجربہ ہم کو برف سے حاصل ہو جائے تو یقیناً ہم کہہ دینگے کہ برف کی خاصیت سوزش اور گرمی ہے، برف اور آگ دونوں آپ کے سامنے ہیں، دونوں کو اچھی طرح غور سے دیکھیے، کیا ان کی ذات میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جس کی بنا پر احساس بلکہ تکرار احساس سے قبل آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ ایک میں گرمی اور دوسرے میں ٹھنڈک کا ہونا ضروری ہے، آپ کے ہاتھ میں کوئی شخص کافور اور سنکھیا دونوں کی تھوڑی تھوڑی مقدار لاکر رکھ دیتا ہے، اس سے پہلے آپ ان چیزوں سے واقف نہ تھے، اب آپ دونوں کو غور سے دیکھیے، اور خوب الٹ پلٹ کر دیکھیے، سونگھ کر، چکھ کر، چھو کر کسی طرح آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کے خواص و آثار کیا ہیں؟ یہ فیصلہ ناممکن ہے جب تک ان کا

بار بار تجربہ نہ کیا جائے، اور ہر بار کے عمل سے ایک ہی نتیجہ ظاہر نہ ہو، اس سے ثابت ہوا کہ اشیاء کے خواص و آثار کا علم صرف یکسانی **عمل** اور **تجربہ** پر موقوف ہے۔

عمل کی اسی یکسانی اور تجربہ کی بنا پر ہم علل و معلولات، اور اسباب و مسببات کا سلسلہ قائم کرتے ہیں، اور اسی کی بنا پر مدعیانِ عقل و دانش وہ صنم کدہ قائم کرنا چاہتے ہیں، جس کے پرستاروں کے نام نیچری میٹرلیسٹ، مادہ پرست، فطرت پرست اور طبیعی ہیں، وہ جب ایک شے سے ایک ہی عمل اور اثر کا بار بار تجربہ کرتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ اُس شے سے اُس خاصیت و اثر کا انفکاک قطعاً محال ہے، اور جب ایک شے کے بعد فوراً دوسری چیز پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھتے ہیں، اور کبھی اس میں تخلف نہیں پاتے، تو یہ یقین کلی کر لیتے ہیں کہ دوسری شے معلول و مسبب اور پہلی شے علت و سبب ہے، اور یہ کلیہ قائم کر لیتے ہیں کہ گرمی و سوزش کا سبب آگ ہے، ٹھنڈک اور برودت کا سبب برف ہے، موت کا سبب سنکھیا ہے، یا یوں کہیے کہ آگ کا خاصہ جلانا، برف کا خاصہ ٹھنڈا کرنا، سنکھیا کا خاصہ انسان کی زندگی کا ختم کر دینا ہے۔ معجزہ کے امکان سے چونکہ ان کے خیال کے مطابق ان آثار و خواص کا انکار یا علل و اسباب کا ابطال لازم آتا ہے، یعنی یہ ماننا پڑتا ہے کہ آگ ہو اور جلائے نہیں، سمندر ہو اور غرق نہ کرے، اس لیے وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معجزہ قطعاً محال ہے۔

اسباب و علل محض عادی ہیں | لیکن ابھی ثابت ہو چکا کہ ہم جن کو آثار و خواص یا اسباب و علل کہتے ہیں محض اس تجربہ پر ان کی بنیاد ہے کہ ہم نے ہمیشہ اس شے کو ہوتے دیکھا ہے اور اس سے یہ توقع یا زیادہ سے زیادہ ظن غالب یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیندہ بھی جب یہ شے پیدا ہوگی تو

اس کے بعد دوسری شے پیدا ہو جائے گی، لیکن اس سے یہ یقین کس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے، وہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے، اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہیگا، اور ہمارے علاوہ شروع سے آج تک اور جن جن لوگوں نے اس کو دیکھا ہے، ان کے مشاہدہ کا بھی یہی نتیجہ نکلا کیا ہے، اور آئندہ بھی اُن کے مشاہدہ کا یہی نتیجہ نکلا کرے گا، آجتک آگ کے متعلق اور جن آگوں کے متعلق آپ کا جو تجربہ ہے اس پر آپ یقین کر سکتے ہیں، لیکن محیط ارض کی ہر آگ کے متعلق جو آپکے تجربہ میں نہیں آئی ہے، اور نہ آسکتی ہے یہ کیونکر یقین پیدا کر لیتے ہیں کہ ان سب کا اثر جلانا ہی ہے، اور نیز یہ اعتماد کس مقدمۂ یقین پر قائم کر لیتے ہیں کہ آئندہ تا قیامت آگ کا عمل و اثر ہمیشہ جلانا ہی رہیگا، اور جب آپکے اس یقین و اعتماد کے لیے کوئی دلیل قائم نہیں ہے، تو چند آگوں کو دیکھکر آپ اس قضیۂ کلیہ پر کیونکر ناقابلِ شکست یقین کی مہر لگا دیتے ہیں کہ "دنیا کی ہر آگ جلاتی ہے اور ہمیشہ جلاتی رہے گی"

اسباب عادیہ کا علم صرف تجربہ سے ہوتا ہے

غرض خواص و آثار اور اسباب و علل کی نسبت، علم انسانی کا جہانتک احاطہ ہے وہ صرف یکسانیِ عمل اور تجربہ کا نتیجہ ہے، ہم ایک شے کے بعد دوسری شے کو ہوتے ہوئے دیکھتے آئے ہیں، اس لیے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا، اس کی مثال یہ ہے کہ ہم ایک شخص کو آغازِ عمر سے دیکھتے آئے ہیں کہ وہ فلاں وقت سوتا ہے، فلاں وقت جاگتا ہے، مسجد میں فلاں دروازہ سے داخل ہوتا ہے، کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا ہے، سالہا سال کے مشاہدہ اور تجربہ کے بعد ہم اس کے متعلق بطریق ظن غالب یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ اس وقت اتنے بجے ہیں، اس لیے وہ اٹھا ہوگا، اتنے بجکر اتنے منٹ

آئے ہیں، اس لیے وہ سو گیا ہو گا، آج جب وہ نماز کے لیے جائیگا تو فلاں دروازہ سے داخل ہوگا، اسی کا نام "**عادت**" ہے، مگر کیا کبھی کوئی اس حماقت میں بھی مبتلا ہو گا کہ سالہا سال کے تجربہ کے بعد وہ یقینی دعویٰ کر بیٹھے کہ اس وقت اس کا سویا رہنا محال قطعی ہے، اس وقت اسکا جاگنا لامحالہ ضروری ہے، اور فلاں دروازہ سے اس کا داخلہ عقلاً لازم ہے؟

اسباب و علل کا علم بدلتا رہتا ہے

اسی طریق پر اشیاء اور موجوداتِ عالم سے عادۃً جو مختلف آثار و نتائج کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ان اشیاء اور موجودات سے ان آثار و نتائج کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور عادۃً ایسا سمجھتے ہیں کہ آیندہ بھی ان سے یہی آثار و خواص صادر ہوں گے،

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمثیل صحیح نہیں ہے، انسان ایک صاحبِ ارادہ ہستی ہے، اسلیے اس کے افعال اس کے ارادہ کے ماتحت ہیں، جن کو وہ جب چاہے بدل سکتا ہے، دیگر غیر ذی روح اشیاء کے افعال ارادی نہیں ہیں، بلکہ خلقی ہیں، اس لیے ان میں تغیر نہیں ہو سکتا، لیکن یہ درحقیقت ایک قسم کا مغالطہ ہے، آپکے حرکات و افعال آپکے اعضاء سے صادر ہوتے ہیں، جو بے ارادہ ہیں، اور ارادہ آپکے نفس یا روح یا ذہن کا فعل ہے، جس طرح آپ کی روح یا نفس یا ذہن کی قوتِ ارادہ آپ کے جامد اور بے جان مضغۂ گوشت اعضاء سے اپنی خواہش حسب مختلف حرکات و افعال صادر کراتی ہے، اسی طرح روحِ اعظم کی قوتِ ارادہ اس بے جان عالمِ کائنات سے اپنی خواہش کے مطابق مختلف افعال اور حرکات صادر کراتی رہتی ہے، اور چونکہ عموماً وہ اس کو ایک ہی نہج پر چلاتی رہتی ہے، اس لیے ہم کو اسباب عادیہ کا علم

کسی قدر عطا ہو گیا ہے،

اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ذہن کے اندر آگ اور گرمی، برف اور ٹھنڈک کے درمیان ایک تلازم پیدا ہو گیا ہے، جس کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ آگ سے گرمی اور برف سے ٹھنڈک کا انفکاک نہیں ہو سکتا، حالانکہ اگر آگ اور برف کے متعلق ہمارا آیندہ تجربہ بدل جائے تو یقیناً یہ تلازم کا خیال بھی بدل جائے گا، مثلاً جس عہد قدیم میں گردشِ آسمانی اور دورِ نجوم، حادثات کے اسباب و علل یقین کیے جاتے تھے، اور ستاروں کی مختلف چالوں اور ان کی خاص خاص اشکال سے حوادثِ عالم کی توجیہ کیجاتی تھی، اس وقت ستاروں کی ایک خاص شکل کے ظہور یا کسی خاص ستارہ کے طلوع اور اس کے آثار و نتائج کے درمیان ایک خاص تلازم سمجھا جاتا ہوگا، اور اس یقین کو کہ یہ دونوں باہم علت و معلول ہیں، ناقابلِ انکار سمجھا جاتا ہوگا، لیکن آج ایسا نہیں ہے،

قدیم و جدید فن طب میں اب آسمان و زمین کا اختلاف ہے، دواؤں کے خواص و اثرات اور امراض کے علل و اسباب میں عظیم الشان تبدیلی ہو گئی ہے، مگر قدیم اطبا، یا اب بھی قدیم طب کے واقف کاروں اور قدر شناسوں کے نزدیک ان کے تجربے اور یکسانی عمل کی بنا پر جن دواؤں کے جو اثرات اور جن امراض کے جو علل و اسباب ہیں، وہ ان کے یقینیات میں داخل تھے، اور ہیں، لیکن ممالک یورپ میں جہاں کوئی اس طب کا نام بھی نہیں جانتا اور اس کے تجارب و تحقیقات کا مشاہدہ نہیں کیا گیا ہے، ہمارے اطباء کے یقین کردہ آثار و خواص اور اسباب و علل کو وہاں اوہام سے زیادہ رتبہ نہیں دیا جا سکتا،

خود اوہام کیا چیز ہیں ؟ جاہل طبقوں اور وحشی قوموں میں بہت سے ایسے یقینیات ہیں جن کو آپ اوہام سے تعبیر کرتے ہیں، مگر ان میں یہ اوہام کیونکر پیدا ہوئے ؟ اسی تکرار تجربہ سے، انھوں نے کئی دفعہ دیکھا کہ جب صبح کو فلاں پرند بولا یا اڑا تو فلاں بات ہو گئی، چند بار کے دیکھنے سے ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اس کا یہ اثر ہے، حالانکہ معلوم ہو کہ اس پرند کے بولنے یا اڑنے اور اس بات کے ہونے کے درمیان، کسی قسم کا تلازم نہیں ہے، تاہم چونکہ ان کا یقین ان کے تجربہ پر مبنی ہے، اس لیے اس کے خلاف باور کرنا اُن کے لیے اتنا ہی محال ہے جتنا کہ آگ اور گرمی و سوزش کے درمیان تلازم، اور ان دونوں کے درمیان علت و معلول پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے یہ تخیل کہ آگ موجود ہو، اور اس سے گرمی و سوزش کا اثر ظاہر نہ ہو،

جن ملکوں میں خچر نہیں ہوتے، وہاں کے باشندے اپنے تجربہ کی بنا پر اس مسئلہ پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ دو مختلف النوع جانوروں میں باہم توالد و تناسل نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے خلاف ان کو یقین دلانا چاہیں کہ گھوڑے اور گدھے مل کر باہم اس فرض کو انجام دیتے ہیں، اور اس سے خچر نام ایک تیسری نوع تیار ہوتی ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں انکو کس قدر تامل ہوگا، لیکن کیا ان کا تامل ہندوستان و مصر میں مطابقِ واقعہ سمجھا جائیگا ؟ جہاں ہزاروں دفعہ یہ مشاہدہ ہو چکا ہے۔

اسبابِ علل کا علم تجربہ سے ہوتا ہے

الغرض ہم جن کو اصولِ فطرت، نوامیسِ قدرت اور لاز آف نیچر کہتے ہیں، وہ صرف روزمرہ کے مشاہداتِ عادیہ کے نام ہیں، ہم دیکھتے آئے ہیں کہ درخت کس طرح اگتے ہیں، جاندار موجودات کس طرح پیدا ہوتے ہیں، آفتاب کس طرح طلوع

ہوتا ہے، پانی کس طرح برستا ہے، ان کو دیکھتے دیکھتے ہم اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہم ان کا اسی طرح ہونا ضروری اور اس کے خلاف ہونا محال قطعی سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے، کچھ دنوں کے بعد وہ پھوٹتا ہے، اس میں کونپلیں نکل آتی ہیں، پھر وہ پودے کی شکل اختیار کرتا ہے، شاخیں نکلتی ہیں، اور بڑھکر درخت ہو جاتا ہے، ایک قطرۂ آب خون اور خون سے گوشت بنجاتا ہے، اس میں رگیں، پٹھے اور ہڈیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دل و دماغ او جگر و گردہ اپنی اپنی جگہ پر بنجاتے ہیں، پھر کہیں سے اس میں روح آجاتی ہے، پھر اس آئینہ میں احساس و عقل جلوہ آرا ہوتی ہے، ایک مدت متعینہ کے بعد وہ پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے، اس طرز پیدائش کو دیکھتے دیکھتے حیرت زائی اور استعجاب و استبعاد کی روح ہم سے بالکل فنا ہو گئی ہے، اور ہم کبھی ایک لمحہ کیلیے بھی غور نہیں کرتے کہ ایک جامد دانہ، نامی درخت کی شکل میں اور ایک بیجان قطرہ لایعقل ایک جاندار و ذی عقل انسان کی صورت میں کیونکر بدل گیا، لیکن ہمیں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بیجان لکڑی جاندار سانپ بن گئی، اور عیسیٰؑ نام ایک بچہ بن باپ کے پیدا ہو گیا، تو ہماری محدود عقل و تجربہ کا پُرغرور سر انکار سے ہلنے لگتا ہے، یہ کیوں؟ اس لیے کہ کبھی ہم نے ایسا ہوتے دیکھا نہیں آفتاب روز پورب سے طلوع ہوتا ہے اور پچھم میں جاکر غروب ہو جاتا ہے، ہم کو اس پر مطلق تعجب نہیں ہوتا، اور نہ یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے، اور جب یہ سنتے ہیں کہ قیامت کے دن آفتاب پورب کے بجائے پچھم سے نکلے گا، تو ہم اس کو خلافِ عقل کہتے ہیں، کیا پورب سے اسکا نکلنا عقل کے موافق تھا؟ اور ہم آفتاب کو اگر پورب سے نکلتے نہ دیکھتے تو خود بخود عقلاً یہ فیصلہ کر لیتے کہ اس کو پورب ہی سے

نکلنا چاہیے اور مغرب ہی میں ڈوبنا چاہیے، عموماً انسان کے ایک سر، دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ اور دو پانوں اور ہر ہاتھ پانوں میں پانچ پانچ انگلیاں ہوتی ہیں، لیکن تاریخ طبعی انسانی کی کوئی کتاب پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ قدرت کے مستثنیات کی بھی کوئی انتہا نہیں، اور سینکڑوں ہزاروں بچے اس کے خلاف پیدا ہوئے ہیں، اب جس طرح آپ اس پر اعتراض نہیں کرتے کہ انسان کے دو ہی ہاتھ اور دو ہی پانوں کیوں ہوتے ہیں، اس پر بھی اعتراض نہیں کر سکتے کہ اس بچہ کے چار ہاتھ اور چار پاؤں کیوں ہیں، اور جس طرح آپ کو اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ آدمی جی کر مر کیوں کر جاتا ہے، ایسے ہی اس پر حیرت نہ کیجیے مر کر جی کیونکر جاتا ہے، ان دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک واقعہ کو آپنے بار بار دیکھا ہے، اور دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا، لیکن کسی چیز کا دیکھنا اور نہ دیکھنا کسی چیز کے فی نفسہ محال یا ممکن ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتی،

حاصل یہ ہے کہ ہم کو معجزات کے متعلق جو استبعاد نظر آتا ہے، اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ہمارے گذشتہ مشاہدات و تجربات کے خلاف ہوتا ہے، لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس کے گذشتہ مشاہدات اور تجربات میں غلطی کا ہونا یا اس میں انقلاب ہو جانا کچھ محال نہیں، طبیعیات جدیدہ نے طبیعیات قدیمہ کی تحقیقات کی دیوار ڈھادی، حکمائے جدید نے حکمائے قدیم کے سینکڑوں تجربات باطل کر دیے، ہیئت قدیم اور ہیئتِ جدید میں آسمان اور زمین کا اختلاف پیدا ہو گیا، اختراعات جدیدہ نے سینکڑوں اور ہزاروں قدیم مستبعدات اور ممتنعات کو ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا، جب ہمارے گذشتہ تجربات اور تحقیقات کا یہ حال ہے، تو انسانی تحقیقات و تجربات کی آیندہ صحت کی کون ضمانت کر سکتا ہے؟

فلسفۂ یونان پڑھ کر ہم یقین کرتے تھے کہ زمین ساکن اور آفتاب متحرک ہی، اب روز روشن کی طرح یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ آفتاب ساکن اور زمین متحرک ہی، اس لیے اگر کسی پیغمبر کی زبان سے اس وقت یہ خیال ادا ہوتا کہ زمین متحرک اور آفتاب ساکن ہی تو حکمتِ قدیمہ کی درسگاہ میں یہ خیال شاید جاہلانہ اور مضحکہ انگیز سمجھا جاتا، پھر حکمت جدیدہ کے دانایانِ روزگار کو آج مذہب کی جو چیز مضحکہ انگیز نظر آتی ہے، کیا معلوم کہ کل خود ان کی تحقیقات "حکمتِ مستقبلہ" کے مدرسہ میں قابل مضحکہ نہ ٹھہرے گی۔

الغرض صفحات بالا سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ بنی نوع انسان کے اصل سرمایۂ علم علل و معلول میں جو کچھ ہے وہ صرف ان کے تجربہ کی کمائی ہے، اور اسی کی بناپر استدلال تمثیلی کے طور پر وہ ایک چیز کو چند بار دیکھ کر اپنے ذہن میں ایک حکم کلی پیدا کر لیتے ہیں، مثلاً ایک سیب کو دیکھا، اس کی خوشبو کو سونگھا، اس کے مزہ کو چکھا، اب دوسرا سیب ہمارے سامنے آتا ہی، اسکی شکل و صورت اور رنگ کو دیکھکر، اسکی خوشبو کو سونگھ کر ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی سیب ہے، اور اس کا مزہ ایسا ہوتا ہے، اور پھر چند سیبوں کو دیکھکر ہم یہ حکم کلی لگا دیتے ہیں کہ ہر سیب ایسا ہوتا ہی، اور اس کا یہ خاصہ اور اثر ہوتا ہے، اسی طرح ہم نے برف کو دیکھا، اسکی شکل و صورت، رنگ، مزہ اور ٹھنڈک کو محسوس کیا، اور پھر کئی دفعہ اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ہم نے ہر دفعہ پہلی برف کی مثل دیکھکر یہ کہہ دیا کہ یہ بھی برف ہی، اور ہر برف ٹھنڈا ہوتا ہے، یہی حال اس قضیہ کا ہے کہ "ہر آگ جلاتی ہی" اب غور کیجیے کہ آپ کے یہ قضایا جو محض استدلال تمثیلی کی بنیاد پر قائم ہیں عقلاً کیونکر ناقابلِ شکست یقین بننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، یہ اور بات ہی کہ آپ عادۃً اپنی علمی اور کاروباری دنیا

کیلیے ان پر یقین کر کے جلب منافع اور دفع مضار میں ان سے کام لیں اور یہی علت عادیہ کی حقیقت و مصلحت ہے

علامہ ابن تیمیہ کا بیان کہ اسباب و علل تجربی ہیں

ہم نے جس پیرایہ پر مسئلۂ علیت کی تشریح کی ہے یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے، علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطق میں جابجا اس خیال کو ظاہر کیا ہے، چنانچہ ہم یہاں اسکی تلخیص اس لیے درج کرنا چاہتے ہیں کہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ ناظرین کے سامنے آجائے،

کھانے کے بعد آسودگی، پینے کے بعد سیری، بدیہی تجربیات میں ہے، اسی طرح لذت وغیرہ کا احساس ہے کہ جب انسان اس کا احساس کرتا ہے تو اس کے بعد فوراً ایک اثر پاتا ہے، پھر جب بار بار اس شے کے احساس کے بعد وہی اثر پاتا ہے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہی شے اس اثر کا سبب ہے، اسی کا نام تجربیات ہے، قضایائے کلیہ کی اصل یہی تجربیات ہیں، تفصیل یہ ہے کہ مثلاً جب ایک شخص کسی خاص دوا کو استعمال کرتا ہے اور یہ پاتا ہے کہ اس سے فلاں مرض دور ہو گیا یا فلاں قسم کا نقصان ہو گیا تو مرض کا اس سے پیدا ہو جانا یا زائل ہو جانا تجربہ ہے، یہی حال دیگر آلام و لذات کا ہے، جو مشمومات، مسموعات، مرئیات اور ملموسات سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جب اس کو سونگھتا، یا دیکھتا، یا سنتا، یا چکھتا یا چھوتا ہے، پھر نفس میں جو لذت کا احساس ہوتا ہے، وہ وجدانیات میں سے ہے، جن کو حواس باطن سے دریافت کرتا ہے، اب نفس میں جو اعتقاد کلی قائم ہو جاتا ہے کہ اس جنس کے ہر فرد سے لذت حاصل ہوتی ہے، اور اس جنس کے ہر فرد سے الم حاصل ہوتا ہے، وہ من قبیل تجربیات ہے، کیونکہ حواس ظاہرہ و باطنہ سے شئے کلی کا احساس نہیں ہو سکتا، حکم کلی کا جو اعتقاد نفس میں قائم ہو جاتا ہے، وہ حس اور عقل کے مجموعہ سے ہوتا ہے، اور اسکا

نام تجربیات ہے، مثلاً یہ اعتقاد کہ کھانے اور پینے کی چیزوں سے آسودگی اور سیری پیدا ہوتی ہے، اور زہر قاتل کے استعمال سے آدمی مرجاتا ہے۔ اور بیماری پیدا کرنے والے اسباب سے آدمی بیمار پڑجاتا ہے اور اس بیماری کا فلاں اسباب و ذرائع سے استیصال ہوجاتا ہے، یہ کل کے کل قضایائے تجربیہ ہیں، کیونکہ حس تو صرف جزئی اور شخصی چیزوں کا احساس کرتا ہی، لیکن جب ایک شے سے ایک ہی احساس باربار ہوتا ہی تو عقل ادراک کرتی ہے کہ اس مشترک امر کی وجہ سے جوان تمام افراد میں تھا، یہ بات پیدا ہوئی اور یہ چیز فلاں قسم کی لذت پیدا کرتی ہی، اور اس شے سے فلاں قسم کی تکلیف پیدا ہوتی ہے، یہی حال حدسیات کا ہی کہ ان کی جزئیات کا بھی علم احساس سے ہوتا ہے، لیکن تکرار سے عقل قدر مشترک کا اندازہ لگالیتی ہے۔۔۔۔ مثلاً جب چاند کی روشنی کا اختلاف آفتاب کے مقابلہ کے اختلاف سے دیکھتے ہیں تو گمان کرلیتے ہیں کہ چاند کی روشنی آفتاب سے حاصل ہوئی ہے، یا یہ دیکھتے ہیں کہ ثوابت کی حرکت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا، اور وہ سب ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں، تو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فلک ایک ہے، اسی طرح جب سبع سیارہ کے اختلاف حرکات کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہر سیارہ کا فلک دوسرے سے مختلف ہے،

قیاس کی بحث میں علامۂ ممدوح کہتے ہیں،

فلاسفہ نے یقینیات کو صرف چند قضایا میں محدود کر دیا ہے، جن میں سے ایک حسیات ہیں، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ حس سے ہرگز کسی عام اور کلی شے کا ادراک نہیں ہوسکتا،

اس لیے فقط حسیات سے کوئی قضیۂ کلیہ عامہ نہیں بن سکتا جو برہانِ یقینی کا کوئی جزو بن سکے، تمثیلاً اہلِ منطق کہتے ہیں کہ "آگ جلاتی ہے۔" حالانکہ اس قضیہ کی عمومیت اور کلیت کا علم تجربہ اور عادت سے ہوا ہے، جو قیاس تمثیلی کی ایک قسم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسکا علم اس طرح ہوا کہ آگ میں جلانے والی قوت موجود ہوتی ہے، تو یہ علم بھی کہ "ہر آگ میں یہ قوت موجود ہوتی ہے۔" ایک حکم کلی ہے، جو احساس سے نہیں دریافت ہو سکتا، اور اگر یہ کہا جائے کہ ضروری ہے کہ آگ کی صورت نوعیہ میں یہ قوت موجود ہو، اور جسمیں یہ قوت موجود نہ ہوگی وہ آگ نہ ہوگی، تو یہ دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو مفید یقین نہیں، کیونکہ یہ قضیہ کہ "جس شے میں یہ قوت ہوتی ہے وہ جلاتی ہے۔" اس میں تمثیل شمول، عادت اور استقرائے ناقص کو دخل ہے، اور یہ معلوم ہے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ "آگ ہر شے کو جو اس کے اندر پڑتی ہے جلا دیتی ہے۔" وہ غلطی کرتا ہے، کیونکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس شے میں جلنے کی قابلیت ہو، ورنہ وہ ہر شے کو نہیں جلا سکتی جس طرح پتھر اور یاقوت کو نہیں جلا سکتی، یا ان اجسام کو نہیں جلا سکتی جن میں مانع آتش دوائیں لگا دی گئی ہوں، خرق عادت کی بحث کا مقام دوسرا ہے، بہر حال قضایائے حسیہ میں کوئی کلیہ ایسا نہیں ہے، جس کا نقض نہ ہو سکے، اور درحقیقت قضیہ کلیہ حسیہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ قضیۂ حسیہ مثلاً "یہ آگ جلاتی ہے"، اس میں حس صرف ایک خاص چیز کا ادراک کرتی ہے، حکم کلی جو عقل لگا دیتی ہے تو فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ نفس ان خاص افراد اور مثالوں کے دیکھنے کے بعد اپنے میں یہ استعداد پیدا کر لیتا ہے کہ اس کے اندر یہ الہام پیدا ہو جائے کہ ہر آگ جلاتی ہے، اور

یہی حکم کلی ہے، تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بھی قیاس تمثیلی ہی ہے، اور اس کی کلیت اور عمومیت
پر اُس وقت تک وثوق نہیں کیا جا سکتا، جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ حکم تمام
افراد میں مشترک ہی، اور یہ اسی وقت تک ممکن ہی، جب تمام افراد کا تجربہ کر لیا جائے
پھر بھی قضایائے عادیہ میں سے کوئی قضیہ ایسا نہیں ہی جس کا ٹوٹنا باتفاق عقلاء
جائز نہ ہو، بلکہ فلاسفہ تک خرقِ عادت کو جائز سمجھتے ہیں، مگر وہ اس کے لیے فلکی
طبعی اور نفسیاتی اسباب بیان کرتے ہیں، اور ان ہی تینوں اسباب کی طرف
خرقِ عادت کو منسوب کرتے ہیں، اور اسی سے انبیاء کے معجزات اولیاء کے کرامات
اور سحر وغیرہ کو ثابت کرتے ہیں"

اسی قیاس کی بحث کے آغاز میں علامۂ ممدوح لکھتے ہیں:۔

اور یہی حال تجربیات کا ہے، لوگوں نے عموماً تجربہ کیا ہے کہ پانی پینے سے سیری
ہوتی ہی، اور گلا کٹ جانے سے آدمی مرجاتا ہے، اور ضرب شدید سے تکلیف ہوتی ہی، ان
تمام قضیوں کا علم محض تجربہ کی بنا پر ہے، کیونکہ حس نے ایک خاص سیری کا ادراک کیا
ہے اور گلا کٹنے سے ایک خاص شخص کو مرتے دیکھا ہے، اور مارنے سے تکلیف ایک
خاص شخص نے محسوس کی ہے، اب یہ حکم کہ جو شخص ایسا کرے گا یہ خاص اثر پیدا ہوگا تو یہ
قضیہ کلیہ حس سے نہیں معلوم ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ حکم عقلی کا لگاؤ بھی ہے۔

تجربہ سے جو اثر معین کسی شے معین میں معلوم ہوتا ہے، اس کی نسبت یہ دیکھنا ہے کہ
اس شے معین میں اور اس کے اثر معین میں ایک خاص تلازم ہے، اور اسی کو عادت مستمرہ

کا علم ہوتا ہے خصوصاً جب ان دونوں کے درمیان کسی مناسبت کا بھی شعور ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ جہاں وہ شے بھی پائی جاتی ہے وہاں یہ اثر بھی پایا جاتا ہے، اور جہاں وہ اثر پایا جاتا ہے، وہاں وہ شے بھی پائی جاتی ہے، اور نیز یہ کہ جہاں وہ شے نہیں پائی جاتی، وہ اثر بھی نہیں پایا جاتا، اور جہاں وہ اثر نہیں پایا جاتا وہاں وہ شے بھی نہیں پائی جاتی، اب جس قدر اس لزوم میں ظنیت پائی جائے گی اسی قدر علیت کا اعتقاد بھی ظنی ہوگا، اور جسقدر اس لزوم میں قطعیت ہوگی اسی قدر لزوم کے اعتقاد میں قطعیت ہوگی، اور یہی قضایائے عادیہ ہیں، جیسے طب کے تجربیات وغیرہ، یا یہ علم کہ روٹی کھانے سے آسودگی اور پانی پینے سے سیری ہوتی ہے، اور کپڑے پہننے سے بدن میں گرمی اور برہنگی سے بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے......

پس تجربیات سے علم حاصل ہونے کا سبب ایک شے کا دوسری شے کے بعد ہونے سے اور تکرار اثر سے پیدا ہوتا ہے۔"

تجربیات کی بنا شہادت اور روایت، اور تاریخ پر ہے

غرض ان مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ اشیاء کے خواص اور موجودات کے اسباب کا علم ہم کو محض تجربہ سے حاصل ہوا ہے، اب یہاں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ کیا **تجربی یقین** کے پیدا ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود اس **یقین** کرنے والے نے اس کا تجربہ کیا ہو، ہم دنیا میں ہزاروں تجربی مسائل پر یقین رکھتے ہیں، مگر ان میں سے بہت کم ہمارے ذاتی تجربہ میں آئے ہیں، طبعیات، کیمیائیات، طبیات، فلکیات، ارضیات کی ہزاروں باتیں ہیں جن پر ہم یقین رکھتے ہیں، مگر ہمارے

ذاتی تجربہ میں بہت کم آئی ہیں، اگر آپ یہ کہیں کہ گو وہ ہمارے ذاتی تجربہ میں نہیں آئی ہیں، لیکن ان علوم کے ماہرین نے ان کا تجربہ کیا ہے، اور ہم کو ان کی شہادت کا اس لیے یقین ہے، کہ وہ اپنے اپنے علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، اور اپنے ذاتی تجربوں کو انھوں نے اپنی تصنیفات میں لکھ دیا ہے، تو گویا آپ نے قبول کر لیا کہ دوسروں کے تجربیات بھی مفید یقین ہیں، بشرطیکہ خود ان تجربہ کرنے والے علماء پر آپ کو وثوق ہو، اور ان کے تجربیات صحیح و مستند شہادتوں اور واسطوں سے آپ تک پہنچیں۔

دنیا کے واقعات کا سب سے بڑا دفتر تاریخ ہے، جو عہد ماضی کی ظلمت میں ہمارے لیے چراغ راہ ہے، اور اس چراغ میں تیل کون برابر ڈالتا جاتا ہے کہ یہ بجھتا نہیں؟ وہ راویانِ اخبار اور ناقلانِ حکایات ہیں، جو ایک عہد سے دوسرے عہد تک اس کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں، اگر یہ سلسلۂ روایت کہیں منقطع ہو جائے تو عہد ماضی کی دنیا بھی عالم مستقبل کی طرح تیرہ و تار ہو جائے، لیکن تاریخ کی ہر شہادت آسانی کے ساتھ قبول نہیں کر لی جاتی، بلکہ اس کے لیے چشم دید گواہوں کا وجود، ان کی صداقت اور راست شعاری اور پھر اس کے بعد بیچ کے واسطوں کی سچائی اور راست گفتاری اور عدم فریب کے ثبوت کی بھی ضرورت ہے لیکن اگر یہ شرائط پورے پورے ہو جائیں تو روایات منقولہ کی صداقت میں کسی کو شک نہ ہونا چاہیے،

فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں

حقیقت میں فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں، فلسفہ تو اشخاص یا جماعتوں کے منتظم خیالات کی، اور سائنس کائنات فطرت کے تجربی اکتشافات کی تاریخ ہے، فلسفہ کی درسگاہ کا ہر پروفیسر نہایت وثوق

کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اس مسئلہ میں یونان، اسلام اور یورپ کے فلاں فلاں اساطین فلسفہ کی یہ رائیں ہیں، کیا اس وثوق کی بنیاد صرف شہادت تاریخی پر نہیں ہے؟ آغاز آفرینش سے لے کر اس وقت تک دنیاے انسانی نے علم و اکتشاف، تجربہ و دانش کا جو سرمایہ جمع کیا ہے، کیا وہ بجز شہادت تاریخی کے کسی اور طریقہ سے حاصل ہوا؟ یا ہو سکتا ہے؟ یا آیندہ ہوگا، آپ یقین رکھتے ہیں کہ جسم ۹۲ بسیط عنصروں سے مرکب ہے، ہائیڈروجن اور آکسیجن پانی کے دو جزء ہیں، سنکھیا کے استعمال سے آدمی مرجاتا ہے، مگر ان میں سے ایک بات بھی آپ کے تجربہ میں نہیں آئی ہے، البتہ چونکہ صحیح اور مستند ذریعوں سے آپ تک یہ تحقیقات پہنچی ہیں، اس لیے آپ ان کو باور کرتے ہیں، لندن اور پیرس کو آپ نے خود نہیں دیکھا لیکن باایںہمہ آپ کو ان شہروں کے وجود میں شک نہیں، مگر کوہ قاف کے پرستان کے وجود پر آپ کو یقین نہیں، اس لیے کہ پہلے دو شہروں کے وجود کی خبر آپ نے بہ کثرت لوگوں سے، اور ایسے ثقہ اور مستند لوگوں سے سنی ہے کہ آپ اس میں شک نہیں کر سکتے لیکن کوہ قاف کے پرستان کے عینی مشاہدوں تک آپ کا سلسلۂ روایت صحیح اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچا ہے، اس لیے آپ کو اسکے وجود میں بہت حد تک شک ہے، اسی طرح ہیئت و فلکیات کے اکثر مسائل مثلاً ستاروں کی چالیں، خاص ستاروں کا طلوع و غروب وغیرہ کسی نہ کسی ہیئت دان اور فلکی کا مشاہدہ ہے، اور پھر صدیوں کے مشاہدات یکجا ہو کر آپ کے سامنے ہیئت و فلکیات کا ناقابل انکار دفتر بن کر آتا ہے، مگر غور کیجئے کہ اس دفتر بے پایاں کا ہر ایک مشاہدہ بجز تاریخی روایت و شہادت کے کسی اور طریقہ سے پہنچا ہے، یا پہنچ سکتا ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے، برف ٹھنڈک پہنچاتی ہے، آفتاب روشن ہے، پتھر سخت ہے، کھانے سے سیری ہوتی ہے، چوٹ سے تکلیف ہوتی ہے، غرض تمام قضایاے تجربیہ جن پر علوم و فنون کی بنیاد قائم ہے، اور جن کی عمومیت و کلیت کا آپ کو یقین یا ظن غالب ہے، ان کی اس کلیت اور عمومیت کا یقین یا غلبۂ ظن صرف آپ ہی کے ذاتی تجربہ پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ان میں سے ہر قضیہ کی عمومیت اور کلیت کے بنانے میں آپ کے سوا، اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں اور بیسیوں نسلوں کے مشاہدات کو دخل ہے، اور یہ مشاہدات آپ تک تحریری یا زبانی تاریخی شہادتوں کے ذریعہ سے پہنچے ہیں، تب جاکر وہ انسانی مسلمات میں داخل ہوئے ہیں۔

تاریخی شہادتوں کے شرائط استناد

لیکن کسی تاریخی شہادت کے مستند ہونے پر آپ کچھ قیود بھی عائد کرسکتے ہیں، مثلاً یہ کہ اخیر راوی چشم دید گواہ ہو، یعنی یہ کہ وہ واقعہ کے وقت، مقام واقعہ پر حاضر ہو، اور خود اس کا بلا واسطہ ذاتی علم حاصل کیا ہو، وہ راست گفتار ہو، اس کا حافظہ صحیح اور درست ہو، فریبی اور جھوٹا نہ ہو، اسی طرح آغازِ سلسلۂ روایت سے لیکر آخر تک بیچ کا ہر راوی بھی ان ہی صفات سے متصف ہو، جہانتک ان صفات میں ترقی ہوگی، واقعہ کے متعلق آپکے علم و اذعان میں بھی ترقی ہوگی، اور جہانتک ان میں کمی ہوگی، آپکے علم و اذعان میں بھی کمی ہوگی۔

مسلمانوں کا علم روایت

اب مسلمانوں کے علم، اخبار یا علم نقل و روایت یعنی **اصول حدیث** پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ یہی اصول انھوں نے ہر روایتی شہادت کے قبول کرنے کیلیے مقرر کیا ہے، سلسلۂ روایت کے ان اوصاف میں جس قدر بھی نقص ہوگا، اس جزو واقعہ کے علم و اذعان میں بھی اسی قدر نقص ان کے نزدیک پیدا ہوگا، پیغمبر اسلام علیہ السلام کی طرف

جس قدر بھی صحیح و مستند **معجزات** منسوب ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے، جس کی صداقت کو اس اصول پر پرکھ نہ لیا گیا ہو، ہیوم نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "فہم انسانی" میں جہاں معجزات پر بحث کی ہے، انجیل کے بیان کردہ معجزات کی نسبت وہ اس لیے بے اعتباری ظاہر کرتا ہے کہ "مصنفین انجیل جو ان واقعات کے راوی اول ہیں ان میں سے کوئی واقعہ کا چشم دید گواہ نہیں ہے" لیکن ہیوم کو اگر اسلامی طرز روایت و اصول حدیث کی احتیاطوں سے آگاہی ہوتی تو کبھی اسلام کے معجزات کی نسبت اس بے اعتباری کا اسکو موقع نہ ملتا۔

صحیح معجزات نبویؐ کے پہلے رواۃ یعنی وہ **صحابۂ کرام** جو واقعات کے چشم دید گواہ ہیں، صدق مقال اور راست گفتاری پر ان کی زندگی کا ایک ایک حرف گواہ ہے، اور ان کی عقل، ذہانت اور متانت رائے پر ان کے کارنامے شاہد عدل ہیں، بیچ کے رواۃ وہ **محدثین** عظام ہیں جن کی سچائی، راستی اور حفظ و فہم پر اسماء رجال کے اوراق کی مہریں ثبت ہیں، پیغمبر اسلام علیہ السلام نے علی رؤس الاشہاد کہا اور بار بار کہا کہ "جو شخص میری طرف کسی جھوٹی بات کی نسبت کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے"، صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کسی خبر کو بیان کرتے ہوئے کانپ جاتے تھے، بیچ کے ثقہ اور مستند رواۃ بھی انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے، اس پر بھی ان کی تمام روایات کا درجہ یکساں نہیں ہے۔

اگر روایت کے ہر دور میں راویوں کی تعداد کثیر شریک ہو تو اس کو خبر **متواتر** کہتے ہیں، اور اگر ہر دور میں گو تعداد کثیر نہ ہو، لیکن دو یا دو سے زیادہ ہوں تو وہ **مستفیض** اور **مشہور** ہے، اور اگر کسی دور میں ایک ہی راوی رہ گیا ہو تو اس خبر کو خبر احاد کہتے ہیں، معجزات نبویؐ

مختلف طرق سے مروی ہیں، اور اسی کے اعتبار سے ان کی صحت بیان کا درجہ ہے، یہ سچ ہے کہ بعد کے لوگوں نے آپ کی طرف بہت سے ایسے معجزات منسوب کر دیے ہیں، جو صحیح نہیں ہیں، لیکن ہمارے محدثین نے نہایت جانفشانی اور ایمانداری سے اُن روایات کو معیار پر پرکھ پرکھ کر الگ کر دیا ہے اور اس کتاب کی جلد اول کے مقدمہ میں تمام و کمال بحث موجود ہے۔

معجزات کے ثبوت پر یہ طرز استدلال گو عجیب ہے، مگر غلط نہیں، دنیا میں ہر واقعہ کے ثبوت کا یہی طریقہ ہے، اور وہی اس باب میں بھی کارآمد ہے، یہ کیسی زبردستی ہے کہ جس طرز استدلال پر دنیا سے یقین کا عملی کاروبار چل رہا ہے اس کو اگر مذہب استعمال کرے تو مدعیانِ عقل کی جبینِ متانت پر بل پڑ جاتے ہیں۔

نادیدہ واقعات پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف روایات کی شہادت ہے

دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے اُس کے علم کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان اس واقعہ کے وقت موجود ہوگا، یا موجود نہ ہوگا، پہلی صورت میں اس کا علم، اس کے احساس و مشاہدہ پر موقوف ہے، اور وہ روایت کے تمام جھگڑوں سے بے نیاز ہے، جیسے کہ ان صحابہ کا، اس معجزہ کے متعلق علم جو انکے سامنے ظاہر ہوا، اور دوسری صورت میں اس واقعہ کا علم صرف روایت سے ہو سکتا ہے، اور اس کے سوا کوئی ذریعۂ علم اس کے لیے دنیا میں موجود نہیں ہے، آپ کا فرض صرف اس قدر ہے کہ روایت کی اچھی طرح تنقید کر لیجئے، اور جس طرح دنیا کے دوسرے عملی کاروبار میں واقعات پر یقین کرنے کے ذرائع استعمال تام ہیں، اس باب میں بھی ان ہی کو استعمال کیجئے، عقلی احتمالات اور ذہنی شبہات کی کوئی حد نہیں ہے، مگر کبھی روزمرہ کے معاملات میں وہ آپ کے

یقین کے سدِ راہ نہیں ہوتے،

خبر احاد پر بھی عملاً یقین ہوتا ہے | متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبر احاد تک پر آپ روزانہ یقین کرتے ہیں، خطوط، تار، اخبارات آج کل کی زندگی کا جز ہیں، اور ان میں سے ہر ایک پر آپ کو کامل وثوق ہے، رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات و ایجادات وطبی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کر لیتے ہیں، آج تمام تجارت کا دارومدار ان ہی تاروں پر ہے، یہ شدید مالی خطرات کا موقع ہے، مگر ہر بیوپاری اور تاجر بخوشی اس خبر احاد کو یقین کر لیتا ہے، اور اپنی تمام دولت اس کے نذر کر دیتا ہے، اور کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کہ کسی نے غلط کہا ہو، ممکن ہے غلط لکھ گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو، یہ تمام احتمالاتِ عقلی قائم ہو سکتے ہیں، مگر عملی یقین پر ان احتمالات کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔

ہم شفاخانوں میں جاتے ہیں، اور عطاروں اور کمپونڈروں سے دوائیں لیکر باطمینانِ تمام ان کو استعمال کرتے ہیں، حالانکہ معلوم ہے کہ ان شفاخانوں میں اکسیر اور سنکھیا دونوں کی بوتلیں پہلو بہ پہلو رکھی ہیں، ممکن ہے کہ تنہا دوا بنانے والے کی یہ اطلاع کہ یہ دوا تمھارے نسخہ کے مطابق ہے، غلط ہو، اور اس لیے اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے، مگر کبھی یہ خدشہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا، اور ہم بخوشی اپنی جان کو خبر احاد کے یقین کے نذر کر دیتے ہیں، پھر معجزات اور مذہب ہی کے باب میں شہادت کے مسئلہ پر تمام عقلی احتمالات اور شکوک کا ازالہ فرض کیوں تصور کیا جاتا ہے،

واقعات پر یقین کے لیے اصلی بنیاد امکان اور عدم امکان کی بحث نہیں بلکہ روایت کے ثبوت اور عدم ثبوت کی ہے

آج کل مغربی علم تاریخ اور فنِ روایت کا بڑا کارنامہ یہ اصول سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ کیا وہ ممکن بھی ہے؟ اور جب یہ طے ہو جائے تو روایت کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے لیکن یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے تمام واقعی علوم، ہمارے تجربہ اور روایات ہی پر مبنی ہیں، اس لیے کسی شے کے ممکن اور ناممکن ہونے کا فیصلہ، محض مشاہدہ کی تحقیق پر ہی مبنی ہے، اس لیے علم تاریخ اور فنِ روایت کی بنیاد اس کے امکان اور عدمِ امکان کی بحث پر قائم نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہمارے علماے اصول نے بتایا ہے، صرف اس پر قائم ہے کہ آیا یہ واقعہ روایۃً صحیح بھی ہے یا نہیں؟

جس درجہ کا واقعہ ہو، اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے

ہم کو اس اصول کی صحت سے انکار نہیں ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو، اُسی درجہ کی شہادت بھی ہونی چاہیے لیکن درجہ نام کمیت اشخاص سے زیادہ کیفیتِ اشخاص کا ہے، ایک واقعہ کو چند آدمی بیان کرتے ہیں، مگر انکی راست گفتاری معرض بحث میں ہے، لیکن ایک ایسا شخص اس کے خلاف اپنی روایت بیان کرتا ہے جس کی صداقت مسلّم ہے جس کی راست گفتاری کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے، جس کی سمجھ، حافظ اور وثوق کا ہم کو علم ہے، اور جس کی دوسری اخلاقی صفات جن کا روایت کا اثر پڑتا ہے، نہایت بلند ہیں، تو ظاہر ہے کہ واقعہ کی حیثیت سے دوسری شہادت پہلی شہادت سے زیادہ قابلِ قبول ہے، راویوں کی ان صفات کی واقفیت کا روایاتِ اسلامیہ کے سوا دنیا میں کسی اور قوم و مذہب کی روایات کے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے

دنیا کے اور مذاہب اور قوموں کی روایات کے مقابلہ میں اسلامی روایات کی ایک خاص اہمیت ہے،

معجزات در اصل تجربیات کے خلاف نہیں ہوتے

اس موقع پر ایک اور مسئلہ کو بھی صاف کرنا ہے، عام طور سے معجزات کی شہادت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ معجزہ کی شہادت سینکڑوں، ہزاروں شہادتوں کے خلاف ہوتی ہے، اس لیے وہ ناقابلِ یقین ہے، یہ حقیقت میں ایک قسم کا مغالطہ ہے، ہزاروں لاکھوں شہادتیں اس بات کی بیشک ہیں کہ آگ نے فلاں فلاں موقع پر جلایا، اب جو شخص ایک معجزہ کو بیان کرتا ہے کہ فلاں موقع پر آگ نے نہیں جلایا تو یہ شہادت ان ہزاروں لاکھوں شہادتوں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ان سے الگ ایک واقعہ ہے، اس روایت سے "ان لاکھوں ہزاروں شہادتوں کی مخالفت اور انکار اس وقت لازم آتا کہ جن موقعوں کے متعلق یہ کثیر التعداد شہادتیں اپنا مشاہدہ بیان کرتی ہیں، ان کی تکذیب و تغلیط کی جاتی، دو شہادتوں کی باہمی ترجیح کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دونوں ایک ہی خاص واقعہ کو مختلف نتیجوں کے ساتھ بیان کریں، اور یہاں یہ صورت نہیں ہے، جن آگوں کے جلانے کے متعلق سینکڑوں شہادتیں موجود ہیں، معجزہ کا راوی ان کی تغلیط و تکذیب نہیں کرتا، بلکہ ایک خاص آگ کی نسبت اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے، جس کے متعلق ان کو نفیاً یا اثباتاً کوئی علم نہیں، مثلاً ایک طرف ایک شخص کی تنہا یہ شہادت ہوتی کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کے ہاتھوں سے پانی کا چشمہ ابلنے لگا، دوسری طرف سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی یہ شہادت ہوتی کہ نہیں ایسا واقعہ نہیں ہوا، تو بیشک اس موقع پر

دوسری شہادت کو پہلی شہادت پر ترجیح دی جاسکتی اور تمام مسلمان اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر کسی معجزۂ نبوی کے متعلق اس قسم کی مخالف شہادت موجود ہو تو وہ اس معجزہ کو صحیح معجزاتِ نبویؐ کی فہرست سے خارج کر دیں گے۔

معجزات کا ثبوت روایتی شہادتیں ہیں

الغرض معجزہ کی شہادت کے متعلق اصل بحث یہ نہیں کہ یہ ممکن ہے یا ناممکن، بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ یہ شہادت کس درجہ کی ہے؟ اور اس کے رواۃ کی صحیح البیانی کا کیا پایہ ہے؟ اس کے لیے صحابۂ کرام اور تابعین عظام کی راستی، دیانت، صدقِ مقال اور ان کی اخلاقی زندگی کے دیگر پہلوؤں کے مطالعہ کی حاجت ہے، اور یہی شے ہے جو معجزات کی شہادت کو طاقتور یا کمزور بنا سکتی ہے، اور یہی ہمارے محدثین اور اہل اصول کا قانونِ شہادت ہے، اور اسی طریق سے اہل السنۃ والجماعۃ معجزہ کو ثابت کرتے ہیں، علامہ ابو منصور عبد القادر بغدادی اشعری کتاب الفرق میں اہلِ سنت کا مسلک لکھتے ہیں:۔

وبهذا النوع من الاخبار (المستفيض)	اسی خبر مشہور کے ذریعہ سے ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات
علمنا معجزة نبينا صلى الله عليه وسلم فى انشقاق	کو جانا، مثلاً شق قمر، دستِ مبارک میں کنکریوں کا تسبیح
القمر، وتسبيح الحصا فى يده وحنين الجذع	پڑھنا، شاخ خرما کا گریہ وبکا کرنا، اور تھوڑے
اليه لما فارقه واشباعه الخلق الكثير	کھانے سے بہت سے لوگوں کو سیر کر دینا وغیرہ
من الطعام اليسير ونحو ذلك من معجزاته (ص۳۱۴ مصر)	

. . . .

خلاصۂ مباحث

گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا خلاصہ حسبِ ذیل سطروں میں کیا جا سکتا ہے

۱۔ معجزہ خرقِ عادت اور قاعدۂ علت و معلول کی استثنائی شکست کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے کسی پیغمبر کی سچائی کی نشانی کے طور پر لوگوں میں ظاہر کرتا ہے،

۲۔ خرقِ عادت اور قاعدۂ علت و معلول کی شکست ممکن، بلکہ واقع ہے،

۳۔ کیونکہ عاداتِ طبعی اور سلسلۂ علل و معلول کا علم ہم کو تجربے سے ہوا ہے،

۴۔ اور تجربہ سے جو علم حاصل ہو اس کی کلیت اور عمومیتِ عقلی کا دعوی نہیں کیا جا سکتا، اسلیے اس سے معجزہ کے محال ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا،

۵۔ تجربہ کی بنیاد ذاتی مشاہدہ یا دوسرے مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر ہے،

۶۔ اس لیے معجزہ کا ثبوت ذاتی مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر مبنی ہے،

۷۔ اسلامی روایات اور صحیح معجزاتِ نبوی کی شہادت اس قدر بلند ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخی روایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور اس سے معجزات اور خوارقِ عادات کا وقوعی ثبوت بہم پہنچتا ہے،

یقینِ معجزات کے اصول نفسی

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا خطاب فلسفہ اور منطق سے تھا، لیکن ظاہر ہے کہ علمی دنیا کا کاروبار ارسطو کے بنائے ہوئے اصول و قواعد پر نہیں چل رہا ہے، بلکہ خالقِ فطرت اپنے وضع کردہ اصول و قواعد پر اس کو چلا رہا ہے، واقعات کسی حد تک تعجب انگیز اور دور از عقل ہوں، تاہم انسانوں کی بڑی تعداد، دلیل و برہانِ منطقی کے بغیر صدق دل سے ان پر یقین رکھتی ہے، کسی واقعہ پر یقین رکھنے کے لیے اس کا فہم انسانی میں آجانا اور عقل و استدلال کی میزان میں اسکا پورا اتر جانا ضروری نہیں ہے ایک طبیعی فلسفی سے لیکر عامی تک مادہ کے وجود

پر یقین رکھتا ہی، حالانکہ استدلال سے اس کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہی کہ ایک واقعہ کی جب روایت کیجاتی ہی تو کچھ لوگ بے دلیل اس کو فوراً تسلیم کرتے ہیں، اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ استدلال و برہان کے باوجود اس کے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے، اگر استدلال کی قوت سے وہ خاموش بھی ہو جائیں تو انکے دل کو تسلی نہیں ہوتی، جو اشخاص کسی جماعت یا ملک کے اندر کام کرتے ہیں انکی سچائی اور خلوص و ایثار کے متعلق سب لوگوں کی رائے برابر نہیں ہوتی، ایک جماعت پس زور و قوت سے ان کے صدق و اخلاق پر ایمان رکھتی ہے، دوسری جماعت اسی زور و قوت کے ساتھ ان کو خائن اور ریاکار جانتی ہے، حالانکہ دونوں کے سامنے اُنکے اعمال کا ایک ہی نقشہ پیش رہتا ہے، مگر نتائج مختلف ہوتے ہیں، اور دو میں سے کوئی اپنے دعویٰ پر کھلے دلائل نہیں رکھتا، اس لیے ایمان و کفر اور یقین و شک کے وجوہ منطقی طرز استدلال سے نہیں بلکہ زیادہ تر نفسیاتی اصول و قواعد سے ماخوذ ہیں،

امام غزالی اور یقین اور اذعان کی صورتیں

امام غزالی نے الجام العوام میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے[1] کہ واقعات کا اذعان اور یقین ہمارے اندر کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ "عام مسلمانوں کو علم کلام کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو خدا نے اپنی توحید و صفات وغیرہ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اور یہ باتیں بدیہی نہیں کہ ان کے لیے دلائل کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح ہم کو پیغمبر کی تصدیق کی ضرورت ہے، اور یہ تصدیق مسئلہ معجزات پر غور و فکر کیے اور معجزہ کی حقیقت اور شرائط کے جانے بغیر ممکن ہی نہیں، اس بنا پر علم کلام کی اشد ضرورت ہے، تو امام صاحب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ "عام مخلوق کو صرف

[1] الجام العوام عن علم الکلام ص ۳۹-۴۱ مصر

ان چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے، اور ایمان اس یقین جازم کا نام ہے، جس میں تردد اور شک نہ ہو، اور اس میں خطا اور غلطی کا خیال اس کو نہ ہو، اس یقین جازم کے چھ درجے ہیں، جو چھ مختلف طریقوں سے حاصل ہوتے ہیں:"

۱۔ پہلا درجہ اس یقین کا ہے، جو ایسے دلائل سے حاصل ہو، جن میں برہان کے تمام منطقیانہ شرائط ایک ایک کر کے پائے جائیں، اور ان دلائل کے مقدمات کا ایک ایک حرف اچھی طرح جانچ لیا گیا ہو، یہاں تک کہ کسی میں شک وشبہ اور غلطی والتباس کا احتمال نہ رہا ہو، اس اصول کے مطابق تو بہت کم لوگ ایسے ہو سکتے ہیں، جن کو یقین کا یہ مرتبہ نصیب ہو سکے بلکہ ہر زمانہ میں ایک دو آدمی سے زیادہ اس معیار پر پورے نہیں اتر سکیں گے اگر نجات صرف اسی یقین پر منحصر ہو، تو نجات پانے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہو گی، بلکہ انسانوں کے لیے دنیا کے واقعات پر یقین کرنے کی بہت کم گنجایش نکل سکے گی، اور شاید ریاضیات کے علاوہ کہیں اور اس صورت یقین کا پیدا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے،

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان **مسلمات** سے یقین حاصل ہو جن کو عام طور سے لوگ مانتے ہیں، اور ارباب عقل کے حلقوں میں وہ مقبول ومشہور ہیں، جن میں شک کا اظہار کرنا لوگ معیوب سمجھتے ہیں، اور نفوس انسانی ان کے انکار سے ابا کرتے ہیں؛ ان مقدمات سے استدلال بعض لوگوں میں ایسا یقین جازم پیدا کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا تزلزل راہ نہیں پا سکتا،

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ان **خطابیات** کے ذریعہ سے یقین پیدا کیا جائے،

جن کو لوگ عام بول چال، اور عملی کاروبار میں استعمال کیا کرتے ہیں اور عادۃً ان کو صحیح سمجھتے ہیں، اگر طبعِ انسانی میں، خاص طور سے اس مسئلہ کی طرف غیر معمولی انکار یا شدید تعصب نہ ہو اور سامع میں تشکیک، مناظرہ اور خواہ مخواہ کرید اور حجت کی عادت نہ ہو، اور اس کی طرف فطرتِ صالحہ سادہ اور صاف ہو، تو اس طریقہ سے اکثر افرادِ انسانی کو یقین کی دولت ہاتھ آسکتی ہے، اور اسی لیے قرآن مجید نے اسی طرزِ استدلال سے اکثر کام لیا ہے،

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ جس شخص کی دیانت اور ایمانداری پر یقین ہو اور اس پر کامل اعتقاد ہو، بکثرت لوگ اس کے مداح ہوں، یا تم خود اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کی ہر بات کو صحیح باور کرتے ہو، تو اس کا کہنا تمہارے اندر یقین پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے اپنے بزرگوں اور استادوں اور مرشدوں کے بیان کا لوگ حرف بحرف یقین کر لیتے ہیں، ایک بڑا شخص کسی کی موت کی خبر دیتا ہے تو ہر شخص اس کو باور کر لیتا ہے، اسی طرح اگر کسی شخص کو کسی کی سچائی یا پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کا یقین ہو جائے تو وہ بلا پس و پیش اس کی ہر بات کو صحیح تسلیم کر لے گا، چنانچہ حضرت صدیقؓ (یا اور اکابر صحابہؓ) کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو حسنِ اعتقاد تھا وہ اسی قسم کا تھا، اس لیے آپ جو کچھ فرماتے تھے اُن کو اس کے باور کرنے میں کسی دلیل و برہان کی حاجت نہ تھی،

۵۔ حصولِ یقین کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ روایت کی صورت حال کی ایسے دوسرے قرائن سے تصدیق ہو، جن سے گو ایک مناظرہ پسند اور حجت طلب شخص کی تشفی نہ ہو، مگر عام اشخاص کی ان سے تسلی ہو جاتی ہے، مثلاً اگر شہر میں یہ عام خبر پھیلی ہوئی تھی کہ امیر شہر بیمار ہے،

اسی اثنا میں قلعہ سے گریہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں، اور ایک شاہی غلام نے آکر روایت کی کہ امیر نے وفات پائی تو اس روایت کے تسلیم کر لینے میں عام لوگوں کو کوئی جائے انکار نہیں رہتی، گو اس کی صحت کی راہ میں آپ بیسیوں عقلی احتمالات پیدا کرتے رہیں، یہی سبب ہے کہ کتنے اعرابی تھے جنھوں نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا، یا آپ کی دل آویز اور پر اثر باتیں سنیں، یا آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو مشاہدہ کیا، اور بے دلیل و برہان آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے (کیونکہ انھوں نے پہلے آپ کی نبوت کا چرچا تو سنا تھا لیکن اس دعویٰ کی صداقت نے ان کے دل میں پوری طرح گھر نہیں کیا تھا، مگر جب اتفاق سے آپ کے دیدار کا ان کو موقع ملا تو قرائنِ حال اور آثار قیافہ کے ذریعہ سے نیک و بد اور اچھے برے کی تمیز کا جو ایک خاص جوہر انسان میں ودیعت ہے اس نے فیصلہ کر دیا کہ یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط)

۶۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ جو روایت بیان کی جائے، اگر وہ سامع کے مزاج، اخلاق، اور خواہش کے مطابق اور مناسب ہو تو اس کے صحیح تسلیم کر لینے میں اُس کو کبھی پس و پیش نہ ہوگا، اس حصول یقین میں نہ تو حسن اعتقاد کی ضرورت ہے، اور نہ قرائن و آثار کی تائید کی، یہ فطری اور طبعی مناسبت خود حصول یقین کے لیے کافی ہے، (یہی سبب ہے کہ سابقینِ اسلام میں وہی صحابہ داخل ہیں جو فطرۃً نیک اور طبعاً راستی پسند اور جویائے حق تھے)

ان ہی مختلف طریقوں سے لوگ یقین اور اذعان کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرتے ہیں، اور یہی طریقے غیبیات اور معجزات پر بھی یقین کرنے کے ہیں،

معجزہ اور سحر کا فرق | اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب غریب امور صادر ہوتے ہیں، سحر طلسم، نیرنگ، شعبدہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جا سکتی ہیں، سحر و طلسم کے الفاظ گو اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنی مسمرازم اور ہپنوٹزم کے سمجھ لیے جائیں، ایسی صورت میں ایک پیغمبر اور ساحر و شعبدہ باز اور مسمرائزر کے درمیان کیا فرق ہوگا؟ یہ سوال ہے جس پر علم کلام میں بڑی بڑی بحثیں ہیں، معتزلہ اور ارباب ظواہر میں علامہ ابن حزم کا یہ دعویٰ ہے کہ معجزہ کے علاوہ سحر و طلسم و شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریب نظر ہیں، لیکن معجزہ سے قلب حقیقت اور تبدیل خاصیت ہو جاتی ہے، اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے جو عظیم الشان عجائب سرزد ہوتے ہیں، مثلاً سمندر کا خشک ہونا، چاند کا شق ہو جانا وغیرہ، یہ چیزیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہو سکتیں، حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے، اور ساحر شر میں،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان وجوہات سے اشکال کی اصلی گرہ نہیں کھلتی، ایک شخص اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بظاہر ایک خارقِ عادت کرشمہ پیش کرتا ہے، اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکا اور نظر بندی ہے، یا رمز الٰہی ہے، یا معمولی کام ہے، یا عظیم الشان کارنامہ ہے، نہایت مشکل ہے، کیونکہ ان اشیا کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز نمایاں نہیں ہو سکتا، نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف ہوئی یا شر میں، یا یہ کہ ضروری ہے کہ یہ خوارق عادت محلِ خیر میں صرف ہوں، یا محلِ شر میں، اس کے علاوہ کوئی تیسری نہیں ہو سکتی، بہت کچھ قابلِ بحث ہے،

ایک مسمرزیر اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے، اور اس سے غریبوں کا علاج کرتا ہے، یہ تو خیر اور نیکی کی چیز ہے، تو کیا آپ اس کو معجزہ کہدیں گے،

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائبات امور میں دو عظیم الشان فرق ہیں، ایک یہ کہ معجزہ براہ راست خدا کا فعل ہوتا ہے، اور دوسرے عجائب امور اسباب طبعی ونفسی کے نتائج ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ معجزہ سے مقصود اعداے دعوت الٰہی کی ہلاکت یا مبلغ رسالت کی تائید اور مومنین صادقین کی حمایت اور برکت ہوتی ہے، محض کھیل تماشہ، شعبدہ بازی اور بازی گری اسکا مقصد نہیں ہوتی، اور آپ سب سے آخری شے جو ان دونوں کے درمیان حدفاصل بنجاتی ہو، یہ ہے کہ ساحر و بازی گر و شعبدہ باز صرف تماشہ، کرتب اور عجائبات دکھاتے ہیں، اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی، ارادوں کی بے گناہی، دلوں کی طہارت اور صفائی شریعت الٰہی کی تبلیغ، قلوب کے تزکیہ اور سیہ کاریوں کے قلع وقمع کے نہ وہ مدعی ہوتے ہیں، اور نہ یہ خواص اور کارنامے ان سے ظاہر ہوتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کی معصوم زندگی، پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص وکیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں، قدم قدم پر خدا ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے، ان کی صدائے حق جماعتوں، قوموں اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے، ان کی سچائی، راستی، اور صداقت پر انکے سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے، وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار اور صدق وصفا کی مہر لگاتے ہیں، ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے، مگر کافر کو مومن، بدکار کو عفیف، بیباک کو متقی، بخیل کو فیاض، سخت کو نرم،

اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا، وہ لوہے کو زرِ خالص کی صورت میں بدل سکتا ہے، لیکن کسی زنگ آلود دل کو جلا نہیں دے سکتا،

یہ ظاہری اشتباہ اور التباس صرف نبی اور ساحر و متنبی (جھوٹے پیغمبر) ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ اور ملی جلی ہوئی ہے، صبر اور بے حمیتی توکل اور کاہلی، بخل اور کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف، حق گوئی، اور گستاخی، شجاعت اور تہور، ان کے ڈانڈے باہم اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ انسان کی قوت ممیزہ کبھی کبھی دھوکا کھا جاتی ہے، لیکن اہلِ نظر ان دونوں حقیقتوں کے ظاہری تشابہ سے فریب میں نہیں آتے، ان دونوں کی ظاہری شکل و صورت گو ایک ہو، مگر ان دونوں کے خصائص و آثار اس درجہ متفاوت اور متمائز ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے حدود اور فرق و امتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں، جب پیغمبر اپنا معجزہ، اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری حیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لیے گو دونوں ایک ہوں، مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، تو ایک اخلاق کا مجسمہ، پاکیزگی کا فرشتہ، شریعت کا حامل، گنہگاروں کا طبیب اور قلوب کا معالج ہوتا ہے، اور دوسرا محض تماشاگر، یا شعبدہ باز، یا مصنوعی حیلہ گر اور نقال،

ایک عطائی اور طبیب حاذق، ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جنرل، ایک حرف شناس اور ماہر علوم، ایک مکار اور زاہد، ایک مصنوعی اور حقیقی صوفی کے درمیان شاید کبھی عوام فرق نہ کر سکیں، مگر جب ان دونوں کے آثار و خصائص اور علامات و قرائن،

باہم ملائے جائیں تو ظلمت و نور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہو جاتا ہے،

مولانائے روم نے اس فرقِ مراتب کو مثنوی میں نہایت عمدہ تشبیہات کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں | فرقِ شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

اس طرح کی لاکھوں ہم شکل چیزیں ہیں | لیکن ان میں کوسوں کا فاصلہ ہے،

ہر دو صورت گر بہم ماند رواست | آبِ تلخ و آبِ شیریں را صفاست

دونوں کی صورتیں اگر باہم مشابہ ہوں تو کچھ ہرج نہیں، میٹھا اور تلخ پانی دونوں کا رنگ ایک ہی طرح صاف ہوتا ہے

ہر دو یک گل خوردہ زنبور و نحل | لیک شد زاں نیش وزیں دیگر عسل

بھڑ اور شہد کی مکھی ایک ہی پھول چوستی ہیں | لیکن اس سے زہر اور اس سے شہد پیدا ہوتا ہے،

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب | زیں یکے سرگیں شد وزاں مشکِ ناب

دونوں قسم کے ہرن ایک ہی گھاس کھاتے اور ایک ہی پانی پیتے ہیں، مگر اس سے مینگنی اور اس سے مشک پیدا ہوتا ہے

ہر دو نے خوردند از یک آب خور | آں یکے خالی و آں پُر از شکر

دونوں قسم کی نے، ایک ہی نالی سے پرورش پاتی ہیں | لیکن ایک نے سے خالی اور دوسرے سے شکر پیدا ہوتی ہے

ایں خورد زاید، ہمہ بخل و حسد | و آں خورد آید ہمہ نور احد

ایک آدمی غذا کھاتا ہے تو اس سے بخل و حسد پیدا ہوتا ہے، اور دوسرا وہی غذا کھاتا ہے تو اس سے خدائی نور پیدا ہوتا ہے

ایں زمیں پاک ست و آں شورست و بد | ایں فرشتہ پاک و آں دیواست و دد

یہ زمین سیر حاصل ہے اور وہ بری اور بنجر ہے | یہ مقدس فرشتہ ہے اور وہ شیطان اور جانور

بحرِ تلخ و بحرِ شیریں درمیاں　　　　درمیان شان برزخ لایبغیان"

شیریں اور تلخ سمندر ملے ہوئے ہیں، مگر ان کے درمیان ایک فاصل ہے جس سے تجاوز نہیں کر سکتے

زرِ قلب و زرِ نیکو در عیار　　　　بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار

کھوٹے اور کھرے سونے کی تمیز　　　　کسوٹی کے بغیر نہیں ہو سکتی

صالح و طالح بصورت مشتبہ　　　　دیدہ بکشائی کہ گردی منتبہ

نیک اور بدکار کی صورتیں ملتی جلتی ہیں　　　　آنکھیں کھولو تو تمیز ہو سکے گی

بحر را نیمیش شیریں چو شکر　　　　طعم شیریں، رنگ روشن چوں قمر

دریا کا آدھا حصہ شکر کی طرح شیریں ہے　　　　مزا میٹھا اور رنگ چاند کی طرح سپید ہے

نیم دیگر تلخ ہمچو زہرِ مار　　　　طعم تلخ و رنگِ مظلم قیر وار

دوسرا نصف حصہ سانپ کے زہر کی طرح ہے　　　　مزا کڑوا، اور رنگ تارکول کی طرح سیاہ ہے

اے بسا شیریں کہ چوں شکر بود　　　　لیک زہر اندر شکر مضمر بود

بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو شکر کی طرح میٹھی ہیں　　　　لیکن اس کے باطن میں زہر چھپا ہے

جز کہ صاحب ذوق نشناسد بیاب　　　　او شناسد آبِ خوش از شورِ آب

صاحبِ ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے　　　　وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھاری

جز کہ صاحب ذوق بشناسد طعوم　　　　شہد را ناخوردہ کے دانی ز موم

صاحبِ ذوق کے سوا مزے کی تمیز اور کون کر سکتا ہے، جب تک شہد کو نہ کھاؤ موم اور شہد میں کیونکر تمیز کر سکتے ہو

سحر را با معجزہ کردہ قیاس　　　　ہر دو را بر مکر پندارد اساس

اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا	اور سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے
زرِ قلب و زرِ نیکو در عیار	بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار
تم کھوٹے اور کھرے سونے کو	کسوٹی کے بغیر تمیز نہیں کر سکتے
ہر کرا در جان خدا بنہد محک	ہر یقین را باز داند او ز شک
خدا نے جس کی روح میں کسوٹی رکھی ہو	وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے
چوں شود از رنج و علت دل سلیم	طعمِ صدق و کذب را باشد علیم
جب آدمی کے دل میں بیماری نہیں ہوتی	تو وہ صدق اور کذب کے مزے کو پہچانتا ہے

اب صرف یہ شبہہ رہ جاتا ہے کہ جو قوت حیرت زا خوارق کی قدرت رکھتی ہے اسکا رخ بھی نہایت آسانی کے ساتھ بدلا جا سکتا ہے، یعنی ساحر بے تکلف اپنی ساحرانہ قوت کو دنیا کے تزکیۂ اخلاق و اصلاحِ عالم میں صرف کر سکتا ہے، اور اس سے کوئی محال عقلی لازم نہیں آتا، لیکن امکان عقلی اور امکانِ واقعی دو مختلف چیزیں ہیں، یہ عقلاً ممکن ہے کہ ہر شخص بادشاہ ہو سکتا ہے، عالمِ عصر ہو سکتا ہے، کشور کشا ہو سکتا ہے، مگر واقعاً اور عملاً یہ قدرت ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی،

اس لیے ساحر محض ایک تماشاگر ہوتا ہے، اس میں یہ قدرت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس قوت سے تزکیۂ نفوس، تطہیرِ اخلاق، اور اصلاحِ عالم کا کام لے سکے، یہی وجہ ہے کہ آجتک کسی ساحر اور شعبدہ گر نے اصلاحِ عالم کا فرض ادا نہیں کیا، لیکن پیغمبر اپنے معجزانہ کارناموں سے دنیا کو الٹ دیتا ہے، بدی کے کانٹوں کو ہٹا کر نیکی کے گل و ریحان سے

اس خاکدانِ عالم کو سجا دیتا ہے،

معجزہ دلیل نبوت ہوسکتا ہے یا نہیں

اسی تقریر سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں؟
اشاعرہ کا جواب اثبات میں اور معتزلہ کا نفی میں ہے، اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیر کن بحث ابن رشد نے کشف الادلہ میں کی ہے، اور ثابت کیا ہے، کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہوسکتا، کیونکہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے، اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی، مثلاً جب ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے قوم کے عقائد، اعمال اور اخلاق کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوا ہے، لیکن جب اس سے اس دعویٰ کی تصدیق کے لیے دلیل طلب کی جاتی ہے تو وہ خشک چشمے کو پانی سے لبریز کرتا ہے، چاند کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے، لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، یہ تمام واقعات اگرچہ نہایت عجیب غریب ہیں، لیکن ان دلائل کو دعویٰ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟

فرض کیجئے کہ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا ماہر ہے، اور اس کے ثبوت میں انسان کو جانور اور جانور کو انسان بنا دیتا ہے، تو اس واقعہ سے اس کے فلسفہ اور ریاضی کا کمال کیونکر ظاہر ہوسکتا ہے؟ اشاعرہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے، اور جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے، اور اسی کمال کے اظہار کے لیے معجزہ طلب کیا جاتا ہے، اور انبیاءؑ کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے

ہیں، تاہم اُن کو صرف دو نوع میں شمار کیا جاتا ہے، اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات،
اور ان دونوں کو اجزاے نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے، اخبار بالغیب سے اس کے
علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے، اور تصرف فی الکائنات سے اس کی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے،
ایک اور مناسبت یہ ہے کہ معجزہ خرقِ عادت کا نام ہے، اس میں کوئی نزاع نہیں کہ
اشیا، اور حقائق کے خصائص اور علل، خدا کے امر و حکم سے ہیں، اب جو شخص ان خصائص
و علل کو اپنے معجزہ سے توڑ دیتا ہے، وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جس برتر ذات نے
ان اسباب و علل کو بنایا ہے، وہی اس کو توڑ سکتی ہے، اور یہ شکست و خرق چونکہ اس کے
واسطہ سے ظاہر ہوا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسی کا فرستادہ ہے، اس کی مثال
یہ ہے کہ ایک بادشاہ اپنی رعایا کے پاس قاصد بھیجتا ہے، رعایا پوچھتی ہے کہ اس بات کا کیا
ثبوت ہے کہ تم بادشاہی قاصد ہو؟ وہ اس کے جواب میں بادشاہ کی مہر اور انگوٹھی پیش کرتا ہے،
اگرچہ ظاہر ہے کہ قاصد کے دعواے پیامبری کو مہر اور انگوٹھی سے براہ راست کوئی مناسبت
نہیں لیکن یہ مناسبت یوں ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ مہر اور انگوٹھی بادشاہ ہی کی نشانی ہے،
جو ایک معمولی قاصد کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی طرف
سے نشانی دے کر بھیجا گیا ہے،

علم کلام کی کتابوں میں ایک عام مثال یہ دی جاتی ہے کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ شاہی
دربار اور جلوس کے رسوم و آداب خاص ہوتے ہیں، بادشاہ دربار میں معمولی فرش پر نہیں
بلکہ طلائی و نقرئی تخت پر بیٹھتا ہے، جلوس میں وہ پاپیادہ نہیں، بلکہ سوار ہو کر نکلتا ہے،

ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قاصد بن کر مجمع عام میں آتا ہے، یہ مجمع اس کو شاہی پیامبر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، قاصد بادشاہ سے کہتا ہے کہ اے بادشاہ! اگر میں حقیقۃً تیرا فرستادہ ہوں تو رسم و عادت کے خلاف تو فرش پر جلوس فرما اور پیادہ پا نکل، بادشاہ اسکے مطابق دربار فرش پر جلوس کرتا ہے، اور پیادہ پا چلتا ہے، بادشاہ کا یہ عمل یقیناً اس بات کی تصدیق ہوگی کہ وہ شاہی قاصد ہے اسی طرح دنیا کے اسباب و علل، اس دنیا میں خدا کی بادشاہی کے رسوم و عادات ہیں، پیغمبر اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے، کفار اسکے قاصد الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتا ہے، اے خدا اگر میں حقیقۃً تیرا فرستادہ ہوں تو اپنے رسوم و عادات کے خلاف معجزہ اور خرقِ عادت دکھا، وہ دکھاتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے،

لیکن معجزہ اگر دلیل نبوت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس قسم کا استدلال ہے، ظاہر ہے کہ اس کو برہان یقینی نہیں کہا جا سکتا، تاہم دلیل کا انحصار صرف برہانیات میں نہیں ہے، بلکہ اس کی اور بھی متعدد قسمیں ہیں، اور معجزہ ان مقدمات میں داخل ہو سکتا ہے،

ابن رشد نے کشف الادلہ میں معجزہ کو **خطابیات** میں داخل کیا ہے، یعنی معجزہ اگرچہ نبوت پر بالذات یقینی طور پر دلالت نہیں کرتا، تاہم جب کوئی پیغمبر سلسلۂ کائنات میں عجیب و غریب تصرف کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہر شخص اس کے کمالِ روحانی کا اعتراف کرتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان تصرفات کی قدرت رکھتا ہے، وہ ضرور اپنے دعوی میں صادق ہوگا، ان دونوں نتائج یعنی تصرف فی الکائنات اور اصلاحِ روحانی میں اگرچہ باہم کوئی تلازم نہیں، تاہم عوام کی دلفریبی کے لیے یہ کافی ہے،

لیکن اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ جدل ہے جس میں مسلماتِ خصم سے استدلال کیا جاتا ہے، اور تاریخی حیثیت سے معجزات کو قیاسِ جدل کہنا زیادہ موزوں ہوگا، زمانۂ قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جو لوگ پیغمبر ہوتے ہیں، ان میں کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرور ہوتی ہے، اور وہی پیغمبر کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے، اس بنا پر جب کوئی پیغمبر کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس موروثی اور مسلّمہ عقیدہ کی بنا پر تمام لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے ہیں، اور پیغمبر کو مجبوراً دکھانا پڑتا ہے، یہ معجزہ اگرچہ ایک فلسفی کے لیے دلیل و حجت نہیں ہو سکتا، تاہم جو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معجزہ دلیلِ نبوت ہے، اور ان ہی کے طلب و اصرار سے اس معجزہ کا ظہور ہوا ہے، اُن کو اس کے ذریعہ سے ساکت کیا جا سکتا ہے، اور وہ اُن کے لیے دلیل ہو سکتا ہے؛

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان اس بحث میں غلط مبحث ہو گیا ہے، اشاعرہ کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیلِ نبوت ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے، اور معتزلہ کا اعتراض اسی وقت درست ہو سکتا ہے، جب اشاعرہ اس کو منطقی دلیل کہیں، دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورہ میں نہیں بلکہ عام اور لفظی معنی (نشان) میں استعمال ہوا ہے، اس بنا پر جب معجزہ سرے سے دلیلِ منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ انواعِ دلیل کی کس قسم میں داخل ہے، بے سود ہے، چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوت پر دلالتِ **عقلی** نہیں، بلکہ **عادی** ہے، شرح مواقف بحثِ معجزات میں ہے:-

وھذہ الدلالۃ لیست دلالۃ عقلیۃ	معجزہ کی دلالت نبوت پر محض دلالتِ عقلی نہیں ہے، جیسے

محضة کد لالة الفعل علی وجود الفاعل	فعل کی دلالت وجود فاعل پر، یا فعل کے استحکام
ودلالة احکامه واتقانه علی کونه عالما	ونظم کی دلالت، فاعل کے علم پر، عقلی ہی، کیونکہ دلائل
بما صدر عنه فان الادلة العقلیة ترتبط	عقلی اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور
نفسه بمدلولاتها ولا یجوز تقدیرها غیر دالة علیها	یہ فرض ناممکن ہی کہ وہ اپنے مدلول پر دال نہ ہوں اور
ولیست المعجزة کذالک .... بل هی	معجزہ کی دلالت کی صورت ایسی نہیں ہی، بلکہ معجزہ کی
دلالة عادیة کما اشار الیه	دلالت دلالت عادیہ ہے، جیسا کہ صاحب مواقف
بقوله وهی عندنا ای الاشاعرة	نے اپنے ان لفظوں میں کہا ہے کہ یہ دلالت ہمارے
اجراء الله عادته بخلق العلم	(اشاعرہ کے) نزدیک اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ
بالصدق عقیبة، ای عقیب	کی عادت یہ ہے کہ جب معجزہ صادر ہوتا ہی تو صاحب معجزہ
ظهور المعجزات،	کی سچائی کا علم وہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے،

آج کل کے محاورۂ علمی میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ "معجزہ کی دلالت عقلی نہیں، بلکہ عادی ہے" یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں، بلکہ نفسیاتی (سائیکالوجیکل) دلیل ہی، عادت انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو نفوس اسکی عظمت و کبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں، جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلند تر سطح میں آکر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اور خوارق عادت اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کے دعوی کو تسلیم کر لیتے ہیں،

آج گو نبوت نہیں، مگر **ولایت** ہے، آج بھی جس شخص کی نسبت باخدا اور ولی کا ل

ہونے کا خیال لوگوں میں ہوتا ہے تو فوراً یہ سوال ہوتا ہے کہ اُن سے کچھ کرامتیں بھی صادر ہوئی ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ملا، اور خود ذاتی مشاہدہ بھی ہوا تو اس شخص کی نسبت حسنِ اعتقاد بڑھ جاتا ہے، یہ عام تقاضائے انسانی ہے، اس میں مومن و کافر، عقلمند و بیوقوف اور زنگی و فرنگی کی کوئی تخصیص نہیں،

لیکن جو طبیعتیں فطرۃً اثر پذیر نہیں، بلکہ معاند متعصب اور کور باطن ہیں، اُن کے لیے یہ خوارق و معجزات قطعاً بے سود ہوتے ہیں، کیونکہ اُن کا عناد، تعصب اور کور باطنی حسن ظن کے بجائے ہمیشہ سوء ظن کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور وہ بڑے سے بڑے معجزہ کو بھی دیکھ کر یہی کہدیتے ہیں کہ یہ سحر و جادو، اور طلسم و نیرنگ ہے، اس لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ مدعی نبوت کے اخلاق، خلوص، پاکیزگی و طہارت کا امتحان کیا جائے، جس میں یہ باتیں ثابت ہو جائیں گی، عادۃً ناممکن ہے کہ وہ کاذب اور جھوٹا ہو، امام غزالی نے منقذ میں، امام رازی نے مطالب عالیہ میں، اور عارف روم نے مثنوی میں نہایت تفصیل سے اس بحث کو لکھا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ نبوت کی اصلی دلیل معجزہ نہیں، بلکہ تعلیم و ارشاد، اور قوتِ علم و عمل کا کمال ہے،

امام غزالی کی تقریر

نبوت کے کچھ آثار و خواص ہیں، اگر کسی شخص کی نسبت یہ شبہہ ہو کہ یہ پیغمبر ہے یا نہیں، تو اس کا علم صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہو سکتا ہے، یہ معرفت یا تو ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہو، جیسی صحابہ کو تھی، یا خبر متواتر سے اور سن کر ہو، جیسی اب عام لوگوں کی ہے، نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی جس میں ہوتی ہو وہی آمادہ

تصدیق ہوتا ہے مثلاً اگر تم کو طب اور فقہ سے کچھ واقفیت ہے، اور ان کا ذوق رکھتے ہو، تو جو شخص فقیہ یا طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، تم اُس کے احوال کو دیکھ کر اور اسکی باتیں سنکر فوراً یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ یہ طبیب یا فقیہ ہے یا نہیں، اور اسی طرح تم امام شافعی کی فقاہت اور جالینوس کی طبابت کی تصدیق تقلید سے نہیں، بلکہ اپنی ذاتی تحقیق سے کر سکتے ہو، گو آج امام شافعی اور جالینوس کا وجود نہیں، مگر ان کے سوانح اور تصنیفات پڑھ کر اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ امام شافعی فقیہ کامل اور جالینوس طبیب حاذق تھے، یا نہیں، اسی طرح گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان نہیں، مگر آپ کی سیرتِ مبارکہ، آپ کی شریعت، آپ کی تعلیمات، آپ کے ارشادات موجود ہیں، جن سے آپ کی نبوت کی تصدیق ہر شخص کر سکتا ہے، اسی معیار سے کسی مدعیِ نبوت کے دعوی پر یقین کرنا چاہیے۔ لاٹھی کے سانپ اور قمر کے شق ہونے سے نہیں، کیونکہ اگر ان خوارق پر نظر ڈالو اور دوسرے بیشمار قرائن اور شہادتوں کو ان کے ساتھ نہ ملاؤ تو ممکن ہے کہ یہ خطرہ پیدا ہو کہ یہ جادوگری اور نظربندی ہے[1]،

امام رازی کی تقریر | امام رازی نے مطالب عالیہ میں نبوت اور متعلقاتِ نبوت کی بحث سب سے زیادہ استیعاب سے لکھی ہے، ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ نبوت تسلیم کرتے ہیں، ان میں دو جماعتیں ہیں، ایک کا مذہب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل معجزہ ہے۔ یہ جمہور اہل مذاہب کا مسلک ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو خود

[1] المنقذ من الضلال ص ۳۵ و ۳۶ مصر

غور کرنا چاہیے کہ صداقت و راستی کیا ہے، اس کے بعد ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں، جو نبوت کے دعویٰ کے ساتھ لوگوں کو دین حق کی دعوت دیتا ہے، اس کی دعوت مؤثر ہوتی ہے، اور وہ لوگوں کو باطل پرستی سے ہٹا کر حق پرستی کی طرف لارہی ہے، تو ہم یقین کرلیں گے کہ یہ سچا پیغمبر ہے، یہ مذہب عقل سے قریب تر ہے اور اس راہ میں شکوک و شبہات کم ہیں،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانیت کا کمال، قوت علمی و عملی کی تصحیح تکمیل اور تزکیہ ہے، اس قوت کے لحاظ سے انسان کے تین طبقے ہیں، ایک وہ جو اس میں ناقص ہے، یا عام انسان ہیں، دوسرا وہ جو خود کامل ہے، مگر دوسروں کو کامل نہیں بنا سکتا، یہ خواص اور صلحا کا درجہ ہے، تیسرا وہ جو خود کامل ہے، اور دوسروں کو بھی کامل کردیتا ہے، یہ انبیاءؑ ہیں، اس کمال و نقص کے ہزاروں متفاوت درجے اور مرتبے ہیں، اور ان ہی کے لحاظ سے اُن کی قوت و مرتبہ کا اندازہ ہوگا، ان کی قوت علمی کے سامنے تمام مقدمات بدیہی ہوتے ہیں، اور معارف الٰہی پر ان کو عبور ہوتا ہے، اور ان کی قوتِ عملی اس عالمِ جسمانی میں تصرفات کرتی ہے، اور یہی معجزات کا مقصد ہے، اس قوتِ علمی و عملی کے کمال کے ساتھ یہ نظر آتا ہے کہ وہ ان دونوں کو جو ان لوگوں میں پست اور ناقص ہیں، اپنے فیض صحبت اور فیض تعلیم سے کامل کردیتے ہیں، اور امراض قلبی کا وہ علاج کرتے ہیں، تو یہی ان کی نبوت کی دلیل ہے،

امام رازی نے اس تفصیل کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ اثباتِ نبوت کا یہی طریقہ قرآن مجید نے اختیار کیا ہے، اور چند سورتوں کی تفسیر لکھ کر دکھایا ہے کہ ان میں نبوت کے

یہی آثار و خصائص بیان ہوئے ہیں،[1]

مولانا روم کے حقایق | مولانا روم نے اس بحث کو عمدہ تشبیہات اور تمثیلات سے اس درجہ قریب الفہم بنا دیا ہے کہ تمام شکوک و شبہات دفع ہو جاتے ہیں، اس سے پہلے مولانا کے وہ اشعار لکھے جا چکے ہیں، جن میں یہ دکھایا ہے کہ نبوت کی تصدیق کے لیے سب سے پہلی چیز حسنِ ذوق ہے، آبِ شیریں اور آبِ شور، صورت و شکل اور رنگ و بو دونوں میں ایک ہوتے ہیں، مگر صرف صاحبِ ذوق ان دونوں کا فرق محسوس کر سکتا ہے، اسی طرح نبی اور متنبی گو ظاہری شکل و صورت اور دعوائے نبوت میں یکساں نظر آتے ہیں، مگر صاحبِ ذوق ان دونوں کے آثار و خصائص سے فوراً تمیز کر لیتا ہے،

جز کہ صاحب ذوق بشناسد بیاب	غور کرو، صاحبِ ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے،
او شناسا آبِ خوش از شور آب	وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھاری ہے،
جز کہ صاحبِ ذوق بشناسد طعوم	صاحبِ ذوق کے سوا مزے کی تمیز اور کون کر سکتا ہے
شہد را نا خوردہ کے دانی زموم	اگر شہد نہ کھایا ہو تو موم اور شہد میں تمیز کیونکر کر سکتے ہو،
سحر را با معجزہ کردہ قیاس	اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا
ہر دو را بر مکر پندارد اساس	اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے،

[1] مطالب عالیہ کا پیشِ نظر قلمی نسخہ ناقص ہے، یہ فصل راغب پاشا نے اپنے سفینہ میں تمام کمال نقل کی ہے اور مولانا شبلیؒ نے الکلام کے ضمیمہ میں اس کو شائع کر دیا ہے، دیکھو سفینۂ راغب پاشا، مطبوعہ مصر صفحہ ۲۷۷

زرِ قلب و زرِ نیکو در عیار	تم کھوٹے اور کھرے سونے کا فرق
بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار	کسوٹی پر پرکھے بغیر نہیں کر سکتے،
ہر کرا در جاں خدا بنہد محک	خدا نے جس کی روح میں یہ کسوٹی رکھی ہے
ہر یقیں را باز داند او ز شک	وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے،
چوں شود از رنج و علت دل سلیم	جب آدمی کا دل بیماری سے پاک ہو
طعم صدق و کذب را باشد علیم	تو وہ صدق و کذب کے مزہ کو پہچان لیگا،

دوسری چیز طلب ہی، جب تک دل میں کسی چیز کی طلب نہیں ہوتی، اس کی طرف التفات نہیں ہوتا جس کا دل صداقت و راستی کا بھوکا نہیں، وہ غذاے روحانی کا طالب نہیں، اور جب دل میں طلب اور روح میں بیقراری پیدا ہو جاتی ہے اس وقت وہ دلیل و برہان کے لفظی مباحث سے بہت بلند ہو جاتا ہے، کسی کو اگر پیاس ہو، اور وہ تم سے پانی طلب کرے، اور تم پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کرو کہ یہ پانی ہے تو کیا وہ تمھارے اس دعویٰ پر دلیل مانگے گا؟ کہ پہلے یہ ثابت کرو کہ یہ پانی ہے، نہیں بلکہ وہ بلا دلیل نہایت شوق سے اپنا ہاتھ بڑھائے گا، اور پانی پینے لگے گا۔

تشنہ را چوں بگوئی، رو، شتاب	جب کسی پیاسے کو کہو کہ جلد جاؤ
در قدح آب است، بستاں زود آب	دیکھو وہ پیالہ میں پانی ہے
ہیچ گوید تشنہ کیں دعویٰ است، رد	کیا کوئی پیاسا اسوقت یہ کہتا ہے کہ یہ فقط تمھارا
از برم، اے مدعی! مہجور شو	دعویٰ ہی ہے، چلو ہٹو۔

یا گواہ و حجتی بنما کہ این	یا کیا وہ یہ کہتا ہے کہ پہلے اس دعویٰ کی دلیل
جنس آب است و ازان ماء معین	لاؤ، یہ پانی ہے،
یا بطفلِ شیر، مادر بانگ زد	یا جب شیر خوار بچہ کو اسکی ماں بلا کر کہتی ہے
کہ بیا من مادرم ہاں اے ولد	کہ اے بچہ! میں تیری ماں ہوں،
طفل گوید مادرا حجت بیار	تو بچہ یہ کہتا ہو کہ اپنی ماں ہونے پر دلیل پیش کرو
تا کہ با شیرت بہ گیرم من قرار	تب میں تمھارا دودھ پیوں گا،
در دلِ ہر امتی کز حق مزہ است	جس کے دل میں حق کا مزہ ہوتا ہے
روئے و آواز پیمبر معجزہ است	اس کیلیے خود پیغمبر کا چہرہ اور پیغمبر کی آواز معجزہ ہوتی ہے
چوں پیمبر از بروں بانگے زند	جب پیغمبر باہر سے آواز بلند کرتا ہے تو
جانِ امت در دروں سجدہ کند	امت کی روح اندر ہی اندر سجدہ کرتی ہے
زانکہ جنس بانگ او اندر جہاں	سبب یہ ہوتا ہو کہ دنیا میں اسکی آواز کی سی کوئی
از کسے نشنیدہ باشد گوشِ جاں	آواز روح کے کانوں نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی،

تیسری چیز اتحاد جنسیت ہے، معجزات کا مقصد عموماً معارض کو لاجواب اور خاموش کرنا ہوتا ہے، لاجواب و خاموش کر کے تم خصم کو زیر کر سکتے ہو، مگر اس کے دل میں تشفی نہیں پیدا کر سکتے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچائی اور راستی کا عنصر ہے، وہ خود اپنی ہمجنس شے کے طلبگار اور خریدار ہوتے ہیں،

موجب ایماں نباشد معجزات	درحقیقت معجزات ایمان کا باعث نہیں ہوتے،

بوے جنسیت کند جذبِ صفات	بلکہ اتحاد جنسیت کی بو اسکے صفات کو اپنی طرف کھینچتی ہے،
معجزات از بہر قہرِ دشمن است	معجزات تو مخالف کو دبانے کے لیے ہوتے ہیں،
بوے جنسیت سوے دل بردن است	اور اتحاد جنسیت کی بو دل کو متاثر کرنے کیلیے ہے،
قہر گردد دشمن اما دوست نے	دیا کر تم دشمن کو زیر کر سکتے ہو مگر دوست نہیں بنا سکتے،
دوست کے گردد بہ بستہ گردنے	جسکو زبردستی گردن باندھ کر زیر کرو وہ دوست کیونکر ہو سکتا ہے،

معجزات کا صدور اکثر اس طرح ہوتا ہے کہ معاندین یہ سمجھ کر کہ پیغمبر کاذب ہے، اُس سے کسی خرقِ عادت کا مطالبہ کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ اس کو پیش نہیں کر سکتا، اور اس طریقہ سے لوگوں میں اس کی رسوائی ہوگی، اور اس کے دعویٰ کی تکذیب ہو جائیگی، لیکن اللہ تعالیٰ اس خرقِ عادت کو ظاہر کر دیتا ہے، اور اس سے پیغمبر کی رسوائی اور فضیحت کے بجائے اس کی صداقت اور راست بازی اور عالم آشکارا ہو جاتی ہے، اور اس بنا پر معجزہ اُس کے صدق پر ایک نشانی اور آیت بن جاتی ہے، فرعون نے جادوگروں کو جمع کر کے چاہا کہ حضرت موسیٰؑ کو رسوا کرے، مگر یہی واقعہ حضرت موسیٰؑ کی کامیابی اور فرعون کی ناکامی کا سبب بن گیا، اور سینکڑوں جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر صداے لبیک بلند کر دی، اس بنا پر معاندین کا وجود اعلان نبوت کی بلند آہنگی اور شہرت کے لیے ضروری ہے،

منکران را قصد، اذلالِ ثقات	مخالفوں کا یہ ارادہ کہ طلب معجزہ سے نیکوں کا
ذل شدہ، عزّ و ظہورِ معجزات	لغزشیں دیدیں انکی ذات اور معجزات کے غلبہ و عزت

قصدِ شان زاں کارِ ذلِ ایں بدہ
ان کا ارادہ اس طلب معجزہ سے پیغمبر کی ذلت تھی،

عین ذل، عزِّ رسولاں آمدہ
لیکن یہی ذلیل کا ارادہ پیغمبروں کی عزت کا باعث ہو جاتا ہے،

گر نہ انکار آمدے از ہر بدے
اگر کوئی بدکار پیغمبر کا انکار نہ کرتا،

معجزہ برہان چرا نازل شدے
تو معجزہ برہان بن کر کیوں نازل ہوتا،

خصم منکر تا نہ شد مصداق خواہ
جب تک فریق دوم دعویٰ کا منکر اور خواہانِ تصدیق نہ ہو

کے کند قاضی تقاضائے گواہ
قاضی گواہ و شاہد کب طلب کرتا ہے،

معجزہ ہمچو گواہ آمد، زکی!
اسی طرح اے عقلمند! معجزہ بھی پیغمبر کا گواہ ہے

بہر صدقِ مدعی در پیشگی
جو مدعی کی تصدیق کے لیے سامنے آیا ہے،

طعنہ چوں می آمد از ہر ناشناخت
جب کوئی ناشناس طعنہ کرتا تھا،

معجزہ می داد حق و بنواخت
تو پیغمبر کو معجزہ دے کر نوازش فرماتا تھا

مکرِ آں فرعون سی صد تو شدہ
فرعون موسیٰؑ کے مقابلہ میں سیکڑوں چالیں چلا،

جملہ ذلِ او و قمعِ او شدہ
مگر ان میں سے ہر ایک خود اسی کی ذلت و بیخکنی کا باعث ہوئی،

ساحراں آوردہ حاضر نیک و بد
اس نے اچھے برے ہر قسم کے جادوگر جمع کیے

تا کہ جرحِ معجزہ موسیٰ کند
تاکہ موسیٰؑ کے معجزہ کو باطل کرے،

تا عصا را باطل و رسوا کند
اور عصائے موسیٰ کی قوت کو باطل و رسوا کرے،

اعتبارِ او ز دلہا بر کند
اور لوگوں کے دلوں سے اس کے اعتبار کو کھوئے

عینِ آں مکر آیتِ موسیٰ شدہ
لیکن عین یہی سازش موسیٰ کی صداقت کی نشانی ہو گئی،

اعتبار آں عصا بالا شدہ — اور اس سے اس عصا کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔

معجزہ سے مقصود اگر معاندین کو خاموش اور رسوا کرنے کے علاوہ ان کے دلوں کو متاثر کرنا ہوتا تو اس کے لیے اس کی ضرورت نہ تھی کہ عصا کو سانپ بنایا جائے۔ اور قمر کو دو ٹکڑے کر دیا جائے اور اس کے ذریعہ سے قلوب کو متاثر کیا جائے، ان جمادات و نباتات پر تصرف کر کے قلوب میں تصرف کرنے سے زیادہ صاف اور سیدھا راستہ یہ تھا کہ براہ راست خود دلوں میں تصرف کیا جائے کہ وہ صدائے نبوت کے سننے کے ساتھ لبیک پکار اٹھیں، معاندین کا معجزہ طلب فرقہ جو انبیا سے جمادات و نباتات پر انکے اثرات کا طالب ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے قبولِ ایمان پر آمادگی ظاہر کرتا ہے، خود اُن کی یہ طلب، ان کے ضمیر کی پستی اور قلب کی سیاہی کی دلیل ہے، جن کے آئینۂ دل پاک و صاف ہوتے ہیں، وہ بلا واسطۂ جمادات و نباتات بغیر سے براہ راست خود اس اثر کو قبول کرتے ہیں، اس کے علاوہ معجزہ سے ہر شخص کو ہدایت نہیں ملتی، اس کے لیے بھی استعداد کی ضرورت ہے، دریا کی طراوت اور اُس کے روح افزا ہونے میں شک نہیں، لیکن اس میں خشکی کے پرند زندہ نہیں رہ سکتے،

معجزہ کاں بر جماداتے اثر — یا عصا یا بحر یا شق القمر

معجزہ جو بے جان چیزوں پر اثر و تصرف کرتا ہے، مثلاً عصا کا سانپ ہو جانا، سمندر کا پھٹ جانا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا

گر اثر بر جاں زند بے واسطہ — متصل گردد بہ پنہاں رابطہ

اگر وہ معجزہ براہ راست روح کو متاثر کرے، تو اندر اندر روح سے اس کا رابطہ پیدا ہو،

بر جمادات آں اثر ہا عاریہ است | آں پئے روحِ خوشِ متواریہ است

لیکن غیر ذی روح چیزوں پر اس کا اثر عاریۃً ہے، اور روح کے لیے وہ پوشیدہ ہے۔

تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر | حبذا نان بے ہیولائے خمیر

مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس غیر ذی روح شے کی اثر پذیری کو دیکھکر روحِ انسانی اثر پذیر ہو

بر زند از جانِ کامل معجزات | بر ضمیرِ جانِ طالب چوں حیات

لیکن معجزہ روحِ کامل کو خود بے واسطہ اور براہ راست متاثر کرتا ہے، اور طالب کے لیے زندگی ہوتا ہے

معجزہ بحر است و ناقص مرغِ خاک | مرغِ خاکی رفت در یم، شد ہلاک

معجزہ کی مثال دریا کی ہے، اور ناقص کی خشکی کے پرندہ کی، خشکی کا پرندہ دریا میں جائے گا، تو ڈوب جائے گا۔

مرغِ آبی در وے ایمن از ہلاک | ماہیاں را مرگ بے دریاست خاک

لیکن آبی پرندہ اس میں جائے تو موت سے بے پروا رہے گا، بلکہ مچھلیوں کے لیے تو دریا کے بغیر خشکی موت ہے۔

الغرض ناقصین اور معاندین کے لیے جس طرح صدقِ نبوت کے دوسرے دلائل بے کار ہوتے ہیں، معجزہ کی شہادت بھی بیکار ہوتی ہے، معجزہ طلب فرقہ، شاذ و نادر ہی دولتِ ایمان پاتا ہے، لیکن وہ ہستیاں جو براہ راست پیغمبر کے وجود سے اثر پذیر ہوتی ہیں، ان کو قبولِ اثر کے لیے معجزہ کے واسطہ کی حاجت نہیں، ابو جہل معجزۂ جمادات دیکھ کر بھی کافر ہی رہا، اور ابو بکرؓ معجزۂ دل سے صدیق اکبر ہوئے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ

از ستیزہ خواست بو جہل لعین | معجزات از مصطفےٰ شاہ بہین

ابو جہل نے عناد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کیا۔

معجزہ جست از نبی بوجہل سگ — دید و نفزودش ازاں الا کہ شک

لیکن یہ معجزہ دیکھ کر بھی، شک کے سوا، اس کو یقین نہ پیدا ہوا،

لیک آں صدیق حق معجز نخواست — گفت ایں رو خود نہ گوید غیر راست

لیکن ابوبکر صدیق رضؓ نے معجزہ طلب نہ کیا، انھوں نے کہا کہ یہ چہرۂ نبوی سچ کے سوا جھوٹ کہہ نہیں سکتا

صحابہ کو کیونکر رسالت کا یقین آیا

اب یہاں پہنچکر مفروضات اور نظریات کو جانے دیجئے، واقعات کو لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آوازۂ نبوت بلند کیا تو اُس آواز کی تائید کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا، عرب کا ذرہ ذرہ اس صدائے حق کا دشمن تھا، آپ پشتہاپشت کے خوکردہ عادات کے ترک کی دعوت دیتے تھے، موروثی مذہب جو لوگوں کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا، آپ اس کی مذمت کرتے تھے، جن بتوں اور دیوتاؤں کے رعب وہیبت سے وہ کانپتے تھے، آپ ان کو منہدم کرنے کا حکم دیتے تھے، سرقہ، ڈاکہ، لوٹ، مار، قتل، خونریزی، کینہ، عداوت، سود، قمار، زنا، شراب، غرض وہ تمام افعال جو عرب کے خصائص بن گئے تھے، آپ ان کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے، علاوہ بریں آپؐ کے دست مبارک میں کوئی ظاہری مادی طاقت نہ تھی، دولت وخزانہ نہ تھا، اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لیے بجز مصائب اور بلایا کے آپ کے پاس کوئی ظاہری قابلِ معاوضہ چیز نہ تھی، ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام کا نام لینے کے ساتھ وہ اپنے گھر سے بیگانہ، اپنی جائداد سے محروم، اپنے خاندان سے ناآشنا، اپنے وطن سے مہجور، اور اکابر شہر اور رؤسائے قریش میں رسوا و بدنام، اور

اور ہر قسم کی مصیبتوں کا ہدف اور نشانہ بن جائے گا، غریب مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ بے رحمیاں اور سفاکیاں کی جا رہی تھیں وہ سب کے سامنے تھیں، بایں ہمہ ایک خلقت تھی کہ آستانۂ محمدیؐ کی تلاش میں چلی آتی تھی، عرب کے دور دور کے قبائل سے لوگ چھپ چھپ کر پہنچتے تھے، اور بیعت کر کے واپس جاتے تھے۔ اور آخر وہ بھی جو سالہا سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے۔ اسلام کے شدید مخالف اور بدر و اُحد اور احزاب و خندق کے بانی تھے، وہ بھی ایک روز سرِ اطاعت جھکانے پر مجبور ہوئے،

آخر اس کے کیا اسباب تھے؟ اور کیونکر ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صداقت کا یقین آیا، عیسائیوں کی طرح یہ کہنا آسان ہے کہ محمدؐ نے لڑ کر لوگوں کو مطیع بنا لیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ہزاروں جاں نثار لڑنے والے کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوئے، ان کو کس نے لڑ کر مطیع بنایا، اب اگر اسلام لانے والوں کے اسباب پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سب کے اسلام لانے کا ایک ہی سبب نہ تھا، سینکڑوں ہزاروں آدمی ایک متحد نتیجہ کا یقین رکھتے ہیں، لیکن ان کے یقین کے اسباب و علل کی تلاش کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کے یقین کے اسباب و علل اور اذعان کے طرق اور ذریعے مختلف ہیں، ہزاروں صحابہ نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی، آپؐ کی رسالت پر ایمان لائے، آپؐ کی صداقت پر یقین کیا، مگر یہ تصدیق، یہ ایمان اور یہ یقین کسی ایک سبب کا نتیجہ نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف معجزہ ہی نبوت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ ہر طبیعتِ صالحہ اور قلبِ سلیم کے لیے پیغمبر کی صداقت کی مختلف دلیلیں مؤثر اور کارگر ہوئی ہیں،

حضرت ابوبکرؓ صرف دعوائے نبوت کو سن کر ایمان لے آئے، محض دعویٰ کی صداقت نے ان کو ہر دلیل و برہان سے بے نیاز کر دیا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبیدہ بنؓ جراح یہ دیکھکر اسلام لے آئے کہ ابوبکرؓ سا دانشمند اس صداقت سے متاثر ہے، حضرت خدیجہؓ ایمان لائیں، مگر یہ کہہ کر کہ آپؐ جیسے اخلاق گرانمایہ کا انسان جو غریبوں کا مولیٰ، مقروضوں کا ماویٰ اور مسافروں کا ملجا ہے، کبھی شیطان کے پنجہ میں نہیں گرفتار ہو سکتا، حضرت انیس غفاریؓ اور حضرت عمرو بن عنبسہ سلمیؓ یہ دیکھ کر اسلام لائے کہ آپؐ مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی، حضرت جبیر بنؓ مطعم، نجاشی شاہ حبش وغیرہ سینکڑوں اشخاص کلامِ ربانی سن کر حلقہ بگوش ہو گئے، حضرت ضماد بن ثعلبہ ازدیؓ نے نفس کلمۂ طیبہ سننے کے ساتھ نعرۂ حق بلند کر دیا، حضرت عبداللہ بنؓ سلام چہرۂ انور کو دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ "یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں" حضرت ضمام بنؓ ثعلبہ رئیس بنی سعد اس طرح اسلام لائے کہ انھوں نے بے تکلفی کے ساتھ دربارِ نبویؐ میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قسم دلائی کہ تم کو سچ مچ خدا نے بھیجا ہے، اور جب آپؐ نے قسم کھائی تو وہ مسلمان ہو گئے۔

اوس و خزرج کے بہت سے لوگ اپنے یہودی ہمسایوں سے سنا کرتے تھے کہ ایک نبیِ آخر الزماں کا ظہور ہونے والا ہے، جب انھوں نے آپؐ کی تقریر سنی تو پہچان لیا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں، فتح مکہ کے بعد سینکڑوں قبائل اسلام لانے پر اس لیے مجبور ہوئے کہ خانۂ خلیل ایک جھوٹے پیغمبر کے قبضہ میں نہیں جا سکتا، ایک پورا قبیلہ صرف آپؐ کی فیاضی سے متاثر ہو کر کلمہ لا الٰہ الا اللہ پکار اٹھا، متعدد شعرائے عرب اور اصحابِ علم صرف

قرآن مجید کے اثر کو دیکھ کر دل کو قابو میں نہ رکھ سکے، متعدد قریشی جانباز جو معرکۂ بدر سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، مسلمانوں کے آدابِ اخلاق کو دیکھ کر اسلام لے آئے، صلح حدیبیہ کے بعد مکہ کے ہزاروں آدمیوں کو جب مسلمانوں سے بے تکلف میل جول کا موقع ملا تو وہ اسلام کی صداقت کے اعتراف پر مجبور ہوگئے، ابوسفیان جس کو نہ تو معجزات اور خوارقِ عادات متاثر کرسکے، اور نہ بدر و خندق کی تلواریں اس کو مرعوب کرسکیں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتۂ دامادی اس کے سخت دل کو نرم کرسکا، وہ اس نظارہ کو دیکھ کر اپنے ضمیر کے اعتراف کو نہ روک سکا کہ قیصرِ روم، اپنے تختِ جلال پر بیٹھ کر، مکہ کے بوریانشین پیغمبر کے پانوں دھونے کی آرزو رکھتا ہے، ثمامہ بن آثال، ہند زوجۂ ابوسفیان، ہبار بن الاسود، وحشی قاتل حمزہ یہ دیکھ کر مسلمان ہوگئے کہ آپ دشمنوں کے ساتھ بھی کس محبت سے پیش آئے، قیصرِ روم صرف آپؐ کے چند اوصاف اور اسلام کے چند مناقب سن کر اظہارِ حق پر مائل ہو گیا۔ حضرت عدیؓ بن حاتم قبیلۂ طے کے عیسائی رئیس تھے، وہ آپؐ کو بادشاہ سمجھ کر مدینہ آئے، مگر یہاں انھوں نے دیکھا کہ مکہ کی ایک لونڈی آتی ہے، اور آپ اس کی حاجت روائی کو کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ دیکھ کر ان کا دل اندر سے پکار اٹھا کہ آپ بادشاہ نہیں پیغمبر ہیں،

ایسے لوگ بھی تھے جو ان روحانی و اخلاقی معجزات کے مقابلہ میں مادی معجزات سے متاثر ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتے تھے، قریش کے بہت سے لوگ فتح روم کی پیشین گوئی کو پوری ہوتے دیکھ کر اسلام لے آئے، ایک سفر میں ایک قبیلہ کی عورت آپ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہتے دیکھ کر اپنے قبیلہ میں جا کر کہتی ہے کہ آج میں نے عرب کے سب سے بڑے جادوگر کو

دیکھا، اور اسی استجابت نے پورے قبیلہ کو مسلمان کر دیا، متعدد یہودی اس لیے مسلمان ہو گئے کہ گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی جو نشانیاں بتائی گئی تھیں، وہ حرف بہ حرف آپ میں صحیح نظر آتی تھیں، متعدد یہودی علماء نے آکر آپ کا امتحان لیا، اور جب آپ نے از روئے وحی انکے جوابات صحیح دیے تو وہ آپ کی نبوت پر ایمان لائے، ایک شخص نے کہا کہ میں اس وقت آپ کو سچا رسول تسلیم کروں گا، جب یہ خرمے کا خوشہ آپکے پاس آکر آپ کی رسالت کی شہادت دے، اور جب یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مسلمان ہو گیا،[۱] ایک سفر میں ایک اعرابی نظر آیا، آپ نے اس کو اسلام کی دعوت دی، اس نے کہا "آپ کی صداقت کی شہادت کون دیتا ہے" آپ نے فرمایا "سامنے کا درخت"، اور یہ کہکر آپ نے اس درخت کو بلایا، وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر آپکے پاس آکر کھڑا ہو گیا، اور تین بار اس کے اندر سے کلمۂ توحید کی آواز آئی۔ یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔[۲] سراقہ بن مالک جو ہجرت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتے آرہے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ آپ کی دعا سے تین دفعہ ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تو ان کو یقین ہو گیا کہ اسلام کے اقبال کا ستارہ نقطۂ اوج پر پہنچ کر رہیگا، چنانچہ خط امان حاصل کیا اور بعد کو مسلمان ہو گئے[۳]

چوں پیمبر از بروں بانگے زند — جانِ امت در دروں سجدہ کند

بر زند از جانِ کامل معجزات — بر ضمیر جانِ طالب چوں حیات

---

[۱] جامع ترمذی معجزات ص ۶۰۳ [۲] مسند دارمی، باب ما اکرم الیہ اللہ نبیہ من ایمان الشجر [۳] صحیح بخاری جلد اول، ہجرت۔

دلائل و معجزات

اور

عقلیاتِ جدیدہ

نوشتۂ مولانا عبد الباری صاحب ندوی، سابق استاذ فلسفۂ جدید، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے آیات و نذر بیکار رہیں،

لیکن

در دل ہر کس کہ دانش رامزہ است — روئے و آواز پیمبر معجزہ است (عارف روم)

متکلمین و حکمائے اسلام نے عقلی حیثیت سے معجزہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ گذشتہ مباحث میں نظر سے گذر چکا ہے، "سیرت" کے اس حصہ کو اصلاً معجزاتِ نبویؐ کی نقلی اور روایاتی تحقیق سے تعلق تھا، تاہم ضمناً قدیم کلامی مباحث بھی ایک حد تک آگئے ہیں، ذیل میں اس موضوع پر صرف عقلائے مغرب کی ترجمانی کرنی ہے، اور جدید تحقیقات و خیالات کی روشنی میں جو نتائج نکلتے ہیں، ان کو پیش کرنا ہے،

آغاز کتاب میں نبوت اور معجزہ کے مفہوم کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے، سب سے پہلے اس پر ایک نظر اور ڈال لو،

مفہوم نبوت جس طرح رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی کا آنا قانون قدرت ہے، اسی طرح یہ بھی ایک سنۃ الٰہی ہے کہ جب عالم انسانیت پر ضلالت و گمراہی کی تاریکی چھا جاتی ہے تو اس کے مطلع سے ہدایت و رہنمائی کا نور طلوع کرتا ہے، اور اگرچہ جس طرح ظلمتِ شب میں چھوٹے بڑے ستارے اپنی جھلملاہٹ سے کچھ نہ کچھ روشنی پیدا کرتے رہتے ہیں، اسی طرح عام مصلحین و مجددین کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی حد تک ضلالتِ انسانی کی سیاہی کو کم کرتا رہتا ہے، تاہم آفتاب کی ضیا پاشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ستاروں کی جھلملاہٹ بالکل ماند پڑ جاتی ہے، اور کرۂ ارض دفعۃً بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

سلسلۂ مصلحین کے اسی آفتابِ ہدایت کا نام ادیان و شرائع کی اصطلاح میں نبی پیغمبر، یا رسول ہے، عام مصلحین کے ہاتھ میں صرف انسانی عقل و بصیرت کی مشعل ہوتی ہے لیکن **مشکوٰۃ نبوت** سے جو نور ہدایت ابلتا ہے اس کا سرچشمہ وہ "نور السمٰوات والارض" ہوتا ہے جس سے عام مادی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں، پیغمبر وہ کچھ دیکھتا ہے جو ہم نہیں دیکھتے، وہ کچھ سنتا ہے جو ہم نہیں سنتے۔ اس کے احوال و کوائف سے ہم ناآشنا، اور اس کے عقل و حواس سے بیگانہ ہوتے ہیں، مختصراً یوں سمجھو کہ پیمبرانہ خصائص کی اصلی روح عالمِ ناسوت سے ماورا کسی عالم غیب کے ساتھ تعلق و ربط ہے، انسان اسی عالمِ اسرار و غیوب کو اپنی محدود تعبیر میں عالمِ قدس، عالمِ روح، عالم مثال وغیرہ سے موسوم کرتا ہے،

مفہوم معجزہ حامل رسالت اپنے ابنائے جنس کو جو دعوت دیتا ہے، اور دنیا کو جو پیام پہنچاتا ہے، اس کی سچائی کی واضح ترین دلیل یا آیت، اگرچہ خود یہ پیام اور اس کے حامل کا

مجسم وجود ہوتا ہے، تاہم بہ اقتضائے لیطمئنّ قلبی یا بہ لحاظ اتمام حجت اس داعی حق کے تعلق سے کچھ ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو عام حالات میں انسانی دسترس سے باہر نظر آتے ہیں، اور ان کی توجیہ و تعلیل سے انسانی عقل اپنے کو وامانده پاتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ پر آگ سرد ہوگئی، حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدہا بن گیا، حضرت عیسیٰؑ بے باپ کے پیدا ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چشم زدن میں "مسجد حرام" سے لیکر "مسجد اقصیٰ و سدرۃ المنتہیٰ" تک کی سیر کرلی، ان واقعات کی توجیہ سے چونکہ عقل انسانی عاجز ہے، اس لیے ان میں ایک طرح کا غیب نظر آتا ہے، اور جس شخص کے تعلق سے ان کا ظہور ہوتا ہے، عالم غیب کے ساتھ اس کے روابط کی نشانی و آیت یا تائید غیبی کا کام دیتے ہیں، قرآن مجید کی زبان میں اس قسم کے واقعات کا نام بینات، براھین یا زیادہ تر آیات (یا آیات بینات) ہے۔ محدثین ان کو "دلائلِ نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں، اور حکماء و متکلمین کی اصطلاح میں ان ہی کو معجزات کہا جاتا ہے۔

ترتیب مباحث | معجزات کی جو نوعیت ہے اس کے لحاظ سے سب سے پہلی بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ آیا ان کا وقوع ممکن بھی ہے یا نہیں؟ قدماء نے علل مخفیہ وغیرہ سے توجیہ معجزات کی جو کوششیں کی ہیں ان کا مدعا حقیقۃً امکان ہی کو ثابت کرنا ہے۔ مگر حکمت و فلسفہ کے دور جدید میں امکان کے ساتھ ایک دوسری زیادہ اہم بحث شہادت کی پیدا ہوگئی ہے، نفس امکان سے تو اب شاید ہی کسی حکیم یا فلسفی کو انکار ہو، البتہ یہ امکان اس قدر بعید الوقوع معلوم ہوتا ہے کہ یقین و توقع کے لیے عام واقعات تاریخی کے درجہ کی شہادت

کافی نہیں خیال کی جاتی،

لیکن چونکہ امکان اور شہادت دونوں کی بحث کا اعلی مرجع معجزانہ واقعات کا قابلِ یقین واذعان ہونا یا نہ ہونا ہے، اس لیے امکان وشہادت دونوں سے زیادہ اہم سوال خود یقین کی ماہیت واسباب کا ہے، تعجب ہوتا ہے کہ اس طرف بحث معجزات کے ضمن میں متقدمین ومتاخرین میں سے جہاں تک علم ہے، کسی کا بھی ذہن نہیں گیا صفحاتِ ذیل میں نہ صرف اس اہم سوال کا مستقلاً جواب دیا گیا ہے، بلکہ دراصل یہی جواب معجزہ کے متعلق تمام مباحث کا مقطع اور خاتمۂ سخن ہے،

ہرکیف اس خاکہ کی بنا پر ترتیبِ مباحث یہ ہوگی،

۱۔ امکان معجزات،

۲۔ شہادتِ معجزات،

۳۔ استبعاد معجزات،

۴۔ یقین معجزات،

۵۔ غایت معجزات،

امکان معجزات

یوں تو یورپ میں معجزات پر بیسیوں مستقل کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ اس بحث پر ہیومؔ[1] نے جو چند اوراق لکھے تھے، وہ سارے طومار پر بھاری ہیں،

---

[1] *Human under standing* "فہم انسانی" (باب بحث معجزات)

اور گو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس موضوع پر یہ سب سے پہلی تحریر تھی، تاہم وقوع معجزات کے خلاف جو آخری حربہ استعمال کیا جا سکتا ہے، وہ بھی یہی ہے یہی وجہ ہے کہ ان اوراق پر کم و بیش دو صدیاں گذر جانے پر بھی موافق و مخالف دونوں کے قلم کی روشنائی ان ہی نقوش کے مٹانے یا اجاگر کرنے میں صرف ہوتی رہی ہے،

| ہیوم کا استدلال | ہیوم کے استدلال کا ماحصل یہ ہے کہ |

(۱) انسان کے علم و یقین کا مدار تمام تر تجربہ پر ہے، جس طرح آدمی تجربہ سے یہ جانتا ہے کہ آگ لکڑی کو جلاتی اور پانی سے بجھ جاتی ہے، اسی طرح تجربہ ہی کی بنا پر وہ اس کا بھی یقین رکھتا ہے کہ جب تک دروغ بیانی کا کوئی خاص سبب نہ ہو لوگ علی العموم سچ بولتے ہیں، یعنی جس چیز کی وہ روایت یا تصدیق کرتے ہیں، وہ عام طور پر تحقیق کے بعد صحیح ثابت ہوتی ہے،

(۲) جس نسبت سے کسی امر کے متعلق گذشتہ تجربات کی شہادت قوی یا ضعیف ہوتی ہے، اُسی نسبت سے ہمارے دل میں اذعان، شک یا انکار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور ہونی چاہیے۔

فرض کرو کہ تمھارے محلہ میں ساٹھ ستر برس کی عمر کا ایک بوڑھا فقیر رہتا ہے جس کو تم بچپن سے دیکھتے ہو کہ چیتھڑے لپیٹے ہوئے بھیک مانگ کر زندگی بسر کرتا ہے، پیری و فاقہ کشی سے ہڈیوں کا صرف ڈھانچ رہ گیا ہے، کل تک تم نے اس کو اسی حال میں دیکھا تھا، آج تمھارا ایک پڑوسی آکر کہتا ہے کہ "وہ بیچارہ بڈھا فقیر رات کو مر گیا، تم کو اس بیان کے باو

کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، لیکن یہی پڑوسی اگر یہ بیان کرے کہ "میں نے اس فقیر کو نہایت قیمتی لباس میں اعلیٰ درجہ کی موٹر پر سوار وائٹ وے کی دوکان پر کچھ چیزیں خریدتے دیکھا" تو تم کو سخت اچنبھا ہوگا۔ اور اگر پڑوسی کی صداقت کا غیر معمولی طور پر تم کو اعتبار نہیں ہے یا اور بہت سے معتبر لوگ اس کی تصدیق نہیں کرتے تو اس بیان کے قبول کرنے میں تم بہت زیادہ پس و پیش کروگے۔ تیسری صورت یہ فرض کرو کہ اس پڑوسی نے یہ بیان کیا کہ "میں نے اس پیر فرتوت، پوست و استخوان فقیر کو آج دیکھا کہ بیس پچیس برس کا جوان رعنا ہے" اب تم اپنے پڑوسی کو یا تو محض لاعنی سمجھوگے، یا یہ خیال کروگے کہ اس کو کچھ نہ کچھ دھوکا ہوا ہے، لیکن اس بیان کی واقعیت کا اذعان ہرگز تمھارے دل میں نہ پیدا ہوا ہوگا، کیوں؟

صرف اس لیے کہ اس قسم کی مثال انسان کے گذشتہ تجربات میں ایک بھی نہیں ملتی، اسی بنا پر اس کو خلافِ فطرت یا خارقِ عادت قرار دیا جاتا ہے، جس کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ سمجھ لینا کہیں زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ راوی کو کوئی دھوکا ہوا، یا وہ دانستہ جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ سچے سے سچے آدمی کا جھوٹ بول دینا، یا عاقل سے عاقل انسان کا دھوکا کھا جانا، بجائے خود ایک نادر الوقوع شے سہی، تاہم عدیم الوقوع نہیں ہے اور خرقِ عادت کے مقابل میں اس کا وقوع بہت زیادہ ممکن و قابلِ قبول ہے،

(۳) معجزہ اسی صنف کے عدیم الوقوع یا قانون فطرت کے خارقِ واقعہ سے عبارت ہوتا ہے، ورنہ پھر وہ معجزہ نہیں رہتا، اس لیے کہ اگر محض نادر الوقوع شے کا نام ہو جس طرح کہ کسی آخری درجہ کے مدقوق کا صحت یاب ہو جانا، یا ایک مفلس کا رات بھر میں دولتمند

ہو جانا، تو یہ ایسے واقعات ہیں جن کی توجیہ کے لیے عام انسانی زندگی ہی میں کچھ نہ کچھ تجربات ملتے ہیں، مثلاً مفلس کے گھر میں کوئی دفینہ نکل آسکتا ہے، بخلاف اس کے معجزہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیل و توجیہ عام تجربات کی دسترس سے باہر ہو،

اس لیے معجزہ گویا بذات خود آپ اپنی تردید ہے،

اس استدلال کو خود ہیوم کے الفاظ میں بھی سن لینا چاہیے:

"معجزہ نام ہے قوانینِ فطرت کے خرق کا، اور چونکہ یہ قوانین مستحکم اور اٹل تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں، اس لیے معجزہ خود اپنے خلاف اتنا زبردست ثبوت ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی تجربی ثبوت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا، کیا وجہ ہے کہ ہم ان باتوں پر قطعی یقین رکھتے ہیں کہ تمام انسان فانی ہیں، سیسہ آپ ہی آپ ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا، آگ لکڑی کو جلاتی اور پانی سے بجھ جاتی ہے، صرف یہی کہ یہ امور قوانین فطرت کے مطابق ثابت ہو چکے ہیں اور اب ان کا توڑنا بغیر قوانینِ فطرت کے توڑنے، یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ بلا معجزہ کے ناممکن ہے، جو چیز عام قانون فطرت کے اندر واقع ہوتی ہے وہ کبھی معجزہ نہیں خیال کی جاتی، مثلاً یہ کوئی معجزہ نہ ہوگا کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں تندرست و توانا ہے، اچانک مرجائے، کیونکہ اس قسم کی موت گو نسبتہً قلیل الوقوع سہی، لیکن پھر بھی بارہا مشاہدہ میں آچکی ہے، البتہ یہ معجزہ ہوگا کہ کوئی مردہ زندہ ہو جائے، کیونکہ ایسا کبھی کسی ملک میں نہیں دیکھا گیا ہے، لہذا جس واقعہ کو معجزہ کہا جاتا ہے، اس کے خلاف تجربہ کا مستمر و متواتر ہو جانا ضروری ہے، ورنہ پھر یہ معجزہ کے نام سے نہ موسوم ہوگا، اور چونکہ کسی شے کا متواتر تجربہ خود ایک قطعی ثبوت ہے، تو گویا معجزہ

کی نفس حقیقت و ماہیت ہی میں اس کے وجود کے خلاف ایک قطعی و براہ راست ثبوت موجود ہے، اور ایسا ثبوت جو نہ اس وقت تک معجزہ کو ثابت ہونے دے سکتا ہے، اور نہ خود باطل کیا جا سکتا ہے، جب تک اس کے خلاف اس سے بڑھ کر ثبوت نہ پیدا کیا جائے۔"

"لہذا صریح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ایک کلی اصول کی حیثیت رکھتا ہے) کہ کوئی تصدیق و شہادت معجزہ کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ یہ ایسی نہ ہو جس کی تکذیب خود اس معجزہ سے بڑھ کر معجزہ ہو جس کو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے، اور اس صورت میں بھی دلائل میں باہم تصادم ہوگا، جو دلیل جتنی زیادہ قوی ہوگی، اپنی زائد قوت کے مناسب یقین پیدا کرے گی۔ فرض کرو کہ ایک شخص آکر مجھ سے کہتا ہے کہ اس نے ایک مردہ کو دیکھا کہ زندہ ہوگیا تو میں ذرا سوچنے لگتا ہوں کہ آیا یہ زیادہ ممکن ہے کہ یہ شخص دھوکا دینا چاہتا ہو، یا خود دھوکا کھا گیا ہو، یا یہ اغلب ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے، صحیح ہو۔ ہیں ان دونوں معجزوں میں موازنہ کرتا ہوں، اور جدھر کا پلہ زیادہ جھکتا معلوم ہوتا ہے، اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں، اور ہمیشہ اسی احتمال کو رد کرنا پڑتا ہے جس میں معجزہ پن زیادہ نظر آتا ہو، البتہ اگر روایت کی تکذیب واقعہ روایت سے بڑھ کر معجزہ ہو تو اس صورت میں بیشک مجھ کو روایت کے یقین پر مجبور ہو جانا پڑے گا، لیکن اس کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔" (فہم انسانی" باب معجزات)

غرض ہیوم کے استدلال اور اس کی تعریف معجزہ کی رو سے اگر ایک طرف ہم اپنی میزان عقل میں کسی خارقِ عادت واقعہ کی شہادت و روایت کو رکھیں اور دوسری طرف اس کے خلاف دنیا کے ہزارہا سال کے مستمر و متواتر تجربہ کو، تو ظاہر ہے کہ یہ شہادت چاہے

کتنی ہی معتبر و وقیع کیوں نہ ہوتا، ہم اس متواتر تجربہ کے ہم وزن کسی حال میں نہیں ٹھہر سکتی، لہذا انسانی شہادت کی کوئی کمیت و کیفیت بھی معجزہ کے یقین و اثبات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی،

حضرت موسیٰؑ کا ایک معجزہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنی جان کے دشمن اور اپنے سب سے بڑے منکر فرعون کے گھر میں پرورش پائی، ہیوم سے بڑھ کر معجزہ کا کون دشمن و منکر ہوگا لیکن اس انکار کو جب اس کے پورے فلسفہ کی روشنی میں دیکھو، تو نظر آتا ہے کہ قبولِ معجزات کی راہ میں عقل کی خود فریبی کا جو سب سے زبردست طلسم حائل تھا، اس کو ہیوم ہی نے توڑا اور ہمیشہ کے لیے برباد کر دیا ہے، جس کے بعد راستہ کے صرف چند کانٹوں کا ہٹانا باقی رہ جاتا ہے، چراغ کے تلے اندھیرا، آدمی بارہا اپنے ہاتھ کی مشعل سے دوسروں کو راستہ دکھلاتا ہے۔ اور خود نہیں دیکھ سکتا،

انسان کے ذہن میں جس قدر یہ اعتقاد راسخ ہے، شاید ہی کوئی اور ہو کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مادی علل و اسباب اور قویٰ و خواص کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے، چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اپنے ظہور کے لیے ایک اٹل اور غیر متغیر علت رکھتا ہے، ہر شے اپنے اندر کوئی نہ کوئی ایسی قوت یا خاصہ رکھتی ہے جس سے اس وقت تک اس کا انفکاک ناممکن ہے جب تک یہ خود اپنی ذات و حقیقت سے منفک نہ ہو جائے، یہ ناممکن ہے، کہ میرا قلم میز کی ایک جانب سے دوسری جانب کو چلا گیا ہو، بے اس کے کہ کسی ہاتھ یا کسی اور مادی شے نے اس کو حرکت دی ہو، اس کاغذ پر جو نقوش تم کو نظر آرہے ہیں ضرور ہے کہ ان کو کسی نہ کسی قلم نے کھینچا ہو،

اسی طرح یہ نہیں ہو سکتا کہ انار کے درخت سے آم کا پھل یا آم کے درخت سے انار کا پھل پیدا ہو،
آم کے درخت سے ہمیشہ آم اور انار کے درخت سے ہمیشہ انار ہی پیدا ہوگا۔

غور کرو، جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ نہ جلا سکی تو تم کو اسکے
باور کرنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے، اسی لیے کہ آگ جب تک آگ ہے، جلانے کا
خاصہ اس سے منفک نہیں ہو سکتا، اس کو ابراہیمؑ اور نمرود کی تمیز نہیں، اژدہا ایک
جاندار مخلوق ہے، جو تولیدِ مثل کے قاعدے سے اپنی ہی جیسی جاندار مخلوق سے وجود
میں آتا ہے، اس لیے یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا کیونکر اژدہا بن گیا،
انسان کا بچہ اپنے والدین کے بندھے ہوئے اور مشترک عملِ توالد و تناسل کا نتیجہ ہوتا ہے،
پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ بے باپ کے پیدا ہوئے، دس قدم کی مسافت
طے کرنے کے لیے بھی آدمی اپنے پاؤں یا کسی اور مادی وسیلہ کی احتیاج ہوتی ہے
اور جس قدر مسافت زیادہ ہوتی ہے، اسی قدر اُس کو قطع کرنے میں زیادہ وقت
لگتا ہے، لہٰذا یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ پیغمبر اسلامؐ نے بلا معمولی وسائلِ مادی کے
استعمال کے طرفۃ العین میں "مسجد حرام" سے "مسجد اقصیٰ" اور "سدرۃ المنتہیٰ" تک کی
سیر کر لی، زمین و آسمان کی آیات کا مشاہدہ کیا، اور تمام انبیاے سابقین سے گفتگو
فرمائی، پھر یہ تمام مراحل اتنے وقفہ میں کیونکر طے ہو سکتے ہیں کہ واپسی پر کواڑ کی زنجیر ہل رہی ہو
اور بستر کی گرمی ہنوز قائم ہو،

سلسلۂ علل و اسباب اور اشیا کے افعال و خواص ہی کے اصول و قوانین کا نام

حکما و فلاسفہ کی اصطلاح میں قوانینِ فطرت ہے، جن کا خرق محال خیال کیا جاتا ہے، مثلاً کششِ ثقل ایک قانونِ فطرت ہے، جس کا یہ اقتضا ہے کہ جب تم ڈھیلے کو اوپر پھینکو گے تو وہ لوٹ کر ہمیشہ نیچے آجائے گا، فضا میں اس کا معلق رہنا ناممکن ہے، ہائڈروجن اور آکسیجن دو عناصر کے ایک خاص مقدار میں ملنے کا خاصہ یہ ہے کہ پانی بن جاتا ہے، جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔

قوانین فطرت کی حقیقت

اب دیکھو کہ جن چیزوں کو تم قوانینِ فطرت کا لقب دیتے ہو، اور جو بظاہر اسقدر قطعی اور اٹل نظر آتے ہیں، واقعات کی کسوٹی پر ان کی کیا بساط ٹھہرتی ہے، اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ نمک نمکین اور شکر میٹھی کیوں ہوتی ہے؟ تو یہ سوال تم کو ایسا ہی مہمل و مضحک معلوم ہوگا، جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ جزء کل سے چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ جزء کی حقیقت ہی یہ ہے کہ کل سے چھوٹا ہو، اسی طرح لوگ سمجھتے ہیں کہ نمکینی اور مٹھاس نمک اور شکر کی حقیقت میں داخل ہیں، لیکن سوچو کہ کیا نمک کی نفس ذات میں تم کو کوئی ایسی شے نظر آتی ہے جس کی بنا پر بلا اس کو چکھے ہوئے تم یہ حکم لگا سکو کہ اس کا مزہ بالضرورت شکر کے مزہ سے مختلف ہونا چاہیے، صرف دونوں کے چکھنے اور تجربہ کی بنا پر نمک کو نمکین اور شکر کو شیریں یقین کیا جاتا ہے، سنکھیا زہر ہے، جس کے کھانے سے آدمی مرجاتا ہے، سنکھیا کا ایک ٹکڑا لے کر اس کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھو، اس کی ذات یا حقیقت میں کہیں کوئی ایسی شے محسوس ہوتی ہے جس کی وجہ سے تم بلا تجربہ اسکو موت کی علت قرار دے سکو؟ جس شخص نے سنکھیا کبھی نہیں دیکھی یا اس کے اثر سے ناواقف

ہے، اس کو تم بہ آسانی کھلا سکتے ہو، کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس کو خود سنکھیا کے اندر کوئی ایسی شے نہیں نظر آتی جس سے بلا سابق تجربہ کے وہ اُس کے زہر قاتل یا علتِ موت ہونے کا علم و یقین حاصل کر سکے، بیسویں صدی کے سائنسداں کے لیے یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ پانی دو مختلف اجزا یا عناصر سے مرکب ہے لیکن جب تک اس حقیقت کا تجربہ نہیں ہوا تھا، ڈھائی ہزار سال تک حکماء اور عقلاے عالم پانی کو ایک مفرد و بسیط عنصر یقین کرتے رہے، حالانکہ پانی کی جو صورت و شکل کاونڈش[1] کے سامنے تھی، وہی طالیس ملطی[2] کے سامنے بھی تھی، سنکھیا اور شکر کے بجائے اگر ہم کو سمیت اور شیرینی کا تجربہ پتھر کی کنکریوں میں ہوتا تو ہم ان کو اسی طرح مہلک (ہلاکت کی علت) و شیریں یقین کرتے جس طرح آج سنکھیا اور شکر کو کرتے ہیں،

جان اسٹورٹ مل نے اپنی مشہور کتاب "نظام منطق"[3] میں اسکی نہایت عمدہ مثال دی ہے کہ

> "آج سے پچاس سال پہلے وسط افریقہ کے باشندوں کے نزدیک غالباً کوئی واقعہ اس سے زیادہ تجربہ کی قطعیت و یکسانی پر مبنی نہ تھا جتنا یہ کہ تمام انسان کالے ہوتے ہیں، اسی طرح کچھ زیادہ دن نہیں ہوے کہ اہل یورپ اس کو فطرت کی یکسانی کی ایک بالکل قطعی و غیر مشتبہ مثال سمجھتے تھے کہ تمام ہنس سفید ہوتے ہیں[4]، مزید تجربہ کے بعد افریقہ و یورپ والوں

---

[1] جس نے پانی کو بسیط عنصر کے بجائے آکسیجن و ہائیڈروجن سے مرکب ثابت کیا[2] یونان کا پہلا فلسفی جو پانی کو مبدء عالم جانتا تھا[3] "سسٹم آف لاجک" کتاب سوم باب ۳ فصل ۲ [4] وسط افریقہ کے آدمی کالے اور یورپ کے ہنس سفید ہوتے ہیں۔

دونوں کو معلوم ہوا کہ یہ خیالات غلط تھے، لیکن اس تجربہ کے لیے ان کو پانچ ہزار برس انتظار کرنا پڑا، اور اس طویل مدت میں انسانی آبادی کے دو بر اعظم فطرت کی ایک ایسی یکسانی پر یقین کرتے رہے جس کا حقیقۃ" کوئی وجود نہ تھا۔"

کائنات فطرت کی وسعتِ بیکراں کو دیکھتے ہوئے، آج بھی نوع انسان کے تجربہ پر مبنی قوانینِ فطرت کی بساط اس سے زیادہ نہیں ہے، جتنی کہ اس تجربہ کی تھی کہ "تمام انسان کالے ہوتے ہیں" اور "تمام ہنس سفید"۔ انیسویں صدی کے ایک مشہور فلسفی ڈاکٹر وارڈ نے اسی حقیقت کو ایک مفروض مثال کے پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ فرض کرو کہ

"افریقہ کے کسی صحرا میں ایک نہایت عظیم الشان سلسلۂ عمارت ہے جو چاروں طرف ایک چار دیواری سے گھرا ہوا ہے، اس کے اندر ایک خاص ذی عقل مخلوق آباد ہے جو اس احاطہ سے باہر نہیں جا سکتی، یہ عمارت ایک ہزار سے زائد کمروں پر مشتمل ہے، جو سب مقفل ہیں، اور کنجیوں کا پتہ نہیں کہ کہاں ہیں، بڑی محنت و جستجو کے بعد کل پچیس کنجیاں ملتی ہیں، جن سے ادھر ادھر کے پچیس کمرے کھل جاتے ہیں جو سب ہم شکل ہیں، لہٰذا کیا اس بنا پر اس احاطہ کے اندر رہنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کردیں کہ بقیہ ۹۷۵ کمرے بھی اسی شکل کے ہیں[1]"

قوانینِ فطرت یا خواصِ اشیاء و علاقۂ تعلیل (علت و معلول) کی مذکورۂ بالا حقیقت اگرچہ اب حکمت (سائنس) و فلسفہ دونوں کے مسلمات میں داخل ہے، لیکن اس حقیقت

---

[1] مل کی "منطق" کتاب سوم، باب ۲۱ فصل ۴ حاشیہ۔

کو سب سے پہلے جس شخص نے اجاگر کیا، وہ معجزات کا منکر ہیوم ہی تھا، اس لیے خود اسی کی زبان سے سنو کہ جس چیز کو وہ **خرقِ عادت** کہہ کر ناممکن قرار دیتا ہے، اس کے عدمِ امکان کا کیا وزن ہے؛

"جب[1] ہم اپنے آس پاس کی خارجی چیزوں پر نظر کرتے ہیں اور مختلف علتوں کے افعال کو غور سے دیکھتے ہیں، تو ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس کے اندر کسی قوت یا لزوم کا پتہ چلتا ہو، نہ ان کی کوئی ایسی صفت نظر آتی ہے، جو معلول کو اس طرح علت سے جکڑے ہوئے ہو کہ ایک کو دوسرے سے مستنبط کرنے میں خطا کا امکان نہ ہو، ہم کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک واقعہ کا ظہور دوسرے کے بعد ہوتا ہے، بلیرڈ کے ایک گیند میں ضرب لگانے سے دوسرے میں حرکت ظاہر ہوتی ہے، بس حواس ظاہری سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی بساط اسی قدر ہے، اشیا میں اس تقدم وتاخر یا تبعیت کے پائے جانے سے ذہن کو نفس تبعیت کے علاوہ کوئی اور احساس یا ارتسام باطنی نہیں حاصل ہوتا۔"

"کسی شے کو پہلی دفعہ دیکھنے سے ہم کبھی قیاس نہیں کرسکتے کہ اس سے کیا معلول یا نتیجہ ظاہر ہوگا، حالانکہ اگر علت کے اندر کسی قوت یا انرجی کا پتہ محض ذہن دوڑانے سے چل سکتا تو بلا کسی سابق تجربہ کے ہم اس نتیجہ ومعلول کی پیشین گوئی کردیتے اور پہلی ہی نظر میں قطعی حکم لگادیتے۔"

"حقیقت امر یہ ہے کہ کائنات مادی کا ایک ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے صفات محسوسہ کی بنا پر ہم اس کے اندر کسی قوت کا سراغ لگاسکیں یا قیاس سے بتلاسکیں کہ

---

[1] فہم انسانی باب، فصل ۱،

اس سے کوئی اور دوسری شے ایسی وجود پذیر ہو سکتی ہے جس کو معلول کا لقب دیا جاتا ہے، صلابت، امتداد، حرکت، یہ چیزیں بجائے خود مستقل صفات اور ایسے واقعہ کا نشان نہیں دیتیں جس کو ان کا نتیجہ کہا جاسکے، موجودات عالم میں ہر آن تغیر و تبدل جاری ہے، ایک چیز دوسری چیز کے بعد برابر آتی جاتی رہتی ہے، لیکن وہ قوت وطاقت جو اس ساری مشین کو چلاتی رہتی ہے، ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے، اور اجسام کی کسی محسوس صفت میں اپنا کوئی نشان نہیں رکھتی. ہم یہ واقعہ جانتے ہیں کہ آگ کے شعلہ میں گرمی پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں (گرمی و شعلہ) میں کیا لزوم ہے، اس کے قیاس سے ہمارا تخیل قطعاً عاجز ہے"

اسی سلسلہ میں چند صفحات بعد کی ایک طویل عبارت[1] کا یہاں اقتباس مناسب ہے، جس سے آگے چل کر کام پڑے گا۔

"عام طور پر لوگوں کو فطرت کے پیش پا افتادہ اور مانوس واقعات و افعال کی توجیہ میں کوئی دشواری نہیں نظر آتی (مثلاً بھاری چیزوں کا نیچے آجانا، درختوں کی بالیدگی حیوانات میں توالد و تناسل، یا غذا سے جسم کی پرورش وغیرہ کے واقعات) بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان صورتوں میں ان کو علت کی بذاتِ خود اس قوت کا علم و احساس ہے جس کی بنا پر یہ اپنے معلول کو مستلزم ہے، اور اس لیے ظہور معلول میں خطا کا امکان نہیں، بات یہ ہے کہ تجربہ یا عادت دراز کی وجہ سے ان کے ذہن میں ایک ایسا میلان و رجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ علت کے سامنے آتے ہی اس نتیجہ کا یقین ہو جاتا ہے، جو معمولاً اس کے ساتھ پایا گیا ہے، اور یہ مشکل سے ممکن

---

[1] فہم انسانی باب ۷ فصل ۱

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ظاہر ہو سکتا تھا، صرف اُس صورت میں جبکہ غیر معمولی واقعات و حوادث ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً زلزلہ، وبا، یا کوئی اور عجیب غریب بات، تو البتہ انکی صحیح علت کا پتہ نہیں لگتا، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ انکی توجیہ و تشریح کیسے کی جائے، اس مشکل میں پڑکر لوگ علی العموم کسی اَن دیکھی صاحب عقل و ارادہ ذات کے قائل ہو جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ ناقابل توجیہ ناگہانی واقعات اسی ذات کے پیدا کردہ ہیں لیکن فلاسفہ کی باریک بیں نگاہ کو نظر آتا ہے کہ روزمرہ کے معمولی واقعات کی پیدا کرنے والی قوت بھی اسی طرح نامعلوم ناقابل توجیہ ہے جس طرح کہ انتہائی سے انتہائی غیر معمولی واقعات کی .... چنانچہ بہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ بلا استثناء تمام واقعاتِ عالم کا مبدء اُسی ذات کو قرار دیں جس کی طرف عوام صرف معجزات اور فوق الفطرت واقعات و حوادث کے ظہور کو منسوب کرتے ہیں ...... (ان کے نزدیک) ہر معلول کی واقعی و براہ راست علت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہستی برتر کا ارادہ ہوتا ہے...... بلیرڈ کا ایک گیند جب دوسرے گیند سے ٹکراتا ہے، تو خود خدا اپنے ارادۂ خاص سے اس کو متحرک کر دیتا ہے، اور یہ ارادہ ان عام قوانین کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اپنی مشیت سے کائنات پر حکم فرمائی کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔"

جب یہ مسلّم ہو چکا کہ قوانینِ فطرت کی بنیاد تمامتر تجربہ پر ہے، اور تجربہ کے ناقابلِ خطا ہونے کا کبھی کسی حالت میں بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تو پھر ظاہر ہے کہ کسی شئے کو خلافِ فطرت یا خارقِ عادت کہہ کر اس کو غلط یا ناممکن کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے، چنانچہ خود ہیوم

کا اپنے اسی اصول پر دعویٰ ہے کہ "جس شے کا تصور ممکن ہے وہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہو سکتی اور جو شے مستلزمِ تناقض نہ ہو، اس کو کسی حجت و برہان یا عقلی دلیل سے غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا[1]"

پروفیسر ہکسلے جو فلسفی سے زیادہ حکیم (سائنٹسٹ) ہے، اور جس کی جگہ حکما کی صفِ اول میں ہے، اس نے ہیوم کے اس قول کو اپنی تحریروں میں جا بجا نقل کر کے اس کی نہایت شدت سے تائید کی ہے، خود ہیوم کے نظریہ معجزات پر بحث کرتے ہوئے[2] پہلے تو معجزہ کے متعلق اس کی اس تعریف کی تغلیط کی ہے کہ "وہ نام ہے قوانینِ فطرت کے خرق کا" اور بتلایا ہے کہ معجزات کے معنی زیادہ سے زیادہ "انتہائی حیرت انگیز واقعات[3]" کے ہو سکتے ہیں، پھر اسی ضمن میں ہیوم کے مذکورہ بالا قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

"لیکن معجزہ کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہے، لہذا خود ہیوم ہی کے دعوی کے مطابق معجزہ کو کسی برہانی دلیل سے غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا"

"با ایں ہمہ ہیوم خود اپنے ہی اصول کے خلاف اور بالکل متناقض ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ مردہ کا زندہ ہو جانا معجزہ ہے، کیونکہ ایسا پہلے کبھی کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں ہوا ہے"

اس ارتکاب تناقض کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے طنزاً لکھا ہے کہ اگر ہیوم کے استدلال کی مہملیت کو برہنہ کر کے دیکھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ جو چیز پہلے کبھی نہیں واقع ہوئی وہ آیندہ بغیر قوانین فطرت کے خرق کے نہیں واقع ہو سکتی"

---

[1] فہم انسانی باب ۲ [2] ہکسلے کی کتاب "ہیوم" باب (متعلق معجزات) [3] انگریزی میں معجزہ کے لیے جو لفظ مستعمل ہے (مرکیل) اس کے لفظی معنی بھی "حیرت انگیز" کے ہیں۔

ہکسلے کا ایک نہایت دلچسپ مضمون "ممکنات و ناممکنات" ہے، اس میں بھی ہیوم اس کے پیش نظر ہے، اور اپنی حکیمانہ ذمہ داری کے پورے احساس و شعور کے ساتھ لکھتا ہے[1] کہ

"صحیح معنی میں بجز تناقض کے اور کسی بھی ایسی چیز سے میں واقف نہیں ہوں جس کو "ناممکن" کہنا حق بجانب ہو۔ منطقی ناممکنات کا وجود ہے لیکن طبیعی ناممکنات کا قطعاً کوئی وجود نہیں "مربع مدور، ماضی موجود، دو متوازی خطوط کا تقاطع" یہ چیزیں ناممکنات سے ہیں، اسلیے کہ "مدور موجود یا حاضر اور تقاطع" کا تصور ہی "مربع" "ماضی اور متوازی" کے تصور کے متناقض ہے، لیکن پانی پر چلنا، یا پانی کو شراب بنا دینا، بچہ کا بے باپ کے پیدا ہونا، مردہ کو زندہ کر دینا یہ چیزیں مفہوم بالا کی رو سے "ناممکنات سے نہیں ہیں"۔

"ہاں اگر ہم یہ دعوی کر سکتے کہ فطرت اشیا کے متعلق ہمارے علم نے تمام ممکنات کا کامل احاطہ کر لیا ہے تو شاید یہ کہنا بجا ہوتا کہ آدمی کے صفات چونکہ پانی پر چلنے یا ہوا میں اڑنے کے متناقض ہیں، اس لیے یہ افعال اس کے لیے "ناممکن" ہیں۔ لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ علم فطرت کی انتہا تک پہنچنا کیسا ابھی تک ہم اس کی ابتدا اور ابجد سے آگے نہیں بڑھے ہیں، بلکہ ہماری قوتیں اس قدر محدود ہیں کہ کبھی بھی ہم ممکنات فطرت کی حد بندی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ واقع ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے، اس کا ہم کو علم ہے، باقی جو کچھ واقع ہونے والا ہے، اس کی نسبت ہم صرف ایک توقع قائم کر سکتے ہیں جس کی بنیاد کم و بیش گذشتہ تجربے کے صحیح سمجھنے پر ہے جس سے ہم کو خیال ہوتا ہے کہ مستقبل ماضی کے مماثل ہوگا۔"

---

[1] ص ۱۹۷

اس میں شک نہیں کہ کچھ دن پہلے بعض گوشوں سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں کہ "کائنات کا ہر ذرہ قانون کا پابند ہے۔" اور "وہم وبے عقلی انسان کی بدترین دشمن ہے، اور عقل وحکمت بہترین دوست، لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جہاں کہیں عقیدۂ معجزات کا پتہ چلے اس پر حملہ کریں[1]۔"

لیکن یہ باتیں قریباً چوتھائی صدی قبل کی ہیں[2]، ۱۹۲۷ء کے بعد کوانٹم[3] نظریہ کی بدولت سائنس میں جو بھونچال آیا ہے اس نے سائنس کی دنیا میں بھی اب ایسے بے باکانہ ومدعیانہ نعروں کی گنجائش نہیں چھوڑی، فلسفہ میں تو علت ومعلول کے لزوم ووجوب کی بنیاد دلیل کو ہیوم کیا، ہیوم سے صدیوں پہلے امام ابوالحسن اشعری ہی نے کھوکھلا کردیا تھا، البتہ سائنس کی بنیاد وہی فطرت کی یکسانی یا علیت کے اٹل قانون پر رکھی اور سمجھی جاتی تھی، اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ خود سائنسی تجربات واختبارات ہی کی راہ سے یہ اٹل قانون نہ صرف مجروح ومتزلزل ہوگیا ہے، بلکہ سر آرتھر ایڈنگٹن جیسے اکابر سائنس کے نزدیک اس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا پڑا ہے، چند سال قبل دنیا کے سائنس کے تازہ ترین معلومات وخیالات پر "ماڈرن بلیف[4]" کے نام سے رسائل کا ایک سلسلہ شائع ہوا تھا، اسکے جستہ جستہ یہ اقتباسات پڑھو کر

"کوانٹم نظریہ نے بڑا زبردست انقلاب برپا کردیا ہے، کہ مادی دنیا میں اب تک علت ومعلول کے قانون کی فرمانروائی کو اٹل تصور کیا جاتا تھا، سارے طبعی واقعات وحوادث

---

[1] Wonders of life (عجائبات حیات) از ہیگل باب ۳ معجزات [2] معجزات پر سیرت کا یہ ٹکڑا آج (۱۹۵۵ء) سے ۲۴ سال قبل لکھا گیا تھا [3] پورا نام Outline of Modern Beliefs

بالکلیہ جبری یا وجوبی قوانین کے تابع یقین کیے جاتی تھی، سلسلۂ علل ومعلولات میں کہیں کوئی خلل و رخنہ نہ تھا، مگر ۲۷ء میں اس خیال ویقین کو سخت دھکا لگا، اور ماہرین طبیعیات نے دیکھا کہ علیت کے وجوب وکلیت کو مادی دنیا سے رخصت کرنا پڑا، اور سارے قرائن اسی کے نظر آتے ہیں کہ وجوبی وقطعی علیت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا،

ابھی بالکل حال حال تک قانون علیت کو سائنسی تحقیقات کا بالاتفاق بنیادی اصول قرار دیا جاتا تھا، لیکن اب اسی اصول کو ترک کر دینے کا سوال پیدا ہوگیا ہے، کہ آیا کارخانۂ فطرت میں ہر واقعہ لزوماً کسی ایسے دوسرے واقعہ ہی سے پیدا ہوتا ہے، جس کو علت کہا جاتا ہے؟ یا اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حوادثِ فطرت کی تہ میں کوئی ایسی شے کارفرما ہے جس کو اختیار یا آزادی ارادہ کہا جاتا ہے،

ماحصل یہ کہ اس وقت تک طبعی مظاہر کی تحلیل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہم کو کہیں بھی وجوبی یا جبری قانون کی موجودگی کی شہادت نہیں ملتی، (بحوالہ جرنل آف فلاسفی بابتہ ۳۳ء)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوانین فطرت کا سرے سے کوئی وجود نہیں، بلکہ "ان" کی حیثیت اعداد وشمار کے لیے قوانین کی رہ جاتی ہے۔ زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں کوئی ایسا قانون نہیں جانتی ہیں کہ فلاں شخص چالیس برس کی عمر میں مرجائیگا، لیکن اتنا جانتی ہیں کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد آدمی چالیس کے سن میں مرجائینگے، یعنی افراد

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۵) مرتبہ جے رڈبلو، ان سولیوان (Sullivan) واٹر گریرسن (Grierson) حصۂ چہارم باب ۶ ص ۲۸۵

کامل نا قابل پیش بینی ہونے کے باوجود جماعت کی نسبت پیش بینی ممکن ہے بس قوانین فطرت فقط اسی معنی میں موجود ہیں اور سائنسی پیش گوئی یا پیش بینی ہو سکتی ہے[1]۔

بالفاظ دیگر قانونِ فطرت کی نوعیت در اصل قانون عادت کی ہے، یعنی کسی خاص فرد کے بارے میں وجوباً پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ وہ فلاں عمر میں مرجائے گا، البتہ عادۃً یہ معلوم ہے کہ "کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد چالیس سال کی عمر میں مرجائیں گے" مذہب کی زبان میں اسی قانون عادت کو عادۃ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی بنا پر بھی عللِ فطرت کی یکسانی یا قوانینِ فطرت کے نفس وجود کا انکار نہیں لازم آتا، البتہ ان قوانین کا منشا اندھے بہرے بے علم و اختیار مادہ کا اٹل وجوب و لزوم سے نہیں، بلکہ ایک علم اختیار روالی ذات (اللہ تعالیٰ) کی عادتِ جاریہ سے ہے، جو کسی حکمت و مشیت کے تحت کبھی کبھی اس عادتِ جاریہ کے خلاف بھی کر سکتی اور کرتی ہے، یہی معجزہ ہے، اور بقول مشہور سائنسداں ڈاکٹر کارپنٹر کے کہ قائل مذہب سائنسداں کو اس کے ماننے میں کوئی عقلی دشواری نہیں پیش آ سکتی کہ خالق فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف بھی کر دے سکتا ہے، ہم کو معجزات کے خلاف اگر سائنس کے کسی ایسے فتوے کا علم نہیں، جو معتبر شہادت کی موجودگی میں ان کے قبول سے مانع ہو،[2]

جب کارپنٹر کے زمانہ ہی میں سائنس کا کوئی ایسا فتویٰ معلوم نہ تھا، تو اب کوانٹم نظریہ

---

[1] پورا نام Outline of Modern Belief ص ۶، مترجمہ ڈبلو ان سولیوان (Sulivan)

[2] دیکھو فرانک بیلارڈ کی The miracle of unbelief حصہ چہارم باب ۱۲ ص ۳۰ و اڈگریرسن (Grierson)

کے بعد جبکہ کلام و فلسفہ کے نرے قیاسات سے گذر کر خود سائنس کی دنیا میں اور سائنس ہی کی راہ سے فطرت یا علّیت کے نام نہاد اٹل قوانین کا وجود اتنا مشتبہ ہوگیا ہے کہ مادی دنیا سے بظاہر ان کو ہمیشہ کے لیے رخصت کرنا پڑ رہا ہے، تو اور بھی سائنس کا یا قوانینِ فطرت کے خرق کا نام لے کر کسی معجزہ کا انکار کس منہ سے کیا جا سکتا ہے، لہٰذا بقول کارپنٹر ہی کے "اصل سوال صرف یہ ہے کہ آیا اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے یا نہیں، جس سے معلوم ہو کہ خالقِ فطرت کبھی کبھی خلافِ فطرت بھی کر دیا کرتا ہے[1]"

یہ صرف ممکن ہی نہیں ہے کہ خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف کر سکتا ہے، یعنی معمولی سلسلۂ علل و اسباب و معلولات کو توڑ سکتا ہے، بلکہ ایک اور نامور عالم طبیعیات پروفیسر ڈالبیر[2] کا اعتراف یہ ہے کہ اس امر کی ہمارے پاس خاصی شہادت موجود ہے جس کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض طبعی حوادث اس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے تمام معمولی علل و اسباب غائب ہوتے ہیں، اجسام حرکت کرتے ہیں، درانحالیکہ نہ کوئی شخص ان کو چھو رہا ہے، اور نہ برقی یا مقناطیسی عوامل کا پتہ ہے..... اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ ایک نفس کا خیال دوسرے نفس میں (بلا کسی وساطت کے) پہنچ جا سکتا ہے، اور جس قسم کے واقعات کو معجزہ سمجھا جاتا تھا ان کا وقوع اب غیر اغلب نہیں رہا ہے، ہکسلے کو اگرچہ اس بارے میں ہیوم سے شدید اختلاف ہے کہ "معجزہ نام قوانینِ فطرت کے

---

[1] دیکھو فرانک بیلارڈ کی The miracle of unbelief [2] دیکھو اسکی کتاب Matter, Ether, Motion (مادہ، ایتھر، حرکت)

خرق کا ہے۔" لیکن تصریحات بالا سے قانونِ فطرت کی جو حقیقت ثابت ہوتی ہے، اُسکو اگر وضاحت کے ساتھ سامنے رکھا جائے تو ہمارے نزدیک معجزہ کی یہ تعریف چنداں قابلِ اعتراض نہیں رہ جاتی۔

(۱) قوانین فطرت عبارت ہیں قوانینِ عادت سے،

(۲) جو ہم کو بذات خود اشیا کے اندر نہیں معلوم بلکہ انکی بنیاد تمامتر گذشتہ تجربہ پر ہوتی ہے، جس کے خلاف ہونا ہمیشہ ممکن ہے، اور کسی اصلی استحالہ کو متلزم نہیں،

(۳) لہذا قوانینِ فطرت کے خلاف ہونا (یعنی ان کا خرق) بذاتِ خود ممکن اور عقلاً جائز، بہ الفاظ دیگر یہ کہ معجزہ عقلاً بالکل جائز و ممکن ہے۔

شہادت معجزات

امکان، وقوع کے لیے کافی نہیں | لیکن کسی امر کا صرف عقلاً جائز و ممکن ہونا اس کے وقوع کی دلیل نہیں، یہ عقلاً بالکل جائز و ممکن تھا کہ اکبر ہندوستان کے ساتھ انگلستان کا بھی بادشاہ ہوتا، مگر واقعاً ایسا نہیں کسی شے کے وقوع کو قبول کرنے کے لیے دو صورتیں ہیں (۱) غیر مشتبہ مشاہدہ یا (۲) تشفی بخش شہادت، غیر مشتبہ مشاہدہ کی صورت میں کوئی شے بحث طلب نہیں رہ جاتی، مثلاً

"آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک سفر میں حضرت جابرؓ سے وضو کا پانی طلب فرمایا، انھوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈھا، پانی نہیں ملا، انصار میں ایک شخص تھے، جو خاص طور پر آپ کے لیے پانی ٹھنڈا کر کے رکھتے تھے، حضرت جابرؓ نے آپ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی تو آپ نے انکو ان انصاری کے پاس بھیجا لیکن اُن کے پاس بھی اسقدر کم پانی نکلا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصہ ہی میں جذب ہو کر رہ جاتا، حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکی خبر دی تو آپنے اس برتن کو منگا بھیجا اور ہاتھ میں لیکر کچھ پڑھا، اور اسکو ہاتھ سے دبا دیا، پھر حضرت جابرؓ کو برتن دیا، اور طشت طلب فرمایا، آپنے ہاتھ کی انگلیاں پھیلائیں اور اس طشت کے اندر رکھ کے حضرت جابرؓ کو حکم دیا کہ بسم اللہ کہکر آپکے ہاتھ پر پانی گرائیں، حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا، پہلے آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی اُمڈا، پھر تمام طشت بھر گیا، یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہو گئے، اس کے بعد آپنے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرا رہ گیا۔"[1]

---

[1] دیکھو کتاب ہذا، بیان عام معجزات،

اب اگر حضرت جابرؓ نے اس واقعہ کو بچشم خود مشاہدہ کیا، اور ان کو اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہیں تھا تو ظاہر ہے کہ ان کو اس کے یقین وقبول میں کیا تامل ہو سکتا تھا، البتہ ہمارے لیے اس کے باور کرنے میں یہ بحث پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ فی نفسہٖ ممکن ہے یا ناممکن، اور حضرت جابرؓ کی شہادت کہاں تک قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے،

لہٰذا **امکانِ معجزات** کا مرحلہ طے ہو چکنے کے بعد دوسری بحث **شہادتِ معجزات** کی پیدا ہوتی ہے،

ہیوم کا فتویٰ

ہیوم کا روایاتِ معجزہ کے متعلق اگرچہ آخری فتویٰ یہی ہے کہ اس کے اثبات کے لیے انسانی شہادت کی کوئی کمیت وکیفیت نہیں کافی ہو سکتی، تاہم نفس خارقِ فطرت واقعات کے لیے اس کے نزدیک بھی انسانی شہادت کا ایک درجہ ایسا موجود ہے جس کی بناپر ان کو قبول کیا جاسکتا ہے،

فرض کرو کہ تمام زبانوں کے تمام مصنفین اس پر متفق ہوں کہ یکم جنوری سنہ ۱۶۰۰ء سے لیکر آٹھ دن تک برابر تمام روے زمین پر تاریکی چھائی رہی، یہ بھی فرض کرو کہ اس خارقِ عادت واقعہ کی روایت آج تک لوگوں کی زبان پر ہے، اور دوسرے ممالک سے جو سیاح آتے ہیں وہ بے کم وکاست، اور بلا شائبۂ تناقض وہاں کے لوگوں کی یہی روایت بیان کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانہ کے حکما کا کام شک کے بجائے اس واقعہ کا یقین کرکے اس کی توجیہ اور اس کے علل واسباب کی جستجو ہوگی، کائناتِ فطرت میں زوال وانحطاط، فنا و فساد کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اگر کسی حادثہ سے اس کی

تباہی کے آثار پائے جائیں تو اس کے بارے میں انسانی شہادت قابلِ قبول ہوگی بشرطیکہ یہ شہادت نہایت وسیع، متواتر اور متفق علیہ ہو۔"[1]

ہیوم کا تعصب

اب اگر یہی واقعہ کسی نبی کی طرف منسوب کر کے معجزہ قرار دیا دیا جائے تو ہیوم کے نزدیک اس پر یقین کرنے کے لیے کوئی انسانی شہادت قابلِ قبول نہ ہوگی، کیوں؟ اسلیے کہ "اس قسم کی شہادت خود اپنی تکذیب ہے،" حتیٰ کہ "جس معجزہ کی بنا کسی انسانی شہادت پر ہو، وہ حجت واستدلال کے بجائے محض تمسخر انگیز چیز ہے۔" مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک وخرافات افسانوں کے دام میں آجاتے ہیں، لہذا مذہب کی طرف نفس انتساب ہی معجزہ کے حیلہ، وفریب ہونے کا پورا ثبوت ہے، مذہب جیسی مقدس شے کی تائید میں لوگ بے ضرر کذب وافترا سے باک نہیں کرتے، پیمبر (معاذ اللہ) عزت پیمبری کے شوق میں ہر طرح کے خطرات کو گوارا کرسکتا اور مکر واحتیال پر آمادہ ہوسکتا ہے، انسان زود اعتقاد اور بالطبع عجائب پسند ہے، معجزات کا قبول عام اور بہ آسانی شائع وذائع ہوجانا خود ہی بات کا کافی ثبوت ہے کہ انسان میں عجائب پرستی کا کیسا شدید میلان ہے، اور اسلیے عجائب پرستی کے تمام بیانات کو بجا طور پر اشتباہ کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے، پھر معجزات اور فوق الفطرت باتوں کے خلاف ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد زیادہ تر جاہل اور وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے، ایک عقلمند آدمی پرانے زمانہ کی حیرت زا تاریخوں کو پڑھ کر پکار اٹھتا ہے کہ عجب بات ہے کہ اس قسم کے خارقِ عادت واقعات ہمارے زمانہ میں نہیں ظاہر ہوتے، ان ہی

---

[1] فہم انسانی باب ۱۰

وجوہ کی بناپر دعویٰ ہو کہ مذہب کے نام سے جتنے معجزات بیان کیے جاتے ہیں، وہ سب کے سب محض خرافات اور انسان کی اوہام پرست فطرت کا ڈھکوسلا ہیں[1]،

بلاشبہہ شہادت کی جرح و تعدیل اور تحقیق و تنقیح کے وقت یہ تمام امور قابل لحاظ ہیں لیکن کیا ان میں سے کوئی ایک شے بھی ایسی ہے جس کی بناپر محض معجزہ یا مذہب کا نام آتے ہی کسی غیر معمولی و خارقِ عادت واقعہ سے انکار کر دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ مذہب کے نام سے ہیوم کا یہ ایسا ناقابل حمایت اور صریح تعصب تھا جس کے لیے صدائے تائید حکمت و فلسفہ کے سنجیدہ حلقوں سے نہیں اٹھ سکتی تھی، اور اگر کسی معجزہ کی تصدیق میں تشفی بخش شہادت موجود ہو تو اس کے قبول سے محض معجزہ ہونے کی بناپر کسی عاقل کو انکار نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک سفر میں

صحابہؓ بھوک سے اسقدر بیتاب ہوئے کہ اونٹنیاں ذبح کرنا چاہیں، لیکن آپ نے تمام لوگوں کے زادِ راہ کے جمع کرنے کا حکم دیا، ایک چادر بچھائی گئی، اور اس پر تمام زادِ راہ ڈھیر کیا گیا، اس تمام سامان کی مجموعی تعداد نے صرف اسقدر زمین کا احاطہ کیا جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی، اور اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی، لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھالیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے[2]"

کافی شہادت | اب اس روایت میں اگر ان امور کی کافی شہادت مل جائے کہ (۱) تمام زادِ راہ صرف ایک بکری کے بیٹھنے بھر کی جگہ میں آگیا تھا (۲) اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی (۳) سب لوگوں نے سیر ہو کر کھالیا (۴) اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے، تو ہکسلے جیسے حکیم و فلسفی تک کو اس روایت کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

---

[1] یہ تمام قریب قریب ہیوم ہی کے الفاظ ہیں جو تم کو اسکے مضمون "معجزات" میں جابجا ملیں گے [2] دیکھو کتاب ہذا بیان عام معجزات

چنانچہ اسی نوعیت کا ایک معجزہ حضرت مسیحؑ کا انجیل میں مذکور ہے، کہ پانچ روٹیوں اور مچھلیوں سے پانچ ہزار آدمیوں کا پیٹ بھر گیا، اور پھر بھی اتنے ٹکڑے بچ رہے جنکو جمع کرنے سے بارہ ٹوکریاں بھر گئیں[1]۔ لیکن اس معجزہ کے باور کرنے میں روایۃً و درایۃً جو دشواریاں نظر آتی ہیں ان کو پوری طرح واضح کرنے کے بعد بھی ہکسلے نے لکھا ہے کہ

"اگر یہ ثابت ہو جائے کہ (۱) کھانا شروع کرتے وقت روٹیوں اور مچھلیوں کا وزن کیا تھا (۲) ۵ ہزار آدمیوں میں یہ تقسیم کی گئیں، بلا اس کے کہ ان کی کمیت یا کیفیت میں کوئی اضافہ ہوا ہو (۳) تمام آدمی واقعاً پوری طرح آسودہ ہوگئے (۴)، اسکے بعد ٹوکریوں میں جو ٹکڑے جمع کیے گئے، ان کا وزن کیا تھا، تو پھر ممکنات و ناممکنات کے بارہ میں میرے موجودہ خیالات کچھ ہی ہوں، لیکن مذکورہ بالا چار چیزوں کی تشفی بخش شہادت کے بعد مجکو ماننا پڑے گا کہ پچھلے خیالات غلط تھے، اور اس معجزہ کو ممکنات فطرت کی ایک نئی اور خلافِ توقع مثال سمجھوں گا۔"[2]

غرض معجزہ نہ صرف فی نفسہ ایک ممکن الوقوع شے ہے، بلکہ "تشفی بخش شہادت" کی بنا پر اسکے وقوع کا یقین بھی کیا جا سکتا ہے، اس کے بعد یہ بحث رہ جاتی ہے کہ آیا مذہبی یا تاریخی کتابوں میں جو معجزات مذکور ہیں، ان کے یقین کرنے کے لیے "تشفی بخش شہادت" موجود ہے۔

اس سوال کا جواب ہیوم کو تو نفی میں دینا ہی چاہیئے تھا لیکن یہاں پہنچکر ہکسلے بھی سپر افگندہ ہو جاتا ہے، اور ہیوم کے جواب سے لفظاً و معنیً کامل طور پر اتفاق کر لیتا ہے۔[3]

---

[1] یوحنا باب ۶۔ آیات ۵۔۱۴ [2] مقالات ہکسلے جلد ۵ صفحہ ۲۰۳ [3] ایضاً صفحہ ۲۰۷

"یہ سچ ہے کہ معجزات کے ناممکن ہونے کا دعویٰ نہیں ثابت کیا جا سکتا، لیکن مجھکو کوئی ایسی شے

قطعاً نہیں معلوم، جس کی بنا پر میں ہیوم کے اس وزنی فتویٰ میں کچھ ترمیم کر سکوں کہ

"تاریخ کے سارے دفتر میں ایک بھی ایسا معجزہ نہیں ملتا جس کی تصدیق و تائید

میں ایسے فہمیدہ، باہوش اور تعلیم یافتہ لوگوں کی کافی تعداد موجود ہوں جن کے خود فریب و

مغالطہ میں پڑنے کا ہم کو اندیشہ نہ ہو جن کی راست بازی اس درجہ غیر مشتبہ ہو کہ کسی مصلحت

کی بنا پر دوسروں کو فریب دہی کا ان پر گمان نہ ہو سکے، جو لوگوں کی نگاہ میں ایسی عزت و

شہرت رکھتے ہوں کہ اگر ان کا جھوٹ کھل جائے تو ساری عزت خاک میں مل جائے

ساتھ ہی جن واقعات کی وہ روایت یا تصدیق کر رہے ہیں وہ ایسے علی الاعلان طریقے

سے اور ایسے مشہور مقام پر واقع ہوئے ہوں کہ ان کی نسبت دروغ بیانی چھپ ہی

نہ سکے، حالانکہ انسانی شہادت کو قطعی بنانے کے لیے یہ تمام باتیں ضروری ہیں۔"

ہیوم نے کہنے کو تو کہدیا کہ قبول معجزات کے لیے جس درجہ کی شہادت درکار ہے، اسکا تاریخ

کے دفتر میں کہیں پتہ نہیں لیکن معجزات کے عدم قبول کی کیا واقعاً یہی وجہ ہے؟ اور کیا اس نے

اپنے اس دعویٰ کی چند ہی صفحات آگے بڑھ کر خود تردید نہیں کر دہی ہے؟

فرانس میں کوئی "مشہور درگاہ ہے" جس کے تقدس پر (بقول ہیوم) لوگ مدتوں

فریفتہ رہے ہیں۔"

"بہروں کو سماعت، اندھوں کو بصارت مل جانا، اور بیماریوں کا اچھا ہو جانا، اس مقدس

درگاہ کی معمولی کرامتیں تھیں، جن کا ہر گلی کوچے میں چرچا رہتا تھا، لیکن سب سے حیرت انگیز اور

غیر معمولی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی کرامتیں ایسے اشخاص کو حَکَم یا ثالث بنا کر اُن کے رو برو ثابت کر دکھائی گئی ہیں، جن کی دیانت پر حرف رکھنا ناممکن ہے، پھر ان پر ایسے گواہوں کی مہر تصدیق ثبت ہے، جن کی شہرت و سند مسلّم ہے، جس زمانہ میں ان کرامتوں کا ظہور ہوا وہ علم کا زمانہ ہے، اور جگہ بھی ایسی جو دنیا کا مشہور ترین خطہ ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ کرامتیں چھاپ چھاپ کر ہر جگہ شائع کی گئیں، باایں ہمہ یسوعی فرقہ تک کو انکی تکذیب یا پردہ دری کی مجال نہ ہوئی، حالانکہ یہ لوگ خود اہل علم تھے، مجسٹریٹ ان کی حمایت پر تھا، اور ان خیالات کے جانی دشمن تھے، جن کی تائید میں یہ معجزات پیش کیے جاتے تھے، اب

یہ بتاؤ کہ کسی امر کی توثیق و تصدیق کے لیے اتنی تعداد میں موافق حالات ہم کو کہاں میسر آسکتے ہیں، اور ان دل بادل شہادتوں کے خلاف ہمارے پاس بجز اس کے اور کیا دلیل ہو کہ

یہ واقعات بذات خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارقِ فطرت ہیں، اور معقول پسند آدمیوں کی نگاہ میں انکی تردید کے لیے بس یہی ایک دلیل کافی ہے،[1] اللّٰھم احفظنا من شرورِ انفسنا!!

ہیوم کا صریح تناقض | ایک ہی مضمون کے اندر ایسے زبردست فلسفی کی ایسی صریح تناقض بیانی جس قدر حیرت افزا ہے، اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز ہے، بات یہ ہے کہ انسان کا یقین ہمیشہ اس کی منطق کا ساتھ نہیں دیتا، جبریہ اس کے قائل ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے، اور اس دعویٰ پر انھوں نے اٹل سے اٹل دلائل قائم کر دیے ہیں، تاہم دیکھو کہ ۲۴ گھنٹے کی زندگی میں وہ خود کتنے لمحے، ان دلائل کی بنا پر، اپنے کو مجبور محض یقین کرتے ہیں، ہیوم کے دلائل

[1] فہم انسانی باب ۱۰، قابل توجہ فقرات کو زیر خط میں مؤلف ہذا نے کیا ہے

فلسفہ نے بیشک یہ ثابت کر دیا کہ معجزہ فی نفسہ ناممکن نہیں لیکن پھر بھی دل سے یہ کھٹک نہیں نکلتی کہ یہ واقعات (معجزات) بذات خود ناممکن اور سراسر خارق عادت ہیں۔" اور ان کی تردید کے لیے بس یہی ایک دلیل کافی ہے، فرانس کی درگاہ کے متعلق جو کرامتیں مشہور ہیں ان کی توثیق و تصدیق کے لیے اسی درجہ کی شہادت اس کو مل گئی جس کا چند صفحہ پہلے اسکے نزدیک تاریخ کے بارے دفتر میں وجود نہ تھا لیکن پھر بھی ان کرامتوں سے قطعی انکار ہے،

لہٰذا معلوم ہوا کہ معجزات کا یقین کرانے کے لیے کسی معجزہ یا کرامت کی تائید میں صرف ممکن سے ممکن انسانی شہادت کا مہیا کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ پہلے اس کے عدم امکان کا وسوسہ پوری طرح ذہن سے نکالنا چاہیے، اور پھر خود یقین کی ماہیت و اسباب پر بحث کرنی چاہیے۔

انتہائی استبعاد | اوپر اگرچہ ہم نے ہیومؔ کی اس تعریف میں چنداں مضائقہ نہیں خیال کیا تھا کہ معجزات نام ہے خارقِ فطرت واقعات کا لیکن تم نے اقتباس بالا کے آخری زیر خط جملہ میں دیکھ لیا کہ "خارق" کا لفظ کس قدر گمراہ کن ہے، خود ہیومؔ ہی کے فلسفہ کی رو سے معجزات کا بالذات ممکن ہونا قطعی طور پر محقق ہو چکا ہے، پھر بھی اس کی زبان قلم اس لغزش سے اپنے کو نہیں بچا سکتی کہ واقعات (معجزات) بذات خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارقِ فطرت ہیں۔" اصل یہ ہے کہ نفسی ایتلافات کی بنا پر ہمارے ذہن میں یہ غلط خیال بے طرح جاگزیں ہو چکا ہے کہ فطرت یا قانونِ فطرت ایک اٹل[1] اور ناممکن التغیر شے ہے، اس لیے کسی واقعہ کو "خارقِ فطرت" کہنے

---

[1] دیکھو صفحات بالا،

ہی اس کے ناممکن ہونے کا تصور ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے،

لہذا جب یہ مختتم طور ثابت ہو چکا ہے کہ خود معجزہ کی ذات میں عدم امکان داخل نہیں ہے، بلکہ "تشفی بخش شہادت" کی موجودگی میں اس کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ تو اس کو خارقِ فطرت کی گمراہ کن تعبیر کے بجائے ہلکسلے کے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ "انتہائی حیرت انگیز" واقعہ کہا جا سکتا ہے، لیکن "انتہائی حیرت انگیز" سے بھی مناسب تر تعبیر انتہائی مستبعد کی ہوگی۔

استبعاد معجزات

فطرت کی یکسانی ایک عام خیال جو اس "حیرت انگیزی" میں اضافہ کرتا ہے، یہ ہے کہ کارخانۂ فطرت کے تمام پرزے ہمیشہ اور ہر حالت میں یکساں ہی نتائج پیدا کرتے ہیں، حکما جب تک فطرت کی یک رنگی پر زور دیتے ہیں تو اسی مغالطہ میں مبتلا نظر آتے ہیں حتیٰ کہ مل کو اپنی منطق[1] میں اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ فطرت کی کارفرمائی ہمیشہ یکسانی پر مبنی ہوتی ہے، ہم خود غور کریں تو کچھ نہ کچھ مثالیں ایسی سامنے آتی رہتی ہیں جن سے یہ مغالطہ دور ہو جانا چاہیے، ابھی آج ہی اخبار پڑھتے وقت اس قسم کے دو واقعے نظر پڑے[2]۔

عورتوں کے علی العموم بوقتِ واحد ایک لڑکا ہوتا ہے، یا کبھی کبھی دو، لیکن حال میں مکسکو (امریکہ) میں ایک عورت کے ایک ساتھ آٹھ لڑکے پیدا ہوئے، ایک دوست سے اس واقعہ کا ذکر آیا، تو انھوں نے کہا، کچھ عرصہ ہوا کہ برہما میں ایک عورت کے چھ لڑکے

---

[1] نظام منطق کتاب ۳ باب ۳ [2] یہ دونوں واقعہ آج ۲۷ فروری ۱۹۲۲ء کے لیڈر میں مذکور ہیں۔

ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی،

طبی دنیا کا عام تجربہ ہے کہ جب خون کی حرارت ۱۰۷ یا ۱۰۸ درجے پہنچ جاتی ہو تو آدمی نہیں بچتا، لیکن برسٹل میں انفلوائنزا کی مریض ایک لڑکی کا بخار ۱۱۴ درجے تک پہنچ گیا، پھر بھی وہ اچھی ہوگئی اور زندہ ہے، خود حیرت زدہ ڈاکٹر کی شہادت ہے کہ

"جب وہ پہلی دفعہ اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے بلایا گیا تو اس کی حرارت ۱۱۲ نکلی، خیال ہوا کہ تھرمامیٹر میں کچھ نقص ہے، دوسرا تھرمامیٹر منگا کر لگایا تو پھر وہی ۱۱۲۔ ڈاکٹر کو اب بھی یقین نہ آیا، اس نے دو تھرمامیٹر اور آزمائے، بالآخر یقین کرنا پڑا کچھ علاج سے بخار اپنی معتدل حالت پر آگیا، لیکن رات کو پھر بڑھ گیا، اور دوسرے دن صبح کو جب ڈاکٹر نے دیکھا تو ۱۱۴ تھا حیرت کی انتہا نہ رہی، بہرحال علاج سے فائدہ ہوا، اور اب مریضہ خاصی رو بصحت ہے۔"

ترکونومتی (ٹرگنامیٹری) یا "مساحۃ المثلثات" وغیرہ ریاضیات عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دیجاتی ہے، ۱۰-۱۱ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ اسکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں، اُن کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے، جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و محنتی اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلّم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے، وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳-۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر پاتے ہیں،

لیکن گذشتہ سال اکتوبر میں (۷) اکاتار، لیڈر) راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدراسی لڑکے کا "معجزۂ ریاضیات" (اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی علم کی مدد کے

اعلیٰ الجبرا، ٹریگونومیٹری، تحلیلی اقلیدس (جامیٹری)، وغیرہ از خود حاصل کی ہے،

ولادتِ مسیحؑ (بے باپ کے)، یا احیاے موتی سے بڑھ کر کس شے میں انتہائی استبعاد یا اعجاز ہو سکتا ہے، لیکن سائنس کی تحقیقات نے (جس کے نزدیک انسان کی حقیقت حیوانِ عالم سے زیادہ نہیں)، حیوانات ہی کے اندر اُس کے نظائر بھی تلاش کر لیے، چنانچہ ہکسلے جیسے سائنسداں نے **معجزات** ہی کے ضمن میں لکھا ہے کہ

"مریمؑ کے کنوارپن میں مسیحؑ کا پیدا ہونا، تو یہ نہ صرف ممکن التصور شے ہے، بلکہ علم الحیات کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ بعض اصنافِ حیوانات میں یہ روزانہ کا واقعہ ہے، یہی حال احیاے موتیٰ کا ہے بعض جانور مر کر مومیات کی طرح بالکل خشک ہو جاتے ہیں اور عرصہ تک اسی حالت میں رہتے ہیں لیکن جب ان کو مناسب حالات میں رکھدیا جاتا ہے تو پھر جان آجاتی ہے[۱]"

ایجاداتِ سائنس | یہ تو سائنس کا علمی و تحقیقاتی پہلو تھا، ایجادی و اختراعی پہلو نے بھی اس سے کم "انتہائی حیرت انگیز" اعجاز نمائیاں نہیں کی ہیں،

لاسلکی ذریعۂ پیغام رسانی کی ایجاد سے پہلے یہ کس قدر مستبعد بلکہ ایک حد تک ناقابلِ تصوربات تھی کہ آپ بمبئی میں بیٹھے ہیں اور آپ کا دوست لندن میں، درمیان میں ہزارہا میل سمندروں کی پہنائی حائل ہے، تار وغیرہ کوئی محسوس شے آپ دونوں کے مابین رابطہ نہیں، پھر بھی چشم زدن میں آپ اس کو اپنا پیام پہنچا دے سکتے ہیں، ایک منٹ میں ۶۰ سکنڈ ہوتے ہیں، ایک سکنڈ کے بھی ۱۶ حصے کیجئے، اور اس سولھویں حصہ میں یہ پیام

---

[۱] مقالات ہکسلے ج ۵ ص ۱۹۹

۱۲ ہزار میل سے زائد کی مسافت طے کر سکتا ہے[1]،

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ آپ صرف پیام ہی نہیں پہنچا سکتے ہیں، بلکہ حال میں ایک فرانسیسی سائنسداں نے اس معجزہ کا دعویٰ کیا ہے کہ بمبئی میں اپنے میز پر بیٹھے بیٹھے آپ اسی لاسلکی کے ذریعہ سے لندن، پیرس، یا نیویارک میں چک پر اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، قریب قریب (یعنی سیکڑوں میل) کے مقامات تک اس کے کامیاب تجربات ہو بھی چکے ہیں[2]۔

تنویم | **طبیعیات** کے ان کرشموں کو دیکھ چکنے کے بعد اب ذرا **نفسیات** کے اس شعبہ کی تحقیقات کو سامنے لایئے جس کا نام **ہپناٹزم** ہے، عربی میں اس کو تنویم مقناطیسی کہتے ہیں لیکن ہم صرف تنویم یا عملِ تنویم سے تعبیر کریں گے۔

اس عمل کی کرامات ہمارے زمانہ کے ایک نہایت ہی بلند پایہ محقق نفسات پروفیسر ولیم جیمس کے الفاظ میں یہ ہے:

"عامل تنویم اپنے معمول سے جو کچھ بھی کہتا ہے اس کو وہ یقین کر لیتا ہے، اور جس چیز کا حکم کرتا ہے اس کو بجا لاتا ہے، حتیٰ کہ جو چیزیں معمولی حالت میں آدمی کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں وہ بھی عامل کے حکم سے واقع ہو سکتی ہیں، مثلاً چھینکنا، چہرے کا سرخ یا زرد پڑ جانا، حرارت خون کا کم یا زیادہ ہو جانا، حرکت قلب میں تیزی یا سستی پیدا ہو جانا، وغیرہ وغیرہ۔"

تم معمول کو یقین دلا سکتے ہو کہ وہ یخ ہوا جا رہا، یا آگ میں جلا جا رہا ہے، تم اس کو آلو کھلاؤ لیکن یقین دلا سکتے ہو کہ شفتالو کھا رہا ہے، تم اسکو سرکہ پلا کر یقین دلا سکتے ہو کہ شراب پی رہا ہے،

---

[1] معارف [2] انڈین ریویو بابت جنوری ۱۹۲۲ء ص ۷۷

نوسادر میں، اسکو لونگنی کی بو محسوس ہوسکتی ہے، کرسی اس کو شیر نظر آسکتی ہے، جھاڑو اس کے لیے خوبصورت عورت بن جاسکتی ہے، راستہ کا شور اُسکو موسیقی معلوم ہوسکتا ہے..... جوان آدمی اپنے کو بچہ یا نپولین اعظم سمجھنے لگ سکتا ہے۔"

"سر یا دانتوں کا درد، دور کر دیا جاسکتا ہے، وجع مفاصل وغیرہ کے مریض کو اچھا کیا جاسکتا ہے، بھوک فنا کر دی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص نے ۴۸ دن تک کھانا نہیں کھایا........ جس چیز سے تم چاہو اسی چیز سے معمول بہرا یا اندھا ہو جاسکتا ہے، مثلاً فلاں لفظ وہ نہ سنے، لاکھ اس کے سامنے چیخو نہ سنے گا، یا فلاں آدمی کو وہ نہ دیکھے، اس کے سامنے کھڑا کرو، وہ نہ دیکھ سکے گا۔"[1]

اس عمل کے وقت معمول پر ایک نیند کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اسی لیے اس کا نام تنویم ہے، لیکن عمل کا اثر اس کیفیت کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے، مثلاً جس مرض کے لیے تم عمل کرو وہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جاسکتا ہے۔ یا فرض کرو کہ معمول سے تم یہ کہدو کہ آیندہ سال جنوری کی ۲۰ تاریخ کو صبح ۹ بجے اپنے پلنگ کے پاس ایک شیر کھڑا دیکھو گے، سال بھر کے بعد ٹھیک اسی وقت پلنگ کے پاس معمول کو شیر دکھائی دے گا،

گو عملِ تنویم کے تجربات زیادہ تر نیند کی کیفیت طاری کرنے کے بعد ہی کیے جاتے ہیں، لیکن اس کیفیت کا نمایاں طور پر طاری ہونا کامیابی عمل کے لازمی شرائط میں نہیں ہے، بلکہ ڈاکٹر مول کا خیال تو یہ ہے کہ ایسے معمول نسبتہً کم ہوتے ہیں، جن پر کیفیت نوم طاری

[1] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب "پرنسپلس آف سائیکالوجی" (اصولِ نفسیات) جلد دوم باب ۲۷

ہوتی ہو[1]، ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس عمل کا اثر افراد ہی تک محدود نہیں، بلکہ جماعتوں اور مجمعوں کو بھی متاثر کرسکتا ہے،

ڈاکٹر البرٹ **مول** کا ابھی نام لیا جاچکا ہے، اس جرمن فاضل کی کتاب "ہپناٹزم" اپنے موضوع پر سب سے بہتر نہایت محققانہ اور مستند خیال کی جاتی ہے، ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب میں دکھلایا ہے کہ بہت سے معجزات کی توجیہ نہایت آسانی کے ساتھ تنویم مقناطیسی سے کی جاسکتی ہے، معجزات ہی پر کیا موقوف ہے، سحر و عملیات تک کے صدہا عجائب کی گرہ کھل جاتی ہے، اور جن واقعات پر عقلانے اوہام و اباطیل کی مہر ثبت کردی تھی، وہ قوانین مادی کی طرح قوانین نفسی کے حقائق بن گئے ہیں،

معجزات شفا | بہت سے معجزات و کرامات کا تعلق امراض کی ایسی شفا سے ہے، جو طب کے مادی وسائلِ علاج پر مبنی نہیں، اور اس کے لیے مدعیانِ عقل کے ہاں اس کا نام "وہم پرستی" تھا لیکن آج تنویمی تحقیقات نے ایک نیا اور نہایت کامیاب اصولِ علاج منکشف کردیا ہے، جو عام مادی وسائل اور استعمالِ ادویہ سے قطعاً مستغنی ہے، اور اس بے دوا کے علاج سے بہرے شنوا ہوجاتے ہیں، پھیپھڑے اور سل کے امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے، آنکھوں کی بیماریاں جاتی رہتی ہیں، وجع مفاصل دور ہوجاتا ہے، زخم بھر آتے ہیں[2]، کیا اس کے بعد بھی **انجیل** کی روایات **مسیحائی** کو "محض خوش اعتقادی یا اکاذیب کا طومار" کہنا خود اپنے جہل مرکب کی گواہی نہ ہوگی؟

---

[1] ڈاکٹر مول کی کتاب "ہپناٹزم" ص ۳۹۲ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۹ء [2] ایضاً ص ۳۵۵

فرانس کی جس مشہور درگاہ کی کراماتِ شفا کا اوپر ذکر گذرا ہے، ہیوم نے معتبر سے معتبر شہادت کے باوجود ان کو "قطعاً ناممکن" قرار دیا تھا لیکن ڈاکٹر مول بلا کسی مطالبۂ شہادت کے قدیم مصری اور یونانی مندروں کی کراماتِ شفا کو تنویم ہی کا معجز نما نفسی اثر سمجھتا ہے[۱]، غرض جو چیز ہیوم کے نزدیک "قطعاً ناممکن" تھی، مول کے نزدیک اب اس میں اتنا استبعاد بھی باقی نہیں کہ کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کرے،

جان اسٹورٹ مل نے معجزہ کی تعریف یہ کی تھی کہ "وہ عبارت ہے ایسے واقعہ سے جس کے پہلے وہ لوازم و شرائط نہ پائے جاتے ہوں جو دوبارہ اس کو وجود میں لانے کے لیے کافی ہوتے ہیں" لیکن آج ہمارے سامنے وہ لوازم و شرائط موجود ہیں جن کی بنا پر عصا اسی طرح اژدہا بن سکتا ہے جس طرح کرسی شیر نظر آسکتی ہے، تم کہوگے کہ تو پھر اس صورت میں حضرت موسیٰؑ کا اعجاز کیا رہا، اس کا جواب آئیگا، سردست تم صرف اتنا سمجھ لو کہ عصا کا اژدہا بن جانا اتنا مستبعد واقعہ نہیں ہے جس پر یقین کے لیے نفس نوعیتِ واقعہ کی بنا پر کسی غیر معمولی شہادت کی احتیاج ہو،

عام تجربات تنویمی تجربات کے علاوہ یوں بھی کچھ نہ کچھ ایسے پر اسرار واقعات مشاہدہ مسموع ہوتے رہتے ہیں، جن کی توجیہ عام قوانینِ فطرت سے نہیں ہوتی، اور جو بہت سے معجزات کے متعلق ہماری حیرت و استبعاد میں کمی پیدا کرتے رہتے ہیں،

ہمارے صوبہ کے مشہور انگریزی اخبار "لیڈر" نے پچھلے سال اپریل میں بردوان کا ایک عجیب و غریب واقعہ چھاپا تھا جو نامہ نگار کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:

---

[۱] ہپناٹزم ص ۳۵۶

"بردوان میں ایک عجیب پر اسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پیدا کردی ہے۔ لالہ کندن لال کپور، ایک کھتری زمیندار ۱۱ ماہ حال کو ۶ بجے شام کے وقت مرا، متوفی چونکہ سوریہ بنسی کھتری تھا، اس لیے جب تک دوسرے دن صبح آفتاب نہ نکل لیا، اس کی لاش جلائی نہیں گئی، جلانے سے پہلے اس کے لڑکے انند لال نے ایک خالی کمرہ میں جہاں کوئی اور نہ تھا، لاش کا فوٹو لیا، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے فوٹو پر پانچ اور دھندلی تصویریں آگئی ہیں، ان تصویروں میں سے دو کو تو خاندان کے لوگوں نے پہچانا تھا کہ متوفی کی پہلی بیوی اور لڑکے کی ہیں جن کے مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ باقی تین تصویریں جو زیادہ روشن نہ تھیں پہچانی نہ جا سکیں۔"

"ٹائمس آف سیلون" میں ایک انگریز پلانٹر (چاے کا کاشتکار) نے اپنے قلیوں کی قربانی اور پوجا کے کچھ مشاہدات لکھے تھے[1] جو اس کو عجیب معلوم ہوتے تھے، ان میں یہ بھی تھا کہ

"ایک شخص آگ کی سوراخ دار چٹی ہتھیلی پر رکھ کر مندر کے گرد رقص و طواف کرتا تھا، اس نے مجھکو یقین دلایا کہ یہ چٹی اس کو بالکل گرم نہیں محسوس ہوتی تھی، حالانکہ جب میں نے تجربۃً چٹی کے اسی حصہ کو جو اس شخص کی ہتھیلی پر تھی، چھوا تو میری انگلی جل گئی، ان کا بڑا پوجاری کم و بیش ایک منٹ تک آگ میں ہاتھ ڈالے رہا اور کوئی اثر نہ ہوا، اسی طرح اور بھی کئی قلیوں نے نہایت غیر معمولی حرکتیں کیں۔"

---

[1] "لیڈر" نے "ٹائمس آف سیلون" کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

ان چشم دید عجائب کو لکھ کر پلانٹر نے ناظرین اخبار سے درخواست کی ہے کہ اگر کسی اور صاحب نے اس قسم کے واقعات دیکھے ہوں تو براہ مہربانی اطلاع دیں، یا اگر ان کی کوئی توجیہ و تشریح ہو سکتی ہو تو کریں، اس پر خود "ٹائمس" نے لکھا ہے کہ "سیلون اور ہندوستان دونوں جگہ مذہبی رسوم کے مواقع پر اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، مثلاً کولمبو میں محرم کے موقع پر لوگ آگ میں چلتے ہیں، ہم کو نہیں معلوم کہ ایسے واقعات کی ابتک علمی توجیہ ہو سکی ہے، ایک نظریہ یہ ہے کہ لوگ اپنے آپ پر عملِ تنویم کر لیتے ہیں[1]۔

بہرحال توجیہ ہو سکے یا نہ ہو سکے، لیکن اڈیٹر ٹائمس نے پلانٹر کے بیان کی تکذیب نہیں کی، نہ کسی مزید شہادت کا مطالبہ کیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس طرح کے واقعات اور بھی وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں، جن کو سامنے رکھنے کے بعد پلانٹر کا بیان اتنا مستبعد نہیں رہتا کہ نفس نوعیتِ واقعات ہی کی بنا پر ان کی تغلیط و تردید کر دی جائے، یا کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کیا جائے،

پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس واقعہ کو غلط سمجھو کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ نہ جلا سکی، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی بنا پر تم ان کی نبوت کا اقرار نہ کرو، لیکن نفس واقعہ سے انکار کا کیا حق حاصل ہے؟

رویائے صادقہ رویا یا خواب کی تشفی بخش عقدہ کشائی سے حکمت و فلسفہ کا ناخن ابتک عاجز ہے، مختلف اصنافِ خواب کی توجیہ کے لیے جو جو نظریات فرض کیے گئے ہیں، وہ

---

[1] تنویم مقناطیسی کی تحقیقات کی رو سے آدمی خود اپنے اوپر بھی عمل کر سکتا ہے۔

خود ایک خواب پریشاں معلوم ہوتے ہیں، لیکن قدرت اپنی عجائب آفرینیوں کے لیے انسانی توجہات کا انتظار نہیں کرتی ،

تم کسی مبصر آدمی سے دریافت کرو، اس کو اپنی زندگی کے بہت سے ایسے خواب یاد ہوں گے جو واقعات مستقبل کی تمثیلی یا صریحی پیش بینی تھے. میرے ایک فلسفی دوست کو اپنے خوابوں کی صحت کا اس قدر تجربہ ہے کہ جب کسی شخص سے خواب میں اُن سے بے لطفی ہو جاتی ہے، تو بیداری میں اس کے نتیجہ کے لیے وہ تیار رہتے ہیں، اور اکثر کچھ نہ کچھ بدمزگی کی نوبت آہی جاتی ہے، مجھ کو اپنے خواب بہت ہی کم یاد رہتے ہیں لیکن جو جس قدر زیادہ وضاحت کے ساتھ یاد رہتا ہے، اسی قدر زیادہ صحیح نکلتا ہے، سنہ ۱۹۲۰ء کے روزنامچہ میں (۵ اپریل) ایک جگہ لکھا ہے کہ

"آج دوپہر کو سویا، تو کیا خواب دیکھتا ہوں کہ "ح" کا خط آیا ہے جس میں "س" کا بھی ایک خط ملفوف ہے، اٹھنے کے بعد ڈاک آئی تو یہ خواب بالکل واقعہ تھا، انتہا یہ کہ خطوں کا جو مضمون خواب میں دیکھا تھا، وہی قریب قریب بیداری میں بھی پایا۔"

حالانکہ مجھ کو "ح" کے خط کا کوئی انتظار نہ تھا اور "س" کا خط تو حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔"

پروفیسر ہلپرکٹ اسیریا کے آثار قدیمہ کا ایک مشہور ماہر ہے، اس نے دو بابلی کتبات کے متعلق ایک اشکال کو جو بیداری میں حل نہیں ہو سکا تھا خواب میں حل کیا، اور وہ بھی اس طرح کہ بابل کے ایک پرانے کاہن نے خواب میں آکر اس کی رہنمائی کی[1]،

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون "ڈریم"۔

جب عام لوگوں کے یہ تجربات ہیں تو پھر اس میں کیا استعجاب و استبعاد رہ جاتا ہے کہ بعض نفوس قدسیہ (انبیاء) کے تمام خواب رویاے صادقہ، یا ایک طرح کا وحی والہام ہوتے ہیں، رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا، رویاے صادقہ (صالحہ) سے ہوئی تھی، اخبار بالغیب کی گرہ بھی بڑی حد تک، رویاے صادقہ سے کھل جاتی ہے،

حقیقی اسرار نبوت | اسرار نبوت میں سب سے زیادہ پراسرار مقام وہ ہے جہاں ابراہیمؑ کو خدا خود ندا دیتا ہے (نَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ) جہاں سے موسیٰؑ کو (وَكَلَّمَ اللهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا) کی بنا پر کلیم اللہ کا شرف عطا ہوتا ہے، اور جہاں محمدؐ اور خدا میں قَابَ قَوْسَيْنِ یا اس سے بھی کم کی دوری رہ جاتی ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں منطق و استدلال کا "حجاب اکبر" اٹھ جاتا ہے، اور ظنی علم کی جگہ کشف و مشاہدہ کا حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے، ابراہیمؑ کو کس نے ندا دی؟ موسیٰؑ نے طور پر کس سے کلام کیا؟ اور "لَنْ تَرَانِي" کے باوجود کیا دیکھا؟ وہ کونسی ہستی تھی جس میں اور محمدؐ میں صرف "قَابَ قَوْسَيْنِ" کی دوری تھی؟ اور "أَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ" کا ماجرا کیونکر پورا ہوا؟ ان سوالات کا جواب جائزہ تحدید میں رہ کر نہ دیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

حقیقی آیاتِ نبوت کی عام مثالیں | عام معجزات کی نوعیت سے، چونکہ اس کی مثالیں جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے معمولی واقعاتِ زندگی میں بھی ملتی رہتی ہیں، لہٰذا اسی نسبت سے انکے استبعاد میں بھی بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے، لیکن "وادی ایمن" اور "سدرۃ المنتہیٰ" کی واردات جو اصلی معجزات اور مقامِ نبوت کی حقیقی "آیات کبریٰ" ہیں، ان کی بظاہر کوئی مثال اس

لہ یا جبریل میں " س"

عالمِ ناسوت میں نہیں نظر آتی جس سے عام انسانوں کو ان کی فہم میں مدد ملے، بیشک لِنُرِیَکَ مِن اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی "کا رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا" اور یہ سچ ہے کہ آفتاب کی عالم افروزی کا اندازہ ستاروں کی چمک سے نہیں ہو سکتا، تاہم بہ قدر استعداد تجلی طور کا ہلکا سا پرتو ذات پہ کبھی کبھی پڑ ہی جاتا ہے، اور چشم بینا کی ہدایت کے لیے اتنا ہی بس ہے،

انبیاے مرسلینؑ کے بعد اولیاے مقربین کے ہاں ان تجلیات کی کافی شہادتیں ملتی ہیں لیکن عام انسانی سطح سے چونکہ یہ درجہ بھی بہت بلند ہے، اس لیے اور نیچے اتر کر ہم کو اپنی سطح کی کچھ مثالیں تلاش کرنی چاہئیں،

پرفیسر ولیم جیمس جو ہمارے زمانہ کا سب سے نامور محققِ نفسیات ہے، اور جس کا شمار اکابر فلاسفہ میں ہے، اُس نے لوگوں کے ذاتی وارداتِ مذہب، یا مذہبی تجربۂ وشعور کے مختلف اصناف پر ۵۰۰ صفحات سے زائد کی ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بلا قید مشرق ومغرب انبیاء واولیاء، عوام وخواص، علما وحکما، سب کے "تجرباتِ مذہبی" کی آپ بیتی واردات کو یکجا کیا، اسی ذخیرہ میں سے ہم صرف عام انسانی سطح کے چند واقعات کا بہ ترتیبِ ذیل انتخاب کرتے ہیں،

سب سے پہلے جیمس نے اپنے ایک بے تکلف اور نہایت ہی ذہین وزیرک دوست کے متعدد تجربات لکھے ہیں، اس دوست کو کبھی کبھی رات کے وقت جبکہ یہ کتب بینی میں

ؔ اس کا نام The Varieties of Religious Experience

"تجربۂ مذہبی کے اصناف" پروفیسر موصوف کا انتقال ابھی ۱۹۱۰ء میں ہوا ہے۔

مشغول ہے، یا خالی بیٹھا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر کوئی موجود ہے، پلنگ کے پاس ہے، اپنی گود میں اس کو دبا رہا ہے، گو وہ نہیں جانتا کہ یہ کون ہے، یا کیا ہے، تاہم نفس اسکی موجودگی کا اس سے کہیں زیادہ اس کو یقین ہے، جتنا کہ دن کی روشنی میں کسی ذی روح کی موجودگی کا ہو سکتا ہے، وہ اس کو کسی متشخص ذات یا انسان کی طرح نہیں دیکھ رہا ہے، پھر بھی اپنے تمام محسوسات سے زیادہ اس کے حقیقی و واقعی ہونے کا اذعان ہے۔

"اس کی موجودگی میں نہ کوئی ابہام و التباس ہے، نہ یہ شعر یا موسیقی کے وجد و کیف کا سا پیدا کردہ کوئی جذبہ ہے، بلکہ یہ ایک قوی شخصیت کی نہایت قریب موجودگی کا قطعی علم و یقین ہے، اور اس کے چلے جانے کے بعد میرے حافظہ میں اس کی یاد ایک حقیقت کی طرح تازہ ہے، ہر چیز جو میں دیکھتا یا سنتا ہوں خواب ہو سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ خواب نہ تھا۔" (صفحہ ۶۰ - ۶۱)

یہ دوست کوئی وہم پرست نہیں ہے، بلکہ جیمس کو اس بات پر حیرت ہے کہ وہ ان تجربات کو مذہبی رنگ میں کیوں نہیں تعبیر کرتا، اس کے بعد ایک اور شخص کا بیان ہے،

"میری آنکھ بہت رات رہے کھل گئی......... ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جان بوجھ کر جگا دیا، اور پہلے میں یہی سمجھا کہ کوئی شخص اندر گھس آیا ہے....... میں نے پھر سونے کے لیے کروٹ بدل لی، فوراً ہی محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے، اور یہ کچھ عجیب احساس تھا کسی عام ذی حیات شخص کی موجودگی کا نہیں، بلکہ ایک روحانی وجود کا احساس تھا، ممکن ہے کہ تم کو اس پر ہنسی معلوم ہوتی ہو، لیکن میں وہ بیان کرتا ہوں، جو مجھ پر گذری،

بجز اس کے کہ میں ایک روحانی وجود سے اس کو تعبیر کروں، اور کوئی بہتر عبارت مجھ کو اپنے احساس کے ادا کرنے کی نہیں ملتی .... ساتھ ہی مجھ کو ایک یہ دہشت بھی محسوس ہوئی کہ کوئی عجیب و خوفناک واقعہ ظاہر ہوا چاہتا ہے۔ (ص۹۳)

ایک سائنس داں کے اعترافات سنو،

بیس اور تیس سال کی عمر کے ما بین، میں بتدریج لاادری اور لا مذہب ہو گیا تھا، تاہم اس "غیر متعین شعور" سے میں کبھی خالی نہیں رہا، جس کا نام ہربرٹ اسپنسر نے حقیقۃ مطلقہ رکھا ہے، لیکن اسپنسر کی طرح یہ حقیقت میرے لیے محض ناممکن العلم نہ تھی، کیونکہ گو میں نے طفلانہ طریقہ سے خدا سے دعائیں مانگنا چھوڑ دیا تھا، اور مذہبی رسم کے مطابق کبھی نماز نہیں پڑھی، نہ دست بدعا ہوا، تاہم میرا زیادہ حال کا تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ عملاً اس ذات کے ساتھ مجھ کو وہی تعلق رہا ہے جو دعا اور نماز کا ہوتا ہے جب مجھ پر کوئی مصیبت پڑی، خواہ وہ خانگی ہو یا کاروباری، یا جب میں کسی معاملہ کے متعلق پریشان و متردد ہوا، اور میرا دل بیٹھنے لگا تو اعتراف کرتا ہوں کہ استعانت کے لیے میں اسی تعلق کی طرف بھاگا، جو اس ذات کے ساتھ مجھ کو حاصل تھا........ اس نے ہمیشہ میری نصرت کی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تائید غیبی نے مجھ کو بے انتہا قوی کر دیا ہے...... میں پاتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا تعلق دراصل شخصی تھا، کیونکہ ادھر چند سال سے اس سے استعانت کی قوت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے جس سے مجھ کو ایک صریح فقدان کا شعور ہے........ اور اقرار ہے کہ میں اپنی زندگی میں ایک بڑی قوت و نصرت سے محروم ہو گیا ہوں،

...... جس ذات کو میں "اس" سے تعبیر کر رہا ہوں، یہ اسپنسر کی نامعلوم حقیقت نہ تھی، بلکہ یہ میرا خدا تھا جس کی تائید پر مجھ کو بھروسہ تھا، لیکن جس کو نہیں معلوم میں نے کس طرح گم کر دیا۔" (ص ۶-۶۵)[1]

سوئیٹزرلینڈ کے ایک شخص کی آپ بیتی یہ ہے کہ

" میں پوری طرح صحیح و تندرست تھا، ...... کسی قسم کی تھکن، بھوک یا پیاس قطعاً نہ تھی، طبیعت بالکل چاق اور شگفتہ تھی، گھر سے جو خبر ملی تھی اچھی تھی، غرض دور و نزدیک کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی، ہوشیار رہنما ہم لوگوں کے ساتھ تھا، راستہ میں بھٹکنے کا بھی مطلقاً اندیشہ نہ تھا، مختصر طور پر اپنی اس حالت کو یوں ادا کر سکتا ہوں کہ میرا دل و دماغ اس وقت کامل توازن کی حالت میں تھا کہ یکایک مجھ کو اپنے اندر ایک طرح کا ارتفاع محسوس ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ خدا موجود ہو گیا۔ اس کی رحمت و قوت میرے سارے وجود میں نفوذ کر رہی ہے، یہ کیفیت اس درجہ شدید تھی کہ ساتھیوں سے بہ مشکل اتنا کہہ سکا کہ آگے چلو میرا انتظار نہ کرو، اب مجھ میں کھڑے ہونے کی تاب نہ تھی، ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ آیا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایک حقیر اور میری جیسی گناہگار مخلوق پر اتنا بڑا رحم و فضل فرمایا کہ زندگی ہی میں اپنے کو پہچنوا کر اپنی ربوبیت کا کرشمہ دکھلایا۔ میں نے اس سے نہایت الحاح کے ساتھ دعا کی کہ میری زندگی تمام تر اس کی رضاجوئی میں بسر ہو، جواب ملا کہ بس تو روز بروز عاجزی و

[1] اس حالت کو سامنے رکھکر ذرا ان آیات کو پڑھیے "ایاک نستعین" ففروا الی اللہ وما النصر الا من عند اللہ

سکنت کے ساتھ میری رضا پر چلنے کی کوشش کر، اور اس کا فیصلہ مجھ خدائے قادر و توانا پر چھوڑ دے کہ اس سے بھی زیادہ شعور کے ساتھ تو مشاہدۂ حق کے قابل ہوا ہے یا نہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ یہ احساس و اثر اس قدر گہرا اور واضح تھا کہ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا موسیٰ نے کوہ طور پر کچھ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس قدر بیان کر دینا اور مناسب ہوگا کہ اس عالم وجد میں خدا کسی شکل و صورت اور رنگ و بو سے متصف نہ تھا۔ نہ میں اس کی موجودگی کی کوئی خاص جگہ محسوس کر رہا تھا۔" (ص ۶۶-۶۷)

جیمس نے تو اس قسم کے تجربات کا ایک انبار لگا دیا ہے، لیکن ہم ایک طویل بیان کے دو جملوں کے اقتباس پر بس کرتے ہیں۔ قیاس اور اخذ نتائج کے لیے امید ہے کہ یہی تین چار مثالیں کافی ہوں گی۔ امراض دماغی کے ایک ماہر ڈاکٹر نے خود اپنا تجربہ لکھا ہے کہ

"اس کے بعد مجھ پر ایک انتہائی فرحت و انبساط کی کیفیت طاری ہوئی جس کے ساتھ ہی ایک ایسی اشراقی یا انشراحی حالت پیدا ہوئی جس کا بیان ناممکن ہے۔ اس حالت میں دوسری چیزوں کے ساتھ اس بات کا بھی مجھ کو صرف یقین نہیں، بلکہ عینی مشاہدہ ہوا کہ کائنات بے جان مادہ سے نہیں بنی ہے، بلکہ ایک ذی حیات وجود ہے۔ مجھ کو خود اپنے اندر ایک ابدی حیات کا احساس ہوا۔ یہ کیفیت صرف چند سکنڈ تک رہی لیکن اس کی یاد اور حقیقت کا احساس آج چوتھائی صدی گذر جانے پر بھی اسی طرح تازہ ہے۔" (ص ۳۹۹)

ان مثالوں کو سامنے رکھکر اب یہ حدیث پڑھو کہ

"ایک دفعہ صبح کی نماز کے لیے آپ دیر سے برآمد ہوئے، نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ

اپنی اپنی جگہ ٹھہر جائیں پھر فرمایا کہ آج شب کو میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں جتنی کہ میرے لیے مقدر تھیں، تو نماز ہی میں کچھ اونگھ سا گیا (نعست) اس حالت میں میں نے دیکھا کہ جمالِ الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہے، خطاب ہوا، اے محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کی نہیں، اے میرے رب! میں نہیں جانتا اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا، جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی، اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں، سوال ہوا یا محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں، عرض کی ہاں میرے رب .... الخ[1]"

اس میں کلام نہیں کہ مکالمۂ طور اور ماجرائے اسراء (معراج) کا مقام مذکورۂ بالا مثالوں سے اتنا ہی بلند ہے، جتنا کہ انبیاءؑ کا مقام انسانوں سے بلند ہونا چاہیے، تاہم عالمے ہست کہ ایں عالم ازاں تمثالے است" ان مثالوں سے ایک نہ ایک حد تک اس مقامِ برتر کا دھندلا سا تصور پیدا کیا جا سکتا ہے، اور ہمارے مدعا کے لیے اسی قدر کافی ہے،

مقدمات ثلثہ | یقینِ معجزات کے لیے ہماری منطقِ استدلال کے تین مقدمات تھے، جن میں سے دو کو تو ہیوم اور ہکسلے نے بترتیب پورا کر دیا تھا، تیسرا مختلف اصنافِ استبعاد کے شواہد سے پورا ہو جاتا ہے، ان مقدماتِ ثلثہ کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) معجزات بذاتِ خود کوئی ناقابلِ تصور یا ناممکن الوقوع شے نہیں ہیں، (ہیوم)

---

[1] پوری حدیث کے لیے دیکھو آگے ذکر مشاہدات،

(۲) زیادہ سے زیادہ ان کو "انتہائی حیرت انگیز" یا "انتہائی مستبعد" واقعات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس لیے (الف) انسانی شہادت کی بنا پر ان کو قبول کیا جا سکتا ہے، (ب) البتہ "انتہائی حیرت انگیزی" و استبعاد کی وجہ سے بظاہر اُن کو قبول کرنے کے لیے جو شہادت مطلوب ہے، اس کو بھی ہر لحاظ سے انتہائی حد تک قابلِ اعتبار ہونا چاہیے، (ہکسلے)

(۳) لیکن معجزات میں جس قسم کا استبعاد یا حیرت انگیزی پائی جاتی ہے، اس کے شواہد چونکہ عام انسانوں کے مادی، نفسی یا روحانی تجربات میں بھی ملتے رہتے ہیں، جن کے قبول و یقین کے لیے لوگ کوئی غیر معمولی شہادت طلب نہیں کرتے،

لہٰذا یقین معجزات کے لیے بھی کسی غیر معمولی شہادت کی ضرورت نہیں،

اصلی بحث یقین کی ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ ہیوم و ہکسلے کی ناقص منطق سے اگر کوئی شخص گمراہ ہو گیا تھا، تو کیا وہ اس منطق کا صرف تیسرا مقدمہ پورا کر دینے سے راہ راست پر آجائیگا؟ اور کیا اب صفحاتِ بالا کے پڑھ لینے سے معجزہ کا کوئی منکر نہ رہ جائیگا؟ مجھ کو تو اندیشہ ہے کہ محض یہ سیاہ نقوش ایک منکر کو بھی مومن نہ بنا سکیں گے، آپ کہیں گے کہ شاید استدلال ہی بودا ہے، لیکن کیا دنیا کا کوئی قوی سے قوی استدلال بھی، نفس اپنی قوتِ استدلال کی بنا پر کسی کو معجزات کا یقین دلا سکتا ہے؟ ارسطو، مِل اور ہیگل[۱] جو منطق کے "اقانیم ثلثہ" ہیں، کیا یہ سب کے سب مل کر بھی کوئی ایسی منطق یا عقلی استدلال پیدا کر سکتے تھے جو بذاتِ خود

---

[۱] ارسطو اور مل علی الترتیب قیاسی و استقرائی منطق کے امام ہیں جن کا تعلق اضافی حقایق و علوم سے ہے، لیکن ہیگل (جرمنی) نے منطق کے زمین و آسمان ہی بدل دیے، یعنی منطق کو مابعد الطبیعیات بنا کر اس کے ذریعہ "حقیقۃ مطلقہ" کا سراغ لگانا چاہا ہے،

ہر عام و خاص کو معجزات کا یقین دلا دیتا؟

ان سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو پھر معجزات کے متعلق خالی امکانِ وقوع اور شہادتِ وقوع کی بحث چنداں اہم نہیں رہ جاتی، بلکہ اصلی بحث یقین کی ماہیت اور اس کے علل واسباب کی ہے،

یقین معجزات

یقین کی ماہیت یقین کی فلسفیانہ ماہیت پر کوئی مفصل و مستقل بحث چھیڑنا مقصود نہیں ہے، نہ یہاں چنداں اس کی ضرورت ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ نفس تصور اور اس کے یقین میں کیا فرق ہے۔

یہاں ہمارے مقصد کے لیے صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ ریاضی کے تصورات مجردہ[1] کی طرح امور واقعیہ (واقعات) کے متعلق ہمارا یقین ناقابلِ تغیر یا اطلاقی نوعیت کا نہیں ہوتا، بلکہ لذت والم، حیرت واستعجاب، رنج وغم، محبت ونفرت، ارادہ و خواہش وغیرہ دیگر کیفیاتِ نفسی کی طرح محض ایک اضافی و تغیر پذیر ذہنی کیفیت کی

[1] معجزات کا تعلق، چونکہ تاریخ اور روایت کے واقعات سے ہے، نہ کہ ریاضی کی مجردات سے، اسلیے ہم مجردات ریاضیہ کے علم یقین کی جو نوعیت ہے اسکی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ورنہ دراصل یقین بھی کسی ایسی اطلاق اور اٹل یا ناقابل تغیر بنیاد پر نہیں قائم ہے جسکا انکار نہ ہوسکے، بلکہ مل جیسے منطقی و فلسفی کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ریاضیات کی مفروضہ قطعیت محض ایک وہم و فریب ہے، جس طرح براق کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے آدھے گھوڑے اور آدھے انسان کا، یہ نہیں لازم آتا کہ براق کا وجود یقینی اور واقعی ہے، اسی طرح دائرہ کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے ایسی شکل کا جس کے نصف قطر تمام برابر ہوں، یہ نہیں لازم آتا کہ واقعاً ایسا کوئی دائرہ موجود بھی ہے، انتہا یہ کہ مل کے نزدیک اس میں بھی کوئی تناقض نہیں کہ دو اور تین مل کر چھ ہو سکتے ہیں۔

حیثیت رکھتا ہے جس طرح کسی واقعہ سے ہر شخص کے نفس میں کیفیاتِ بالا کا پیدا ہونا، یا ایک طور پر پیدا ہونا ضروری نہیں ہے، اُسی طرح ہر آدمی کے دل میں اس واقعہ کا یقین یا ایک ہی معنی میں یقین پیدا ہونا بھی لازمی نہیں،

تاریخ کی بعض کتابوں میں ایک روایت مذکور ہے، کہ اسکندریہ کا کتب خانہ حضرت عمرؓ کے حکم سے اس بیدردی کے ساتھ جلایا گیا کہ چھ مہینہ تک مصر کے حماموں کا ایندھن بنا رہا علم کا فدائی اور حکمت و فلسفہ کا عاشق اس روایت کو پڑھ کر کفِ افسوس ملنے لگتا ہے اور اس کے دل میں نفرت و غصہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بخلاف اس کے اسی روایت کو اگر ایک سپاہی پڑھتا ہے تو نہ وہ اپنے اندر کوئی نفرت و غصہ پاتا ہے اور نہ اتنا افسوس کرتا ہے، اس کے نزدیک قلعہ انٹورپ کی بربادی کتب خانۂ اسکندریہ سے کہیں زیادہ ماتم انگیز ہے، لیکن یہی روایت اگر کسی صوفی عارف کی نظر سے گذرے تو رنج و غصہ کی جگہ اس کو انتہائی مسرت ہوسکتی ہے کہ "حجابِ اکبر" کا یہ "دفترِ بے معنی" اسی سلوک کا مستحق تھا۔ "صد کتاب و صد ورق در نار کن"

تم نے دیکھا کہ ایک ہی چیز سے مختلف اشخاص پر مختلف بلکہ متضاد جذبات طاری ہوئے، جذبات کی طرح یقین و عدمِ یقین کے بھی متضاد اثرات طاری ہوئے ہیں، جن اہلِ یورپ کے دل میں مسلمانوں کی وحشت و جہالت کا تعصب راسخ تھا اور جن کی طبیعت تنقیصِ اسلام کی ہر شہادت کو قبول کرنے پر حریص تھی، انھوں نے نہ صرف شہادت کی تحقیق و تفتیش کے بغیر اس خبر کا یقین کرلیا، بلکہ اس کی روایتی و درایتی تضعیف کے بعد بھی

ان کا یقین قائم رہا، لیکن ان ہی اہل یورپ میں جو گروہ اس درجہ اسلام کے ساتھ عداوت نہیں رکھتا تھا کہ اس کے جذبۂ انصاف پسندی کو تعصب نے مغلوب کر لیا ہو، اس کو تحقیق کے بعد یہ روایت ہی سرے سے بے اصل و مضحکہ خیز نظر آئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک مسلمان مورخ جو کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کو دامنِ اسلام پر وحشت و جہالت کا ایک بدنما داغ سمجھتا تھا، اور کسی طرح اس کا محبتِ اسلام سے لبریز دل اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا، اس کی تحقیقات نے اس روایت کو نہ صرف دشمنوں کا صریح افترا و بہتان قرار دیا، بلکہ الٹے خود ان ہی افترا پرداز دشمنوں کو اصلی مجرم ثابت کر دکھایا۔[۱]

"ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا"

نظریاتِ حکمت کا یقین یقین کی یہ جذباتی و اضافی حیثیت صرف واقعاتِ تاریخ و روایت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ فلسفہ و حکمت (سائنس) کے نظریات و نظامات کا یقین بھی یہی حیثیت رکھتا ہے، پروفیسر جیمس نے "ارادۂ یقین"[۲] اور "جذبۂ عقل پرستی"[۳] کے عنوان سے دو نہایت دلچسپ مضمون لکھے ہیں، ان میں اس نے دکھایا ہے کہ ہمارا یقین کس قدر خواہش و ارادہ یا جذبات کی اضافی کیفیات کا پابند ہے، اور سائنس و فلسفہ کی بنیاد جس عقل پرستی پر ہے وہ بھی دراصل مذہب پرستی یا عجائب پرستی کی

---

[۱] دیکھو رسائل شبلی مضمون "کتب خانۂ اسکندریہ"۔ [۲] انگریزی میں ان دونوں مضامین کا نام علی الترتیب Will To Believe.

اور Sentiment of Rationalism ہے جو دیگر مضامین کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، افسوس کہ یہاں ہم بخوفِ طوالت ان سے زیادہ استفادہ نہیں کر سکتے، لیکن جو انگریزی داں اصحاب یقین کی حقیقت و نوعیت کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں، ان کو یہ دونوں مضمون ضرور پڑھنے چاہئیں

نوعیت کا محض ایک جذبہ ہے۔

یکسانی کا جذبہ | ایک فلسفی یا حکیم فلسفیانہ یا حکیمانہ فکر و تفحص میں کیوں اپنا سر کھپاتا ہے؟ زیادہ تر اس "خواہش" کی بنا پر کہ عالم میں جو ایک تشتت و پریشانی، کثرت و پراگندگی نظر آتی ہے، کوئی ایسا اصول یا قانون دریافت ہو جائے، جو اس کثرت و پراگندگی کو وحدت و یکسانی کے رشتہ سے مربوط و مسلسل کردے، اس قانون و اصول کے عقلی یا صحیح ہونے کا کیا معیار ہے؟ صرف یہی کہ اس کے قبول و باور کرنے سے ہمارے دماغ کی حیرانی و پریشانی رفع ہو جاتی ہے، اور کارخانۂ فطرت میں یکسانی و ہمواری کی موجودگی کا ایک خوشگوار و لذیذ احساس یا جذبہ پیدا ہوتا ہے،

"یہ لذت کہ پراگندہ واقعات در اصل کسی ایک ہی مخفی واقعہ کے مظاہر ہیں، اسی طرح کی لذت ہے جو کسی گویئے کو پراگندہ آوازوں کے ایک نغمہ یا راگ میں منتظم کر دینے سے حاصل ہوتی ہے، کون شخص اس امر کی دلفریبی کو نہ محسوس کرے گا کہ سیب کو زمین کے ساتھ وہی تعلق ہے، جو چاند کو اس کے ساتھ ہے، غبارہ اسی قانون کے ماتحت اوپر چڑھتا ہے جس کے ماتحت پتھر نیچے گرتا ہے، اس یقین میں کس کے لیے لذت نہ ہوگی کہ پہاڑ پر چڑھنے یا درخت کے کاٹنے میں جس طاقت سے ہم کام لیتے ہیں وہ وہی ہے جو آفتاب کی ان کرنوں میں پائی جاتی ہے جو اس غلہ کو پکاتی ہیں، جس کا صبح ہم نے ناشتہ کیا ہے"[1]،

نظم و یکسانی کی لذت کے لیے انسان کی فطرت جس درجہ حریص ہے۔ اسی کو ملحوظ

---

[1] جیمس کا مضمون "جذبۂ عقلیت" Sentiment of Rationality

رکھ کر ہمارے زمانہ کے ایک زبردست معلمِ فلسفہ پروفیسر رائس نے تنبیہ کی ہے کہ "جہاں کہیں بھی ہم کو کسی قانون **فطرت** کی وحدت و یکسانی کا یقین محسوس ہو، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس احساس وحدت کا بڑا حصہ اصل فطرت کی واقعی وحدت کے بجائے اس ناقابلِ استیصال جذبہ پر مبنی ہوسکتا ہے جو وحدت و نظم کی پسندیدگی کے لیے خود ہمارے نفوس کے اندر موجود ہے"[1]۔

یہی تعصب تھا جس کی بناپر ایک بڑے سائنسداں نے جمیس سے کہا کہ "کلام نفسی کا دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو بھی تمام اہل سائنس کو اس کے دبانے اور چھپانے پر ایکا کرلینا چاہیے۔ کیونکہ اس سے فطرت کی یکسانی اور نیز بہت سی ایسی چیزوں کی تکذیب ہوتی ہے، جنکے مانے بغیر سائنس داں اپنا کام نہیں چلاسکتے۔" اس قول کو نقل کرکے جمیس نے لکھا ہے کہ اگر یہی سائنس داں حضرات کلام نفسی کو سائنس کے حق میں **مفید مطلب** پاتے تو اس سے اغماض کے بجائے نہ صرف اس کی شہادت کی تحقیق پر آمادہ ہوجاتے، بلکہ یہی شہادت یقین کے لیے کافی ہوتی[2]۔

اب تم ہی فیصلہ کرو کہ "کیا عقل پرست سائنس" کے تعصبات وہم پرست مذہب" کے تعصبات سے کچھ بھی کم، یا مختلف ہیں؟ اور کیا اہل سائنس کا انکارِ معجزات وحدت و یکسانی کے مذکورۂ بالا تعصب کا نتیجہ نہیں ہے؟

---

[1] دیکھو "اصول نفسیات" جلد دوم ص ۲۰۰ بحوالہ The Religious Aspect of Philosophy

(فلسفہ کا مذہبی پہلو) مصنفہ پروفیسر رائس

[2] "ارادۂ یقین" صفحہ ۱۰ طبع جدید ۱۹۱۷ء

نظریات فلسفہ کا یقین | خیر اہل سائنس یا حکما کو تو خود ہی بڑی حد تک اس امر کا اعتراف ہے کہ سائنس کے نظریات و نوامیس زیادہ تر اضافی اور مفروضی حیثیت رکھتے ہیں لیکن فلاسفہ یا متا تھیں، جو حقائقِ عالیہ اور صداقتِ مطلقہ کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کا دعویٰ رکھتے ہیں ان کے اصول و نظریات پر تو انسانی جذبات یا ذاتی میلانات کا سایہ تک نہ پڑنا چاہیے تھا، مگر یہ کس قدر حسرت انگیز منظر ہے، کہ سب سے زیادہ فلسفہ ہی کے مذاہب و نظامات شخصی جذبات و خواہشات کا عکس نظر آتے ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ جتنے فلاسفہ اتنے ہی مذاہب، حتیٰ کہ ایک عام و دلچسپ تقسیم کی رو سے فلاسفہ کی دو قسمیں یہ قرار پائی ہیں کہ رونے والے (بکائیہ) اور ہنسنے والے (ضحکیہ) فلاسفہ جن کو زیادہ سنجیدہ اصطلاح میں علی الترتیب "شریہ" اور "خیریہ"[1] کہا جاتا ہے، یا اس کو "یاسیہ" اور "رجائیہ" بھی کہہ سکتے ہو، اگر نفسیاتی تحلیل کی جائے تو اس اختلاف کا مبنی رونے اور ہنسنے، یاس و رجاء، امید و بیم وغیرہ کے ذاتی جذبات و احوال ہی ثابت ہوں گے۔

دورِ جدید کا ایک زبردست فلسفی شوپنہار، جس کا شمار فلسفہ کے اکابر ائمہ میں ہے اور جو فلاسفہ کی رونی جماعت کا ایک نامور فرد ہے، اس کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ وہ "قوتِ مطلقہ" صرف ارادہ یا خواہش ہے، نہ کہ عقل یا فکر، اور یہ ارادہ چونکہ "بے عقل" ہے، اس لیے اس کی کوئی غایت نہیں، دنیا میں کوئی فلاح و سعادت نہیں بلکہ یہ تمام تر "بے مقصد" ارادہ کا ایک کھلونا یا تماشا ہے، خارجی عالم اسی "بے عقل و بے مقصد" ارادہ کی محض ایک تصویر ہے،

---

[1] انگریزی میں ان کا لقب علی الترتیب "Optimists" اور "Pessimists" ہے۔

کرۂ عقل کی سب سے اونچی سطح پر بسنے والے ان فلاسفہ کے باہمی اختلافات بلکہ تضادِ آراء کا یہ عالم ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی کہتا ہے کہ دنیا تمام تر عقل پر مبنی ہے، کوئی مدعی ہے کہ اس کا وجود سراپا بے عقلی ہے، کوئی شخصی خدا کا یقین رکھتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ شخصی خدا ناقابلِ تصور ہے، کسی کو ذہن سے باہر خارجی دنیا کا اذعان ہے، کوئی ثابت کرتا ہے کہ خارجی دنیا کا وجود محض وہم و فریب ہے، کسی کی زبان پہ ہے کہ ایک مستقل و قائم بالذات روح ہے، کوئی پکارتا ہے کہ نفس کے تغیر پذیر احوال کے سوا کچھ نہیں ہے، کسی کا دعویٰ ہے کہ سلسلۂ علل نامتناہی ہے، کوئی مانتا ہے کہ نہیں، ایک علۃ العلل ہے، کوئی انسان کو مجبور محض پاتا ہے، اور کوئی مختار، کوئی مبدءِ عالم کی وحدت کا قائل ہے، اور کوئی کثرت کا، بظاہر مہمل سے مہمل بات بھی تم کو ایسی نہ ملے گی جس کا باور کرنے والا عاقل سے عاقل فلسفی نہ ملتا ہو،

عقل انسانی کی ان ہی حیرانیوں کو دیکھ کر آدمی پکار اٹھتا ہے کہ کسی چیز کو حق کہنے کے صرف یہ معنی ہیں کہ جب تم اس کو حق یقین کرو تو حق ہے، ورنہ نہیں[۱]، اور خصوصاً موجودہ زمانہ میں تو اس سرعت و کثرت کے ساتھ نظریات اُبل پڑے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے زیادہ واقعی خیال کرنا، قریباً ناممکن ہو گیا ہے، اس قدر مختلف ہندسات، اس قدر مختلف منطقیں، اس قدر مختلف طبعیاتی و کیمیاوی مفروضات پیدا ہو گئے ہیں کہ صحیح سے صحیح اصول کے نسبت بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعیت کا پرتو ہونے کے بجائے محض انسانی ذہن کی ایجاد ہے[۲]،

۱؎ ارادۂ یقین. Theories of Knowledge (نظریات علم) از پروفیسر اکرفٹ ص ۲۳۳ بحوالہ

۲؎ The meaning of Truth ("معنی صداقت") ص ۵۸

مشاہدات کا یقین

تم سمجھتے ہو گے کہ علم ویقین کی یہ اضافی یا ذہنی نوعیت زیادہ سے زیادہ اصول ونظریات تک محدود ہو گی، باقی مشاہدات ومحسوسات جو ان اصول ونظریات کا آخری مرجع ہیں، وہ تو بہر حال کوئی اضافی شے نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان کے متعلق زید وعمرو کی نوعیتِ یقین میں کوئی تفاوت ناممکن ہے، لیکن تمہارا یہ "ناممکن" نہ صرف "ممکن" بلکہ واقعہ ہے،

دن رات کے ان معمولی تجربات کا تو ذکر ہی کیا، کہ ایک چیز جو ایک آدمی کو خوبصورت معلوم ہوتی ہے، دوسرے کو بدصورت نظر آتی ہے، ایک کو خوش مزہ محسوس ہوتی ہو دوسرے کو بدمزہ، آلاتِ حس ومشاہدہ کی ساری دنیا عبارت ہے، رنگ وبو، آواز، مزہ سردی وگرمی شکل وصورت، طول وعرض (امتداد) پستی وبلندی، دوری ونزدیکی سے، لیکن کیا ان میں سے ایک شے کے متعلق بھی عامی، حکیم اور فلسفی سب کا یقین یکساں نوعیت رکھتا ہے،

عامی آدمی اپنے حواس کی مذکورۂ بالا ساری دنیا کو ٹھوس خارجی حقایق یقین کرتا ہے، لیکن حکیم یا سائنس داں کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں، اور آج کل کے سائنسداں تو بار بار اس حقیقت کو دہراتے رہتے ہیں کہ اشیا در اصل وہ یا ویسی نہیں جیسی کہ ہمارے حواس کو محسوس ہوتی ہیں"۔ (ماڈرن بلیف ص ۵۶) ذہن یا احساس سے باہر نہ کوئی رنگ ہے نہ بو، نہ کوئی آواز ہے، نہ مزہ، لیکن حکمت کو چونکہ اپنی تحققات میں قدم قدم پر مادہ وقوت کے الفاظ دہرانا پڑتے ہیں، اس لیے خالص حکیم کے دل میں مادہ پرستی کا ایک ایسا جذبہ ومیلان پیدا ہو جاتا ہے کہ باوجود اس اقرار کے کہ "مادہ"

کسی نامعلوم شے کا نام ہے۔" پھر بھی کسی نہ کسی مفہوم میں اُس کے وجود خارجی کے یقین پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، بخلاف اس کے فلسفہ یا مابعدالطبیعیات کا عالم چونکہ حکیمانہ تعصبات سے بالاتر ہے، لہٰذا بے جھجک سرے سے وجود مادہ ہی کا انکار کر دیتا ہے، اس کے نزدیک بس جو کچھ وجود ہے وہ ذہن یا نفس کا،

مگر یقین کی گردن دلائل سے کب جھکتی ہے، ممکن ہے کہ چند لمحات کے لیے حکیم یا فلسفی عالم رنگ و بو یا مادہ کے وجود فی الخارج کے خلاف یقین پر قائم رہ سکتا ہو، لیکن بالآخر اس کو جبلت کی حکومت قاہرہ اسی نقطہ پر واپس لاتی ہے، جہاں سے غور و فکر نے اسکو منحرف کیا تھا، اور شب و روز کی زندگی میں وہ عالم رنگ و بو کے وجود خارجی پر اسی طرح اذعان رکھتا ہے جس طرح ایک عامی آدمی،

غرض یقین اپنی ماہیت کی رو سے تمام تر صرف ایک نفسی میلان ہے، جو نہ علم کا پابند ہے، نہ جہل کا، جس کا انحصار نہ عقل پر ہے، نہ بے عقلی پر، جو نہ سچ پر موقوف ہے نہ جھوٹ پر، وہ فلسفہ، حکمت، علم و عقل سب چیزوں سے پیدا ہو سکتا ہے، اور کسی سے بھی نہیں پیدا ہو سکتا، اور جب پیدا ہونا چاہتا ہے، تو کلیفرڈ کے اس مشورہ کا منہ نہیں دیکھتا کہ جھوٹ پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ ہمیشہ یقین کے بغیر رہو"

کیا عجیب بات ہے کہ یقین کی اس ماہیت پر بھی کہ وہ دلائل کا کوئی منطقی نتیجہ نہیں، بلکہ محض ایک ذہنی میلان ہے، خود اسی شخص کی نکتہ رس نظر پڑی تھی، جو یقین معجزات کا سب سے بڑا مخالف ہے، چنانچہ "ارسٹاٹیلین سوسائٹی" کے ایک ممبر براڈ نامی

نے ۳-۴ سال ہوئے ہیوم کے نظریہ معجزات پر ایک مضمون کے ضمن میں خود ہیوم کے اصول کی بنا پر لکھا ہے[1] کہ

"ہیوم کو یقین معجزہ سے اس لیے انکار ہے کہ معجزہ گذشتہ مستمر تجربہ کے منافی ہوتا ہے، مثلاً گذشتہ تجربہ یہ ہے کہ الف کے بعد ہمیشہ ب ظاہر ہوتا رہا ہو جس سے ہمارے اندر ایک قوی یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ آیندہ بھی "ب" "ہمیشہ" "الف" کے تابع ہوگا، ایک مذہبی آدمی معجزہ پر اس لیے یقین کرتا ہے کہ اس کے اندر عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے یقین کا ایک فطری میلان موجود ہے، جن سے مذہب کی تائید ہوتی ہو، دونوں صورتوں میں یقین کا نفسیاتی سبب ظاہر ہے، ہیوم کا عدم یقین اس کے اس فطری میلان پر مبنی ہو کہ جو کچھ پہلے ہوا ہے وہی آیندہ بھی ہوگا، اور مذہبی آدمی کا یقین اس کی عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے قبول کرنے کے فطری میلان پر مبنی ہے، جن سے مذہب کی تائید ہوتی ہو، لیکن خود ہیوم کو تسلیم ہے کہ گذشتہ مستمر تجربہ سے آیندہ پر حکم لگانے کا ہم کو کوئی منطقی حق حاصل نہیں ہے، لہذا مذہبی آدمی کا یقین معجزات پر، اور ہیوم کا یقین قوانین فطرت پر (جس کا نتیجہ معجزات کا عدم یقین ہے) منطق کی نگاہ میں دونوں بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں، دونوں صورتوں میں یقین نفسیاتی علت پر مبنی ہے، اور کسی صورت میں بھی کوئی منطقی علت ہیوم نہیں پیش کر سکتا۔"

جب یہ معلوم ہو چکا کہ یقین کی ماہیت صرف ایک طرح کا غیر منطقی میلان نفسی ہے

[1] دیکھو ارسٹاٹیلین سوسائٹی (جمعیۃ ارسطاطالیسیہ) لندن کی روداد بابت ۱۷-۱۹۱۶ء صفحہ ۹۲

تو اسکے اسباب کی جستجو منطق و فلسفہ کے دلائل میں بے سود ہے منطقی یا فلسفیانہ دلائل زیادہ سے زیادہ میلانِ یقین کی تقویت و تضعیف کا کام دے سکتے ہیں لیکن خود اس میلان کی تخلیق اُن کے بس سے باہر ہے، یہ میلان بذاتِ خود ایک نفسی حقیقت ہے، لہٰذا اس کے اسبابِ تخلیق کا سراغ نفسیات (علم النفس) ہی کے اوراق میں مل سکتا ہے، کم و بیش تمام علمائے نفسیات نے یقین کی ماہیت و اسباب پر بحث کی ہے لیکن ہمارے لیے یہاں علم النفس کے عام تفصیل طلب طرزِ بحث سے ہٹکر کسی قدر مختلف اور مختصر راہ زیادہ مناسب ہوگی'

نفسیاتِ یقین | البتہ بنیادِ بحث کے لیے استناداً کسی معتبر شہادت کا سامنے رکھنا ضروری ہے' جس کے لیے عہدِ حاضر میں امریکہ کے سب سے بڑے استادِ نفسیات پروفیسر ولیم جیمس کا نام مستند ترین ضمانت ہو سکتا ہے، اس لیے پہلے ہم پروفیسر موصوف کی کتاب "اصولِ نفسیات" کے باب احساسِ حقیقت (جلد دوم) سے اسبابِ یقین کے متعلق چند اصولی باتیں بلفظہٖ نقل کرتے ہیں،

(۱) "معالجات (تدابیر شفا طلبی) کے بارے میں انسان کی زود اعتقادی اسی قسم کے نفسی اسباب (یعنی جذباتی احوال) پر مبنی ہے، حتیٰ کہ جب کوئی محبوب و عزیز شخص خطرناک بیماری یا تکلیف میں مبتلا ہو تو ناگوار سے ناگوار شے بھی زود اعتقادی کی راہ میں نہیں حائل ہو سکتی، (خصوصاً عورتوں کے لیے) جس شے میں کچھ بھی امید شفا ہو، اس کے کرنے سے تسلی حاصل ہوتی ہے، لہٰذا جو علاج بھی ایسی حالت میں تجویز کیا جائے، وہ آتش گیر مادہ کے لیے چنگاری کا کام دیتا ہے طبیعت ذرا اس پر عمل کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے، آدمی اس علاج کا سامان کرتا ہے،

اور کم از کم ایک دن کے لیے اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ خطرہ جاتا رہا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یقین آفرینی کے بڑے اسباب امید و بیم وغیرہ کے جذبات ہیں جن کے احاطۂ اقتدار میں ماضی، مستقبل اور حال تینوں داخل ہیں۔" (صفحہ ۳۱۰-۳۱۱)

اس کے بعد دوسرے ہی صفحہ پر ہے کہ

(۲) سب سے زیادہ یقین آفریں وہ نظریہ ہوتا ہے جو ہمارے محسوسات کی تشفی بخش توجیہ کے علاوہ، ایسی چیزیں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو، جو سب سے زیادہ دلچسپ ہوں، اور جو ہمارے حاسۂ جمال پرستی اور جذباتی و عملی ضروریات کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہوں،

لیکن ہم کو یہاں نفسیاتِ یقین کے متعلق اصل میں جس مختصر متن کی شرح کرنی ہے وہ یہ ہے کہ

(۳) "ارادہ (خواہش) اور یقین (جس کے معنی نفس اور اشیا کے مابین ایک خاص تعلق کے ہیں) ایک ہی نفسیاتی واقعہ کے دو نام ہیں۔" (صفحہ ۳۲۱)

خواہشِ یقین ارادہ اور یقین کے ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے یقین کے لیے لازمی ہے کہ پہلے دل میں اس کے یقین کا ارادہ یا خواہش پیدا ہو۔ یقین ایک قسم کی تشفی ہے، جب تک اس کے لیے طلب و تشنگی نہ موجود ہو، یہ نہیں حاصل ہوتا، پانی پینے اور اس سے سیراب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے پیاس لگے لیکن اکثر پیاس لگنا ہی پانی پی لینے کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ شرط یہ ہے کہ اس کے پینے سے کوئی روکنے والا خیال موجود نہ ہو، مثلاً پانی کا دشمن کے ہاتھ سے ملنا، اس کی ناپاکی کا شبہہ، یا کسی بیماری کیلیے

اس کے مضر ہوتے کا اندیشہ، اسی طرح نفس پیاس کے علاوہ کبھی کبھی ترغیبات کی موجودگی بھی پانی پینے پر آمادہ کر دیتی ہے، مثلاً گرمی کے موسم میں کسی دوست کے یہاں صفائی و نفاست کے ساتھ کوری کوری صراحیوں میں ٹھنڈا پانی رکھا ہو، اور ان کے آس پاس لکھنؤ کے نازک کاغذی آبخورے چنے ہوں تو بے پیاس کی پیاس لگ آتی ہے،

موانع و مؤیداتِ یقین | یقین کی صورت میں ہم ان دونوں چیزوں کو علی الترتیب خواہش یقین کے موانع اور مؤیدات سے تعبیر کریں گے، جب کوئی چیز یقین و اذعان کے لیے پیش کی جاتی ہے تو خواہش اور اُس کے موانع و مؤیدات میں باہم ایک نفسی معرکہ آرائی ہوتی ہے، اور یقین یا عدم یقین کا فیصلہ اس معرکہ آرائی کے آخری نتیجہ پر منحصر ہوتا ہے، اگر خواہشِ یقین زیادہ قوی ہے، تو وہ بلا مؤیدات کی اعانت کے موانع پر غالب آجاتی ہے، اگر موانع زیادہ قوی ہیں تو وہ خواہش کو مغلوب کر دیتے ہیں، اگر موانع سرے سے نہیں موجود ہیں تو تنہا خواہش کافی ہوسکتی ہے، یا اگر موانع بہت ہی معمولی درجہ کے ہیں تو ضعیف سے ضعیف خواہش بھی اپنے مؤیدات کی مدد سے ان کو زیر کر لے گی۔

عقلی یا منطقی دلائل کو زیادہ سے زیادہ ان ہی موانع و مؤیدات کی صف میں جگہ مل سکتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ اس معرکہ کے تینوں (خواہش، موانع اور مؤیدات) پہلوانوں کا اصلی حربہ جذبات ہی ہوتے ہیں،

اب اوپر اقتباس اول میں جیمیں نے جو مثال دی ہے، اس کو سامنے رکھکر دیکھو کہ یقین کے پیدا کرنے میں خواہش و ارادہ کو کیا دخل ہے، اور مؤیدات و موانع کا اس پر

کیا اثر پڑتا ہے،

فرض کرو کہ زید کے گھر میں ایک شخص مہینوں سے مریض پڑا ہے طبی علاج کوئی کارگر نہیں ہوتا، ایک دوست آکر کہتا ہے کہ شہر میں ایک متقی، پرہیزگار، بے طمع بزرگ ہیں جن کی دعا سے بہتوں کو فائدہ ہوا ہے، تم بھی ان ہی کی طرف کیوں نہ رجوع کرو،

ظاہر ہے کہ زید کے دل میں اس مریض کے لیے شفا طلبی کی خواہش موجود ہے، اب اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی (مانع) نہیں ہے، تو بے تکلف دوست کے مشورہ پر عمل کے لیے آمادہ ہو جائے گا، اور طبیعت میں کم از کم کچھ دیر کے لیے شفا کی ایک امید بندھ جائے گی جس کا نام میلانِ یقین ہے، اب بزرگ موصوف کے پاس پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ اہل حاجت کا میلہ لگا ہوا ہے، پھر ان کے اتقا، اور بے لوثی کی کچھ مثالیں آنکھ کے سامنے آتی ہیں، لازماً ان چیزوں سے زید کے میلان یقین کی اور تائید و تقویت ہوتی ہے،

لیکن اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی ہے، وہ نہایت سخت ملحد و مادہ پرست ہے تو ایسی حالت میں وہ دوست کے مشورہ پر عمل کرنے کی جگہ الٹے اس سے طرح طرح کی بحثیں کرنے پر آمادہ ہو جائے گا، دعا کے اثر کو قانونِ فطرت کے منافی بتائے گا، اس کی شہادت پر جرح کرے گا، جو لوگ ان بزرگ کے پاس حاجت لیکر جاتے ہیں، ان کو اوہام پرست کہے گا، اور اپنے اندر کوئی میلان یقین نہ محسوس کرے گا۔

البتہ اگر یہی مادہ پرست و بدعقیدہ زید ایک دولت مند آدمی ہے، مریض خود اس کا اکلوتا، نوجوان ہونہار لڑکا ہے، جو اس کی دولت کا تنہا وارث اور خاندان کا ایک ہی

چراغ ہے، جس مرض میں اپنے بوڑھے باپ کی تمام امیدوں اور آرزؤں کا یہ مرکز مبتلا ہے وہ نہایت خطرناک ہے، ڈاکٹر اور اطبا علاج کرتے کرتے تھک گئے اور جواب دے چکے ہیں، ان حالات میں زید کی خواہشِ شفاطلبی جس درجہ قوی ہوگی معلوم ہے، ان ہی مواقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے، اب زید کی ساری بدعقیدگی دھری رہ جائیگی، دوست کا مشورہ اس کی مایوسیوں میں امید کی ایک جھلک ثابت ہوگا، اسکی انتہائی طلب و تشنگی، الحاد و مادہ پرستی کے تمام دلائل و موانع پر غالب آئے گی، اور وہ بلا بحث و حجت دوست کے ساتھ ہو جائے گا، اور جتنی ہی زیادہ اس کی خواہش قوی ہوگی، اتنی ہی زیادہ امید و یقین کے ساتھ یہ ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوگا،

لیکن اگر زید کے الحاد و بدعقیدگی کا جذبہ اتنا زبردست ہو کہ وہ اس کی قوی سے قوی خواہش شفاطلبی کو بھی زیر کر سکتا ہے تو بڑے سے بڑے بزرگ کی بزرگی بھی بیکار ثابت ہوگی، اور دوست کی جانب سے دعا کی شفابخشی کے دلائل و شواہد کا اگر انبار بھی لگا دیا جائے تو رائیگاں جائیگا، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ میں غالباً اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، ایمان و یقین کا حاسہ قلب ہے، اگر وہ مختوم ہے تو پھر عقل انسانی کی کوئی منطق اس مختومیت کا ازالہ نہیں کر سکتی۔

ساحروں کے دل میں ذوقِ ایمان کی کچھ نہ کچھ تشنگی موجود تھی، حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھ کر بے اختیار سربسجود ہو گئے اور پکار اٹھے اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى لیکن کیا فرعون کے معاند و مختوم قلب پر بھی کوئی معجزہ اثر کر سکا؟ انبیائے کرام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

کی حیات طیبہ تمھارے سامنے ہی، "سیرۃ النبی" میں، ابتدائی قبولِ اسلام کے صفحات پڑھو،
ہر سطر ذوقِ ایمان وطلبِ یقین کے مذکورۂ بالا نفسی حقایق سے معمور ملے گی،

نفسیاتِ یقین کی شہادت واقعاتِ سیرت سے

حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ یہ ہے کہ وہ بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے، اور حق کی تلاش میں تھے، انھوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو کہ یہ شخص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) جو نبوت کا دعوی کرتا ہے، اس کی تعلیم وتلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے اور واپس جاکر بیان کیا کہ "وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہی" ان مؤیداتِ یقین کے بعد حضرت ابوذرؓ خود مکہ گئے، اور گو اس وقت مکہ کی سرزمین پر اعلانِ اسلام کے لیے نہایت خطرناک موانع موجود تھے، تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے بعد ذوقِ ایمان کی تشفی نے اتنا جوش پیدا کر دیا کہ عین حرم کے اندر حضرت ابوذرؓ نے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کرکے کہا کہ "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہٗ"، اس اعلان کی بدولت جان بچنی مشکل ہوگئی،[1]

حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی، آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے، اور ساتھ کھیلے تھے، وہ گو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، دل میں نورِ حق موجود تھا، بالآخر ان بے رحمانہ ایذاؤں نے جو دشمنانِ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے تھے، اظہارِ اسلام پر بیتاب کر دیا، اظہار تو کر دیا

[1] یہ پورا واقعہ پڑھنے کے لائق ہے۔ دیکھو سیرۃ النبی جلد دوم طبع اول صفحہ ۱۱-۱۲

لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، آخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے"[1] موانعِ یقین موجود تھے، لیکن "دین حق" کے قبول اور اس کے داعی کی حمایت کا جذبہ ان موانع سے قوی تر تھا،

قیصر روم کے پاس جس وقت داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نامۂ مبارک پہنچا اور قیصر و ابوسفیان میں باہم جو گفتگو ہوئی اُس کے بعد گو قیصر کے ضمیر میں ایمان و اذعان کی روشنی پیدا ہوئی، اور اس نے کہا کہ "مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔" لیکن قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اُس سے بطارقہ اور اہل دربار سخت برہم ہو چکے تھے، نامۂ مبارک پڑھے جانے کے بعد اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھکر قیصر نے اہل عرب کو دربار سے اٹھا دیا، اور گو اس کے دل میں نورِ ایمان آ چکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی۔[2] "تخت و تاج کی حرص، دولت ایمان کی ترغیب سے قوی تر ثابت ہوئی،

خسرو پرویز کے تاریک دل میں قیصر روم کے برابر بھی ایمان کی روشنی نہ تھی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے، ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا، بخلاف اس کے نامۂ مبارک پر پہلے خدا کا نام، اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے، پھر نامۂ مبارک چاک کر ڈالا لیکن چند روز کے بعد خود سلطنتِ عجم

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول طبع دوم صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۸ [2] ایضاً صفحہ ۴۲۶ - ۴۲۹، پورا مکالمہ پڑھو۔

کے پرزے اڑ گئے۔[۱]"

اسی قسم کے واقعات کی بنا پر مصنف سیرت نے اوائلِ دعوت میں اسلام لانے والوں اور اس کے مخالفین کے جو مشترک خصائص گنائے ہیں، ان سے بھی تمام تر یقین کے ان ہی اصول و اسباب کی تائید ہوتی ہے، جو اوپر بیان ہوئے ہیں، تفصیل کے لیے خود سیرت (جلد اول طبع دوم صفحہ ۱۹۲-۲۰۴) کی طرف رجوع کرنا چاہیے، یہاں اختصار کے ساتھ صرف ضروری خلاصہ کا اعادہ کیا جاتا ہے،

اسلام لانے والوں کے خصائص مشترک۔

(۱) "اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع و پاکیزہ اخلاق تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت ابوذرؓ وغیرہ کا شمار ان ہی طالبانِ حق میں ہے۔" (خواہشِ یقین)

(۲) "بعض صحابہ ایسے تھے، جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے، اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو کہتے تھے،" (موانعِ یقین کی کمی)

(۳) "یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب نظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابوفکیہؓ، صہیبؓ وغیرہ جن کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی۔" (موانع کی کمی)

---

[۱] سیرۃ النبی جلد اول، طبع دوم صفحہ ۲۳۰

قریش سے بڑھ کر اسلام کا کون دشمن ہو گا، لیکن ان کی دشمنی کے کیا اسباب تھے؟

(۱) مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی، قریش ہمسایگانِ خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے جس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور و کلید بردار تھے"۔ عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیلِ بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی"۔

"اسلام کا اصلی فرض اس طلسم کو برباد کر دینا تھا لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت، اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لیے قریش نے شدت سے مخالفت کی، اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا، اسی قدر وہ مخالفت میں سرگرم تھے"۔

(۲) "قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی لیکن اسلام اور عیسائیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا" ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں،

(۳) "ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی، قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے، بنو ہاشم اور بنو امیہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندانِ بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی"۔

(۴) ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بد اخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بد اخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابو لہب نے

حرم محترم کا غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، اخنس بن شریق نمام و کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت دار و گیر کرتے تھے، جس سے اُن کی عظمت واقتدار کی شاہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں۔"

غرض اولاً تو ان قریش میں ایمان و یقین کی خواہش کا کوئی نشان نہیں ملتا، ثانیاً اگر نفس خواہش کچھ موجود بھی ہوتی تو تذکورۂ بالا موانع اس قدر زبردست تھے، کہ جب تک یہ نہ ہٹا دیے جاتے، اس خواہش کا ظہور ناممکن تھا،

یقین کے متعلق اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ٹھہرتا ہے کہ

(۱) بذات خود یقین، عام انسانی جذبات و احساسات ہی کی طرح کا ایک نفسی میلان یا ذہنی کیفیت ہے، فلسفہ و حکمت، بلکہ ریاضی تک کے منطقی دلائل سے، جو یقین پیدا ہوتا ہے اس کی ماہیت بھی اس نفسی میلان سے زیادہ نہیں ہے،

(۲) یقین کی بنیاد عقلی و نقلی تمام چیزوں میں یقین کی نفس خواہش اور پھر اُس خواہش کے موانع و مؤیدات کا وزن ہے،

(۳) ان بنیادی اسباب یقین کی تعمیر تمامتر ان جذبات و معتقدات اور مزعومات و مفروضات (علوم عقلیہ) سے ہوتی ہے، جو کسی شے کے قبول و یقین کو پیش کرنے سے پہلے افراد یا جماعت کے نفس میں جاگزیں ہوتے ہیں،

لہذا اب دیکھنا یہ ہے کہ معجزات کے یقین وقبول کے لیے کس قسم کے معتقدات کی نفس میں پہلے سے موجودگی لازمی ہے،

غایت معجزات

معجزہ منطقی دلیل نہیں اوپر آغاز کلام میں معجزہ کا جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ معجزہ نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، البتہ جو شخص مذہب کا قائل ہے، غیب پر ایمان رکھتا ہے، اور اس سنت الٰہی کا معتقد ہے کہ بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے خدا ان ہی کے اندر سے کسی نہ کسی برگزیدہ بندہ کو اپنے پیام کے ساتھ بھیجتا رہا ہے، اس کے سامنے جب کسی مقدس انسان کی طرف سے اس پیام کے حامل یا نبی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اور یہ داعی الی اللہ اپنے ظاہری و باطنی کمالاتِ اخلاقیہ و اوصافِ حمیدہ کے لحاظ سے عام انسانوں سے برتر نظر آتا ہے، تو اس شخص کے دل میں ایمان کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے، اب اگر اس پیغمبر سے کوئی معجزہ نما واقعہ ظاہر ہوتا ہے، یا اسکی طرف کسی معجزہ کا انتساب کیا جاتا ہے تو وہ اس کی صداقت کی ایک آیت یا نشانی کا کام دیتا ہے، جس سے ذوقِ ایمان کی تقویت ہوتی ہے، اور اس طرح ایمان کے تشنہ کام نفوس کے لیے ایک معنی کر کے معجزہ براہ راست خود نبوت کی نہیں، البتہ مدعی نبوت کی صداقت کی ایک نفسی دلیل بن جاتا ہے،

معجزہ کی اصلی غایت اس دلیل یا آیت کی جو غرض و غایت ہو سکتی ہے، اسکی نفسی حقیقت کو یوں سمجھو کہ مذہب کی بنیاد تمامتر اسرار و غیوب پر ہے، سب سے بڑا اسرار یا غیب بلکہ

غیب الغیب خود خدا کا وجود اور اس کی ذات ہے حشر و نشر، جن و ملک، وحی و الہام تمام چیزیں ایک عالم غیب ہیں نبوت نام ہی اسی عالم غیب کے ساتھ روابط و علائق کا، معجزہ میں بھی چونکہ ایک طرح کا غیب پایا جاتا ہے، یعنی وہ عالم ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا ہے، اس لیے جو شخص غیب پر ایمان رکھتا ہے، اس کا نفس قدرۃً اس یقین کی جانب مائل ہو جاتا ہے کہ جس برگزیدہ انسان سے معجزہ ظاہر ہوا ہے، وہ عالم غیب سے خاص تعلق رکھتا ہے،

لیکن اگر کوئی شخص غیب پر ایمان نہیں رکھتا یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے معجزہ تصدیق نبوت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے اور نہ آیت، کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی شے ہے کہ پہلے آدمی نفس اس امر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے، اور وہ ہدایتِ خلق کے لیے انبیاء کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے، جو آدمی نقطہ، خط یا سطح وغیرہ مبادی اقلیدس ہی کا قائل نہیں اسکو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو، جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لیے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازمی ہے، اسی طرح تفصیلاتِ مذہب پر یقین کرنے کے لیے پہلے نفس مذہب کا یقین ضروری ہے۔

مل نے ہیوم کے انکار معجزات کی تنقیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جو شخص کسی فوق الفطرت ہستی اور انسانی معاملات میں اس کی مداخلت کا پہلے ہی سے قائل نہیں ہے، اس کے سامنے اگر کسی انسان کی نسبت فوق الفطرت یا خارق عادت باتوں کی روایت کیجائے تو وہ ان کو معجزہ نہ مانے گا معجزات سے خود خدا کا وجود

نہیں ثابت کیا جا سکتا، اس لیے اگر خدا کا اعتقاد پہلے ہی سے نہ موجود ہو تو کسی فوق الفطرت
ہستی کی مداخلت کے علاوہ معجزنما واقعات کی اور بھی توجیہات ممکن ہیں ...... یہاں تک
تو ہیوم کی دلیل بامعنی کہی جا سکتی ہے، لیکن اگر ایک ایسی ذات کا وجود قطعی یا غالب طور پر
بھی مان لیا جائے جو موجودہ نظام فطرت کی خالق ہے، اور اس لیے اس میں تغیر و ترمیم
بھی کر سکتی ہے، تو ہیوم کی دلیل بے معنی ہو جاتی ہے، جب تم نے خدا کو مان لیا تو پھر جس شے
کو اس کے ارادہ نے پیدا کیا تھا، اس پر اس ارادہ کا براہ راست عمل و اثر خواہ مخواہ کا فرضی
نہیں رہتا، بلکہ ایک سنجیدہ "امکان" بن جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں سوال کی نوعیت
ہی بدل جاتی ہے، اور خدا کی مداخلت یا عدم مداخلت کا فیصلہ اس بحث پر ٹھہرتا ہے کہ
کائنات فطرت میں اس کی سنت عمل کیا رہی ہے یا عقلاً کیا رہنا چاہیے"[1]

غرض معجزہ کو معجزہ سمجھ کر اس کے یقین و قبول کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی پہلے غیب

---

[1] دیکھو Three essays on Religion (مذہب پر تین مضامین) مطبوعہ "ایشیاٹک پریس
صفحہ ۹۸، نیز نظام منطق کتاب سوم باب ۲۵ فصل ۲۔ اسی میں مل نے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے، وہ یہ کہ خدا کو مان
لینے کے بعد معجزہ کو قانون فطرت کا سرے سے خارق ہی نہیں کہا جا سکتا پتھر کو اوپر پھینکو اور کوئی شے بیچ میں مانع
یا عائق نہ ہو، تو اس صورت میں اس کا زمین پر لوٹ کر نہ گرنا یا ہوا میں معلق رہنا بیشک خلاف فطرت ہوگا لیکن اگر
اس کو بیچ میں کوئی روک لے تو زمین پر نہ گرنا بالکل خارق عادت نہ ہوگا کیونکہ مانع موجود ہے، معجزہ کی صورت
میں جو ارادہ خداوندی معمولی سلسلۂ علل و اسباب کا خالق ہے، وہی اس کے عمل سے مانع ہو جاتا ہے، لہذا معجزہ نہ
خلاف فطرت ہے اور نہ بلا علت، کیونکہ عمل علت کی شرط تو یہ ہے کہ کوئی مانع نہ موجود ہو اور یہاں موجود ہے۔

(خدا و مذہب) پر ایمان رکھتا ہو، اس کے بعد دیکھو کہ معجزہ کی مذکورۂ بالا غایت اور اس پر یقین کی اولین شرط کو پیش نظر رکھکر وقوع معجزہ کی مختلف صورتیں یا توجیہات کیا ہوسکتی ہیں، جزئی شقوق، یا فروعی احتمالات سے قطع نظر کر کے جن سے قدیم و جدید علم کلام کا دفتر پُر ہے، اصولی طور پر صرف وہی دو صورتیں نکلتی ہیں جن کی جانب مل نے اقتباس بالا میں اشارہ کیا ہے،

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خدا نے کارخانۂ عالم چلانے کے لیے کچھ اصول و قوانین مقرر کر دیے ہیں، جن کے مطابق اس کل کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر کام کرتا رہتا ہے، اور ارادۂ الٰہی اپنی اس سنتِ جاریہ میں کبھی کسی حالت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کرتا، بقول اسپنوزا کے کہ "خدا کی خدائی اور اس کی حقیقی عظمت و حکمت کا اظہار اسی سے ہوتا ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیر نظام کا پابند ہو، قدرتِ خداوندی کے معنی یہی ہیں کہ کارخانۂ فطرت اپنے ازلی یا اٹل قوانین کا تابع ہے[لے]"

اس احتمال کی رو سے معجزہ کا وقوع بھی ان ہی ازلی قوانین کی کسی نہ کسی الٰہی کارفرمائی کی ماتحت ہونا چاہیے، جس کا کم از کم ظہور معجزہ کے وقت عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا اور اس لیے معجزہ جو در اصل محض ایک فطری واقعہ ہوتا ہے، بظاہر لوگوں کو معجزہ نظر آتا ہے، مثلاً جس وقت تک عمل تنویم کے نفسی قوانینِ فطرت کا انکشاف نہیں ہوا تھا، عصائے موسوی کا اژدہا بن جانا معجزہ تھا، لیکن آج اس نفسی قانون کے جاننے والوں کے لیے کرسی کا شیر

لے اسپنوزا جدید فلسفہ کا ایک نامور امام ہے دیکھو اسکا مجموعہ تصنیفات Spinoza's Work جلد اول باب ۶ بحث معجزات،

بن جانا فطری واقعہ ہے اور عصاے موسوی کے اژدہا نظر آنے کی بھی اس سے توجیہ کیجا سکتی ہے،
لیکن اس توجیہ سے یہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں یہ واقعہ معجزہ نہ تھا،
اس لیے کہ اس زمانہ تک معجزہ کی وہ غایت جس کا ابھی اوپر ذکر آچکا ہے، اس واقعہ سے
پوری طرح حاصل تھی یعنی اس میں ایک طرح کا غیب پایا جاتا تھا، اور اس کا وقوع
عالمِ ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا تھا، لہذا اس سے نبی کی تصدیق کا
(جو عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے) نفس میں میلان پیدا ہو سکتا تھا، جیسا کہ ساحروں کے نفس
میں پیدا ہوا، انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے نبی ہونے کی تصدیق کی،

البتہ آج یہ واقعہ البرٹ مول یا ولیم جمیس کے سامنے بیان کیا جائے تو وہ اس کو بجائے
معجزہ کے صرف ایک فطری واقعہ سمجھنے کا حق رکھتے ہیں، اس لیے اب اگر کوئی نبی یا ولی اپنی
نبوت یا ولایت کی تصدیق کا میلان کسی معجزہ یا کرامت کے ذریعہ سے مول اور جمیس وغیرہ
کے دل میں پیدا کرنا چاہے تو کوئی ایسی نشانی ظاہر کرنا ہوگی جس کی توجیہ سے ان کا موجودہ
علم اسی طرح عاجز ہو، جس طرح کہ انبیاے سابقین کے زمانہ میں ان کے معجزات کی توجیہ سے
اس وقت کا علم عاجز تھا، یا بعض کی توجیہ سے اب بھی عاجز ہے، مثلاً شق قمر، لیکن اصل یہ ہے
کہ عملِ تنویم کے تجربات میں اگر تھوڑی سی قیاسی وسعت اور پیدا کر لی جائے تو شق قمر وغیرہ
تقریباً ہر قسم کے خوارق کی توجیہ ہو سکتی ہے،

کیونکہ اس عمل کا دار و مدار تمام تر عامل کی قوت اثر آفرینی اور معمول کی اثر پذیری پر ہے،
یہ نفسی تاثیر و تاثر کم و بیش ہر انسان میں موجود ہے جس کی ادنیٰ مثالیں ہم کو ہر زمانہ کی معمولی

زندگی میں ملتی رہتی ہیں، ہماری زبان کی ایک عامیانہ مثل ہے کہ "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" جس کے یہی معنی ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے اوضاع واطوار سے اثر پذیر ہوتا ہے، نیک صحبت کے فوائد اور بری صحبت کے مضار کا بھید یہی نامحسوس تاثر ہے، جس قدر کسی شخص کی قوت ارادی یا قوت تاثیر زبردست ہوتی ہے، اسی قدر زیادہ وہ دوسروں پر اثر ڈال سکتا ہے، دنیا کے اکابر رجال کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہی قوت رہی ہے، ان کے صرف کہنے کا لوگوں پر جو اثر پڑتا ہے، وہ دوسروں کے دلائل وبراہین کا نہیں پڑتا، اس کی بہترین زندہ مثال گاندھی جی ہیں، انھوں نے جس درجہ کے امراء اعیانِ ملک سے چرخہ کتوالیا ہے، اور اپنی سیدھی سادی گفتگو اور تحریروں سے جس طرح اس کی خوبیوں کا یقین ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دل میں پیدا کر دیا ہے، وہ بڑی حد تک اسی قوت کا کرشمہ ہے، ورنہ ملک میں ان سے زبردست خطیب، انشاء پرداز اور منطقی سیکڑوں ملیں گے، لیکن اثر آفرینی کا یہ سحر وجادو کسی کی تقریر، کسی کی تحریر اور کسی کے دلائل میں نہیں ملتا، غرض اثر آفرینی[1] کی یہی قوت ہے جس کو عاملِ تنویم مشق سے بڑھا کر کسی کو شیر اور جھاڑو کو حسین عورت بنا دے سکتا ہے،

ان واقعات کی بنا پر ہم کو یقیناً اپنے قیاس میں اتنی توسیع کا حق حاصل ہے کہ ماہرینِ تنویم

[1] انگریزی میں اس اثر آفرینی کے لیے (Suggestion) کی اصطلاح ہے جس کی پوری حقیقت کو تجربات اور مثالوں سے سمجھنے کیلیے انگریزی داں حضرات ڈاکٹر سیڈس کی دلچسپ کتاب "نفسیات اثر آفرینی" The Psychology of Suggestion کی طرف رجوع کر سکتے ہیں،

یا عام اکابر رجال و مصلحین کی قوتِ اثر آفرینی کے مقابلہ میں انبیاے کرامؑ کی وہبی و روحانی قوتِ تاثیر و نفوذ کا مرتبہ کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے، اور اس لیے وہ اُن سے بھی بدرجہا زیادہ عجیب تر و محیر العقول امور کا یقین لوگوں کے دل میں پیدا کر دے سکتے ہیں، عامل تنویم، اثر آفرینی کے لیے کچھ نہ کچھ ظاہری حرکات و سکنات یا الفاظ و خطاب کا محتاج ہوتا ہے، اور اس کا زیادہ تر اثر افراد تک محدود رہتا ہے، لیکن نبی کی اعلیٰ اور روحانی قوتِ تاثیر کے لیے صرف باطنی ارادہ کافی ہو سکتا ہے، اور اس کا اثر افراد سے بڑھ کر جماعت تک کو محیط ہو سکتا ہے،

البتہ یہاں ایک وسوسہ دل میں پیدا ہوگا جس کا دور کر لینا ضروری ہے، وہ یہ کہ معجزہ کی اس توجیہ کو قبول کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی حقیقت ایک طرح کے سحر، نظر بندی یا فریب حواس سے زیادہ نہیں ہے، یعنی جس شخص کو کوئی معجزہ نظر آتا ہے، اس کا وجود خود اس شخص کی نظر، حواس یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ذہن سے باہر کسی خارجی و حقیقی شے کی صورت میں نہیں ہوتا،

بعض وسوسوں کا جواب اوپر معجزہ کی جو غایت معلوم ہو چکی ہے، اس کے لحاظ سے اس وسوسہ کا صاف جواب تو یہ ہوگا کہ وہ غایت بہر نوع حاصل ہے، معجزہ فی نفسہٖ چاہے کوئی خارجی شے ہو یا محض ذہنی، اصلی غرض صرف اتنی ہے کہ جس فرد یا جماعت کے سامنے کوئی معجزہ پیش کیا جائے اس کے علم کے لحاظ سے وہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ غیب رکھتا ہو، ہاں بظاہر اس سے بھی ایک اور قوی تر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں پھر نبی اور عامل تنویم یا ساحر میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اس اشکال کا حل بھی ضمناً اوپر ہی گذر چکا ہے، کہ معجزہ بجائے خود نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، بلکہ جس شخص میں ظاہری و باطنی کمالات یعنی اصلی خصائص نبوت

واصافات حمیدہ عام انسانوں کے مقابلہ میں فوق العادۃ حد تک مجتمع ہوتے ہیں، اس کے حق میں معجزہ محض تائید مزید کا کام دے سکتا ہے۔ اور جس شخص پر نبوت کے یہ اصلی خصائص وکمالات روحانی مؤثر نہ ہوں وہ بلاشبہ نبی کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک بڑا ساحر قرار دے گا، جیسا کہ منکرین نے ہمیشہ کہا ہے کہ "هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ"۔ "إِنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ"۔ "قَالُوا هٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ"۔ "وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ"[۱]۔

لیکن اس وسوسہ کار کہ توجیہ بالا کی بنا پر معجزہ کی حقیقت کسی خارجی و واقعی وجود کی جگہ محض

---

[۱] متکلمین اسلام کے ہاں سحر و معجزہ کی بحث ایک مستقل مسئلہ ہے لیکن ان میں بھی اہل تحقیق کا مسلک یہی ہے کہ دونوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ہے، بعضوں کے نزدیک تو محض استعمال کا فرق ہے یعنی انبیاء اور اولیاء اپنے نفس کی قوت مجز نمائی کو مقاصد خیر کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور ساحر مقاصد شر کے لیے (سفینۃ الراغب ص ۱۱۰) مولانا حمید الدین فراہی جیسے بڑھ کر موجودہ دنیائے اسلام میں شاید ہی کسی کو فہم قرآن کی سعادت حاصل ہو وہ بھی "لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ" سے یہی نتیجہ اخذ فرماتے ہیں کہ معجزہ اور سحر میں صرف یہ فرق ہے کہ ساحر فلاح یاب نہیں ہوتا یعنی وہ اپنی قوتِ سحر کو خود اپنے یا دوسروں کے لیے فلاح و خیر کے اغراض میں استعمال نہیں کرتا، بلکہ علی العموم جادوگروں کی اخلاقی حالت نہایت پست ہوتی ہے،

لیکن "وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ" کی نص قرآنی کا زیادہ صاف و صحیح مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساحر کا سحر جب نبی اور اس کے معجزہ کے مقابلہ میں آتا ہے تو وہ مغلوب و ناکام رہتا ہے، جیسا کہ عصائے موسیٰ کے مقابلہ میں ظاہر ہوا اس سے سحر و معجزہ میں جب کہ دونوں میں مقابلہ ہو، ظاہری فرق و تمیز کا بھی ایک یقینی معیار ہاتھ آجاتا ہے، باقی دونوں کی باطنی حقیقت میں کیا فرق ہے، یہ تو فن سحر کا عالم ہی جان سکتا ہے، جیسا کہ تمام فنی حقایق میں ہوتا ہے، اور جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدمقابل ساحروں نے فرق جان لیا تھا،

ایک ذہنی یا خیالی وہم کی رہ جاتی ہے، تحقیقی جواب درصل مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے، جو تمام عقلی موشگافیوں کی آخری عدالت مرافعہ ہے، مگر اس عدالت کا آخری فیصلہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ حقیقی یا واقعی وجود صرف خارجی چیزوں کا ہے، بلکہ اس کے نزدیک تو یہی امر سرے سے مشتبہ ہے کہ خود خارج کا کوئی وجود ہے، اور اساطینِ فلسفہ کی ایک بڑی جماعت (تصوریہ) کا مسلک یہ ہے کہ "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"، حقیقی وجود صرف روح، ذہن یا نفس کا ہے باقی دریا، پہاڑ، چاند، سورج، زمین و آسمان، جو کچھ دیکھتے ہو، یہ سب تمہارے ذہن ہی کے اندر ہیں، مادہ اور عالم مادی محض ایک "وہم و گمان"[۱] ہے، اس جماعت نے عالمِ خارجی کی ایک توجیہ یہ کی ہے کہ جن چیزوں کو ہم موجودات خارجی سمجھتے ہیں، وہ صرف ذہن کے تصورات ہیں، جو خدا ہمارے اندر پیدا کر دیتا ہے، اسی راز کی طرف اکبر مرحوم نے باتوں باتوں میں اس طرح اشارہ کیا ہے کہ "جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم و گماں ہمارا"۔ لہذا جس ذات یا قوت نے ہمارے ذہن میں عصائے موسوی اور ثابت و مسلم قمر کا تصور پیدا کیا تھا، اسی نے اگر تھوڑی دیر کے لیے عصا کی جگہ اژدہا اور قمرِ مسلم کی جگہ شقِ قمر کا تصور پیدا کر دیا تو دونوں کے وجود کی حقیقت و نوعیت میں کیا فرق پڑا۔

سائنس جس کا جذبۂ مادہ پرستی دلائل سے لاجوابی اور خود مادہ کو غیر مادی وغیر جوہری

---

[۱] "مابعد الطبیعیات" کے اس نازک مسئلہ کی توضیح کی گنجائش یہاں نہیں نکالی جا سکتی، البتہ دورِ جدید میں تصوریت کے بانی اول برکلے کا فلسفہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے، جو لوگ فلسفہ کا ذوق رکھتے ہیں، وہ تو اس کی اصل کتاب "مکالمات و مبادی" کا مطالعہ کر سکتے ہیں، عام لوگ شاید "فلسفۂ برکلے" سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے (مطبوعۂ دارالمصنفین)

کہنے کے باوجود مادیات کے وجود خارجی سے یک قلم دست برداری پر راضی نہیں، اور اس تاریکی میں کسی نہ کسی طرح الجھا رہنا ہی پسند کرتا ہے، وہ بھی کم از کم محسوسات کی نسبت تو یہ ماننے پر مجبور ہی ہے کہ رنگ و بو، آواز و مزہ، سردی و گرمی وغیرہ کا وجود صرف ایک ذہنی احساس یا تصور ہے جس کو مادہ نامی کوئی "نامعلوم شے" ہمارے ذہن میں خلق کر دیتی ہے، اور جس کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں۔ جب رنگ اور آواز جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں، اس کے حقیقی و واقعی وجود کے صرف اتنے ہی معنی ہیں کہ ہم اس کا احساس و تصور رکھتے ہیں، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ معجزات کے وجود کو ہم اس سے زیادہ حقیقی و واقعی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

ایک اور اعتراض

یہ تو وہ شبہات تھے جو معجزہ اور سحر و تنویم کی یکسانی یا معجزات کے محض ذہنی وجود کی بنا پر پیدا ہوتے تھے لیکن ایک اور اعتراض معجزہ کی تمام ان توجیہات پر وارد ہوتا ہے جن کی رو سے یہ فطرت کے معمولی غیر متغیر قوانین اور علل و اسباب (چاہے وہ نفسی ہوں یا طبعی و مادی) ہی کے کسی نہ کسی ایسے مخفی عمل کا معلول کیا جاتا ہے جس کا ظہورِ معجزہ کے وقت تک عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا، یہ ایک اعتراض معجزہ کے اضافی ہونے کا ہے، فرض کرو کہ شقِ قمر کی علت خواہ تنویم کی طرح کوئی نفسی قانون ہو، یا کیمیاوی جذب و اتصال کی طرح جو چاند کے مختلف اجزا کو باہم ملحق کیے ہوئے ہے، کوئی ایسا مادی قانون دفع و افتراق ہو جس نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے ہوں، ان دونوں صورتوں میں شقِ قمر صرف اسی وقت تک معجزہ ہے جب تک کہ اس کے نفسی یا مادی قوانین و علل کا انکشاف نہیں ہوتا، لاسلکی پیام رسانی

کے انکشاف سے پہلے، اگر کوئی شخص ہندوستان میں بیٹھ کر ایک سکنڈ میں امریکہ کا کوئی واقعہ معلوم کر لیتا تو یہ کسی معجزہ سے کم نہ ہوتا، لیکن اب معمولی بات ہے،

بے شبہہ اس معنی کر کے معجزہ یقیناً اضافی شے ہے، اور ہمیشہ رہے گا، کوئی معجزہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو اس احتمال اضافیت سے خالی ہو، کیونکہ انسان کا علم ہی تمامتر اضافی ہے، اگر اس کا علم قطعی و مختتم طور پر تمام قوانینِ فطرت کا احاطہ کر سکتا تو البتہ کسی حد تک معجزہ کی نسبت یہ مطالبہ بجا ہو سکتا تھا کہ ابدالآباد تک کسی قانونِ فطرت سے اس کی توجیہ نہ ہونی چاہیے، لیکن جب ہمارا علم ہی اضافی ہے تو کوئی معجزہ احتمالِ اضافیت سے کیسے خالی ہو سکتا ہے؟ ایک مدعی نبوت یہ اعجاز دکھلا سکتا ہے کہ ایک ہفتہ تک آفتاب غروب نہ ہو، لیکن اس کا قطعی یقین کیسے دلایا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر علم ہیئت کے انکشافات سے اس اعجاز کی توجیہ نہ ہو سکے گی؟ لہذا جو شے آج معجزہ ہے بالفرض کل وہ طبعی واقعہ ثابت ہو جائے تو بھی اس سے آج اُس کے معجزہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اور معجزہ کی غرض و غایت کو پورا کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ (دیکھو اوپر صفحہ ۴-۱۷۳)

۲- دوسری صورت | یہ ہے کہ عام طور پر تو کارخانہ کائنات ایک مقررہ سنت یا بندھے ہوئے قوانین ہی کے ماتحت چلتا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی خدا اپنے مرسلین و مقربین کی تائید غیبی کے لیے اس "سنت جاریہ" میں مداخلت اور تغیر و تبدل کو بھی جائز رکھتا ہے، خواہ یہ تغیر و تبدل فطرت میں کسی نئے حذف و اضافہ کی وساطت سے ہو، یا اس کا منشا براہ راست ارادۂ الٰہی ہو، اور جس طرح اسپنوزا کے نزدیک خدا کی خدائی اس میں نظر آتی ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیر

نظام کا پابند ہو، اسی طرح "بدہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ ہر معلول کی براہ راست علّت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہستی برتر کا ارادہ[1] ہے۔" ان فلاسفہ کے نزدیک وقوعِ معجزہ کے لیے بھی ارادۂ الٰہی کی براہ راست مداخلت ہی والا احتمال زیادہ قابل قبول ہوگا،

اس صورت کے مختلف احتمالات

صورتِ مداخلت کے ان احتمالاتِ ثلٰثہ میں اگرچہ کوئی قطعی تفریق ہر جگہ نہیں کی جا سکتی، تاہم جو موٹا سا فرق کیا جا سکتا ہے، اس کو مثالوں سے سمجھ لینا چاہیے،

(۱) عام قانون فطرت یہ ہے کہ انسان کا بچہ بلا اتصال جنسی نہیں پیدا ہوتا، لیکن اس اتصال جنسی سے جو مادۂ تولید رحم مادر میں داخل ہوتا ہے، اس کو اگر خدا خود رحم کے اندر ہی پیدا کردے جس طرح کہ اور بہت سی رطوبات جسم میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، تو بلا اتصالِ جنسی لڑکا پیدا ہو سکتا ہے، اور مداخلتِ خداوندی کی یہ صورت فطرت میں ایک نئے عارضی اضافہ کی وساطت پر مبنی ہوگی، ممکن ہے کہ "ولادتِ مسیح" میں خدا نے اپنی مداخلت کی اسی صورت سے کام لیا ہو،

(۲) اسی طرح اضافہ کے بجائے حذف کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ چاند کے مختلف اجزاء جس کیمیاوی جذب و اتصال کی قوت سے آپس میں پیوستہ ہیں، ان میں سے صرف اس حصۂ قوت کو جو چاند کے نصفین میں موجب اتصال ہے، تھوڑی دیر کے لیے خدا حذف یا سلب کرلے جس سے شقِ قمر کا معجزہ ظاہر ہو سکتا ہے،

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ کسی مادی واسطہ کا حذف و اضافہ کیے بغیر براہ راست خدا نے صرف ارادۂ "کن فیکون" سے قمر کو شق اور مسیح کو پیدا کر دیا ہو،

---

[1] دیکھو ص ۵ ۱۲

یہی آخری صورت عمیق النظر فلاسفہ و متکلمین اور اہل حق کا مذہب ہے۔ بلکہ تنویمی احتمال کی تو خود کلام مجید کی رو سے گنجایش نہیں، اس لیے کہ تنویم کا عمل اسکے عامل کے علم و ارادہ کے تحت ہوتا ہے، اور معجزات میں انبیاء علیہم السلام کے علم و ارادہ کو قطعاً دخل نہیں ہوتا، اسی لیے وہ فرمایش و تحدی پر کسی آیت یا معجزہ کو خود پیش کر سکنے سے عجز کا صاف اعتراف اور اس امر کا غیر مشکوک اعلان کرتے ہیں کہ "آیات تو صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہیں" (انما الاٰیات عند اللہ۔ انما الاٰیات عند ربی) اور اگر رسول ان کو پیش کرتا یا کرسکتا ہے۔ تو صرف اللہ ہی کے براہ راست حکم و اذن سے "خود کسی رسول میں ہرگز اس کی طاقت نہیں کہ اللہ کی مرضی و مشیت کے بغیر کوئی آیت یا معجزہ پیش کر سکے۔" (مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ) اگر عامل تنویم کی طرح انبیاء علیہم السلام اپنے ہی علم و ارادہ سے معجزات ظاہر کرتے ہوتے تو حضرت موسیٰ اپنے عصا کو سانپ کی صورت میں ظاہر فرما کر خود اسی سے کیوں ڈرتے، اور اس کے پھر عصا بنا دینے کو اللہ تعالیٰ راست اپنی طرف کیوں منسوب فرماتا کہ "ڈرو نہیں ہم اس کو پھر ابھی چھڑی ہی بنا دیں گے۔" لَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى۔

باقی اور جتنے احتمالات اوپر بیان ہوئے وہ بھی بس احتمالات و تاویلات ہی کے درجہ میں ہیں، لیکن تاویل خواہ بعید ہی ہو، تکذیب کے مقابلہ میں اہون ہے، لہٰذا یہ درحقیقت ایسے طفل مزاج عقل پرستوں پر اتمام حجت اور انکار و تکذیب کی راہ سے ان کو بچانے کے لیے ہیں، جو بچوں کی طرح مٹھائی (عقل) کا نام لیے بغیر کسی اعلیٰ حقیقت کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے، اور جن کی عقل، عقل کے نام سے اتنی مرعوب ہے کہ خود عقل کی

نارسائی تک بھی رسائی نہیں پاسکے ہیں،

دراصل بحث و توجہ کی بات ایک ہی ہے کہ سارے کارخانۂ فطرت کی اساس و بنیاد کوئی بے شعور و بے ارادہ مبدء ہے. یا اندر باہر انفس و آفاق میں جو کچھ بھی ہے اور ہوتا ہے تمامتر بالذات و براہ راست کسی علم و ارادہ والی ذات کی مشیت و قدرت کا ظہور ہے. فلسفہ اور فلسفیانہ عقل کے لیے ایک طرف تو یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے یا ہو رہا ہے، وہ ایک ہی ہستی کی جلوہ فرمائی و کارفرمائی کے مظاہر ہیں، اور فلسفۂ تصوریت کی رو سے (جس کا جدید فلسفہ میں خصوصاً دور دورہ رہا ہے) یہ ہستی اسی نوعیت کی ہے جس کو ہم شاعرالذات نفس و روح یا انا و ایغو سے تعبیر کرتے ہیں، باقی مادہ و طبیعت یا مادی و طبعی عوامل و قوانین کی ساری تعبیرات و اصطلاحات دفتر بے معنی ہیں،

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

نئی بات جو سائنس اور سائنسدانوں کے نام سے مرعوب ذہنوں اور عقلوں کے لیے خصوصاً لائق توجہ ہے، یہ ہے کہ مادہ کی بظاہر جس ٹھوس چٹان پر مادیت یا طبعی عوامل و قوانین کی پوری عمارت کھڑی تھی وہ خود نئی طبیعیات ہی میں برف کی طرح گھل رہی ہے" اب ازلی و غیر فانی مادہ اور ٹھوس سالمات پرانا افسانہ ہو چکے ہیں، قائم بالذات جوہر کی حیثیت سے مادہ کو اب کوئی اساسی حقیقت نہیں تسلیم کیا جاتا، وہ اب عملاً برقی توانائی یا برقیات میں گم ہو کر رہ گیا ہے[1]" لیکن خود برق یا برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے، کوئی نہیں جانتا ہی نہیں

[1] ماڈرن بلیف (مقدمہ)

بلکہ مادہ کو کسی معنیٰ میں بھی موجود جاننے کے لیے عام انسانی ذہن و دماغ کے لیے کم از کم اتنا سہارا ناگزیر تھا کہ وہ کسی جگہ (یا مکان میں) موجود ہے، لیکن نظریۂ اضافیت نے اس آخری سہارے کو بھی چھین لیا،

"مادہ جو ہماری عام عقل و فہم کے لیے ایک موجود فی المکان اور قائم فی الزمان جوہر تھا......اور کائنات نام تھا مادہ کے ڈھیروں ڈلوں یا ایسے مادی جوہروں کا جو خاص خاص قوانین کے مطابق زمان و مکان میں ادھر سے ادھر مارے مارے پھرتے تھے"

"اب جو بڑا انقلاب سائنس کے نقطۂ نظر سے برپا ہوا ہے وہ صحیح معنی میں اسی واقعہ کا نتیجہ ہے کہ مادہ اور زمان و مکان سرے سے تین جداگانہ حقایق ہی نہیں قرار دیے جاتے۔"[1]

ایک عامی آدمی عریاں الفاظ میں اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہے کہ مادہ نہ کسی جگہ ہے، نہ کسی وقت میں یعنی نہ کسی مکان میں نہ کسی زمان میں، تو پھر "ہے" کے کیا معنی؟ اضافیت کے اس شاہکار کو پوری طرح سمجھنا سمجھانا تو اعلیٰ ریاضیات کے ماہرین ہی کا کام ہے، ہم عامیوں کو سچ پوچھیے تو ایسے مادہ کی نسبت جو زمان و مکان سے الگ یا مستقل بالذات ہو کر کسی جگہ اور وقت میں یا زمان و مکان کے مظروف کی حیثیت سے نہ پایا جاتا ہو بے ساختہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ "ریاضیات نے تحلیل کرتے کرتے ہماری خارجی (یا مادی) دنیا کو قریباً عدم تک پہنچا دیا ہے"[2] اور یہ تو بہر حال واضح ہو گیا ہے کہ کائنات کو کوئی مشین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ پرانی مادیت دیوالیہ ہو چکی ہے، یعنی وہ مادیت جو کائنات، زندگی اور ذہن سب کا محض ایک مادی تصور رکھتی تھی"[3] اسی طرح

---

[1] ماڈرن بلیف۔ مقدمہ صفحہ ۱۵ [2] ایضاً ص ۳۴ [3] ایضاً

اسی طرح سائنس و ریاضی کے جھروکوں سے بھی فلسفیانہ تصوریت ہی جھانکنے لگی ہے حتیٰ کہ

"سائنسدانوں کو طبعی کائنات میں کسی اساسی خارجی یا معروضی حقیقت کی جستجو میں معلوم ہوا ہے کہ کوئی خارجی حقیقت اگر سرے سے ہو بھی، تو وہ کوئی ایسی نہایت ہی عجیب و غریب شے ہوگی جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ ایڈنگٹن نے نظریۂ اضافیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو طبیعیات کی ایک دوسری جدید ترقی کوانٹم تھیوری تک پہنچکر ہم نے خارجی حقیقت کی جستجو کے مقصد کو ترک کر دیا ہے۔ اور طبعی کائنات کی ایسے عناصر میں تحلیل کرنا پڑی ہے جو صراحتہً ذہنی (Subjective) ہیں۔ اگر خارجی دنیا کو جاننے میں ہمارے لیے خود اپنے ذہنی عنصر کو جدا کرنا مشکل ہے تو خود دانی (Self - Knowing) شعور کے مسائل میں جہاں ذہن و خارج (یعنی جاننے والا اور جانا گیا) حقیقۃً ایک ہو جاتے ہیں، اسکو جدا یا ممتاز کرنا کہیں زیادہ مشکل ہوگا۔"[1]

غرض فلسفہ کے بعد سائنس میں بھی ہوا کا رخ جس طرح تصوریت یعنی اس خیال کی طرف جا رہا ہے کہ ہماری کائنات اور اس کی نیرنگیاں بے شعور مادہ کی میکانکی کارستانیاں نہیں، بلکہ ذہن و شعور کی کار فرمائیاں ہیں، اور خالص سائنسداں نہ سہی لیکن سائنسداں فلسفی کی حیثیت سے سر جیمس جینس، ماکس، پلانک، شروڈنگر، آئینسٹائن وغیرہ جیسے رجالِ سائنس کا تصوریت کی جانب رجحان بڑھتا جا رہا ہے، اور کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے لگے ہیں، جیسا کہ سر جیمس جینس کا صاف اعتراف ہے کہ میرا رجحان تصوریہ کے اسی نظریہ کی طرف ہے کہ اساسی و بنیادی حقیقت شعور ہے، اور مادی کائنات اس سے ماخوذ ہے۔" (ماڈرن بلیف ص ۵۲)

---

[1] ماڈرن بلیف مقدمہ ص ۸

مذاہب کا وجود اسی ذی شعور و ذی علم اساسی سرچشمہ کائنات کے سوا کیا ہی، اور جب ساری کائنات ہی کسی نہ کسی طرح اس کے علم و شعور سے ماخوذ یا اس کی مخلوق ہی، تو معجزات کے مادی یا میکانکی عوامل و قوانین کی جستجو خود عقل کی رو سے کونسی عقلمندی کا کارنامہ ہے[1]، عقل و دانش کی بات تو بس وہی الہ آبادی عارف اکبر کی ہے کہ

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

یقینِ معجزہ کے شرائط | غرض یقینِ معجزہ کی اولین شرط خدا اور غیب کا یقین ہی، اس کے بعد اپنے اپنے علم و مذاق کے مطابق توجیہ معجزات کی جس طرح یہ "پہلی صورت" ممکن ہی کہ وہ عام قوانینِ فطرت (خواہ نفسی یا مادی) ہی کے کسی مخفی عمل کا نتیجہ ہوں، اسی طرح مداخلت کی (خواہ براہِ راست ہو یا بواسطہ حذف و اضافہ) "دوسری صورت" بھی قابلِ قبول ہے، انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹانلی جیونس نے ایک نہایت ضخیم کتاب "اصول سائنس[2]" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ

"وہ پر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گذری ہیں، ان سے ایک نتیجہ جو نہایت صاف طور پر نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم کارخانۂ فطرت میں مداخلتِ خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے"........ جس قوت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے، وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہی، اس قسم کے واقعات ایک معنی

---

[1] ان مباحث کی کامل تشفی بخش ان شاء اللہ فلسفۂ اسلام کے ذیل میں بشرط صحت و حیات ملے گی۔

[2] The Principle of Science (حاشیہ) طبع آخر ۱۹۱۳ء ص ۷۶۶

کر کے ہمارے لیے ناقابلِ تصور کیے جا سکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابلِ تصور نہیں
ہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے"

مگر جو شخص اس خالقِ کائنات **قوت** ہی کا قطعاً منکر ہو، جو سرے سے غیب ہی پر ایمان
نہ رکھتا ہو، اور جو آرنسٹ **ہیگل** (جرمنی کا مشہور ملحد و مادہ پرست)، کی طرح خود خدا، روح، حشر و
نشر وغیرہ کو معجزات (بمعنی اوہام وخرافات) قرار دیتا ہو، اور جس کے نزدیک "معجزات کا یقین
جہالت و بربریت کی آخری نشانی ہو، جس کا فنا کر دینا ہی علم و تمدن کی فتح ہو گی"[1]۔ تو ایسے آدمی
کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ کسی غیبی **قوت** کا آفریدہ ہے، یا
جس شخص سے وہ ظاہر ہوا ہے، اس کے عالمِ غیب کے ساتھ رابطہ و تعلق (نبوت) کی آیت
یا نشانی ہے؟

یقین کی اوپر جو حقیقت بیان کی گئی ہے، اس کے لحاظ سے معجزہ پر بحیثیت آیتِ نبوت
کے یقین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غیب پر ایمان ہو جس کے بغیر یقین معجزہ کی خواہش کا پیدا ہونا ممکن
ہے، پھر بھی جس شخص کی نسبت کوئی معجزہ بیان کیا جاتا ہو، یا جس سے یہ ظاہر ہوا ہو، اس کی
زندگی "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" کی تفسیر اور ظاہری و باطنی کمالات کا بجائے خود ایک معجزہ
ہو (یہ چیزیں خواہشِ یقین کے لیے مؤیدات کا کام دیں گی)، اور سب سے آخری لیکن سب سے مقدم
شرط یہ ہے کہ **فرعون** و **ابوجہل** کی طرح دل میں خصومت و عناد، خودی و خود بینی،
ذاتی اغراض یا ہوا و ہوس کے موانعِ یقین نہ موجود ہوں،

---

[1] دیکھو ہیگل کی کتاب *Wondars of Life* (عجائباتِ حیات) باب ۳ معجزات۔

جس طرح ان شرائط کی عدم موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات پر آمادہ نہیں کرسکتی، بالکل اسی طرح ان کی موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات سے باز نہیں رکھ سکتی،

میرے ایک دوست جن کا شمار کم از کم مسلمانوں میں تعلیم جدید کے مستثنیٰ افراد میں سے ہے. آج سے چند برس پہلے مغربی عقل و حکمت کے شدید پرستار تھے، اور وجود خدا کا ان سے اقرار کرانا اس لیے ناممکن تھا کہ وہ مل کی منطق اور ہکسلے و ہیگل کی تحقیقات سے نہیں ثابت ہوا تھا، قرآن میں ان کے نزدیک علم النفس کے بیسیوں دقایق مرعی تھے، اور اس کا پیش کرنے والا پیمبر اسلام (علیہ السلام)، سکندر، سیزر، سقراط و نپولین وغیرہ قائدین عظام و مصلحین عالم کی صفِ اول میں اپنی جگہ رکھتا تھا، تاہم اگر آیاتِ قرآنی کو بہ حیثیت کلامِ الٰہی انکے سامنے تلاوت کیا جاتا، یا پیغمبر اسلام علیہ السلام کی مکارم اخلاق سے معمور زندگی کو آپ کی پیغمبری کے ثبوت میں بیان کیا جاتا تو وہ "جواب جاہلاں" کی با تمکین "خاموشی" یا زیادہ سے زیادہ ایک "خندۂ تحقیر" کی سزاوار تھی، ظاہر ہے کہ بدعقیدگی کے اس عالم میں روایاتِ معجزہ کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ٹھہر سکتی ہے کہ وہ محض اپنے رُواۃ کی خوش اعتقادیوں یا جاہلانہ عجائب پرستیوں کا مجموعہ ہیں،

لیکن ادھر ان کی اس درجہ حیرت انگیز کایا پلٹ ہوئی ہو کر عقلیاتِ مغرب کا سارا طومار ان کے نزدیک "صد کتاب و صد ورق در نار کن" سے زیادہ مستحق نہیں ہے، قرآن کریم "دقایق نفسیہ" کی جگہ "حقایق الٰہیہ" کا منبع بن گیا ہے، "سیرت نبویہ" کا ایک ایک حرف نبوت پر شاہد عدل ہے، جو زبان جیمس اور ونٹ کی نفسیاتی تحقیقات سے

رطب اللسان رہتی تھی، اس کو انتہائی لذت اب صرف بزرگانِ دین کے مناقب، کشف و کرامات
اور مسائلِ تصوف کے ذکر میں ملتی ہے، حتیٰ کہ دورِ اول کے "ناصح احباب" کو اب خود ان پر
"خوش اعتقادی" کا گمان ہونے لگا ہے،

اس قلبِ ماہیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انبیاے عظام علیہم السلام کا ذکر ہی کیا، ملک کی موجودہ
تحریک "ترک موالات" کے بانی کی ذرا غیر معمولی اخلاق سے آراستہ زندگی بھی ان کو روحانی
کمالات ہی کا پرتو نظر آتی ہے، انتہا یہ کہ ان کی طرف جو طرح طرح کی کرامتیں منسوب
کیجاتی ہیں[1]، ان میں ایک مشہور واقعہ بعض درختوں سے روئی جیسی ایک چیز کا نکلنا تھا، میرے
یہ دوست بھی اس کو تائیدِ غیبی کی ایک نشانی سمجھنے میں شریک تھے، میں نے کہا کہ "کچھ لوگ
اس روئی کو کسی کیڑے کی رطوبت بتلاتے ہیں" کہا "اس سے کیا ہوتا ہے، خدا نے اسی
وساطت سے تائید کی ہوگی"،

شرائط الیقین و غایتِ معجزات کے مقدماتِ بالا کو سامنے رکھکر اب ذرا ریگستانِ عرب
کے اس اُمّی انسان کی زندگی، دعوت اور تعلیمات پر ایک سرسری نظر کرو جس نے ساڑھے تیرہ
صدی ادھر کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا،

اس قدسی صفات انسان کی امانت و دیانت نے ہموطنوں کی طرف سے اس کے لیے
امین کا لقب حاصل کیا تھا، اس کی راست گوئی دوست و دشمن سب کو یکساں تسلیم تھی،
حضرت خدیجہؓ جن کو پچیس برس تک آپ کی زوجیت کا شرف حاصل رہا، وہ ایک موقع پر

[1] یہ تحریر گذشتہ تحریکِ ترک موالات کے شباب کے زمانہ میں لکھی گئی تھی، اسوقت طرح طرح کی یہ کرامتیں ملک میں پھیلی تھیں،

آپ کو تسلی دیتی ہیں کہ "ہرگز نہیں، خدا کی قسم! خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلۂ رحم کرتے ہیں مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں"

اس "اپنے پرائے کے غمخوار" کی دعوت صرف یہ تھی کہ لوگو لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے، اس دعوت سے باز رکھنے میں "رؤسائے قریش" جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انھوں نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ، اور حسن کی دولت پیش کی، اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابو طالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا۔ جس کا جواب اولوالعزم من الرسل کی زبان سے فقط یہ ملا کہ "چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھدیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤں گا" نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی حق کامیاب ہوا، لیکن کیا اس کامیابی سے داعیِ حق صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کوئی فائدہ حاصل کیا؟

مسجد نبویؐ کے صحن میں آپ کے سامنے مال غنیمت کے انبار لگ جاتے تھے، مگر خود اس انبار کو تقسیم کرنے والے شاہ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی یہ تھی کہ "آپؐ کھال کی چٹائی یا خالی زمین پر آرام فرماتے تھے" "کاشانۂ نبوت گو انوار الٰہی کا مظہر تھا، تاہم اس میں رات کو چراغ نہیں جلتا تھا" "کئی کئی دن تک فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے رہتے" گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند خود لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھتے، اس کو

چارہ دیتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے۔" حضرت فاطمہؓ آپ کی محبوب ترین اولاد تھیں، جن کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ چکی پیسنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھرنے سے سینہ پر گھٹے پڑ گئے تھے۔ گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چیکٹ ہوجاتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ جب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لیے ایک لونڈی مانگی، اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپؐ نے صاف انکار کردیا کہ یہ فقراء و یتامیٰ کا حق ہے۔"

اتنا ہی نہیں کہ آپ دنیاوی عیش و آرام سے دست بردار تھے۔ بلکہ دشمنان دین طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے، گالیاں دیتے تھے (گو "رحمۃ للعالمین" کا ہاتھ ان کے حق میں بھی ہمیشہ صرف دعا ہی کے لیے اٹھتا تھا، اور ان کے ساتھ نیکی ہی کا حکم فرماتے تھے) راہ میں کانٹے بچھا دیتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈالتے تھے۔ ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔" یہ سب کچھ تھا لیکن دعوتِ حق، نوعِ انسان کی ہدایت اور فلاح و بہبود کی تعلیمات کا کام بلاشائبۂ تزلزل جاری تھا۔

کیوں؟ اس لیے کہ آپ کو اپنے فرستادۂ خدا ہونے کا اذعان، ہر وقت اس کی نصرت و معیت پر اعتماد، اور بالآخر باطل کے زہوق اور حق کے غلبہ کا اسی طرح یقین تھا جس طرح تم کو رات کی تاریکی کے بعد طلوع صبح کا یقین ہوتا ہے۔ کفار کی دشمنی اور ایذا رسانی سے تنگ آکر ابوطالب سمجھاتے ہیں کہ "جان پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھالو۔" آپ فرماتے ہیں کہ "عم محترم!

میری تنہائی کا خیال نہ کیجئے، حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عجم وعرب ایک دن اس کے ہاتھ ہوگا۔" کفار قریش بدنیتِ (قتل) کے ساتھ آپ کے تعاقب میں نکلے ہیں، غار ثور جس میں آپ مخفی ہیں، اس کے قریب پہنچ گئے ہیں کہ "رفیقہ فی الغار" (حضرت ابوبکرؓ) نے گھبرا کر عرض کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دشمن اس قدر قریب ہیں کہ ذرا نیچے جھک کر اپنے پانوں کی طرف دیکھیں تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔" آپ نے فرمایا کہ "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" "غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔" ایک موقع پر آپ کسی درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما رہے تھے کہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا، چپکے سے آیا، اور آپ کی تلوار درخت سے اتار کر نیام سے باہر کھینچ لی، اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہشیار ہو گئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے۔ جس نے پوچھا کہ "اے محمدؐ اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟" ایک پُر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"

کیا تشنگانِ ایمان کے لیے خود یہ صدا معجزہ نہیں ہے؟ اور کیا جن لبوں سے یہ صدا نکلی تھی ان کو کوئی دیکھنے والا کاذب تصور کر سکتا تھا، اسی کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ پکار اٹھے کہ لیس ھذا بوجہ کذاب (یہ جھوٹے کا منھ نہیں ہے)

یہ سمندر کے صرف چند قطرے تھے، اور اگرچہ انسان کا ناقص قلم پیغمبرانہ سیرت کے تمام خط وخال کو کامل طور پر نمایاں نہیں کر سکتا، تاہم "سیرۃ النبیؐ" کے گذشتہ دو حصوں میں (جہاں سے یہ چند منتشر قطرات ماخوذ ہیں) انسانی ہاتھ سے جو نا تمام مرقع کھنچ سکا ہے، اُسی سے تم بڑی حد تک اندازہ کر سکتے ہو کسی پیکرِ بشری کے اندر "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" کی اس "جامعیتِ کبریٰ" کا ظہور بجائے خود اتنا بڑا اعجاز ہے جس سے بڑھ کر کوئی معجزہ نہ طلب کیا جا سکتا ہے، اور نہ پیش

کیا جا سکتا ہے۔

ایسی اعجازِ مجسم، جامع ہستی کے متعلق "جو صاحبِ شمشیر و نگیں بھی ہو، اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو، اور گدائے بینوا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو، اور سبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنیِ دریا دل بھی جس کی زبان ہمہ وقت ذکرِ الٰہی اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جس کے پانوں رات رات بھر نماز میں کھڑے رہنے سے آماس کر آتے ہوں"۔ اگر کوئی ایسا واقعہ بیان کیا جائے جو خدا کی طرف سے تائیدِ غیبی کی نشانی یا آیت معلوم ہو تو اس شخص کو اس کے یقین و قبول میں کیا تامل ہو سکتا ہے، جو خدا اور غیب پر ایمان رکھتا ہے،

لیکن جو شخص ہیگل کی طرح خدا اور غیب ہی کا منکر ہو، یا **فرعون** کی طرح خود اپنے کو خدا کہتا ہو (انا ربکم الاعلیٰ) یا جس کے قلب کو **ابو جہل** و ابولہب کی طرح کفر و عناد کی تاریکی نے سیاہ کر رکھا ہو، اس کے سامنے بڑے سے بڑا معجزہ پیش کرنے پر بھی زیادہ سے زیادہ یہ جواب مل سکتا ہے کہ "سِحرٌ مُّستمِرٌّ"

یہی راز تھا کہ سیرت نبویہ کے سارے دفتر میں مشکل ایک آدھ ایسا واقعہ ملتا ہے کہ معجزات کی بنا پر لوگوں نے **رسالت** کی تصدیق کی ہو۔ بلکہ عہدِ رسالت کے ہزاروں ایمان لانے والے وہی ہیں جن کے دل میں ایمان کا مزہ تھا، اور جن کے لیے "روے و آوازِ پیمبر" ہی اصل معجزہ تھا گو آج ظاہری روے و آواز ہم سے مستور ہے، لیکن معنوی آدمی **قرآن** اور حقیقی "روے پیمبر" سیرتِ طیبہ ابد الآباد تک ذوقِ ایمان رکھنے والوں کے لیے معجز نمائی کرتی رہے گی، صلی اللہ علیہ وسلم

لبِ لباب

گذشتہ مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ

(۱) معجزہ نام ہے پیمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے جامع انسان کے تعلق سے کسی ایسے واقعہ کے ظہور کا جس کی کم از کم بوقت ظہور عام علل و اسباب سے توجیہ نہ ہو سکے،

(۲) ایسے واقعات بذاتِ خود عقلاً ناممکن نہیں، ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ "انتہائی حیرت انگیز" یا مستبعد واقعات کی ہوتی ہے۔ اس لیے بظاہر اُن کو قبول کرنے کے لیے بھی نہایت غیر معمولی شہادت کی ضرورت نظر آتی ہے،

(۳) لیکن در اصل یہ استبعاد ایسا نہیں ہوتا جس کی کافی مثالیں عام زندگی میں بھی نہ ملتی ہوں، اور جن کے قبول کے لیے کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا،

لہذا یقینِ معجزات کے لیے بھی معمولی درجہ کی قابلِ اعتماد شہادت کافی ہو سکتی ہے،

(۴) مگر یقین صرف شہادت یا غیر خارجی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اسکا دار و مدار زیادہ تر یقین کی خواہش اور اسکے موانع و مؤیدات پر ہے جسکا تعلق بڑی حد تک خود یقین کرنے والے کے گذشتہ معتقدات اور عادات سے ہوتا ہے،

(۵) یقینِ معجزات کی خواہش کا پیدا ہونا موقوف ہے "ایمان بالغیب پر"

(۶) اگر غیب پر ایمان ہے اور فرعون و ابو جہل کی طرح عناد و تعصب کے موانع موجود نہیں ہیں، ساتھ ہی مدعیِ نبوت کی زندگی اپنے احوال و اخلاق کے لحاظ سے بجائے خود اسکی نبوت کی مؤید ہے، تو معجزہ (بمعنی خارقِ عادت) کا کیا ذکر ہے، خود پیمبر کی آواز و صورت ہی معجزہ ہے،

در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است ۔۔۔ روے و آوازِ پیمبر معجزہ است

آیاتؑ و دلائل

اور

قرآن مجید

انبیاء اور آیات و دلائل

گذشتہ صفحات میں جو کچھ پھیلایا گیا ہے، وہ انسانی افکار و خیالات کی جہانتک دسترس ہے اس کی تشریح ہے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک ہدایتؑ ارشاد کا اصلی سرچشمہ قرآن مجید ہے، اس لیے آیات و دلائل کی نسبت اخیر فیصلہ اسی کی عدالت میں ہونا چاہیے، قرآن مجید میں اکثر انبیاء کے سوانح و حالات کے ضمن میں اُن آیات اور معجزات کا بھی بیان ہے، جو اُن کو خدا کی بارگاہ سے عطا ہوئے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات و دلائل انبیاءؑ کے سوانح کا ضروری جزو ہیں، خصوصاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے معجزات سب سے زیادہ تفصیل اور تکرار کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں کہ نزولِ قرآن کے وقت ان ہی دونوں انبیاءؑ کی امتیں عرب میں موجود تھیں، اور ان ہی کے سامنے اسلام اپنے دعووں کو پیش کر رہا تھا،

قرآن مجید میں جن انبیاء کا تذکرہ ہے، ان میں سے کم و بیش حسب ذیل انبیاء کے آیاتؑ دلائل بیان ہوئے ہیں، حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یونسؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوات اللہ علیہم اجمعین، بعض ایسے انبیاءؑ بھی ہیں جن کے آیاتؑ دلائل کے ذکر سے قرآن

خاموش ہیں، مثلاً حضرت اسحٰقؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، ذوالکفلؑ، الیسعؑ وغیرہ لیکن اس خاموشی سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان کو کسی قسم کی نشانی اور دلیل نہیں عطا ہوئی تھی، صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مامن الانبیاء نبی الا اعطی من الایات ما مثلہ او من او امن علیہ البشر	ہر نبی کو کچھ ایسی باتیں دی گئیں جس کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے،

البتہ انبیاے کرامؑ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر معمولی آیات و دلائل ان ہی انبیاؑ کو مرحمت ہوئے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا، اور ضرورت بھی ان ہی کو تھی کہ ان کے عناد و انکار کا وہ ان کے ذریعہ سے جواب دے سکتے، باقی وہ انبیاؑ جو اپنی جماعتوں میں صرف تجدید و اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے، ان کو اس قسم کے دلائل کی حاجت نہ تھی کہ انکی جماعتوں نے ان کی دعوت کے مقابلہ میں عناد و انکار کا اظہار نہیں کیا تھا،

قرآن مجید اور اصطلاح آیات و دلائل

قرآن مجید نے انبیاؑ کے ان معجزات کو عموماً آیت یعنی نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُفْتَرًى (قصص)	جب موسیٰ ان کے پاس ہماری آیات لیکر آئے تو انھوں نے کہا کہ یہ تو صرف مصنوعی جادو ہے،
فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُفَصَّلَاتٍ (اعراف ۱۶)	تو ہم نے فرعون کی قوم پر طوفان، ٹڈی، جوں، مینڈک اور خون کی کھلی ہوئی آیتیں بھیجیں.

---

[۱] کتاب الاعتصام باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت بجوامع الکلم [۲] کتاب الایمان باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم الی جمیع الناس ونسخ الملل بملتہ

فرعون حضرت موسیٰؑ سے کہتا ہے،

اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ، فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (اعراف-۱۳)	اگر تم کوئی آیت لے کر آئے ہو تو اب لاؤ، اگر تم سچے ہو، موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ دفعۃً صاف سانپ بن گئی،

کفار معجزہ طلب کرتے ہیں تو اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے

اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (انعام-۱۳)	آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں،
اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (عنکبوت ۵)	آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں،

کفار کہتے ہیں :-

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (انبیاء -۱)	چاہیے کہ وہ ہمارے پاس کوئی آیت لائیں جیسے پہلے پیغمبر بھیجے گئے،

حضرت صالحؑ اپنے معجزہ کی نسبت کہتے ہیں:

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (ھود)	اور اے لوگو! یہ خدا کی اونٹنی آیت ہے،

لفظ آیت اور معجزہ کی حقیقت

آیت کے معنی "نشانی" اور "علامت" کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم واحساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات وعلامات کی شناخت اور یاد ہے، دنیا میں جسقدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے اور پہچانتے ہو؟ صرف آیات وعلامات سے، کلیات سے لیکر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے، وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے، یہ انسان ہے، یہ درخت ہے، یہ میدان ہے،

یہ انگور ہے، لیکن ہم کیونکر جانتے ہیں؟ اس طرح کہ ان چیزوں کی جو مخصوص نشانیاں ہیں، وہ الگ الگ ہمارے ذہن میں محفوظ ہو گئی ہیں اور اب ان ہی کی مدد سے ہم کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے، ہم پہچانتے ہیں کہ یہ زید ہے، یہ عمرو ہے، یہ میرا عزیز ہے، یہ میرا گھر ہے، یہ میرا گھوڑا ہے، مگر یہ تمام شناختیں آیات وعلامات ہی کی مدد سے ہیں، اگر دنیا میں ہر شے کی مخصوص آیات علامات مٹا دی جائیں تو ہم یقیناً کسی چیز کو نہ شناخت کر سکتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں، نہ پہچان سکتے ہیں،

یہی آیات وعلامات کی جان پہچان اور شناخت ہے، جو حیوان و انسان اور عقلمند و بے وقوف میں فرق پیدا کرتی ہے جس میں ان آیات وعلامات کی شناخت، تمیز اور یاد کی قوت جس قدر زیادہ ہوگی، اسی قدر اس کی عقل و دانائی کا کمال زیادہ ہوگا، ہماری منطق کا تمامتر استدلال بجز آیات وعلامات کے اور کیا ہے، ہم اپنے جس دعویٰ پر جو دلیل قائم کرنا چاہتے ہیں وہ ان ہی آیات وعلامات کی مدد سے کرتے ہیں، بلکہ ہمارے تمام تجربے اور مشاہدے، بلکہ طبیعیات، کیمیائیات، نباتات، حیوانات، ارضیات، ہندسیات، ریاضیات وغیرہ جو کچھ اور جس قدر علوم بھی ہیں وہ صرف علامات شناسی کا مجموعہ ہیں جن سے ہم براہ راست جزئیات کا علم حاصل کرتے ہیں، اور پھر ہم ان سے کلیات تیار کر لیتے ہیں،

غرض ہمارا تمامتر فن استدلال در اصل ان ہی آیات وعلامات پر موقوف ہے، اگر اشیا کی علامات وآیات محو کر دی جائیں تو ہم نہ کسی چیز کو پہچان سکیں گے اور نہ کسی دعویٰ پر کوئی دلیل قائم کر سکیں گے، ہم علت سے معلول پر، اور معلول سے علت پر استدلال کرتے ہیں مگر ان ہی آثار وعلامات کے ذریعہ سے ہم کو تجربہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ شے جب پیدا ہوتی ہے تو اس کے ساتھ یہ آثار وآیات ظاہر ہوتے ہیں،

اب کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ یہ شے پیدا ہوگئی ہے، اسلیے اسکا فلاں نشان اور اثر بھی ضرور پیدا ہوا، یہ علت سے معلول پر استدلال ہے، اور کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ "فلاں نشان اور علامت ظاہر ہے، اس لیے وہ شے بھی ہے" یہ معلول سے علت پر استدلال ہے، کبھی ہم آگ کے وجود سے حرارت کے وجود پر اور کبھی حرارت کے وجود سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں،

ہم کسی غیر آباد میدان میں پہنچ جاتے ہیں، وہاں ہم کو ایک شاندار عمارت نظر آتی ہے، اگرچہ ہم نے اس عمارت کے بنانے والوں کو نہیں دیکھا ہے، مگر اس عمارت کو دیکھ کر ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کسی معمار کی صنعت ہے، ایک جنگل میں ایک جھونپڑے کے اندر ایک تنہا زخمی پڑا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے زخم صاف ہیں، مرہم پٹی ٹھیک ہے، اس کے آرام و آسائش کے تمام سامان قرینہ سے رکھے ہوئے ہیں، ہم نے گو اس کے تیماردار کو نہیں دیکھا، مگر آس پاس کے علامات و آثار بتاتے ہیں کہ اس بیمار کا کوئی تیماردار ہے، اور وہ نہایت رحم و مہربانی سے اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے، ایک شخص آکر کہتا ہے "میں طبیب ہوں" اس کے پاس جو مریض آتے ہیں وہ اس کے نسخہ سے شفا بھی پاتے ہیں، اب گو ہم نے اس کو طب کی تحصیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا، مگر اس کے آثار و علامات کو دیکھ کر اس کے دعویٰ کی تصدیق کر سکتے ہیں، یہی ہمارا فن استدلال ہے، اور اسی پر ہمارے تمام حصولی علوم کی بنیاد ہے،

آیات اللہ قرآن مجید میں آیت کا لفظ اس معنی میں اس کثرت سے آیا ہے کہ ہم یہاں ان کا استقصا بھی نہیں کر سکتے، صرف متفرق سورتوں سے چند آیات یہاں نقل کرتے ہیں، جن سے مفہوم کی تشریح ہو جائے گی،

إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ
مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ، وَ
اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ
الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ، تِلْكَ
اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ
فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ
يُؤْمِنُوْنَ، (جاثیہ-۱)

آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے
نشانیاں ہیں، اور تمہاری پیدائش میں، اور زمین
میں جو چوپائے چلتے ہیں، ان میں ان کے لیے جو
یقین کرتے ہیں نشانیاں ہیں، اور رات دن کے
الٹ پھیر، اور آسمان سے جو خدا روزی برساتا ہے
اور جس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور
ہواؤں کے پھرنے میں عقل والوں کے لیے
نشانیاں ہیں، یہ آیتیں ہیں جن کو ہم سچائی کے ساتھ
پڑھ کر تم کو سناتے ہیں، تو پھر خدا اور اسکی نشانیوں
کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے.

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ
وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (بقرہ)

بیشک آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات دن
کے الٹ پھیر اور ان کشتیوں میں جو دریا کے اندر لوگوں
کو فائدہ پہنچانے والے سامان لیکر چلتی ہیں، اور خدا
جو آسمان سے جو پانی برساتا ہے جس سے وہ زمین کو مرنے کے بعد
زندہ کرتا ہے اور زمین میں جو چوپائے اس نے پھیلا رکھے ہیں
اور ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانے میں اور ان
بادلوں میں جو آسمان و زمین کے بیچ میں مسخر ہیں عقل والوں کے لیے

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا
بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا
قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ
الزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ
وَيَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ (انعام - ١٢)

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ
وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (يونس - ٧)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ
مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ
اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

اور وہی خدا ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر
ہم نے اس سے ہر چیز کی نشو و نما کو ظاہر کیا، پھر اس سے
سبزے پیدا کیے جس سے ہم تہ بہ تہ دانے نکالتے ہیں، اور کھجور
جن کے خوشے نیچے لٹکتے ہوتے ہیں، اور انگوروں کے
باغوں کو اور زیتون اور انار کو اس نے پیدا کیا، جو
باہم ملتے جلتے ہوتے ہیں اور ان میل بھی ہوتے ہیں، ان کے
پھلنے اور پکنے کو دیکھو، ان چیزوں میں ایمان والوں
کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ تم اس میں آرام لو
اور دن کو اس نے روشن بنایا، اس میں ان کے لیے
جو سنتے ہیں نشانیاں ہیں۔

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے خود تمہاری ہی
جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم کو ان کے پاس سکون اور
قرار حاصل ہو، اور تم دونوں کے لیے لطف و محبت پیدا کر دیا
اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، اور اس کی
نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش،
اور تمہاری زبانوں کا اور رنگوں کا ایک دوسرے سے

لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ	الگ ہوتا ہے، اس میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں
بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ	ہیں، اور اسکی نشانیوں میں رات اور دن کو تمہاری
فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	نیند ہے، اور تمہارا اسکی مہربانی (روزی) کی تلاش کرنا ہے
يَّسْمَعُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ	اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں، نشانیاں ہیں، اور
خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ	اسکی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے
مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	جس میں (عذاب) کا خوف اور (رحمت کی) امید
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	دونوں ہیں، اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اسکے
يَّعْقِلُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اَنْ	ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے
تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ	اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی
بِاَمْرِهٖ (روم - ۳)	نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اسکے حکم سے کھڑے ہیں
وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ	اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن
وَالْقَمَرُ ؕ (فصلت - ۵)	سورج اور چاند ہیں،

یہ آیات اللہ یعنی خدا کی نشانیاں، خدا کے وجود اور اس کے صفات کی لیے کے علامات ہیں، جس طرح ویرانہ کی عمارت معمار کے وجود کو، اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم و کرم کے صفات کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان، اور صحن زمین ہے، ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہے، اور زمین کے اندر و باہر ابر، بارش، دن رات، چاند، سورج، درخت، میوے،

پھل، غلہ کے اقسام وغیرہ، زمین کے جانداروں کی زندگی کے سامانِ آرام و آسایش اس خالق و صانع کے رحم و کرم، عطا و بخشش اور دیگر اوصافِ کمال کو نمایاں کرتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ خالق کو اپنے تمام مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق اور اعتنا ہے، کفران ہی کے دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیاتِ الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے، اور اُن کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ (ھود ۔ ۵)	اور یہ عاد کا قبیلہ ہے جس نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا۔
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ (کہف ۔ ۱۲)	یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا۔
وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ (یونس ۔ ۱۰)	اور ان لوگوں میں نہ ہو، جنھوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ (انعام ۔ ۲۰)	اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا

جس طرح یہ آیاتِ الٰہی عام بندہ اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی خاص بندہ سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ سے نمایاں کرتا رہتا ہے،

(۱) انبیا، قوموں کے تاریک ترین زمانوں میں نورِ الٰہی کا مشعل ہاتھ میں لیکر تنہا مجمعوں کے

اندر آتے ہیں، لوگ اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں، اور تیغ و خنجر سے مشعل کے تھامنے والے دست بازو کو زخمی کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ شمع الٰہی بجھنے کے بجائے رفتہ رفتہ اپنے دائرۂ نورانی کو وسیع کرتی جاتی ہے، اور بالآخر سطح ارض کے کناروں تک پہنچ جاتی ہے۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ	وہ چاہتے ہیں کہ اپنے منھ سے خدا کے نور کو بجھادیں
وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ	اور خدا اپنے نور کو پورا روشن کرنے والا ہے، گو کافر
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ	اس سے خوش نہ ہوں، اسی نے اپنے رسول کو
وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ	ہدایت اور سچائی کا مذہب دیکر بھیجا ہے، تاکہ
كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ	وہ اس کو ہر مذہب پر غالب کردے، گو مشرک
(صف - ۱)	اس سے ناراض ہوں

(۲) باوجود تمام معاندانہ کوششوں اور مخالفانہ جد وجہد کے اس نورانی کا پھیلتا جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے، اور اس مشعل گیر دست وبازو میں خدا کی غیر مرئی قوت کام کر رہی ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ	اور تم نے وہ مٹھی بھر کنکریاں نہیں پھینکیں بلکہ
رَمَىٰ (انفال - ۲)	خدا نے پھینکیں۔

قدم قدم پر تائیدات الٰہی اس کا ساتھ دیتی ہیں،

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا	ہم نے اس نصیحت کو اتارا ہے اور بیشک ہم ہی
لَهُ لَحَافِظُونَ (حجر ۱)	اس کی حفاظت کرنے والے،

۳۔ پیغمبر کے صحیفۂ زندگی کا صفحہ صفحہ ہر قسم کے اخلاقی داغ سے پاک ہوتا ہے، اس کی سچائی اور راستبازی عالم آشکارا، اور دوست ودشمن سب کے نزدیک بے عیب ہوتی ہے حضرت صالحؑ کی نسبت کافروں نے گواہی دی،

یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ھود۔ ۶)	اے صالح! پہلے تم سے بڑی بڑی امیدیں تھیں،

حضرت شعیبؑ کی مخالفت کے باوجود ان کو اقرار کرنا پڑا کہ وہ بڑے عبادت گذار ہیں

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (ھود۔ ۸)	اے شعیبؑ! کیا یہ تمہاری عبادت گذاری تمکو کہتی ہے کہ اسکو چھوڑ دیں جسکو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شہادت میں خود اپنی زندگی کو پیش کرتے ہیں،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس۔ ۲)	میں نے تمہارے درمیان مدت تک عمر گذاری ہے، کیا تم سمجھتے نہیں،

۴۔ سب سے آخر یہ کہ تبلیغ ودعوت میں دین الٰہی کی نصرت اور اشاعت میں، مخالفین کی شکست اور ہزیمت میں صلحا، کو مزید ایمان اور تسکین کے حصول میں عجیب غریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو عرف عام میں معجزات کہتے ہیں۔

غرض یہی وہ امور ہیں جو خالق فطرت اور داعی حق کے درمیان رابطۂ خاص اور علاقۂ مخصوص کو نمایاں کرتے ہیں اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادۂ الٰہی ہے۔

آیات دلائل کی دو قسمیں، ظاہری اور باطنی تفصیل بالا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آیات اور نشانات

دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ظاہری اور مادی، اور دوسری باطنی اور روحانی، ظاہری اور مادی آیات و دلائل تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں، مثلاً مردہ کا زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ ابلنا، بیمار کو اچھا کرنا وغیرہ، باطنی اور روحانی آیات و دلائل، مدعیِ نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم، ہدایت، ارشاد، فلاح اور تائید ہے، اہلِ نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی باطنی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں، باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بیں نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری ہی آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں،

نبوت کی باطنی نشانیاں واقعات کی روشنی میں

ہم نے نبوت کی ظاہری اور باطنی دو نشانیاں قرار دی ہیں اور باطنی نشانیوں کو ظاہری علامات پر ترجیح دی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں، آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ قرآن مجید بھی ان ہی کو نبوت کی اصلی علامات قرار دیتا ہے۔ یہاں واقعات کی روشنی میں یہ واضح کرنا ہے کہ عہدِ نبوی میں بھی جو لوگ اہلِ نظر تھے، وہ ان ہی علامات کی تلاش کرتے تھے، چنانچہ ان لوگوں کو بھی چھوڑ دو جنھوں نے بالآخر نبوت کی تصدیق کی، اس عہد کے ان یہودیوں اور عیسائیوں کو دیکھو جنھوں نے گو کسی سبب سے علی الاعلان اس کی تصدیق کی جرأت نہیں کی، مگر وہ اندرونی طور سے متاثر ہو چکے تھے،

بنی اسرائیل سے بڑھ کر عرب میں علاماتِ الٰہی کا رازداں کوئی اور نہ تھا، سیکڑوں یہودی متشککانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، امتحانات لیے، تجربات کیے،

مگر ان کا امتحان و تجربہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ وہ آپؐ کے اخلاق کی آزمایش کرتے تھے، صحفِ انبیاے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے تھے، آپ کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرتے تھے، ان میں سے کسی نے آکر آپ سے خارقِ عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ تماشے بظاہر اور لوگ بھی دکھا سکتے ہیں، اور یہ خوارقِ نبوت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں، آنے والے نبی کی بشارتیں اور صفتیں توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور تھیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحبِ خوارق ہونا اور ظاہری معجزات دکھانا، اس کی صفت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ توراۃ میں اس کے اوصاف یہ بتائے گئے تھے کہ وہ فاران سے طلوع ہوگا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا، اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی، وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا، اور بدکاروں کو جنگی مرد کے مانند ہلاک کرے گا، وہ عبادت گذار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا، ختون قوم (عرب) میں پیدا ہوگا۔" انجیل نے بتایا تھا کہ" وہ تسلی کی روح ہوگا، وہ مسیح کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا، خدا کی زبان اس کے منہ میں ہوگی۔"

سیکڑوں یہود و نصاریٰ آپ کی خدمت میں آئے اور انھوں نے آپؐ کی نبوت کا امتحان لیا، مگر امتحان کے پرچہ میں مادی معجزات کا سوال شامل نہ تھا، بلکہ عام علمی اور مذہبی باتوں کی نسبت استفسار تھا، قرآن مجید نے ان کے دو سوالوں کو دہرایا۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَيْنِ (کہف) اور يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ۔ پہلے سوال میں" ذی القرنین" کا قصہ پوچھا گیا ہے اور دوسرے سوال میں" روح" کی حقیقت دریافت کی گئی ہے، ان کے علاوہ قرآن مجید میں اہل کتاب کے متعدد اعتراضات اور سوالات مذکور ہیں، مگر ان میں سے ایک میں بھی

یہ نہیں کہ ہم کو اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں کوئی خارقِ عادت تماشا دکھاؤ، بلکہ وہی سوالات کرتے تھے جن کو پیغمبر کے علم وعمل یا تعلیم وتزکیہ سے تعلق تھا، آگے چل کر ایک خاص باب میں ہم نے یہودیوں کے امتحانی سوالات جمع کر دیے ہیں، ان کو پڑھ کر تم بہتر فیصلہ کر سکتے ہو، قرآن مجید میں ان کا ایک سوال بے شبہہ ایسا مذکور ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی مادی معجزہ کی خواہش رکھتے تھے، اور وہ یہ ہے،

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ	اہل کتاب تجھ سے فرمایش کرتے ہیں کہ تو ان پر
عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (نساء-۲۲)	آسمان سے کتاب اتارے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودیوں کی معجزہ طلبی نہ تھی، بلکہ چونکہ توراۃ کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ اس کی چند لوحیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے لکھ کر حضرت موسیٰؑ کو دی تھیں، اس لیے وہ اسی تخیل کے مطابق قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے اس کے نزول کو بھی اسی طرح چاہتے تھے،

اب اس عہد کے عیسائیوں کو لو، قیصر روم کے دربار میں جب قاصد نبوی پہنچا، تو ابوسفیان کو (جو اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے) بلوا کر قیصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوالات کیے، وہ حسب ذیل ہیں:-

قیصر - مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟	ابوسفیان - شریف ہے،
قیصر - اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟	ابوسفیان - نہیں
قیصر - اس خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟	ابوسفیان - نہیں،

قیصر۔ جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟ **ابوسفیان**۔ کمزور لوگ ہیں،

قیصر۔ اُسکے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟ **ابوسفیان**۔ بڑھتے جاتے ہیں،

قیصر۔ کبھی تم لوگوں کو اسکی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟ **ابوسفیان**۔ نہیں،

قیصر۔ وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟ **ابوسفیان**۔ ابھی تک تو نہیں لیکن اب جو معاہدہ ہوا ہے دیکھیں وہ اسپر قائم رہتا ہے یا نہیں

قیصر۔ تم لوگوں نے اس سے جنگ کی ہے؟ **ابوسفیان**۔ ہاں،

قیصر۔ نتیجۂ جنگ کیا رہا؟ **ابوسفیان**۔ کبھی ہم غالب ہے کبھی وہ،

قیصر۔ وہ کیا سکھاتا ہے؟ **ابوسفیان**۔ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو،

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں، تم نے کہا کہ اس کے خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے، تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے، تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے

کہ بڑھتا جاتا ہے، تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں دیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے، تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ سچ ہے، تو وہ یقیناً پیغمبر ہے۔

باوجود طولِ کلام کے ہم نے یہ تمام سوالات و جوابات یہاں نقل کر دیے ہیں، غور کرو یہ تمام سوالات صرف پیغمبر کے حقیقی آثار و علامات سے متعلق ہیں، ان میں سے ایک سوال بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ کہ کا مدعی نبوت کوئی معجزہ بھی پیش کرتا ہے؟ حالانکہ اگر نبوت کی حقیقی علامت خوارقِ عادت ہوتے تو سب سے پہلے عیسائی قیصر کو یہی سوال پوچھنا چاہیے تھا۔

حضرت جعفرؓ نجاشی کے دربار میں اسلام پر تقریر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں ایہا الملک[1] ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی، اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو تکلیف نہ دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے۔

نجران کے عیسائی علماء جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو انھوں نے قرآن کی آیتیں سنیں، مسلمانوں کی روحانی کیفیتوں کا مشاہدہ کیا، حضرت عیسیٰؑ کی نسبت اسلام کا فیصلہ دریافت کیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق ان سے

---

[1] مسند ابن حنبل جلد اول صفحہ ۲۰۲

مباہلہ کرنا چاہا، مگر انھوں نے منظور نہیں کیا، اور آپس میں کہا کہ اگر یہ واقعی پیغمبر ہی تو ہم تباہ ہو جائینگے بالآخر سالانہ خراج پر صلح کرلی، دیکھو انھوں نے اسلام کی تعلیمات کا ہر طرح امتحان کیا، لیکن دعوی کے ثبوت میں انھوں نے ظاہری نشان نہیں مانگا،

اب خاص عرب کے حقیقت شناس افراد کا مطالعہ کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ان میں سے ہزاروں اشخاص نے تصدیق کی جن کے فضل وکمال عقل وہوش اور فہم وذکا پر ان کے حالات و واقعات گواہ ہیں، مگر ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو باطنی علامات کے دیکھ لینے کے بعد ظاہری نشانیوں کا طلبگار رہا ہو مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ اسلام لائیں چنانچہ آغاز وحی ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ سے اپنے مشاہداتِ روحانی کا تذکرہ فرمایا تو وہ ایمان لے آئیں، مگر کس اثر سے؟ اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب آپؐ نے بتقاضائے بشریت ان سے اپنے خوفِ جاں کا تذکرہ کیا تو انھوں نے جواب دیا،

واللہ ما یخزیک اللہ ابداً انک	خدا کی قسم خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ صلۂ رحم
لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب	کرتے ہیں، قرضداروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں
المعدوم وتقری الضیف وتعین	کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں، حق
علی نوائب الحق (بخاری بدء الوحی)	مصیبتوں پر لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔

حضرت ابوذرؓ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ ذرا اس شخص کے پاس جاکر دیکھو جو دعوی کرتا ہے کہ اس کے پاس آسمان سے خبر آتی ہے، وہ مکہ آئے اور تحقیق حال کرکے واپس گئے اور حضرت ابوذرؓ سے جاکر کہا؛

رأیتہ یامر بمکارم الاخلاق وکلاماً | میں نے اس کو دیکھا، وہ مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے
ماھو بالشعر (مسلم مناقب ابی ذر) | اور ایک کلام پیش کرتا ہے جو شعر نہیں،

اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے حقیقتِ حال کی تشریح ہوتی ہے اور جن کی تفصیل سے سیرۃ نبویؐ کی گذشتہ جلدیں بھری پڑی ہیں،

قرآن مجید اور نبوت کی باطنی علامات

یہ تمام بیانات درحقیقت قرآن مجید کی ان آیتوں کی تشریح ہیں جن میں نبوت کی حقیقت اور اس کے اصلی آثار و علامات بتائے گئے ہیں،

يَآهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا | اے یہود و نصاریٰ تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ | جو تمہاری کتاب کی بہت سی باتیں جنکو تم چھپاتے ہو
مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ە | صاف صاف بیان کرتا ہے، اور بہت سی باتوں
قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ | سے درگذر کرتا ہے، اللہ کی طرف سے تمہارے پاس
مُّبِيْنٌ ە يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ | روشنی اور قرآن آچکا خدا اس کے ذریعہ سے انکو
رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ | جو اس کی خوشنودی کے پیرو ہیں سلامتی کے راستے
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ | دکھاتا ہے، اور ان کو اپنے حکم سے وہ اندھیرے
وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ | سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھا
(مائدہ ۳-) | راستہ بتاتا ہے،

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ (جمعہ-۱) | خود امیوں میں سے ایک رسول بھوث کیا جو انکو خدا کی
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ | آیتیں سناتا ہے انکو پاک و صاف کرتا ہے، اور کتاب و حکمت

رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	خود امیون میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	ان کو خدا کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک صاف کرتا ہے
وَالْحِكْمَةَ (آل عمران-۱۷)	اور کتاب حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے،
اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ	اس امی فرستادہٗ الٰہی اور پیغامبر کی پیروی کرتے
يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ	ہیں جس کو وہ توراۃ و انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ
وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ	ان کو اچھے کام کا حکم دیتا ہے اور برے کام سے روکتا
وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ	ہے، اور پاک چیزوں کو ان کیلئے حلال، اور ناپاک
الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ	چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے، اور (رسم و رواج کے)
وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ	جو بوجھ اور بیڑیاں ان پر پڑی ہوئی تھیں وہ
كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف-۱۹)	ان سے دور کرتا ہے۔
يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے پیغمبر! ہم نے تجھکو (اپنا) گواہ اور نیکوکاروں
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	کو) خوشخبری سنانے والا، اور (بدکاروں کو)
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا	ڈرانے والا، خدا کی طرف اسکے حکم سے پکارنے والا
(احزاب-۶)	اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے،

الغرض نبوت کے اصلی آثار و علامات یہ ہیں کہ وہ آیاتِ الٰہی تلاوت کرتا ہے، زنگ آلود نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے، لوگوں کو کتاب حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے، وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتا ہے

وہ قوموں کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان کے پانوں کی بیڑیوں کو کاٹ ڈالتا ہے، وہ خدا کا گواہ بن کر اس دنیا میں آتا ہے، لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے بدکاروں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے، اور اس ظلمتکدۂ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔

قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں، اسکے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْــَٔـلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۔

(بقرہ ۱۴ - ۱۴)

اور جنکو علم نہیں، وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہوگئے، ہم نے تو نشانیاں ان لوگوں کیلئے جو یقین کرتے ہیں، کھولکر رکھدیں (اے محمد!) ہم نے تجھکو سچائی دیکر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بناکر بھیجا اور جنکو اب بھی یہ نشانیاں باور نہ آئیں)

کفار پیغمبر کی صداقت کی نشانی چاہتے ہیں، اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی روشنی تو اس کا سراپا وجود ہے۔ اور اہل یقین کے لیے اسکی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کردیگئی ہیں، اسکی حقانیت، نیکوکاروں کو خوشخبری سنانا اور بدکاروں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا اور اس سے انقلاب انسانی اور نتائج روحانی کا ظہور، یہ خود اسکی صداقت کی کھلی نشانیاں ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ

اور وہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) پر اس کے پروردگار

مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ	کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتریں، کہہ کہ
وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ، اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ	نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا
اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى	ہوں، ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ تجھ پر ہم نے
عَلَيْهِمْ (عنکبوت - ۵)	کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

یعنی خود یہ دعوتِ الٰہی اور پیغام ربانی آیت و نشانی ہے، اور اہل بصیرت کے لیے یہی معجزہ ہے،

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ	کیا ان کافروں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہو کہ
عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (شعراء - ۱۱)	بنی اسرائیل کے عالم لوگ اس کو جانتے ہیں۔

یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یہ ہے کہ ایک امی ہو کر وہ ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی صداقت کو علماء بنی اسرائیل جانتے اور سمجھتے ہیں، کیا یہ معجزہ جہلائے قریش کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہے، کہ بڑے بڑے علما، اسکی سچائی کے دل سے معترف ہیں،

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ	اور وہ کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی
اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ	نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا، کیا انکو اگلی کتابوں
الْاُوْلٰى ۔ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ	کی گواہی نہیں پہنچی، اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے
مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ	ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار کیوں
اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ	تو نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ہم تیری
(طٰہٰ - ۸)	نشانیوں کی پیروی کرتے،

یعنی گذشتہ انبیأؑ کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کے جو صفات اور نشانیاں مذکور تھیں پیغمبر اسلام علیہ السلام کا ان کا مصداق کامل ہونا یہی سب سے بڑی نشانی ہے، یا اس آیت کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کفار بار بار یہی کہتے ہیں کہ معجزہ دکھاؤ معجزے تو انھیں دکھائے جا چکے کیا یہ نہیں معلوم کہ گذشتہ قومیں معجزات دیکھکر بھی جب ایمان نہ لائیں تو ان کا کیا حشر ہوا،

کفار کا سوال تھا،

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (رعد - ۱)

کہ اس پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری،

اس کے جواب میں خدانے ارشاد فرمایا

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد - ۱)

اے محمدؐ! تو صرف ڈرانے والا ہے، اور ہر قوم میں ایک ہادی گذرا ہے،

مقصود یہ ہے کہ نبوت کی حقیقت **معجزہ** نہیں، بلکہ **انذار** اور **ہدایت** ہے،

ظاہری آیات اور نشانیاں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انبیأؑ ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتے ہیں، تمام انبیاے کرام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیأؑ کے سوانح وواقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں، یہی سبب ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن مجید نے کفار کی مادی نشانیوں کی طلب میں آپ کی طرف سے

یہ الفاظ کہے

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل) میں تو صرف ایک انسان پیغمبر ہوں،

ظاہری نشانات صرف معاندین طلب کرتے ہیں

لیکن نبوت کے ظاہری اور عامیانہ آثار و علامات یعنی خارق عادت معجزات صرف وہ فرقہ طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں، اور جو تعصب و عناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، چنانچہ انبیاے کرام پر ایمان لانے والوں کے حالات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ معجزات کی طلب نیکو کاروں نے نہیں کی، حضرت موسیٰؑ کو معجزہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں نہیں بلکہ فرعون کے مقابلہ میں دیا گیا، حضرت عیسیٰؑ سے ان کے حواریوں نے نہیں، بلکہ یہودیوں نے معجزہ طلب کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوبکرؓ و عمرؓ نے نہیں، بلکہ ابوجہل و ابولہب نے معجزہ مانگا یہی حال دوسرے انبیاءؑ کا بھی ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت کی پوری تصریح کی ہے، اور طلب معجزہ کے سوال کو ہمیشہ کفار کی طرف منسوب کیا ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۝ (بقرہ-۱۴)

اور جنکو (کتاب نبی کا) علم نہیں (یعنی کفار قریش) کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے خود باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی،

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ (انعام-۴)

اور کفار نے کہا کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی،

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا

اور کفار کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں

أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ (رعد-۱)	نہیں اترتی ،
وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ	اور کفار نے کہا کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے
رَّبِّهٖ (طٰہٰ-۸)	کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا ،

دیکھو کہ ہر آیت میں کفار ہی کا معجزہ طلب کرنا ظاہر کیا گیا ہے ۔

کفار کا یہ معجزہ طلب کرنا نفی معجزہ کی دلیل نہیں

کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبر ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا ، کہ اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار معجزہ کے لیے اصرار کیوں کرتے ؟ لیکن یہ استدلال سرتاپا غلط ہے ، ان کو نفس معجزہ مانگنے پر نہیں ، بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے ، اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں ، چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کی اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے اور انھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان خوارق سے انھیں تسلی نہ ہوگی ، ان کو چاہیے کہ نبوت کے اصلی آثار و علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا	اور جو نہیں جانتے ، وہ کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے
يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ	خود باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی
قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ	نہیں آتی ، ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی اسی طرح
قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ	کہا تھا ، دونوں کے دل ایک سے ہو گئے ہیں ،

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝

(بقرہ ۱۴-۴)

ہم نے نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں کھول کر رکھدی ہیں، اے پیغمبر ہم نے تجھ کو سچائی دیکر نیکو کاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بناکر بھیجا ہے، اور (جنکو یہ نشانیاں باور نہ آئیں) ان دوزخیوں کی تم سے بازپرس نہ ہوگی۔

اس آیت کریمہ میں صاف موجود ہے کہ ہم نشانیاں کھول کر بتا چکے ہیں، لیکن ان نشانیوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اہل یقین ہیں، اور جو ہر امر میں شک کرتے ہیں، ان کا علاج صرف دوزخ ہے۔ دوسری آیت میں ہے

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۔ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

(طٰہٰ - ۸)

اور کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا، کیا انکے پاس گذشتہ کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی، اگر ہم اس سے پہلے کسی عذاب سے انکو ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار کیوں ہمارے پاس کوئی رسول تو نے نہیں بھیجا کہ ہم نے تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔

اس آیت میں بھی معجزات ظاہر ہونے کے بعد مزید معجزات کی طلب پر گذشتہ قوموں کے واقعات کی طرف جو اگلی کتابوں میں مذکور ہیں متوجہ کیا گیا ہے کہ دیکھ لو، دنیا میں انکا کیا حشر ہوا جنھوں نے معجزوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں قبول کیا،

معجزات تو بہرحال کسی نہ کسی آنی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں، اور پھر دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں، اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر پیغمبر معجزہ ہی دکھاتا رہے، تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو، اور پیغمبر کی زندگی صرف ایک تماشاگر کی حیثیت اختیار کر لے، اس لیے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید ہوتی ہے،

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيٰتٌ	اور وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی
مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ	طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری، کہدے کہ
وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ أَوَلَمْ	نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں، میں صرف کھلا ہوا
يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ	ڈرانے والا ہوں، کیا یہ انکو بس نہیں کرتا کہ ہم نے تجھ پر
يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (عنکبوت - ۵)	کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے،

معاندین کو معجزہ سے بھی تسلی نہیں ہوتی

نفسیاتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں، تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر شے کے اندر شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے، جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے، معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق حسن عمل حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے، اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، اور ہر قسم کی دلیلوں کے سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخرالحیل کے طور پر وہ پیغمبروں سے

خارقِ عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں، اور چونکہ انھیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اس لیے وہ کبھی کوئی خارقِ عادت امر پیش نہ کرے گا، اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائیگی اور خود اسی کے ہاتھوں سے اس کے دعووں کے تار و پود بکھر جائیں گے، لیکن قدرت الٰہی نبی آخر حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارقِ عادت بھی پیش کر دیتی ہے، تاہم ان کو دیکھکر بھی معاندانہ روح، ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انھیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خارقِ عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خدائی قوت کا کرشمہ نہیں، بلکہ یہ شیطانی عمل اور سحر و جادو کی قوت سے پیدا ہوا ہے، اور چونکہ بظاہر معجزہ اور سحر و شعبدہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، اس لیے ان کے بدگمان قلب کو اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو متعدد معجزے دکھائے، مگر ہر ایک کے جواب میں انھیں یہی سننا پڑا کہ "تم جادوگر ہو"۔

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (نمل ۔۱) — یہ تو کھلا جادو ہے

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (طٰہٰ ۔۳) — یہ موسیٰ اور ہارون یقیناً جادوگر ہیں

حضرت موسیٰؑ کے معجزۂ عصا کو دیکھ کر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے، اور حضرت موسیٰؑ کی پیغمبری پر ایمان لے آئے، مگر فرعون یہی کہتا رہا

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (طٰہٰ ۔۳) — یہ موسیٰ تم سب کا بڑا جادوگر ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے

توراۃ میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ کہ حضرت موسیٰ فرعون کو جب کوئی معجزہ دکھاتے تھے تو ہر معجزہ کے بعد فرعون کے دل کی سختی علیٰ حالہ باقی رہ جاتی تھی؛ چنانچہ توراۃ میں تقریباً ہر معجزہ کے بعد یہ مذکور ہے "لیکن فرعون کا دل سخت رہا۔ اور اس نے ان کی نہ سنی"[1] انجیل کی بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے سب سے زیادہ معجزات دکھائے لیکن خود انجیل میں مذکور ہے کہ تقریباً ہر معجزہ کے بعد حاضرین کی دو جماعتیں ہو جاتی تھیں، ایک تو انکی معتقد ہو جاتی تھی، اور یقین کرتی تھی کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، اور دوسری کہتی تھی کہ یسوع کے ساتھ شیطان رہتا ہے۔ "تب یہودیوں کے بیچ ان باتوں کے سبب اختلاف ہوا، اور بہتوں نے ان میں سے کہا، اس کے ساتھ ایک دیوتا رہتا ہے اور وہ مجنون ہے۔[2] تم اسکی سنتے کیوں ہو، اوروں نے کہا، یہ باتیں اسکی ہیں جس میں دیو ہے، کیا دیو اندھے کی آنکھیں کھول سکتا ہے،"[3] ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ نے ایک گونگے کو اچھا کیا، لوگ حیرت زدہ رہ گئے، لیکن فریسی یہودیوں نے کہا "یہ دیوؤں کے سردار کی مدد سے دیوؤں کو نکالتا ہے۔[4]" حضرت عیسیٰؑ نے اپنے معاندین کے جواب میں کہا "تم کہتے ہو کہ میں دیوؤں کو بعل زبول (ایک دیوتا کا نام) کی مدد سے نکالتا ہوں۔[5]"

حضرت عیسیٰؑ نے متعدد دفعہ لوگوں سے کہا کہ "تم معجزات دیکھتے ہو، مگر ایمان نہیں لاتے۔"

"یسوع (عیسیٰؑ) نے یہ باتیں کہیں اور اپنے تئیں ان سے (فریسی یہودیوں سے) چھپایا۔ اگرچہ اس نے ان کے روبرو اتنے معجزے دکھائے پر وہ اس پر ایمان نہ لائے۔[6]" تب ان شہروں کو جن میں

---

[1] توراۃ کتاب الخروج [2] یوحنا کی انجیل باب ۱۰۔ ۱۹ [3] متی کی انجیل، باب ۹۔ ۴۲ [4] لوقا کی انجیل ۱۱۔ ۱۸ [5] یوحنا کی انجیل ۱۲۔ ۳۷،

اسکے بہت سے معجزے ظاہر ہوئے، ملامت کرنے لگا کیونکہ انھوں نے توبہ نہ کی تھی [۱]

کفار قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے طالب ہوتے تھے مگر جب معجزے دیکھتے تھے تو کاہن اور جادوگر کہنے لگتے تھے [۲]، عرب میں پیشین گوئی کاہن کیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کو دیکھکر معاندین نے آپ کو کاہن کا خطاب دیا تھا، اسلئے قرآن مجید نے کہا،

فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ (طور-۲)	اے پیغمبر تو اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہے،
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (حاقہ-۲)	اور یہ کسی کاہن کی بات نہیں ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور خوارق کو وہ دیکھتے تھے تو ان کو جادو کا اثر سمجھتے تھے۔

ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (مدثر-۱)	پھر پیٹھ پھیر کر چلا، اور غرور کیا اور کہا کہ یہ تو جادو ہے، جو اگلے وقتوں سے چلا آتا ہے۔

کفار ایک دوسرے کو منع کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ جایا کرو، کیونکہ وہ جادو کیا کرتے ہیں،

هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء-۱)	یہ محمد تو تمھاری ہی طرح آدمی ہیں، کیا تم جادو کے پاس آتے ہو، اور تم دیکھ رہے ہو،
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (احقاف-۱)	حق کے منکرین کے پاس جب حق آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے،

---

[۱] متی کی انجیل ۱۱-۱۰ [۲] صحیح مسلم مناقب ابی ذر،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معجزۂ شق القمر دکھایا تو کفار نے اسکو بھی جادو کہا

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ	نزدیک آگئی قیامت اور چاند پھٹ گیا، اور اگر
وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا	وہ کوئی بھی نشانی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ
سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (قمر-۱)	یہ تو جادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

دوسرے معجزات کو دیکھ کر وہ یہی کہتے رہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جادوگر ہے،

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَا	کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک
اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ	وحی اتاری کہ لوگوں کو ڈرا اور ان کو جو ایمان لائے
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنَّ لَهُمْ	بشارت دے کہ ان کے پروردگار کی بارگاہ میں
قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ	ان کی بڑی پایگاہ ہے، کافر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا
الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (یونس)	جادوگر ہے۔

معاندین کو معجزہ سے بھی ایمان کی دولت نہیں ملتی

چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں ہوتی، اور یقین کی سعادت سے وہ محروم ہوتے ہیں، اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی شک و شبہ کے گرداب سے ان کو باہر نہیں نکال سکتی، وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، کبھی اس کو سحر و جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں، کبھی فریب اور قوت شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے، اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، حجت کے لیے ایک دفعہ معجزہ ان کو دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا، پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کو تسلی نہ ہوگی، چنانچہ سورۂ انعام کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ

نے ان تمام مراتب کو بیان کر دیا ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ (انعام-۱)

اور خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ان کے پاس نہیں آتی لیکن یہ کہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ

(انعام-۱)

اے پیغمبر! اگر ہم تجھ پر ایسی کتاب بھی آسمان سے اتارتے جو اوراق میں لکھی ہو کہ وہ اسکو اپنے ہاتھوں سے چھوئیں تو وہ جو کافر ہیں، یہی کہیں گے کہ یہ فقط ایک ساحرانہ تماشا ہے۔

وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (انعام-۳)

اور اگر وہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو وہ ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ وہ جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے جھگڑا کرتے ہیں، اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ، وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ

(انعام-۱)

اور کہتے ہیں کہ اس پیغمبر کیساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا، کہدے کہ اگر فرشتہ اتارا جاتا تو انکو مہلت نہ دیجا سکتی اور بات پوری ہو جاتی، اگر ہم رسول کا ساتھی کسی فرشتہ کو بناتے تو اسکو بھی انسان ہی کی صورت میں بناتے تو پھر وہی شبہے ان کے دلوں میں ہم پیدا کرتے جو اب یہ کر رہے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ	اور اگر ہم ان کے پاس آسمان سے فرشتے بھی اتار کر
كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ	بھیجیں اور مردے بھی ان سے باتیں کریں، اور
كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا	ہر چیز ان کے سامنے لا کھڑی کر دیں تو وہ ایمان
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ	نہ لائیں گے، لیکن یہ کہ خدا کی مشیت ہو، لیکن
يَجْهَلُوْنَ (انعام - ۱۴)	اکثر لوگ جانتے نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرطِ شفقت سے یہ خیال بار بار آتا تھا کہ یہ رؤسائے قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ رہنے پائیں، خدا نے فرمایا کہ ان کو حقیقت میں براہ راست نبوت سے انکار نہیں بلکہ ان کو نبوت سے اس لیے انکار ہے کہ ان کو اولاً نفس خدا پر یقین نہیں، یہ بظاہر نبوت کی نشانیوں کو طلب کرتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کو خدا کی نشانیاں بھی تسلیم نہیں، ایسے لوگوں کی قسمت میں ایمان کی سعادت نہیں، ان کے لیے معجزے بیکار ہیں، یہ سعادت ان ہی کو ملتی ہے، جو حق کے طالب ہیں، اور حق باتوں کو سنتے ہیں،

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ	ہم جانتے ہیں کہ ان کافروں کی باتیں تجھ کو غمگین کرتی
يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ	ہیں لیکن تجھکو غمگین نہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ تجھکو
وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	نہیں جھٹلاتے ہیں، بلکہ دراصل ان ظالموں کو
يَجْحَدُوْنَ ۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ	خدا کی نشانیوں سے انکار ہے، تجھ سے پہلے انبیا بھی
رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى	جھٹلائے گئے تو انھوں نے اپنی تکذیب پر صبر کیا
مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى	اور ان کو بھی ایذا پہنچائی گئی، یہاں تک

اَتٰهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ
وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ
وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ
فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا
فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ
فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ
يَسْمَعُوْنَ ۝ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ
اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا
لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ
عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
(انعام - ۴)

ان کے پاس خدا کی نصرت آئی، خدا کی باتوں کو
کوئی بدلنے والا نہیں، گذشتہ پیغمبروں کے واقعات
تجھ کو معلوم ہو چکے ہیں اور اگر ان کافروں کی
روگردانی تجھ پر گراں ہو تو اگر تجھ میں طاقت ہو
تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی
ڈھونڈھ کر انکو کوئی نشانی لاکر دے (ان نشانیوں
سے ان پر کوئی اثر نہ ہوگا) اگر خدا چاہتا تو انکو
راہ ہدایت پر متفق کر دیتا تو (غمگین ہو کر)
جاہلوں میں نہ بن، دعوت الٰہی کو وہی قبول
کرتے ہیں جو آواز پر کان دھرتے ہیں (اور یہ
کافر جو دل کے) مردے ہیں، انکو خدا ہی اٹھائیگا
پھر اسی کی طرف لائے جائیں گے، یہ کہتے ہیں کہ
اس پیغمبر پر اسکے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی
کیوں نہیں اتاری گئی، کہدو کہ خدا نشانی اتارنے پر
قادر ہے لیکن اکثر لوگ نادان ہیں،

لیکن معجزہ دیکھنے پر بھی ان کے قلوب کو اطمینان حاصل نہ ہوگا، کیونکہ اس شک و شبہ کا منشا عناد ہے، حق طلبی نہیں، اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلے ہی دفعہ دیکھ کر وہ ایمان لے آتے،

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ
لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا
قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ
وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَا اِذَا جَآءَتْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ
وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ
الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ
حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا
مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ
اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ
عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ
يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ
الْقَوْلِ غُرُوْرًا

(انعام-۱۳)

اور یہ کافر خدا کی بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر
کوئی نشانی انکے پاس آجائیگی تو وہ اس پر ایمان
لے آئینگے، کہدے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں
اور تمھیں کس نے بتایا کہ یہ نشانیاں دیکھکر ایمان
لائینگے، یہ ایمان نہیں لائینگے (نشانی کے بعد)
ہم انکے دلوں کو (حصول یقین سے) اور انکی
آنکھوں کو (اپنے دیکھنے پر اعتبار کرنے سے) پھیر دیتے
ہیں جس طرح کہ یہ پہلے اس پر ایمان نہیں لائے
اور ہم انکو اُن کی اسی سرکشی کی حالت میں چھوڑ دینگے
کہ بھٹکتے رہیں، اگر ہم انکے پاس فرشتے بھی اتار
بھیجیں اور مردے بھی اٹھکر ان سے باتیں کریں
اور ہر چیز ہم انکے سامنے بھی کر دیں تو وہ ایمان
لانے والے نہیں، مگر جو چاہے اللہ لیکن ان میں اکثر
نادان ہیں، اور ہم نے اسی طرح ہر نبی کا معاند انسانوں
اور جنوں سے بنایا ہے، جو ایک دوسرے کو دھوکے کی
نمائشی باتیں سکھایا کرتے ہیں (اسی عناد کے باعث
وہ نشانیوں کو نہیں مانتے)

اگر دفعِ حجت کے لیے ان کو معجزہ دکھایا بھی جاتا ہے تو حیلہ جوئی کر کے کہتے ہیں کہ گذشتہ انبیاء کو جیسے معجزے دیے گئے، جب تک وہی معجزے ہم کو نہ دیے جائیں، ہم ایمان نہ لائیں گے،

فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ — چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے، جیسے

(انبیاء - ۱) — پہلے لوگ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے،

لیکن فرض کرو کہ وہی معجزات دکھلائے بھی جائیں تو ان کی حیلہ جو طبیعت ان سے کب تسلی پائے گی، وہ فوراً یہ کہدیں گے، جیسا کہ انھوں نے بارہا کہا ہے کہ یہ محض ساحرانہ کرشمہ ہے، اور ہماری آنکھوں کو مسحور کر دیا گیا ہے،

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ	اور کافر کہتے ہیں کہ اے وہ جس پر نصیحت اتری ہے
الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ لَوْ مَا	تجھ پر کوئی جن سوار ہے، کیوں تو فرشتوں کو ہمارے
تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ	پاس نہیں لے آتا، اگر تو سچا ہے (خدا کہتا ہے)
الصَّادِقِينَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ	ہم فرشتوں کو دنیا میں حق کے ساتھ اتارتے ہیں،
إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ	اگر فرشتے اتار دیے جائیں تو پھر ان کافروں کو
إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ	مہلت نہ دی جائے گی، اس نصیحت کو ہم نے
لَحَافِظُونَ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ	اتارا ہے، اور ہم ہی اسکے نگہبان ہیں، ہم نے
قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ۝ وَ	تجھ سے پہلے قوموں میں بھی پیغمبر بھیجے، اور
مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا	ان میں سے کسی کے پاس کوئی پیغمبر نہ گیا
كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ كَذَٰلِكَ	لیکن انھوں نے اس سے تمسخر کیا، اسی طرح

نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا	ہم گنہگاروں کے دلوں میں بٹھادیتے ہیں، وہ اس
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ	ایمان نہ لائینگے، یہ اگلوں سے رسم ہوتی آئی ہے، اور اگر ہم
وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ	ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھولدیں اور وہ اس میں
فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا (حجر)	چڑھ بھی جائیں تو یہی کہتے رہینگے کہ ہماری آنکھوں کو متوالا
سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ	بنادیا گیا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے،

حاصل یہ کہ ان معاندین کے شکوک وشبہات کا تو بر تو بادل معجزات اور آیات کی رو شنی سے بھی نہیں چھٹتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلے پہل اسلام کی دعوت اُن کے سامنے پیش کی تو آپ کو انھوں نے "مجنون" کا خطاب دیا، قرآن مجید نے ان کی تردید کی،

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (ن-۱)	تو اپنے پروردگار کی عنایت سے مجنون نہیں،

اس کے بعد آپ نے ان کے سامنے معجزات اور آیات پیش کیے کہ کہیں مجنون سے بھی یہ افعال صادر ہوسکتے ہیں؟ تو انھوں نے آپ کو مجنون کے ساتھ "کاہن" اور "جادوگر" کہا،

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (طور-۲)	تو اپنے پروردگار کی عنایت سے نہ تو کاہن ہے اور نہ مجنون
قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (یونس)	کافروں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے،

آپ نے ان کے اس الزام کے جواب میں اپنی تعلیمات و تلقینات کو پیش فرمایا کہ کاہن و جادوگر علم و حکمت کا یہ خزانہ نہیں رکھتے، لیکن پر عناد قلوب کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی، اور کہا کہ علم وحکمت کے اسرار انھیں کوئی سکھاتا ہے،

وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (دخان-۱)	اور ان معاندوں نے کہا کہ یہ سکھایا ہوا مجنون ہے،

الغرض انسانوں کے افہام وتفہیم اور ہدایت ورہنمائی کے جو اسلوب ؛ درطریق ہو سکتے تھے وہ سب ان کے سامنے پیش کیے گئے مگر انھیں شک و شبہہ کی کشمکش سے نجات نہ ملی،

بایں ہمہ انبیا معاندین کو معجزات دکھاتے ہیں اور وہ اعراض کرتے ہیں

معاندین کی اس پیہم طلب اور اصرار سے خیال ہو سکتا ہے کہ اگر اُن کو کوئی معجزہ دکھایا جائے تو وہ شاید ایمان لے آئیں، لیکن تمام انبیاؑ کی سیرتیں شہادت دیتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوا، انھوں نے معجزات دیکھے، پھر بھی اپنے انکار و اعراض پر نہایت استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا لیکن اس کا انکار ایمان سے متبدل نہ ہوا، جیسا کہ توراۃ اور قرآن دونوں میں بہ تکرار بیان ہوا ہے، قرآن مجید میں ہے

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا	جب موسیٰ ہماری نشانیاں لیکر فرعون کے پاس آیا
يَضْحَكُونَ ۝ وَمَا نُرِيهِمْ مِنْ آيَةٍ	تو وہ ہنستے ہیں، اور ہم انھیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے
إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُمْ	ہیں لیکن یہ کہ وہ پہلی نشانی سے زیادہ بڑی ہوتی ہے
بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝	اور ہم نے انکو بڑے عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ
وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا	رجوع کریں، اور انھوں نے موسیٰ کو کہا اے جادوگر
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّنَا	اپنے خدا سے ہمارے لیے دعا کر جیسا کہ اس نے تجھ سے تیری
لَمُهْتَدُونَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ	دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے (کہ وہ ہم سے
الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ۝	یہ عذاب دور کردے) ہم راہ راست کو قبول کیے لیتے ہیں
(زخرف - ۵)	پس جب ہم نے ان سے عذاب ہٹا دیا تو وہ اپنا عہد

توڑ دیتے

اس موقع پر ایک نکتہ خاص خیال کے لائق ہے، یہ حکایت حضرت موسیٰؑ کے قصہ کا ایک ٹکڑا ہے، جو زمانۂ ماضی کا ایک واقعہ تھا جس کو تمامتر صیغۂ ماضی سے ادا ہونا چاہیے تھا، لیکن اس میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے صیغۂ مضارع کا استعمال کیا ہے، جو واقعۂ حال واستقبال کے بیان کے لیے مقرر ہے،

۱۔ "جب موسیٰ ہماری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس آئے تو وہ ہنستے ہیں"،

۲۔ "اور ہم انھیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے ہیں لیکن وہ پہلی نشانی سے بڑی ہوتی ہے۔"

۳۔ "پہلے انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر موسیٰ کی دعا قبول ہوگئی تو ہم ایمان لے آئیں گے، لیکن جب دعا قبول ہو کر اس کا اثر ہوا تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے ہیں"

اس موقع پر صیغۂ مضارع کے استعمال سے یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ گویہ واقعہ خاص فرعون کے ساتھ پیش آیا، مگر یہ مخصوص حضرت موسیٰؑ ہی کے فرعون کے ساتھ نہیں، بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کی نفسی کیفیت یہی ہوتی ہے، کہ جب ان کے پیغمبر خدا کے احکام اور نشانیاں لے کر ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ صدائے خندۂ تحقیر بلند کرتے ہیں، لیکن خدا انکو نشانیوں پر نشانیاں دکھاتا جاتا ہے، تاہم ان سے ان کی تسکین نہیں ہوتی، اور وہ دوسری کو نشانی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ نشانی ہم کو دکھا دی گئی، ہم یقیناً ایمان لے آئیں گے، لیکن جب وہ نشانی بھی ان کو دکھا دیجاتی ہے، تو ان کو اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی اور وہ آخر تک ایمان کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔

حضرت صالحؑ کی امت نے حضرت صالحؑ سے ایک نشانی طلب کی انھوں نے

کہا یہ اونٹنی تمھاری نشانی ہے، جو ایک دن میں ان کے چشمہ یا کنوئیں کا تمام پانی پی جاتی تھی، اور دوسرے دن ان کے جانوروں کو پانی ملتا تھا لیکن اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام چشمہ یا کنوئیں کا پانی پی جاتی ہے، انھیں تسکین نہ ہوئی اور اس اونٹنی کو مار ڈالا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پاداش میں وہ ہلاک کر دیے گئے، سورۂ شعراء میں ہے،

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ	اے صالح! تم ہماری ہی طرح آدمی ہو، اگر تم
بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ	اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ، صالح
قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ	نے کہا یہ اونٹنی ہے، اس کے لیے پانی پینے کی ایک
لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ه وَلَا	باری ہے، اور تمھارے لیے ایک مقرر دن کا
تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ	پانی پینا ہے، اور اسکے ساتھ کوئی برائی نہ کرو
عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ فَعَقَرُوْهَا	ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا، تو
فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ فَاَخَذَهُمُ	انھوں نے اسکی کونچ کاٹ ڈالی، پھر نادم ہوئے
الْعَذَابُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً	تو عذاب نے انھیں آگھیرا، اس واقعہ میں بڑی نشانی
وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (شعراء - ۸)	ہے، صالح کی قوم کے لوگ اکثر مومن نہ تھے،

عہد محمدیؐ کے فرعونوں اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی تھی، کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انھیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی، چنانچہ کفار قریش کے حال میں قرآن مجید کا بیان ہے

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ	ان کے پاس خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی

وَ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ	نہیں آتی لیکن وہ اس سے اعراض کرتے ہیں
فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ	حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اسکو جھٹلایا
فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا	تو عنقریب جس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں، اسکی
بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (انعام-۱)	حقیقت ان کو معلوم ہوگی۔

ایک موقع پر قرآن مجید نے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق نبوت کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو معاندین قریش کہتے ہیں کہ ان نشانیوں سے ہم کو تسکین نہ ہوگی، جب تک گذشتہ پیغمبروں کی طرح خود ہم کو بھی وہی نشانیاں نہ دی جائیں، یعنی نبوت کے تمام آثار و کیفیات خود ہم پر طاری نہ ہوں، تاکہ ہم کو دھوکہ اور فریب کا شبہہ نہ رہے، خدا نے کہا کہ یہ نبوت ہر ایک کا حصہ نہیں۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ	کفار کو معجزہ دیا جانا	اور جب ان (کفار قریش) کے پاس کوئی نشانی
حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ		آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک نہ مانیں گے
اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ		جب تک ہم کو بھی وہ کچھ نہ دیا جائے جو خدا کے
(انعام-۱۵)		پیغمبروں کو دیا گیا ہے، خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی

اس لیے بالآخر معاندین کی طلب معجزہ سے تغافل برتا جاتا ہے

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد بالآخر معاندین پر حجت تمام ہو جاتی ہے، اور پھر طلب معجزہ کے لیے ان کے پیہم اصرار، الحاح اور طلب کی کوئی پرواہ نہیں کیجاتی، اور صرف عذاب الٰہی کی آخری نشانی ان کے لیے باقی رہ جاتی ہے۔ انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ نے تمام انبیاء سے زیادہ معجزات اور نشانیاں

دکھائیں، تاہم فریسی یہودیوں کو معجزہ کی تشنگی باقی رہ گئی، اور ہر ملاقات میں انھوں نے معجزہ کی نئی فرمایش کی،

"تب فریسی نکلے اور اس سے (حضرت عیسیٰؑ) حجت کر کے اس سے امتحان کے لیے کوئی آسمان سے نشان چاہا" (مرقس ۸-۱۱)

حضرت عیسیٰؑ نے آہ سرد بھر کر فرمایا،

"اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا" (مرقس ۸-۱۲)

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ نے ایک گونگے کو اچھا کیا، بعضوں نے کہا کہ

"یہ بعل زبول دیوتا کی مدد سے ایسے عجیب کام کرتا ہے، اور اوروں نے آزمایش کے لیے اس سے ایک آسمانی نشان مانگا" (لوقا ۱۱-۱۶)

حضرت عیسیٰؑ نے ان کے جواب میں فرمایا،

"اس زمانہ کے لوگ برے ہیں، وہ نشان ڈھونڈھتے ہیں، پر کوئی نشان ان کو نہ دیا جائیگا مگر یونس نبی کا نشان" (لوقا ۱۱-۲۹)

اللہ تعالیٰ نے معاندین قریش کے جواب میں قرآن مجید میں اسی نکتہ کا اظہار فرمایا،

وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ (بنی اسرائیل-۶)

اور ہم کو نشانیوں کے بھیجنے سے صرف اس امر نے باز رکھا کہ پہلوں نے ان کو جھٹلایا،

قرآن مجید میں چار پانچ مقام پر مذکور ہے کہ عہد محمدی کے معاندین نے کہا

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (۔ عٰلا ۔ ۴) محمد پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی،

اس کے جواب میں ان کو نبوت کی اصل حقیقت، انذار، تبشیر، اور ہدایت کی طرف متوجہ کیا گیا، اور خرقِ عادت کی کسی مزید نشانی کے دکھانے سے تغافل اور احتراز برتا گیا، عیسائی معترضین قرآن مجید کی ان آیتوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معجزہ دکھانے سے اس لیے انکار کیا کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں ملا تھا" اگر ان آیتوں سے یہ استنباط صحیح ہے تو انجیل کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں، ان کا مطلب کیا ہوگا، کیا حضرت عیسیٰؑ کا فریسیوں کو معجزہ دکھانے سے انکار کرنا بھی یہی نتیجہ ظاہر کرتا ہے، کہ نعوذ باللہ ان کو کوئی معجزہ خدا کی طرف سے نہیں ملا تھا،

معجزہ کے انکار یا تاخیر کے اسباب

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائناتِ روحانی کو بھی ایک نظام اور اصول کے ماتحت رکھا ہے، اس بنا پر ہم کو ضرورت ہے کہ ان مصالح اور اسباب کا پتہ لگائیں جن کی بنا پر، باوجود قدرت اور شدت ضرورت کے معجزات سے کلیۃً انکار کیا گیا ہی یا ان کے ظہور میں تاخیر ہوئی ہے، قرآن مجید کے امعانِ مطالعہ سے ان اسباب کو ذیل کی صورتوں میں محدود کیا جا سکتا ہے۔

(۱) معجزات کے ذریعہ سے جو لوگ ایمان لاتے ہیں، انکا ایمان محض جبری، تقلیدی، اور بالواسطہ ہوتا ہی، وہ لوگ اپنے دل میں انبیاءؑ کے محاسن تعلیم کا کوئی خاص ذوق نہیں پاتے صرف معجزات کی قوت، اور اعجوبگی ان کو متحیر اور مبہوت کر دیتی ہی، حالانکہ انبیاءؑ کی تعلیم

کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو شریعت کے رمز شناس اور اس کے اسرار و حکم سے ذوق آشنا ہوں،

یہی حالت ہے جس کو قرآن مجید نے "شرح صدر" اور انشراحِ قلب سے تعبیر کیا ہے،

فمن یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ	جس کو خدا ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو
صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (انعام-۱۵)	قبول اسلام کے لیے کھول دیتا ہے،

اس قسم کے لوگوں کے لیے معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کے لیے آفتاب و ماہتاب، آسمان و زمین، دن اور رات، غرض دنیا کا ایک ایک ذرہ معجزہ ہوتا ہے، اور خدا کے وجود، خدا کی وحدانیت، اور پیغمبر کی نبوت پر بلا واسطہ دلالت کرتا ہے، ان کے لیے صرف تفکر اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، یہی گروہ ہے جس پر سب سے زیادہ انبیاء کی نگاہ انتخاب پڑتی ہے اور وہ ان کو صرف تفکر و اعتبار کی ترغیب دیتے ہیں، اس گروہ کے بالمقابل ایک کور باطن فرقہ اور بھی ہوتا ہے، جس پر نظام فطرت کے دوسرے شواہد و آیات کی طرح معجزات کا بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا، انبیاء کو ابتدائے بعثت میں ان ہی دو گروہوں سے سابقہ پڑتا ہے اور چونکہ فطرۃً ایک معجزات سے بے نیاز ہوتا ہے، اور دوسرے پر معجزات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اس لیے ان دونوں گروہوں کے لیے معجزات بیکار ہوتے ہیں، اور اس بنا پر انبیاء ان کے پیش کرنے سے انکار کرتے ہیں، اسی نکتہ کو خداوند تعالیٰ نے ان آیتوں میں بیان کیا ہے،

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ	کہہ کہ دیکھو آسمان و زمین میں کس قدر نشانیاں ہیں
الْاَرْضِ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ	اور نشانیاں اور ڈراوے، تو اس قوم کے لیے کچھ

عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (یونس-۱۰) — بھی کچھ مفید نہیں، جو ایمان نہیں لانا چاہتی،

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ — اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف سے کوئی

عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ — معجزہ کیوں نہیں اترتا، کہہ خدا جس کو چاہتا ہے

یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ — گمراہ کرتا ہے، اور جو اس کی طرف رجوع کرتا

مَنْ اَنَابَ (رعد-۴) — ہے، اس کو ہدایت کرتا ہے،

(۲) بعض دفعہ معاندین ایسی نشانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں جن کے بار کے متحمل، قوتِ انسانی کے دوش و بازو نہیں ہو سکتے، خدا کا خود انسانوں کے سامنے آنا، خدا کا خود ہر انسان سے باتیں کرنا، فرشتوں کا نظر آنا، آسمان سے کوئی مجسم کتاب اتارنا، بازیگر کی طرح پیغمبر کا آسمان پر چڑھنا، کفار کی طرف سے جب اس قسم کے معجزات طلب کیے جاتے ہیں، تو انبیاء کو ہمیشہ انکار کرنا پڑتا ہے، اور اس انکار کا منشا خود منکرین کی فطرت ہے،

یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ — تم سے یہود کہتے ہیں کہ ان کے اوپر آسمان سے

عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ — ایک کتاب اتار دو، لیکن ان لوگوں نے تو

سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ — موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا یعنی ان

فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَ — ان لوگوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دو

تْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ — اس ظلم کا جو انھوں نے اپنے اوپر کیا، یہ نتیجہ ہوا

(نساء-۲۲) — کہ ایک چمک نے ان کو دبا دیا،

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا — اور جن لوگوں کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کیوں

يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْتَاْتِيْنَا اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (بقرہ - ۱۴)

خدا ہم سے باتیں کرتا، یا کوئی نشانی ہمارے پاس نہیں لاتا، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہا دونوں کے دل ایک سے ہیں،

لَوْمَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (حجرات - ۱)

کیوں نہیں فرشتوں کو ہمارے پاس لے آتے اگر تم سچے ہو (خدا کہتا ہے) ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے لیکن حق کے ساتھ، اگر وہ ان کافروں کے سامنے اتریں تو پھر انکو مہلت نہ دیجا سکے گی،

(۳) مادیت کی ترقی کے زمانہ میں تمام فضائل و محاسن کا مرکز صرف دولت، جائداد مال و اسباب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اخلاق و عادات، تمدن و معاشرت، رسم و رواج غرض تمام چیزوں میں امرا کی تقلید کرتے ہیں، لیکن انبیاء ہمیشہ اپنی معاشرت اپنی وضع، اپنے لباس غرض اپنی ایک ایک ادا سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ فضائل کا منبع صرف روح ہے، اور زخارفِ دنیوی سے ان کو کوئی تعلق نہیں،

اسی بنا پر جب منکرین انبیاء سے اس قسم کے معجزات طلب کرتے ہیں جو امرا کے ساتھ مخصوص ہیں، تو انبیا، کو عموماً ان کا انکار کرنا پڑتا ہے،

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ

اور ان لوگوں نے کہا کہ یہ پیغمبر کیوں کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کیوں اس پر ایک فرشتہ نہیں اترا جو اس کے ساتھ انکو

مَعَهٗ نَذِيرًا اَوْ يُلْقٰى اِلَيْهِ كَنْزٌ	کو ڈرائے، یا اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا
اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا	یا اسکے پاس کوئی باغ کیوں نہیں ہے جس سے
وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ	وہ کھائے، اور ظالموں نے کہا تم صرف ایک ایسے
اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (فرقان-۱)	شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے،

(۵) آیت بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کفار کا عام خیال یہ تھا کہ خدا کی طرف سے جو قاصد بن کر آئے اس کو مرتبۂ بشریت سے بالاتر ہونا چاہیے، اور اسکو بے انتہا خدائی قدرتیں حاصل ہونی چاہییں، اس بنا پر جب اس قسم کے معجزے طلب کیے جاتے ہیں جن سے اس ظن فاسد کی تائید ہوتی ہے تو انبیا، ان سے انکار کرتے ہیں،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ	کہہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے
وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ	ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، اور
اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى	نہ میں نے یہ کہا کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف
اِلَيَّ، (انعام-۵)	وحی کا اتباع کرتا ہوں،

(۶) متحدی بہ معجزات یعنی وہ معجزات جو کفار کے مطالبہ پر صادر ہوتے ہیں، انکی تاخیر کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ایسے معجزات پر ایمان نہ لانے کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے، اور منکرین کا گروہ ہلاک کر دیا جاتا ہے، چنانچہ اسکی مثالیں قوم نوح، نمرود اور فرعون سے لیکر قریش تک کی تمام تاریخیں پیش کرتی ہیں، اور قرآن مجید نے اس کو بتصریح بیان کر دیا ہے، حضرت صالحؑ کی امت نے ان سے نشانی طلب کی، خدا نے کہا، نشانی تمہیں دکھائی جائے گی

لیکن اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو تمھاری ہلاکت یقینی ہے،

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ	اور ہم نے نشانیاں بھیجنا اسلیے موقوف کیا
اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ	اگلوں نے ان کو جھٹلایا، اور ہم نے ثمود کو
وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً	اونٹنی کی نشانی دی سمجھانے کو اور پھر
فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ	اُس کا حق نہ مانا، اور نشانیاں جو ہم بھیجتے
اِلَّا تَخْوِیْفًا (بنی اسرائیل-۶)	ہیں تو ڈرانے کو،

لیکن جس طرح افراد کی موت وحیات کا ایک زمانہ مقرر ہے، اسی طرح قوموں کی ہلاکت و بربادی کی بھی ایک خاص مدت متعین ہے،

وَلِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (اعراف-یونس)	ہر قوم کا ایک زمانہ مقرر ہے،

اس لیے اس قسم کے معجزات کے ظہور میں اس مدتِ معینہ تک کے لیے تاخیر کی جاتی ہے، اور پیغمبر اور معاندین دونوں اس کے منتظر رہتے ہیں،

وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ	اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر خدا کیطرف
اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ	سے کوئی نشان نہیں اترتا ہے کہہ کہ غیب صرف
لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ	خدا کیساتھ مخصوص ہے، تم لوگ اسکے ظہور کا
الْمُنْتَظِرِیْنَ (یونس-۲)	انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں،

یہی سبب ہے کہ جن انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا مظہر اتم بنایا، ان کے ہاتھوں سے تحدی اور مطالبہ کے معجزوں کے صدور میں تاخیر برتی جاتی تھی،

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق انجیل کی آیتیں گذر چکی ہیں کہ یوں تو اُن سے بیسیوں معجزے سرزد ہوتے تھے، مگر تحدی اور مطالبہ کے معجزہ سے انھوں نے بالعموم انکار کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد دیکھنا نہیں چاہتے تھے، یہاں تک کہ حواریین نے جب زیادتِ اطمینان اور ترقیِ ایمان کے لیے معجزہ کی فرمایش کی تو خدا نے جواب دیا،

اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ فَمَنْ یَّكْفُرْ	میں یہ آسمانی خوان تم پر اتار سکتا ہوں لیکن
بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ	اس کے بعد اگر تم میں سے کسی نے انکار کیا
عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا	تو میں اس کو ایسا سخت عذاب دوں گا
مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (مائدہ-۱۵)	کہ دنیا میں کسی کو نہ دیا ہوگا،

غرض کائناتِ روحانی کا یہی اصول پیشِ نظر تھا، جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے مطالبہ کی پروا نہیں کرتے تھے، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ ان کے مطالبہ اور تحدی کے مطابق معجزہ آنے کے بعد ان کو پھر فرصت نہ دی جا سکے گی اور وہ برباد ہو جائیں گے۔

چنانچہ معاندینِ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معجزہ طلب کرتے تھے کہ فرشتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لے آؤ، خدا نے کہا کہ اگر وہ سامنے آئیں بھی تو انسانوں کی صورت میں آئیں گے، اور تم کو پھر وہی شبہ رہ جائیگا، علاوہ ازیں قانونِ الٰہی میں یہ آخری حجت ہے، اگر فرشتے اتر آئے اور اس سے بھی تمھاری تسلی نہ ہوئی تو پھر تم کو اس مطالبہ کے معجزہ کے بعد مہلت نہ مل سکے گی، اور تم ہلاک و برباد کر دیے جاؤ گے،

لَوْ مَا تَاْتِیْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ	کیوں تم فرشتوں کو ہمارے پاس نہیں لے آتے

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ مَا نُنَزِّلُ — اگر تم سچے ہو، خدا کہتا ہے فرشتوں کو حق کیسا

الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا — ،تارتے ہیں، اگر وہ اتریں تو پھر تم کو اس وقت

اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (حجر-۱) — مہلت نہ دی جاسکے گی،

(۷) معاندین عموماً پیغمبروں کو جھوٹا جان کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس آخری معجزۂ عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو، وہ آخر کب آئیگا، اور وہ جلد کیوں نہیں آتا؟ چونکہ اپنی نافہمی سے اُن کو یقین ہوتا ہے کہ یہ معجزانہ عذاب ظاہر نہ ہوگا. اس لیے وہ اس کا مطالبہ بار بار کرتے ہیں، تاکہ لوگوں میں پیغمبر کی سبکی ہو، اور ہماری طرح اور لوگ بھی اس کو کاذب تسلیم کریں چنانچہ قرآن مجید میں بار بار ہر قرن کے کافروں کے اس مقولہ کو دہرایا گیا ہے، اور اسکا جواب دیا گیا ہے، حضرت شعیبؑ کی امت نے کہا،

وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ — اور ہمارے خیال میں تم جھوٹے ہو،

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ — اگر سچے ہو تو ہم پر آسمان کا ایک

اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (شعراء ۱۰) — ٹکڑا گرادو.

لیکن اس کے لیے خدا کے ہاں ایک قانون مقرر ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ — ہر قوم کا ایک وقت مقرر ہے تو جب اس کا

فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا — مقرر وقت آجاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی د

يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ — دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی، کہدے اے پیغمبر

اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا — بھلا دیکھو تو اگر خدا کا عذاب راتوں رات یا دن کو

مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ	آ پہنچے تو یہ گنہگار جلدی کر کے کیا کر لیں گے
اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ	کیا جب آنے والا واقعہ آ جائیگا تب تم ایمان
آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ	لاؤ گے ، اب ایمان لاتے ہو! حالانکہ تم تو
(یونس - ۵)	اسی کی جلدی کر رہے تھے ،

عقیدۂ معجزات کی اصلاح قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں ، وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے ، اور اس کے خاص اسباب ہیں ، اسلام دنیا میں دین الٰہی کی تکمیل اور گذشتہ مذہبی اغلاط کی تصحیح کے لیے آیا تھا ، ان ظاہری معجزات نے گذشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر دیے تھے ، جن انبیاءؑ اور بزرگوں سے بکثرت معجزات صادر ہوئے ، ان میں الوہیت اور خدائی کا عنصر تسلیم کیا گیا ، اور اس طرح توحید اور نبوت کی اصلی حقیقت جس پر دین الٰہی کی بنیاد ہے ، متزلزل ہو گئی ، اس لیے قرآن مجید نے نہایت وضاحت ، نہایت صفائی اور نہایت تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا ، اور دنیا میں توحید اور نبوت کی اصل حقیقت اس استواری اور مضبوطی کیساتھ قائم کر دی کہ آیندہ فساد اور سوءِ عقیدہ کے سیل و طوفان سے اس کو گزند پہنچنے کا خطرہ باقی نہ رہا ،

(۱) سب سے پہلے اُس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں ، اور یہ آثار و دلائل ، اصل نبوت سے خارج امور ہیں ، نبوت کے اصل لوازم وحی ، مخاطبۂ الٰہی ، تزکیہ ، انذار ، تبشیر ، تعلیم ، اور ہدایت ہیں ، جیسا کہ ان کی تفصیل پہلے

گذر چکی ہے، اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصلی حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝ ....

....

(بقرہ ۱۴-۱۴)

اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں، خدا خود ہم سے کیوں باتیں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہو گئے، ہم نے تو نشانیاں اُن لوگوں کے لیے کھولدی ہیں جو یقین کرتے ہیں، اے محمد! ہم نے تجھکو سچائی دے کر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بناکر بھیجا ہو (جنکو اب بھی یہ نشانیاں نہ نظر آئیں) تو ان دوزخیوں کا حال تجھ سے نہ پوچھا جائیگا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (عنکبوت-۵)

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اُسکے پروردگار کیطرف سے نشانیاں کیوں نہیں اترتی ہیں، کہدے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں، اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ	اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشان اُس کے
اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اتارا جاتا،
اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ	اے محمد تو تو ڈرانے والا ہے، اور ہر قوم کا
هَادٍ (رعد - ۱)	ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے،

(۲) قرآن مجید نے نہایت وضاحت اور تکرار کے ساتھ اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے کہ ہمارا پیغمبر بشر اور خالص بشر ہے، اس میں الوہیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے، اور اس لیے وہ اپنی طرف سے خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى	میں بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہوں، (البتہ)
اِلَيَّ (کہف - ۱۲ و حم السجدۃ - ۱)	مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

کفار قریش کا خیال تھا کہ پیغمبر کے ساتھ فرشتوں کا پرا ہونا چاہیے، کبھی کبھی خود خدا اس کے سامنے آکر نمایاں ہو، اس کے لیے سونے چاندی کا محل ہو، عجیب و غریب اقسام کے باغ اس کے قبضہ میں ہوں، ہمارے سامنے وہ آسمان پر چڑھے، اور وہاں سے ہمارے لیے کتاب اتار لائے،

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى	اور کافروں نے کہا ہم تم پر اُس وقت تک ایمان
تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا	نہ لائیں گے، جب تک ہمارے لیے زمین سے
اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ	ایک چشمہ نہ بہادو، یا تمہارے قبضہ میں کھجور
وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا	اور انگور کا ایک باغ نہ ہو، اور پھر تم اُسکے

تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا
بیچ میں نہریں نہ بہادو، یا جیسا کہا کرتے ہو

زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ
آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر نہ گرادو، یا

بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا
خدا اور فرشتوں کو ضامن بنا کر لے آؤ، یا تمھارے

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ
لیے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے، یا تم آسمان

اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ
پر نہ چڑھ جاؤ، اور وہاں تمھارے آسمان

لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا
پر چڑھنے کا یقین اس وقت تک ہم کو نہ آئیگا

كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ....
جب تک وہاں سے کوئی ایسی کتاب نہ

(بنی اسرائیل-۱۰)
اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ سکیں،

ان سب کے جواب میں قرآن مجید آپ کو سکھاتا ہے،

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ
کہدے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں کون ہوں

اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل)
ایک آدمی پیغمبر،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ
اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہدے کہ میں یہ تم سے

خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ
نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ تم سے

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ
یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اس حکم کی

(انعام-۵)
پیروی کرتا ہوں جو میری طرف الہام کیا جاتا ہے

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا
اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہدے کہ خود میرا

وَلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ	نفع اور نقصان بھی میرے قبضۂ اختیار میں
كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ	نہیں لیکن جو چاہے خدا! اور اگر میں غیب کی
مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ	باتیں جانتا تو اپنا بہت سا فائدہ کرلیتا
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ	اور مجھ کو کوئی گزند نہ پہنچتا، میں تو صرف ڈرانے والا
يُّؤْمِنُوْنَ ؀	اور خوشخبری سنانے والا ہوں، ان لوگوں
(اعراف - ۲۳)	کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

غور کرو کہ زمین سے باغ کا اگا دینا، یا سونے کا محل کھڑا کر دینا، یا چشمہ بہا دینا یا آسمان سے لکھی لکھائی کتاب اتار دینا، نہ خدا کی قدرت سے باہر تھا اور نہ اس رسول کے ان معجزات سے ما فوق مطالبہ تھا جس کے ہاتھ سے چشمے بہ چکے تھے، جس کے اشارے سے درخت چل چکے تھے، یا جو معراج میں ساتوں آسمانوں کی منزلیں طے کر چکا تھا، لیکن چونکہ اگر اُن کے مطالبہ پر یہ امور واقع ہو جاتے تو وہ اگر بدعقیدگی کو راہ دیتے تو وہ آپ کو جادوگر کہدیتے، اور اگر خوش عقیدگی کا اظہار کرتے تو آپ کو نعوذ باللہ ما فوق البشر تسلیم کرلیتے، اور یہ دونوں باتیں اصول اسلام کے منافی ہوتیں، اس لیے سرے سے انکے اس جاہلانہ مطالبہ کو رد کر دیا گیا کہ چند لوگوں کے ایمان و عدمِ ایمان کی خاطر نفس پیغام و دعوت کے اصول کی بیخکنی نہیں کی جاسکتی،

(۳) عام لوگوں میں انبیأ کی نسبت یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست عالمِ کائنات کے تصرف پر قادر ہیں، چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰؑ

علیہ السلام کے معجزات کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے، اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰؑ کے قبضۂ قدرت میں تھی، اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے، یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی، قرآن مجید نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات، پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں، بلکہ خدا کی قدرت اور مشیئت سے ظاہر ہوتے ہیں،

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (انعام - ۱۳)	کہدے اے پیغمبر! کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں،
قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (عنکبوت - ۵)	کہدے اے پیغمبر! کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں،
قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً (انعام - ۴)	کہدے اے پیغمبر! کہ خدا کو قدرت ہے کہ وہ نشان اتارے،

سب سے زیادہ صاف اور صریح آیت یہ ہے،

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (رعد - ۶)	کسی رسول میں یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لائے۔

انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات جس عبارت اور لب ولہجہ میں بیان ہوئے ہیں،

ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰؑ کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کر دی گئی تھی، اس لیے وہ خاص اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہتے تھے کر دیتے تھے، قرآن مجید اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس نے حضرت عیسیٰؑ کے تمام معجزات کو بیان کر دیا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس عقیدۂ باطل کو بھی رد کرتا گیا ہے، اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا، حضرت عیسیٰؑ کے اختیار سے نہیں چنانچہ خود حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن کہتا ہے،

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ	میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی
اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ	لیکر آیا ہوں، کہ میں مٹی سے پرندہ کی صورت
کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ	کا جانور بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا
طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ	ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہو جاتا ہے،
الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ	اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا اور
الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۵)	مردہ کو زندہ کرتا ہوں۔ خدا کے حکم سے

دوسرے موقع پر حضرت عیسیٰؑ پر اپنے احسانات جتاتے ہوئے خدا نے فرمایا

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ	اور یاد کر، جب تو مٹی سے پرندہ کی طرح صورت
الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَکُوْنُ	میرے حکم سے بناتا تھا، پھر اس میں پھونک
طَیْرًا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَکْمَهَ	مارتا تھا تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہو جاتا تھا،
وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ج وَاِذْ	اور تو اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے

تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِىْ (مائدہ-۱۹) اچھا کرتا تھا، اور جب مردے کو میرے حکم سے زندہ کرتا تھا،

یہ قرآن مجید کے اسی اظہار حقیقت اور خالص تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہ ہوئیں اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا، اور تمام دنیا کے مذاہب میں **توحید کامل** کی علمبرداری صرف اسلام کے دست و بازو کو سپرد ہوئی،

مسئلۂ اسباب وعلل میں افراط وتفریط

عقیدۂ معجزات کے اصلاحات ہی کے تحت میں مسئلہ اسباب وعلل سے بھی تعرض کرنا ہے، جس نے دوسرے مذاہب کیطرح اسلام میں بھی دو فرقے پیدا کر دیئے ہیں، ایک فرقہ وہ ہے جو دنیا میں صرف اسباب وعلل کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے، اور ان اختیارات کو ناقابلِ فسخ وتغیر مانتا ہے، اس کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ان ہی مادی علل واسباب کے ماتحت ہوتا ہے اور اُن میں کسی قسم کا ردوبدل اور فسخ وتغیر نہیں ہوتا، اور اس لیے وہ خرق عادت کو ممتنع اور محال یقین کرتا ہے، کیونکہ یہ اسباب وعلل اور عالم کا یہ نظام کار سنۃ الٰہی ہے، اور سنن الٰہی میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، جیسا کہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے ثابت ہوتا ہے،

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۲۲) تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤگے،

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (ملئکہ ۵) تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تغیر نہ پاؤگے،

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم ۴) اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں،

دوسرا فریق، اللہ تعالیٰ کو نظامِ خاص، قوانینِ فطرت اور اسباب و علل کا پابند ٹھہرانا اُس کی شانِ قدرت کے منافی سمجھتا ہے، اور وہ ان بیچ کے وسائط کے بغیر اس کو فرمانروائے مطلق یقین کرتا ہے، یہ فریق اپنے دعویٰ پر حسب ذیل دلیلیں پیش کرتا ہے،

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (بروج) وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے،

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (آل عمرٰن) اسی طرح خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے،

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ (ابرٰھیم) اور خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے،

إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (حج - ۲) بیشک خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے،

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (بقرۃ ۳۳) لیکن خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (مائدۃ ۱) بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے،

إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (حج - ۲) بیشک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے،

ان آیات کے علاوہ حسبِ ذیل آیت قرآن مجید میں کم و بیش تغیر کے ساتھ آٹھ مقامات پر مذکور ہے،

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے،

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے کی علت صرف خدا کی قدرت، مشیئت اور ارادہ ہے، اور اس لیے ہر قسم کے خرقِ عادت ممکن ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فریق افراط و تفریط کے دو کناروں پر ہیں، اور انھوں نے قرآن مجید کی تمام آیتوں پر غور و تدبر کی نظر نہیں ڈالی ہے، یہی سبب ہے کہ انھوں نے

اشیاء کے خواص وطبائع اور عقلی مصالح وحکم کا انکار کیا ہے،

قرآن مجید اسباب مصالح کا قائل ہے

حالانکہ ان آیات بالا کی بنا پر یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن اسباب علل اور مصالح وحکم کا منکر ہے، کتاب الٰہی سے اپنی جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے صفات کمالیہ اور اس کے حکیم ہونے کی نفی کرنا ہے، قرآن مجید نے جابجا مخلوقات الٰہی میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، اگر یہ صحیفۂ قدرت اسباب مصالح سے خالی ہوتا تو یہ دعوت بے سود تھی، قرآن ان عجائب قدرت کو آیات اللہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور ان کے اسرار وحکم پر غور وفکر کرنے کا حکم دیتا ہے اور اسی دلیل سے وہ خدا کی قادر وحکیم ہستی کے وجود پر استدلال کرتا ہے، اگر یہ چیزیں اسباب ومصالح سے خالی ہوتیں تو ان میں غور وفکر کرنا بے کار ہوتا، قرآن نے آسمان وزمین، چاند سورج، ہوا بادل، پھول، پھل، جسم وجان، ان میں سے ہر شے کو اللہ کی وسیع قدرت اور دقیق مصلحت کا اعلانِ عام قرار دیا ہے، اور انسان کو بار بار ادھر متوجہ کیا ہے،

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ	آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور دن
اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی	کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں،
الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ	وہ جو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے، اور لیٹے یاد کرتے
قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ	ہیں، اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور
یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ	کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار
الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا	تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا،

(آل عمران - ۲۰)

خدانے ان لوگوں کو جو اشیا کی پیدائش کو خالی از مصلحت جانتے ہیں، زجر فرمایا ہے

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا	کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ
وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ	پیدا کیا ہے، اور تم ہمارے پاس نہیں
(مومنون-۶)	لوٹائے جاؤ گے۔
وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو اُن کے
وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (دخان)	درمیان ہے، انکو محض کھیل کے لیے نہیں بنایا،
وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	اور اسی خدانے آسمان سے پانی اتارا، پھر
مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ	ہم نے اس سے ہر شے کی روئیدگی پیدا کی
شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا	پھر ہم نے اس سے ہری کھیتی نکالی، اور اس سے
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا	تو بر تو دانے پیدا کیے، اور چھوہاروں کے
وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ	درخت سے اس کے پھولوں سے لٹکے ہوئے
دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ	خوشے اور انگور اور زیتون اور سیب کے باغ
وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا	جن کے میوے ایک ہی قسم کے اور مختلف
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى	اقسام کے بھی پیدا کیے، جب وہ
ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ	پھلتا ہے تو اُس کے پھل اور اس کے
(انعام-۱۲)	پکنے کو دیکھو،

اگر ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ مصالح واحکام کے آثار پوشیدہ نہ رکھتا تو اُن میں نظر

و فکر کی دعوت کیوں دیتا، متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مخلوقِ الٰہی کے "منافع" کی خاص تصریح فرمائی ہے،

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ
وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ، وَلَكُمْ
فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ
وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ وَتَحْمِلُ
اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا
بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ
اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ
وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ
لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ
السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ وَلَوْ شَآءَ
لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ، هُوَ الَّذِيْ
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ
مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ
فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ، يُنْۢبِتُ لَكُمْ

اور خدا نے جانوروں کو پیدا کیا، ان کے اُون
میں خوشگوار گرمی اور بہت سے فائدے ہیں، ان میں
سے بعض جانور تمھاری خوراک ہیں، اور تم کو
اُن سے رونق ہے جب شام کو ان کو پھیر لاتے
ہو، اور جب چراتے ہو، اور وہ تمھارے
مال واسباب کو اس شہر تک اٹھالے چلتے ہیں،
جہاں تم بغیر سخت تکلیف کے نہیں لیجا سکتے
تھے، بیشک تمھارا رب شفقت والا
مہربان ہے، اور گھوڑے خچر اور گدھے
بنائے کہ تم ان پر سوار ہو، اور رونق ہو،
اور وہ پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے، خدا ہی پر
ہے سیدھی راہ اور اس سے ہٹنے والے بھی
اُسی نے آسمان سے تمھارے لیے پانی اتارا،
کچھ اس میں سے پینے کے کام آتا ہے اور کچھ
سے درخت اگتے ہیں، جس میں تم اپنے

الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ
وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ
وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَ
النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝
وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا
اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ
سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا
طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً
تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ
مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ
فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝
. . . .

(نحل - ۱ - ۲)

جانور چراتے ہو، اس پانی سے خدا تمہارے لیے
کھیتی اگاتا ہے، اور زیتون، چھوہارے، انگور
اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے، اس میں غور و
فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے اور
اسی خدا نے رات اور دن اور سورج اور
چاند تمہارے کام میں لگائے اور تارے
اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں، اس میں عقل
والوں کے لیے نشانیاں ہیں، اور جو بکھیرا
ہے تمہارے لیے زمین میں کئی رنگ کے غلے
اور دانے، اس میں ان کے لیے جو سوچتے
ہیں نشانی ہے، اور وہی خدا ہے جس نے
دریا کو کام میں لگایا ہے کہ تم اس سے تازہ
گوشت کھاؤ اور اس سے وہ (موتی اور مونگے)
نکالو جس کو زینت کا سامان بنا کر پہنتے ہو
اور تم دیکھو کہ کشتیاں اس دریا کو پھاڑتی ہوئی
چلتی ہیں اور اس واسطے کہ تلاش کرو
اسکی بزرگی کو اور شاید احسان مانو،

غور کرو، اگر ان چیزوں میں مصالح و حکم نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ہم انسانوں کو ان چیزوں کی پیدائش پر شکر کا حکم کیوں دیتا،

بعض اشیاء کے مصالح اور اسباب کو خود قرآن مجید نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، پہاڑوں کی مصلحت یہ ظاہر کی ہے،

وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (نحل-۲)

اور اس نے زمین میں بڑے بڑے پہاڑوں کے لنگر ڈالدیے ہیں کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے،

ستاروں کی پیدائش کی غرض بتائی،

وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ (نحل)

اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں،

رات کی پیدائش کی مصلحت یہ بتائی،

جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ (یونس)

اور اسی نے رات بنائی کہ تم سکون حاصل کرو،

چاند کے گھٹنے بڑھنے کی غایت یہ ظاہر کی،

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ (بقرہ ۲۴)

لوگ تجھ سے چاند کی نسبت دریافت کرتے ہیں، کہدے کہ وہ لوگوں کیلئے وقت اور زمانہ کا معیار ہیں،

سایہ، آفتاب، رات، دن، ہوا اور پانی کے مصالح یہ تعلیم کیے،

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا

کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے سایہ کو کس طرح پھیلا رکھا ہے، اور اگر وہ چاہتا تو ایک ہی جگہ ٹھہرا رہتا، پھر سورج کو سایہ کا رہنما بنایا پھر اس سایہ کو ہم اپنی طرف آہستہ آہستہ

قَبْضًا يَسِيْرًا ۵ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ	سمیٹ لیتے ہیں، اسی خدا نے رات کو تمہارا اوڑھنا
الَّيْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ	اور نیند کو آرام اور دن کو تمہارے جد و جہد کیلیے بنایا
النَّهَارَ نُشُوْرًا ۵ وَهُوَ الَّذِي اَرْسَلَ	اسی خدا نے اپنے ابر رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو خوشخبری
الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا	سنانے والا بنایا، اور ہم نے آسمان سے ستھرا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً	اور نکھرا پانی اتارا کہ اس سے مردہ زمین کو زندہ
مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا	کریں اور چوپایوں اور بہت سے انسانوں
وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا (فرقان ۵)	کو اس سے سیراب کریں،

قرآن مجید نے اشیاء کے اسباب و علل ہونے کا بھی صاف اقرار کیا ہے، مثلاً جا بجا بارش کو کھیتی اور پھل پھول کے پیدا ہونے کا سبب بتایا ہے،

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ	اور آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے
مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (بقرہ ۳)	تمہاری روزی کے لیے پھل نکالے،

تمام ذی روح چیزیں پانی سے زندہ ہیں،

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (نور ۶)	اور خدا نے ہر چلنے والے کو پانی سے پیدا کیا،
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (انبیاء ۳)	اور ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا

ہر قسم کے نباتات پانی سے اگتے ہیں،

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً	اسی نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے
فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ (انعام ۱۲)	اس سے ہر چیز کی روئیدگی ظاہر کی،

بادِ صرصر اور آندھی ہلاکت اور بربادی کا ذریعہ ہے،

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ اَيَّامٍ	ہم نے عاد کی قوم پر بادِ صرصر بھیجا منحوس دنوں میں
نَحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ (حم السجدۃ ۲)	تاکہ ہم ان کو رسوائی کا عذاب چکھائیں،
رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ	ایسی آندھی جس میں دردناک عذاب تھا،
شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا، (احقاف ۳)	جو خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کر دیتی ہے،
اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ	یاد کرو جب ہم نے فائدہ نہ پہنچانے والی آندھی
مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا	ان پر بھیجی، جو جس شے پر گذرتی تھی ان کو بوسیدہ
جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ (الذّٰریات ۲)	ہڈی کی طرح کر دیتی تھی،

آگ جلاتی ہے،

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (مومنین)	آگ ان کے چہروں کو جھلسا دیتی ہے،

آگ لکڑی سے پیدا ہوتی ہے،

اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا، جس نے ہرے درختوں سے آگ کو پیدا کیا،

قرآن مجید، اشیاء کے طبعی خواص کا بھی منکر نہیں، شراب میں خواص ہیں،

قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ	کہدے کہ شراب و جوئے میں بڑا گناہ ہے اور ان میں لوگوں کیلئے
وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ ۲۷)	فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے،

اون میں گرمی کی خاصیت ہے،

فِيْهَا دِفْءٌ (نحل)	جانوروں کے اون میں خوشگوار گرمی ہے،

پانی میں پیاس بجھانے اور درخت اگانے کی خاصیت ہے،

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ (نحل ۲)

وہی خدا آسمان سے پانی برساتا ہے، اس سے پینا ہے، اور اس سے درخت ہیں،

شہد میں صحت بخشنے اور بیماری دور کرنے کی خاصیت ہے

يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ (نحل ۹)

شہد کی مکھیوں کے پیٹ میں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے،

لیکن علت حقیقی قدرت و مشیت ہے

غرض ان آیات کریمہ سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید اسباب و علل، مصالح و حکم اور طبائع و خواص کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، اور اس جماعت کا ساتھ نہیں دیتا جو ان چیزوں کا انکار کرتی ہے، اور یہ جانتی ہے کہ ان چیزوں کے تسلیم کرنے سے قدرت و مشیت الٰہی کے عقیدہ کا ابطال لازم آتا ہے، حالانکہ یہ تو اس وقت لازم آتا ہے، جب ان اسباب علل اور طبائع و خواص کو خدا سے مستقل اور مستغنی تسلیم کیا جائے، اور قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء اسباب و علل سے پیدا ہوتی ہیں، اور ان میں طبائع وخواص ہیں، لیکن یہ اسباب و علل اور طبائع و خواص خود خلاقِ عالم کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں، اور وہ ان ہی پر عموماً کاربند رہتا ہے، لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبور اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیر نہ کر سکتا ہو، اور کبھی اپنے خاص حکم و ارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کر سکتا ہو، کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے، اور خدا کی قدرت اور عظمت میں فرق آجاتا ہے، اسی لیے ہر موقع پر قرآن مجید نے اپنی تعلیم میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسباب علل

کے ساتھ ساتھ خدا کی مشیت اور ارادہ کو پیش نظر رکھتا ہے، تاکہ انسانوں میں خدا کی معذوری مجبوری اور عدم قدرت کا تصور نہ پیدا ہو، اور نہ اس کی مشیت وارادہ پر خود اس کی مشیت وارادہ کے سوا خارجی پابندیاں عائد ہوں، چنانچہ وہ تمام آیتیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کے متعلق اوپر دوسرے فریق کی طرف سے پیش کی گئی ہیں، وہ اسی موقع کی ہیں، اور جن سے یہی تعلیم مقصود ہے،

ہم نے اوپر اسباب وعلل اور طبائع وخواص کے ثبوت میں جس قدر آیتیں لکھی ہیں، غور کرو، ان سب میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ان مسببات کے اسباب وعلل اور اشیاء کے طبائع وخواص، خود اس نے اپنی مشیت وارادہ اور اپنے حکم وامر سے بنائے ہیں، اور ہر جگہ اس کی توضیح کردی ہے، تاکہ ظاہر بیں انسان ان ظاہری علل واسباب اور طبائع وخواص کو دیکھ کر اشیاء کی علتِ حقیقی کا انکار کر کے مبتلائے الحاد یا اسباب وخواص کو مستقلاً شریک تاثیر مان کر گرفتار شرک نہ ہو جائے، یہ انبیاءؑ کی تعلیم کا خاص طریقہ ہے، اور قرآن نے اس نکتہ کو کہیں فراموش نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ انبیائے کرامؑ اور بزرگانِ خاص کو بھی عادتِ جاریہ اور ظاہری علل واسباب کے خلاف باور کرنے میں جب استعجاب اور استبعاد ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ کیا ہے، اور ان کے اس استعجاب اور استبعاد کو اپنی قدرت اور مشیت کو یاد دلا کر رفع کیا ہے، حضرت سارہؓ کو پیرانہ سالی میں جب حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو توراۃ اور قرآن دونوں میں ہے کہ ان کو اس پر سخت تعجب ہوا، انھوں نے کہا۔

يَا وَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِي شَيْخًا — اے خرابی! کیا میں جنوں گی، اور میں بڑھیا ہوں اور میرا

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ (ھود) یہ خاوند بوڑھا ہے، یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے

فرشتوں نے جواب میں کہا،

اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ (ھود) (اے سارہ) کیا تم خدا کے کام سے تعجب کرتی ہو؟

اس قدر تنبیہ ان کے ایمان کی تازگی کے لیے کافی تھی،

حضرت زکریاؑ بوڑھے ہوگئے تھے، اور ان کی بیوی بانجھ تھیں، حضرت زکریاؑ کو اپنی اور اپنی بیوی کی حالت کا قطعی علم تھا لیکن وہ اپنی اور اپنی بیوی کی ظاہری عدم استعداد اور اسباب و علل کے نہ موجود ہونے کی صورت میں بھی خدا کی قدرت اور مشیت کے مؤثر حقیقی ہونے پر یقینِ کامل رکھتے تھے، چنانچہ اسی حالت میں انھوں نے ایک وارث کی دعا مانگی، مگر جب ان کو اجابتِ دعا کی بشارت دی گئی، تو تقاضائے بشریت سے کہ انسان ظاہری اسباب و علل کے دیکھنے کا عادی ہے، اس کمالِ ایمان کے باوجود ان کو یہ واقعہ مستبعد معلوم ہوا اور انھوں نے عرض کی،

رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ اے میرے رب! کہاں سے میرے لڑکا ہوگا میری بیوی بانجھ ہے

عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا (مریم ۱) اور میں بوڑھا ہوگیا ہوں یہاں تک کہ بڑھاپے سے اکڑ گیا ہوں

خدا نے اس کے جواب میں صرف اسی قدر فرمایا،

قَالَ کَذٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ کہا یوں ہی ہے تیرے رب نے کہا، یہ مجھ پر آسان ہے (زکریا!

وَّقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا (مریم) تجھکو یاد نہیں) کہ میں نے تجھکو پیدا کیا اور تو کچھ نہ تھا.

حضرت مریمؑ کو جب حضرت عیسیٰؑ کی خوشخبری دی گئی تو انھوں نے بھی ظاہری علل و اسباب

کے خلاف ہونے پر حیرت ظاہر کی۔

قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا (مریم ۲)	مریم نے کہا میرے لڑکا کہاں سے ہوگا مجھکو کسی آدمی نے چھوا بھی نہیں اور میں کبھی بدکار تھی

فرشتہ نے جواب میں کہا :

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا (مریم ۲)	بولا یوں ہی ہے تیرے رب نے کہا وہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس کو لوگوں کے لیے نشانی بنانا چاہتے ہیں اور اپنی طرف سے رحمت۔

قرآن میں سنت اللہ کا مفہوم

وہ فریق جو خرقِ عادت اور خلافِ اسباب و علل کے محال ہونے پر قرآن مجید کی ان آیتوں سے استدلال کرتا ہے جن میں "سنت الٰہی" کے عدم تبدیل کا ذکر ہے، درحقیقت دانستہ یا نادانستہ مفہومِ قرآن کی تحریف کا مجرم ہے۔ قرآن مجید میں "سنت الٰہی" کا ایک خاص مفہوم ہے۔ اور اسی اصطلاحِ خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر، نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند و موعظت اُن کے لیے موثر نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ اُن قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔ اور وہ بالآخر بجلی کی کڑک آسمان کی گرج، زلزلہ کی تھرتھراہٹ، آندھی کی گھڑگھڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک و برباد ہوجاتی ہیں، یہ سنتِ الٰہی ہے، جو ہمیشہ سے قائم ہے، اور

ہمیشہ قائم رہے گی، اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا، قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے، اسی مفہوم میں آیا ہے، چنانچہ وہ تمام آیتیں ذیل میں لکھ دی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو شک وشبہہ باقی نہ رہے،

قریش، داعیٔ حق کو شہر مکہ سے نکالنے کی تیاری کرتے ہیں، اور اس دعوت کو قبول کرنے سے علانیہ انکار کر دیتے ہیں، تو خدا فرماتا ہے،

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	اور وہ (کفار قریش) تو تجھکو اس شہر سے لگے تھے
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا	گھبرانے تاکہ وہ تجھکو یہاں سے نکال دیں، لیکن
يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا سُنَّةَ	اگر ایسا ہو تو وہ تیرے بعد کم ٹھہریں گے، یہ دستور
مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا	پڑا ہوا ہے ان رسولوں کا جن کو ہم نے تجھ سے
وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (بنی اسرائیل)	پہلے بھیجا، اور تو اللہ کے دستور کو ٹلتے نہ پائے گا،

مدینہ کے منافقین اپنی شرارت سے باز نہیں آتے، خدا فرماتا ہے،

اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا	وہ جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے،
سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ	دستور پڑا ہوا ہے اللہ کا ان لوگوں میں جو پہلے
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (احزاب)	ہو چکے، اور تو اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پائیگا،

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے سورہ فاطر کی حسب ذیل آیت سے بڑھ کر اور کون آیت ہو سکتی ہے؟

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ	اور بری کا داؤ پیچ خود داؤ پیچ کرنے والوں پر اُلٹ

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ	جاتا ہے تو کیا اب یہ کافر پہلی قوموں کے
فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا	دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں تو تم اللہ کے دستور
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا	کو ہرگز نہ بدلتے پاؤگے، اور نہ کبھی اللہ کے
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا	دستور کو ٹلتے پاؤگے، کیا وہ زمین میں پھرے
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ	نہیں ہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلی قوموں کا
قَبْلِهِمْ (فاطر ۵)	کیا انجام ہوا،

حدیبیہ کے موقع پر کفار قریش کو تنبیہ اور مسلمانوں کو تسکین دیجاتی ہے،

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا	اور اگر یہ کافر سے لڑتے تو پیٹھ پھیر دیتے،
الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا	پھر وہ کوئی حامی نہ پاتے اور نہ مددگار
وَّلَا نَصِيْرًا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ	اللہ کا دستور پہلے سے چلا آتا
خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ	ہے۔ اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے
لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فتح ۳)	نہ پاؤگے۔

اب ان آیتوں کے پڑھ لینے کے بعد بھی سنۃ اللہ کے مفہوم کے سمجھنے میں کسکو غلطی ہوسکتی ہے؟

قرآن میں فطرۃ اللہ کا مفہوم

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے، جس کو یہ فریق اپنے ثبوت میں پیش کرتا رہتا ہے،

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	خدا کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو

عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم)	بنایا، خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں،

اس موقع پر اس آیت کو پیش کرنا قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے، قرآن مجید کی اصطلاح میں فطرۃ اللہ سے مقصود توحید ہے، جس کو وہ دینِ فطری سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ اوپر کی پوری آیت اگر پیش نظر ہو تو یہ مفہوم خود بخود آئینہ ہو جاتا ہے، خدا فرماتا ہے،

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ	سو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت
عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ	جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے، خدا کے بنائے
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ	میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے،
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (روم ۴)	لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

قرآن مجید کی اس اصطلاح کی تفسیر ایک صحیح حدیث سے پوری طرح ہو جاتی ہے،

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ	کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہیں ہوتا لیکن
فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او	ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے
یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ جمعاء	ہیں جس طرح ہر جانور صحیح و سالم بچہ کرتا ہے، کیا تم نے
ھل تحسون فیھا من جدعاء ثم	دیکھا کہ کوئی کان کٹا بچہ بھی وہ جنتا ہے، اس کے بعد
یقول فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ الخ	آپ نے یہ آیت پڑھی "خدا کی فطرت جس پر اس نے
(بخاری تفسیر سورہ روم)	لوگوں کو پیدا کیا۔" آخر آیت تک،

معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہو

الغرض اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نہ تو اسباب عادیہ کا منکر ہے، اور نہ عالم کے نظام کار کو علل و مصالح سے خالی تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ ان تمام اسباب و علل سے مافوق ایک اور قادر اور ذی ارادہ ہستی کو فرمانروائے کل یقین کرتا ہے جس کی مشیت اور ارادہ کی قوت سے کائنات کی یہ مشین چل رہی ہے، معجزہ کا سبب اور علت براہ راست اس کی مشیت اور ارادہ ہے کبھی یہ مشیت اور ارادہ عادات جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً قوم نوحؑ کے لیے طوفان آنا، قوم لوطؑ کے لیے کوہ آتش فشاں کا پھوٹنا یا زلزلہ آنا، حضرت ایوبؑ کا چشمہ کے پانی سے صحیح و تندرست ہو جانا، قوم عاد و ثمودؑ کے لیے آندھی آنا، مکہ میں قحط عظیم کا رونما ہونا، غزوہ خندق میں آندھی چلنا، یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عادات جاریہ کے خلاف نہیں، لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، نیکوکاروں کی نجات اور گنہگاروں کی ہلاکت ہوئی محض بخت و اتفاق نہیں، بلکہ ارادہ و مشیت الٰہی نے خاص ان قوموں کے لیے بطور نشانی کے ان کو پیدا کیا، اور کبھی یہ مشیت الٰہی عادات جاریہ اور اسباب ظاہری کا نقاب اوڑھکر نہیں، بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، مثلاً عصا کا سانپ بنجانا، انگلیوں سے چشمہ کا جاری ہونا، مردہ کا جی اٹھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، پتھر سے چشمہ کا ابلنا، درختوں کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا، بیجان چیزوں میں آواز پیدا ہونا کہ ان چیزوں کی تشریح موجودہ علم اسباب و علل کی بنا پر نہیں کیجا سکتی، اور نہ ان کو عادات جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے، اس لیے انکی علت خدا کی مشیت اور ارادہ کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، اسی لیے انبیاء نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ اُن سے ظاہر

ہوتا ہے، وہ صرف خدا کی قدرت مشیت اور اذن سے ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ ظاہری علل و اسباب کے مطابق ہوں، تو وہ پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیونکر بن سکتے ہیں، کفار اُن کو دیکھ کر فوراً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے، اس لیے خدائی نشان ہونے کا ثبوت کیونکر بہم پہنچ سکتا ہے،

معجزہ کی باعتبار خرق عادت کے چار قسمیں

اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ معجزات اور نشانیاں کسی نہ کسی حیثیت سے خارقِ عادت ہوں، چنانچہ

(۱) کبھی نفس واقعہ خارقِ عادت ہوتا ہے، مثلاً عصا کا سانپ بنجانا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، انگلیوں سے چشمہ کا ابلنا، مردہ کا زندہ کرنا، وغیرہ،

(۲) کبھی یہ ہوتا ہے کہ نفس واقعہ خلافِ عادت نہیں ہوتا، مگر اس کا اس وقتِ خاص پر رونما ہونا خرقِ عادت بنجاتا ہے، مثلاً طوفان آنا، آندھی آنا، زلزلہ آنا، کفار کا باوجود کثرتِ تعداد کے بے یار و مددگار اہل حق سے خوف کھانا، وغیرہ، تمام تائیداتِ الٰہی اسی قسم میں داخل ہیں،

(۳) ایک صورت یہ ہے کہ نفس واقعہ اور اس کے ظہور کا وقت خاص تو عاداتِ جاریہ کے خلاف نہیں ہوتا، مگر اس کا طریقۂ ظہور خلافِ عادت ہوتا ہے، مثلاً انبیاء کی دعاؤں سے پانی کا برسنا، بیمار کا اچھا ہونا، آفتوں کا ٹل جانا کہ نہ تو پانی کا برسنا، یا بیمار کا اچھا ہو جانا، یا کسی آئی ہوئی آفت کا ٹل جانا، خلافِ عادت ہے، اور نہ اس کے ظہور کا کوئی خاص وقت ہے، لیکن جس طریقہ سے اور جن اسباب و علل سے یہ معجزات ظاہر ہوئے وہ خارقِ عادت ہیں، استجابتِ دعا اسی قسم میں داخل ہے۔

(۴) کبھی نہ تو واقعہ خارقِ عادت ہوتا ہے، اور نہ اس کا طریقۂ ظہور خارق عادت ہوتا ہے

بلکہ اس کا قبل از وقت علم، خارقِ عادت ہوتا ہے، مثلاً انبیاؑ کی پیشین گوئیاں، ایک دفعہ زور سے آندھی چلی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر تھے، آپ نے فرمایا کہ یہ آندھی ایک منافق کی موت کے لیے چلی ہے، چنانچہ جب لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مدینہ میں ایک منافق اس آندھی سے مرگیا، اس معجزہ میں نہ تو آندھی کا چلنا خرقِ عادت ہے، نہ آدمی کا آندھی کے صدمہ سے مرجانا خلافِ اسباب ہے، بلکہ واقعہ کا قبل از وقت علم خرق عادت ہے،

اہل ایمان پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

انبیاء کی زندگی علم وعمل دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے، اور ان کے تمام ارشادات وتعلیمات سے صرف ان ہی دونوں کی ترقی اور تکمیل مقصود ہوتی ہے، اس لحاظ سے انبیاؑ کے بعض معجزات کا اثر صرف علم ویقین پر پڑتا ہے، ان سے کوئی عملی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا، ہاتھ کا چمک اٹھنا، عصا کا سانپ بنجانا، چاند کا شق ہوجانا، اگرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا، اور دوسرے نے انکار کیا لیکن انبیاؑ کے بہت سے معجزات ایسے ہوتے ہیں جن سے نہایت عظیم الشان عملی نتائج ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً عصا کے سانپ بن جانے سے بنو اسرائیل کو کوئی عملی فائدہ نہ پہنچ سکا، لیکن اس کے ذریعہ سے پانی کا جو چشمہ ابلا، وہ ان کے لیے حیات بخش ثابت ہوا، پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، کہ ان سے علم ویقین کو ترقی ہوتی ہے اور دوسری قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصر الٰہی کہا ہے، پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن تائید اور نصر الٰہی اس کی پابند نہیں ہوتی،

آغازِ نبوت میں چونکہ انبیاء صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں اور کفار کی طرف سے ان ہی عقائد

کا انکار کیا جاتا ہے، اور ان ہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے، اس لیے اول اول انبیا سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے جن کا اثر صرف علم و یقین پر پڑ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی قسم کے دو معجزے دیکر فرعون کے پاس بھیجا، اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار قریش کو معجزۂ شق القمر دکھایا، لیکن اس کے بعد انبیا کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہو جاتا ہے، جو عموماً مفلوک الحال، خانہ بدوش، بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے، یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن، خلوص نیت اور شدتِ ایمان کی بنا پر کسی معجزہ کا خواستگار نہیں ہوتا، تاہم تائید الٰہی خود اس کی طلبگار ہوتی ہے اور ہر موقع پر اسکی حفاظت و حمایت کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تائیدات الٰہیہ کا ظہور اکثر بغیر طلب سوال کے ہوتا ہے، مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزہ کا سوال نہیں کیا، لیکن آپ سے اکثر معجزات کا ظہور ان ہی کے درمیان ہوا، بالخصوص غزوات میں اکثر تائید الٰہی نے مسلمانوں کی مدد کی ہے، غزوۂ بدر و حنین میں فرشتوں کا آسمان سے نازل ہونا، تھوڑے سے زاد راہ کا تمام فوج کے لیے کافی ہونا، آپ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، یہ اور اس قسم کے بہت سے معجزات، غزوات ہی کے زمانہ میں آپ سے ظہور پذیر ہوئے، اور ان سے تمام مسلمانوں نے ایسی حالت میں فائدہ اٹھایا جب کہ تمام دنیوی اسباب و وسائل منقطع ہو چکے تھے،

اسی کا نام قرآن مجید کی زبان میں نصر (مدد) اور تائید ہے، اور یہ ہر نبی کو آخر وقت میں عطا کی جاتی ہے، اور عین اس وقت جب بظاہر اسباب مایوسیوں کے تمام مناظر پیش ہوتے ہیں، اور تائید حق کا بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا، دفعۃً نصرت الٰہی توقع کے خلاف گرد و پیش

کے واقعات کے خلاف بجلی کی طرح ناامیدیوں کے بادل سے چمک اٹھتی ہے،

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ	کیا تم کو خیال ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے
لَمَّا یَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ	اور ابھی تم پر وہ حالت گذری نہیں جو تم سے
قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ	پہلوں پر گذری، ان پر مصیبت اور تکلیف آئی،
وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ	اور اس قدر جھڑ جھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اسکے ساتھ
اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ	مسلمان (گھبرا کر) کہہ اٹھے کہ خدا کی نصرت کہاں ہے،
اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ (بقرہ-۲۶)	ہاں خدا کی نصرت نزدیک ہے،
حَتّٰۤى اِذَا اسۡتَایۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا	یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور
اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا	خیال کرنے لگے کہ ان سے نصرت کا وعدہ پورا
فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا	نہیں کیا گیا کہ ہماری نصرت آگئی، پھر ہم نے
عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ	جن کو چاہا وہ بچا دیے گئے، اور پھری نہیں
(یوسف ۱۲)	جاتی ہماری آفت گنہگار قوم سے،

خدا کا یہ قطعی وعدہ ہے کہ وہ حق پرستوں کو ہمیشہ آخر کار نصرت عطا کرے گا،

وَكَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (روم)   اور ایمان داروں کی مدد ہمپر فرض ہے،

یہ نصرت مسلمانوں کو ہر قدم پر تسلی کا پیغام سناتی تھی، بدر ہو کہ اُحد، خندق ہو کہ حنین، ہر جگہ وہی ان کی دستگیر تھی،

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیۡ مَوَاطِنَ كَثِیۡرَةٍ (توبہ)   خدا نے بہت سے موقعوں پر تمہاری نصرت کی،

لیکن سب سے بڑی نصرت بدر کی تھی جب تین سو بے برگ و ساز مہتوں نے قریش کی ایک ہزار مسلح فوج کو کامل شکست دیدی۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ	اور خدا نے یقیناً بدر میں تمھاری مدد کی،
وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (آل عمران ۔۱۳)	جب تمھارے پاس کوئی قوت نہ تھی،

لیکن عام معجزات اور نصرتِ الٰہی میں یہ فرق ہے کہ جو معجزات بطور حجت اور برہان کے پیش کیے جاتے ہیں، وہ صرف انبیاءؑ کی روحانی طاقت کا فیض ہوتے ہیں یعنی ان کا یہ فیض سبب ہوتا ہے ارادۂ الٰہی کے ظہور کا لیکن نصرتِ الٰہی میں پیغمبر کی روحانی طاقت کے ساتھ مومنین کے کمالِ ایمان، شدتِ یقین، تزکیۂ نفس، اور استعداد قلب کی شرکت بھی ضروری ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت نے جب سخت فاقہ کی حالت میں نزولِ مائدہ (خوانِ آسمانی) کی درخواست کی تو انھوں نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی،

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى بْنَ	یاد کرو جب حواریوں نے کہا، اے مریم کے
مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ	بیٹے عیسیٰ کیا آپ کا پروردگار ہم پر آسمان سے
عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ	ایک خوان اتار سکتا ہے عیسیٰ نے کہا خدا سے
اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (مائدہ ۔۱۵)	تقویٰ کرو اگر تم کو یقین ہے۔

میدان جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو نزولِ ملائکہ کی بشارت سناتے ہیں، تو ساتھ ساتھ صبر اور تقویٰ کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ	یاد کر اے پیغمبر! جب تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا

اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ	کہ کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار
مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ ۝ بَلٰٓی ۙ اِنْ	فرشتے اتار کر تم کو مدد دے (خدا کہتا ہے) ہاں
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ	اگر تم مستقل رہو، اور تقویٰ کرو، اور وہ فوراً
ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ	آجائیں تو خدا پانچ ہزار سوار فرشتوں کے
مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ (آل عمران-۱۳)	ذریعہ سے تمہاری مدد کرے گا،

یہی وہ معجزات تھے جن کی نسبت صحابۂ کرامؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ان کو برکت سمجھا کرتے تھے،

کفار کے لیے نتائج کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

جس طرح مومنین پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں ہیں اسی طرح کفار پر نتائج کی حیثیت سے بھی ان کی دو قسمیں ہیں آیت ہدایت اور آیت ہلاک، انبیاءؑ کفار کو پہلے ہدایت کی نشانیاں دکھاتے ہیں اور انکو حق کی دعوت دیتے ہیں، کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں، وہ اُس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے، جب مادۂ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہ جاتا، یعنی اس کثیف مادہ سے چھٹ کر تمام اجزاے لطیفہ الگ ہوجاتے ہیں، اور ڈھیر میں پھوس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیتِ ہلاک، آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب، لوہے کی تلوار بنکر رونما ہوتی ہے، اور سطح خاکی کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کردیتی ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عنایت ہوئے تھے، مگر وہ اس لیے تھے کہ

ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے، جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰؑ کو شق بحر کی آیت ہلاک عنایت ہوئی، اور رود احمر کی لہریں فرعون کو اس کے سارے ساز و سامان اور امرائے دربار کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نگل گئیں، حضرت نوحؑ کو آیتِ طوفان، حضرت صالحؑ کو آیتِ ناقہ، حضرت لوطؑ کو بربادی سدوم کی نشانی، حضرت شعیبؑ کو آیت صاعقہ بجز، حضرت عیسیٰؑ کو آیت رفع اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزہ بَطْشَةُ الْكُبْرىٰ (بدر) جو دیا گیا تھا، وہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا، ان میں سے ہر معجزہ اور نشانی کے ظہور کے بعد یا خود اسی معجزہ اور نشانی کے ذریعہ سے معاندین کی ہلاکت، استیصال اور بربادی ہوئی اور اسی کو قرآن مجید نے سُنَّةُ اللّٰهِ (خدا کا دستور) اور سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ (پہلوں کا دستور) کہا ہے کہ ہر پیغمبر کی قوم میں یہ اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے،

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا	اور بدی کا داؤ پیچ کرنے والوں پر الٹ
بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا	جاتا ہے، تو کیا اب یہ کافر اگلی قوموں کے
سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (فاطر)	دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں،
اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا	یہ جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے
تَقْتِيْلًا ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ	گئے، یہ اللہ کا دستور پڑا ہوا ہے
خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (احزاب۔۸)	اگلی قوموں میں

اس معجزۂ عذاب کے ظاہر ہونے میں عموماً ایک وقت معین تک تاخیر کی جاتی ہے

جس کے اسباب حسب ذیل ہیں،

(۱) یہ معجزۂ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزاء اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین اور کافرین ایک دوسرے سے پھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی، حضرت نوحؑ نے ایک طویل زمانہ تک اپنی قوم کو دعوت دی، اور اس کے بعد ناامید ہو کر انھوں نے آخری معجزہ کی دعا مانگی،

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ	اے میرے پروردگار زمین پر کافروں میں سے
دَيَّارًا إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ	کوئی بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تو ان کو چھوڑیگا
يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا	تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور
إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (نوح-۲)	وہ جنیں گے لیکن فاجر اور کافر کو،

اس کے بعد طوفان آیا اور قوم نوحؑ کو بہالے گیا

اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون سے پوری مایوسی ہو گئی تو انھوں نے دعا کی:

رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ	اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اسکے
مَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي	سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا	اور دولت عطا کی ہے، اے ہمارے رب وہ
عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ	اس سے یہ کام لیتے ہیں کہ (وہ) لوگوں کو تیرے راستے
أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ	سے گمراہ کرتے ہیں، خداوندا انکی دولت کو مٹادے

فَلَا یُوْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۔ (یونس - ۹)

اور انکے دلوں کو سخت کردے تب تک وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھیں گے ایمان نہ لائیں گے،

اس موقع پر اسی قسم کی دعائیں دیگر انبیاءؑ نے بھی کی ہیں،

(۲) اس منزل پر پہنچ کر پیغمبر کو اپنے مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے، حضرت نوحؑ کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں، اِنِّیْ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ عَنْکَبُوْت (میں خدا کی طرف ہجرت کرتا ہوں) حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکل جاتے ہیں، حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت صالحؑ سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی، اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہولیتی، اور مومن و کافر الگ نہیں ہوجاتے، معجزۂ عذاب نہیں بھیجا جاتا حضرت نوحؑ جب تک کشتی پر سوار ہو کر علیحدہ نہ ہولیے، طوفان نہ آیا، حضرت ابراہیمؑ جب تک کلدانیوں کے ملک (عراق) سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے، ان پر عذاب نہ آیا، اسی طرح حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، اور حضرت شعیبؑ اپنی اپنی جماعتوں کو لیکر جب تک الگ نہ ہوگئے، ہلاکت کا عذاب نہیں آیا، اور جب انھوں نے ہجرت کرلی تو یہ معجزۂ عذاب مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوا، اور مومنین کو نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوئی،

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ان واقعات کو بکثرت بیان کیا گیا ہے، اور

نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ دستور اور قانون فرمایا ہے، جس میں تغیر اور تبدل ناممکن ہے، جیسا کہ اس سے پہلے "قرآن مجید میں سنۃ اللہ کے مفہوم" کے ضمن میں آیات قرآنی کے حوالہ سے اس کی پوری تفصیل گذر چکی ہے، سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ اس اصول کو اس طرح بیان کرتا ہے

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ	کیا یہ کافر گذشتہ قوموں کی طرح واقعۂ ہلاکت
اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ	کا انتظار کرتے ہیں، کہدے کہ انتظار کرو
قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ	میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں،
الْمُنْتَظِرِيْنَ ۔ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا	پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں اور
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ حَقًّا	ایسے ہی ایمان لانے والوں کو ہم پر فرض ہے
عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (یونس - ۱۰)	ہم نجات دیں گے ایمان والوں کو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور معجزۂ ہدایت

ہدایت کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معجزات اور نشانیاں صادر ہوتی رہتی تھیں، ان کا بڑا حصہ غیر معمولی قوتِ تاثیر استجابتِ دعاء، تائید و نصرت اور پیشین گوئی کا تھا، اسی غیر معمولی قوت تاثیر کا نتیجہ تھا کہ قریش لوگوں کو آپ کے پاس جانے سے روکتے تھے، سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت کفار کے اس باطنی اعتراف کا آئینہ ہے،

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا	اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں شور و غل
فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ)	کرو، شاید تم غالب آؤ۔

قرآن کے اثر کا ان پر یہ رعب چھایا ہوا تھا کہ وہ لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہ دیکھتے تھے، کہ وہ شور و غل اور ہنگامہ کر کے لوگوں کو سننے نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی **استجابت دعا** کا بھی کفار کو بدرجہ اتم یقین تھا، ایک دفعہ صحن حرم میں جب ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں خلل انداز ہوئے اور آپ نے ان پر بددعا کی، تو بخاری و مسلم میں یہ تصریح ہے، کہ وہ اس کو سنکر کانپ اٹھے[۱]

ایک دفعہ جب مکہ میں قحط عظیم پڑا تو ابوسفیان نے آپ کے پاس آکر کہا کہ "محمد تمہاری قوم ہلاک ہوگئی، خدا سے دعا کرو کہ وہ اس بلا کو ان سے دور کرے"[۲] چنانچہ آپ نے دعا کی اور وہ بلا دور ہوئی، اسی طرح آپ کی **پیشین گوئی** کی صداقت کا بھی ان کو دل سے اعتراف تھا، یاد ہوگا کہ غزوۂ بدر سے پہلے جب امیہ کو حضرت سعد انصاری رضی کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مارے جانے کی پیشین گوئی کی ہے تو وہ گھبرا اٹھا، اور اس کی بیوی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے غزوہ بدر کے موقع پر اپنے شوہر کا دامن تھام لیا کہ "محمد کی پیشین گوئی تمہیں یاد نہیں"[۳] **فتح روم** کی مشہور پیشین گوئی جس دن پوری ہوئی بہت سے لوگ اس نشانِ صداقت سے ہدایت پاکر مسلمان ہوگئے[۴]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کے عجائبات بھی قریش کی نظروں سے گذر چکے تھے، وہ بار بار آپ پر حملے کی تیاریاں کرتے تھے اور ناکام رہتے تھے، ایک دفعہ ابوجہل نے یہ ناپاک

---

[۱] صحیح بخاری آخر کتاب الوضو و مسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین،

[۲] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان [۳] صحیح بخاری اول کتاب المغازی [۴] ترمذی تفسیر سورۂ روم۔

ارادہ کیا، اور اس نیت سے آگے بڑھا تو فوراً ڈر کر پیچھے ہٹ گیا، ساتھیوں نے واقعہ پوچھا تو بتایا کہ مجھے یہ نظر آیا کہ میرے اور محمد ﷺ کے درمیان آگ کی خندق ہے، اور چند پردار ہستیاں کھڑی ہیں،[۱]

الغرض ہدایت کے متعدد نشانات تھے، جو مکہ میں کفار کو اس غرض سے دکھائے گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر ان کے قلوب میں قبولِ حق کی صلاحیت پیدا ہو،

شق قمر آخری نشانِ ہدایت تھا

ہدایت کی ان نشانیوں میں کفار مکہ کے لیے سب سے آخری[۲] اور فیصلہ کن نشان **شق قمر** تھا، جس کے بعد آیات ہلاکت کا آغاز ہونے والا تھا، احادیث میں ہے کہ کفار مکہ آپ ﷺ سے معجزہ کے طالب تھے، تو آپ ﷺ نے ان کو شق قمر کا معجزہ دکھایا، چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، لیکن معاندین کو اس عظیم الشان اور واضح تر معجزہ سے بھی ہدایت نہ ملی، بعضوں نے کہا محمد ﷺ نے جادو کیا ہے، کسی نے کہا ایسی عجیب عجیب باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ قرآن مجید نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے،

---

[۱] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ۔ [۲] ہم نے قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصول الٰہی کے مطابق اولاً ایسا سمجھا تھا کہ شق قمر کا معجزہ ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا ہوگا، لیکن سیر و مغازی اور کتب احادیث کا مطبوعہ ذخیرہ اس دعوی کے ثبوت اور انکار دونوں سے خاموش تھا، اسی اثنا میں حاکم کی مستدرک کی دوسری جلد حیدرآباد سے چھپ کر پہنچی، اس میں سورۂ قمر کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں یہ تصریح ملی کہ یہ نشان قبل مخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا ہے، حاکم کی یہ روایت بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک میں اس کی تصدیق کی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ روایت عبدالرزاق میں بھی موجود ہے (مستدرک ج ۲ صفحہ ۴۷۱، حیدرآباد)

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ	قیامت کا وقت قریب آگیا، اور چاند شق ہو گیا
الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا	اور اگر یہ کافر کوئی نشانی دیکھیں تو اس سے
وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝	منھ پھیر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ جادو تو
(قمر-۱)	ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے،

اب خداوند ذوالجلال کے رحم وکرم نے دوسری شان اختیار کی، یعنی اس کے قہر و غضب نے ان غیر صلاحیت پذیر ہستیوں سے سطح ارضی کو پاک کر دینے کا تہیہ کر لیا اور وہ سنت الٰہی جو تمام گذشتہ امتوں کے ساتھ جاری رہی تھی یعنی یہ کہ معجزوں کے دیکھنے کے بعد ایمان نہ لانے پر کفار کی ہلاکت اور بربادی فرض محتم ہو جاتی ہے، وہ قریش کے حق میں بھی جاری ہوئی،

گذشتہ دستور الٰہی کی تفصیل کے مطابق اس ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کے لیے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی،

(۱) مومنین کی جماعت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہر مکہ سے ہجرت،

(۲) ہجرت سے پہلے ہدایت کی کسی آخری کھلی نشانی کا ظاہر ہونا،

چنانچہ ہجرت سے پہلے شق قمر کا نشان ظاہر ہوا، اور اس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے رؤسا اسلام نہ لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا، اور ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کا وقت قریب آگیا صحابہ میں اسرار نبوت کے جو محرم تھے وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے، مستدرک حاکم (جلد ۳ صفحہ)

اور مسند ابن حنبل (جلد ۱ صفحہ ۲۱۶) میں ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا" اِنَّا لِلّٰہِ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا، اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے، چنانچہ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ والی قتال کی آیت نازل ہوئی[1]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور معجزۂ ہلاکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت دی، اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی، اور آیاتِ ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھائے، بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے سے گذرا، اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا، یعنی قبیلۂ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے، انھوں نے حق کو قبول کر لیا، اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبولِ حق کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے تھے، یا وہ ضعفا رتھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہیں رکھتے تھے، اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کیا جائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے، لیکن وہاں بھی کوئی حق کا سننے والا نہ تھا، بازار اور راستہ میں شریروں نے آپ کو پتھر مارے، یہانتک کہ قدم مبارک خون آلود ہو گئے، آپ مکہ واپس آرہے تھے کہ فرشتۂ جبال نے آپ کو ندا دی کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے، رحمت عالم اب بھی

[1] نسائی کتاب الجہاد اور ترمذی تفسیر آیت بالا میں بھی یہ حدیث مذکور ہے، "س"

مایوس نہ ہوئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ ابھی وہ معجزۂ ہلاک ظاہر نہ ہو، شاید کہ ان کی نسل سے کوئی توحید کا پرستار پیدا ہو، صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اُحد کے علاوہ آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کون تھا؟ آپ نے فرمایا وہ دن جب میں نے (طائف کے سردار) عبد یالیل کے سامنے اپنے کو پیش کیا، اور اس نے انکار کیا، میں مغموم واپس آرہا تھا، کہ فرشتۂ جبال نظر آیا، اور اس کے بعد آپ نے کفار کی ہلاکت کے لیے فرشتۂ جبال کی اجازت طلبی اور اپنا جواب بیان کیا[1]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دن کو ایام مصائب کی تاریخ میں سب سے زیادہ سخت فرماتے ہیں، بظاہر ایسا سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے طائف کی تکلیف کو سخت ترین دن فرمایا، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، اس سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت کی گھڑیاں آپ پر آئی ہیں، بلکہ اس لحاظ سے آپ اس کو سخت ترین دن قرار دیتے ہیں کہ یہ قریش کی فرصت اور مہلت کی اخیر گھڑی تھی، اور اب معجزۂ ہلاک ان کے سر پر تھا، اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا صدمہ تھا، تاہم قریش کو اب آخری عذاب کی اطلاع دیدی گئی تھی، اور وہ نادان استہزا کرتے تھے، جیسا کہ دوسری قومیں بھی اپنے اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہی کرتی آئی ہیں، کفار قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر کہتے تھے جس عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے، وہ کیوں نہیں آتا؟ اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ، اور اپنی صداقت کی یہ آخری نشانی بھی دکھادو،

---

[1] مسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین وبخاری کتاب بدء الخلق

ویقولون لولآ انزل علیہ	اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف
ایۃ من ربہ فقل انما الغیب	سے کوئی نشان کیوں نہیں اترتا، اے پیغمبر!
للہ فانتظروا انی معکم من	کہدے کہ غیب کی بات خدا کے پاس ہے تم اسکے ظہور
المنتظرون (یونس - ۲)	کا انتظار کرو، ہم بھی تمھارے ساتھ منتظر ہیں

کبھی آکر کہتے

او تسقط السمآء کما زعمت	یا جیسا تم کہا کرتے ہو، آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے
علینا کسفا او تاتی باللہ و	کرکے ہم پر گرادو یا خدا اور فرشتوں کو
الملئکۃ قبیلا (بنی اسرائیل - ۱۰)	ہمارے سامنے لے آؤ
لوما تاتینا بالملئکۃ ان کنت	اگر تم سچے ہو تو کیوں نہیں ہمارے
من الصدقین (حجر - ۱)	پاس فرشتوں کو لے آتے ہو،

خدا نے جواب میں کہا

وما کانوا اذا منظرین	جب فرشتے آجائیں گے تو پھر انھیں مہلت
(حجر)	نہ دیجائے گی،

کفار قریش کو معجزۂ عذاب کے دیکھنے کی جلدی تھی، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشین گوئی سراسر جھوٹ ہے۔ خدا نے کہا جب تک پیغمبر کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں، یعنی تمام افراد صالحہ الگ نہ ہو جائیں گے عذاب نہیں آئے گا،

ویستعجلونک بالسیئۃ	اور کفار جلدی چاہتے ہیں تجھ سے، بھلائی

قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(رعد - ۱)

سے پہلے برائی حالانکہ ان سے پہلے گذشتہ قوموں میں اس قسم کے واقعات گذر چکے ہیں، اور تیرا رب لوگوں کی گنہگاری کے باوجود ان کو معاف کرتا ہے، اور تیرا رب بڑے عذاب والا بھی ہے،

اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے معجزہ کو ذکر کر کے کہتا ہے

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۙ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۭ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۭ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۙ ثُمَّ جَاۗءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۙ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ۭ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ڗ

(شعراء - ۱۱)

وہ نہ مانیں گے اس کو جب تک دکھ کا عذاب نہ دیکھ لیں گے، پھر وہ عذاب اچانک ان پر اس طرح آجائیگا کہ ان کو خبر نہیں ہونے پائے گی تو اس وقت کہیں گے کہ ہم کو مہلت بھی کچھ مل سکتی ہے؟ کیا یہ کفار ہمارا عذاب جلد مانگتے ہیں، بھلا دیکھ تو اگر ہم نے ان کو چند سال فائدہ اٹھانے کا موقع دے بھی دیا، پھر ان پر وہ عذاب آگیا جس کا وعدہ تھا، تو کیا ان کی یہ دولت ان کے کچھ کام آئے گی، ہم نے کسی آبادی کو ہلاک نہیں کیا لیکن اسکو ڈر سنانے والے پہلے موجود تھے،

یعنی اس اصول کی بنا پر کہ قوموں کی ہلاکت سے پہلے ان کے اندر ایک ڈر سنانے والا مامور ہوا کرتا ہے۔ قریش میں بھی ایک ڈر سنانے والا آیا، اگر وہ اس کی نہ سنیں گے تو پچھلی قوموں کی طرح وہ بھی نیست و نابود ہو جائیں گے، سورۂ حج میں اللہ تعالےٰ قریش کو مختلف قوموں کے حالات سنا کر کہتا ہے

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا	تو کتنی بستیاں ہم نے برباد کیں، اور وہ گنہگار
وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ	تھیں، اور اب وہ اپنی چھتوں پر ڈھی پڑی
عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ	ہیں، اور کتنے کنوئیں بے کار پڑے ہیں، اور
وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا	کتنے اونچے اونچے محل خراب اور ویران
فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ	ہیں، کیا یہ کافر زمین میں چلے پھرے نہیں
قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ	ہیں، کہ ان کے پاس دل ہوتے جن سے
اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا	سمجھتے۔ یا کان ہوتے جن سے سنتے، کیونکہ
لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى	آنکھیں کچھ اندھی نہیں ہوتی ہیں (کہ انکو
الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِى الصُّدُوْرِ	یہ عبرت ناک مناظر سوجھائی نہ دیتے،
وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ	ہوں)، مگر وہ دل اندھے ہوتے ہیں، جو
وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ	سینوں میں ہیں، اور یہ کافر تجھ سے جلدی
وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ	مانگتے ہیں عذاب، اور اللہ ہرگز اپنا وعدہ
كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ	نہ ٹالے گا، اور تیرے رب کے نزدیک

وَكَاَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا	ایک دن تمھارے ہزار برس کے برابر ہے،
وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا	اور کتنی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو ڈھیل
وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ قُلْ يَا اَيُّهَا	دی، اور وہ گنہگار تھیں، پھر ان کو پکڑا، اور
النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ	میری طرف پھر آنا ہے، کہدے اے لوگو!
مُّبِيْنٌ (حج - ۷)	میں تو صاف صاف تم کو ڈر سنانے والا ہوں،

قرآن نے رؤساے قریش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّةَ	کیا وہ پہلی قوموں کے دستور کا انتظار
الْاَوَّلِيْنَ (فاطر - ۵)	کر رہے ہیں،

چنانچہ گذشتہ قوموں کے قانون کے پورے ہونے کے دن آگئے یعنی رسولؐ اور مومنین کو گنہگار قوم کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت ملی، کیونکہ جیسا پہلے گذر چکا ہے، جب تک رسول اپنی قوم سے ہجرت نہیں کرتا، عذاب و ہلاکت کا نشان ظاہر نہیں ہوتا، چنانچہ کفار قریش کو جو اس نشان کے دیکھنے کے لیے بیتاب تھے پہلے ہی یہ جتا دیا گیا تھا،

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ	اور اگر وہ اس زمین سے تجھ کو گھبرانے لگے ہیں
مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا	تاکہ یہاں سے تجھ کو نکال دیں تو یاد رہے کہ
وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلَافَكَ	تیرے چلے جانے کے بعد وہ بہت کم پھر ٹھہر
اِلَّا قَلِيْلًا ۝ سُنَّةَ مَنْ قَدْ	سکیں گے، تجھ سے پہلے جو رسول گذرے ہیں

اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (بنی اسرائیل - ۸)

ان کی یہ سنت ہے، اور خدا کی سنت کو تم ہٹانہ پاؤ گے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش ادھر اودھر بیٹھے ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے، ابوجہل نے کہا کہ کون مذبح جاکر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا، چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے، تو وہ نجاست آپ کی پشت مبارک پر ڈالدی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجہ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے، اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بیخود ہوئے جاتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو اس موقع پر موجود تھے، کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کرسکتا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے جاکر حضرت فاطمہؓ کو اطلاع دی، جو اس زمانہ میں بچی تھیں، وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا، تو آپ نے سر اٹھایا، یہ پہلا موقع ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوتے ہیں، اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ کے جسم مبارک کو تکلیف پہنچی، بلکہ اس لیے کہ وہ نماز (یعنی مشاہدۂ جمالِ الٰہی) میں جو اس دنیا میں آپ کی محبوب ترین چیز تھی خلل انداز ہوئے۔

قرآن نے کہا:

اَرَأَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (علق)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندۂ الٰہی کو نماز سے روکتا ہے،

یہ رؤساے قریش کی مہلت کا آخیر لمحہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بد دعا کی، اور اس آخری معجزہ ہلاک کی درخواست کی، مگر پھر بھی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت دیکھیے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی طرح پوری قوم کی تباہی و بربادی کی دعا نہیں مانگی، بلکہ صرف قریش کے رئیسوں کے حق میں بد دعا کی، اور ان میں سے بھی صرف سات رئیسوں کے نام لیے، اور فرمایا "خداوندا! قریش کے سرداروں کو لے، خداوندا! ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ بن معیط، امیہ بن خلف، ولید بن عقبہ، اور ابی ابن خلف کو پکڑ" یہ بد دعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔[1]

اب سنت الٰہی کے مطابق معراج کے ساتھ ہجرت کی دعا آپ کو بتائی گئی،[2]

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ	خداوندا! مجھ کو خوبی سے کہیں پہنچا، اور خوبی
اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ	سے نکال، اور اپنے پاس سے مجھے ایک
مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا (بنی اسرائیل ۹)	مدد کرنے والی طاقت عطا کر،

یہ دعا، مقبول ہوئی اور بشارت آئی،

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ	حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل
الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل ۹)	مٹنے ہی کو ہے،

انبیاءؑ کی سنت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین کے ساتھ ہجرت

---

[1] بخاری اور مسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین [2] ترمذی تفسیر آیت مذکور (بنی اسرائیل) اور مستدرک حاکم (باب الہجرۃ) میں تصریح ہے کہ یہ دعاے ہجرت ہے،

فرمائی، اور جس دن کا انتظار تھا وہ آگیا، قرآن نے کہا کہ رؤساے قریش پر آیت عذاب کے نازل ہونے کے لیے ہجرت کا انتظار تھا، وہ ہو چکی، اور اب کوئی مزید انتظار نہیں،

وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا
لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ
وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ
خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ ○ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ
اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ
لَقُلْنَا مِثْلَ ہٰذَا اِنْ ہٰذَا اِلَّآ
اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ○ وَاِذْ قَالُوا
اللّٰہُمَّ اِنْ کَانَ ہٰذَا ہُوَ الْحَقَّ
مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً
مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ
اَلِیْمٍ ○ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمْ
وَاَنْتَ فِیْہِمْ وَمَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَہُمْ
وَہُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ○ وَمَا لَہُمْ اَلَّا
یُعَذِّبَہُمُ اللّٰہُ وَہُمْ یَصُدُّوْنَ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا کَانُوْٓا

اور جب (اے پیغمبر!) منکرین داؤ کر رہے تھے
تیری جان لینے کا کہ وہ تجھ کو قید کر دیں، یا
مار ڈالیں، یا جلا وطن کر دیں، وہ داؤ کرتے
ہیں اور خدا بھی داؤ کرتا ہے، اور خدا داؤ
کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے، اور جب
ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں
تو کہتے ہیں، ہاں ہم نے سنا، اگر چاہیں تو
ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں، یہ تو فقط اگلوں
کی کہانیاں ہیں، اور جب وہ کہتے ہیں کہ
اے خدا اگر یہ قرآن حق ہے تو ہم پر پتھروں
کی بارش کر، یا کوئی اور عذاب ہم پر لا،
اور خدا ان پر (ہجرت سے پہلے) کیونکر عذاب
کرتا، جب کہ تو ان میں تھا، اور خدا ان پر
عذاب کرنے والا نہیں ہے، درانحالیکہ وہ
مغفرت چاہتے ہوں، اور خدا ان پر عذاب

اَوْلِيَآءَهٗ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ○ (انفال - ۴)

کیوں نازل نہ کرے گا جب وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں، حالانکہ وہ اس کی تولیت کے مستحق نہیں، اس کے مستحق صرف پرہیزگار ہیں،

غزوۂ بدر معجزۂ ہلاک تھا

جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف معجزاتِ عذاب آئے، اسی طرح جس قوم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، اس کے لیے غزوۂ بدر معجزۂ عذاب تھا، ہجرت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے پہلے قریش پر قحط کا عذاب آیا، جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا، آسمان کی طرف دیکھتے تھے، تو دھواں سا نظر آتا تھا، بعض رؤسائے قریش نے خدمتِ نبوی میں آکر کہا کہ "محمد! تم رحمت و شفقت اور صلۂ رحم کی دعوت دیتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے"؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی، مگر پھر قریش کی سرگرانی کا وہی عالم ہوگیا، تو ان کے لیے معجزۂ عذاب کے سوا کوئی اور طریقۂ علاج باقی نہ رہا، چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۂ کبریٰ (بڑی پکڑ) ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی، قرآن مجید نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلان عام سنا دیا جس میں پہلے اس قحط کی، پھر ان کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد غزوۂ بدر کی پیشین گوئی تھی،

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ○ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ، رَبَّنَا اكْشِفْ

اس دن کی راہ دیکھ جب آسمان صاف دھواں کر لاوے جو لوگوں کو گھیر لے، اس وقت کہا جائیگا، یہ ہے دکھ کی مار تب گڑگڑائینگے

عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ○ اَنّٰى	کہ خداوندا ہم سے یہ عذاب دور کر دے،
لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ	ہم ایمان لاتے ہیں، کہاں ہو ان کیلیے سمجھنا.
رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ○ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ	حالانکہ ان کے پاس کھول کر سنانے والا رسول
وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ○ اِنَّا	آچکا، تو اس سے پیٹھ پھیری، اور کہا کہ سکھایا ہوا
كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا	دیوانہ ہے، اچھا ہم تھوڑے دنوں کے لیے
اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ○ يَوْمَ نَبْطِشُ	عذاب دور کر دیتے ہیں، تم پھر وہی کرنے والے ہو،
الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ	انتظار کرو اس دن کا جب ہم بڑی پکڑ پکڑینگے
وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ	ہم بدلہ لینے والے ہیں، اور ان سے پہلے ہم فرعون
(دخان-۱)	کی قوم کو آزما چکے ہیں،

ان آیاتِ کریمہ میں پورے واقعہ کی تصویر کھینچ دی گئی ہے، اور آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ بطش اکبر، ان رؤسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرقِ بحر کی حیثیت تھی، حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے بیان کیا ہے کہ "یہ آیتیں قریش کی شان میں نازل ہوئی ہیں، قریش نے جب نافرمانی کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے دعا کی کہ "اے خدا! ان پر حضرت یوسفؑ کے سات برس والے قحط کی طرح قحط نازل کر" چنانچہ مکہ میں سخت قحط پڑا، یہاں تک کہ بھوک سے آسمان اور قریش کی آنکھوں کے درمیان دھواں سا اڑتا نظر آتا تھا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر دعا کی درخواست کی، چنانچہ آپ نے دعا کی، اور بارش ہوئی،

خدا نے کہا کہ وہ پھر اپنی پہلی حالت پر آجائیں گے یعنی ایمان قبول نہ کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بطشۃ الکبریٰ (بڑی پکڑ) کا دن مقرر فرمایا یعنی بدر[1]،

یاد ہوگا کہ صحن حرم میں رؤسائے قریش جو نماز میں خلل انداز ہوئے تھے، آپ نے ان کا نام لیکر ہر ایک کے حق میں بد دعا کی تھی، اس سے پہلے کہ غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آئے، ہجرت کے بعد ہی آپ نے ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کر دیا تھا، بدر سے پہلے حضرت سعد انصاریؓ عمرہ کو گئے تھے، ابو جہل نے ان کو روکا، امیہ نے بیچ میں دخل دینا چاہا، حضرت سعدؓ نے کہا "امیہ تم دخل نہ دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ان کے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے" یہ سن کر امیہ ڈر گیا، چنانچہ جب بدر کا موقع پیش آیا تو اس نے جانے میں پس و پیش کیا، لوگوں کے طعن سے اس نے جانا چاہا تو اس کی بیوی نے دامن تھام لیا اور کہا "کیا تم کو اپنے یثربی دوست کی بات یاد نہیں[2]"

جب غزوۂ بدر کے لیے آپ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ پہلی جلد میں تفصیل گذر چکی ہے مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں، ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گذر کر مکہ کو جا رہا تھا، دوسرا رؤسائے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا، خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی، عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان [2] صحیح بخاری کتاب المغازی۔

نہیں، بلکہ اس بطشۃ الکبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہِ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا، رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پر پہنچے ہیں تو انھیں یہ فکر ہوئی کہ قریش کے تجارتی قافلہ کا پتہ لگایا جائے، چنانچہ مسلمان مخبر ادھر اُدھر گئے، اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے، اور اس سے قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگے، اس نے جواب دیا کہ "قریش کے قافلہ کا تو مجھے علم نہیں، البتہ ان کا لشکر ادھر پڑا ہے"۔ یہ سن کر مسلمانوں نے اس کو مارا کہ یہ ہم سے صحیح حال چھپاتا ہے، مار کھانے پر اس نے کہا "اچھا ٹھہرو قافلہ کا حال بتاتا ہوں"۔ جب لوگ اس کو چھوڑ دیتے تو وہ پھر یہی کہتا کہ "مجھ کو قافلہ کی خبر نہیں، البتہ یہ جانتا ہوں کہ ادھر قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے، اس سے فراغت ہوئی تو فرمایا "جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ کہتا ہے تو تم مارتے ہو"۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "یہ قریش کی تباہی کا دن ہے، یہ ابوجہل کا مقتل ہے، یہ عتبہ کا ہے، یہ اُبَی کا ہے، وغیرہ"۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا، ایک سرِ مو وہاں سے اس نے تجاوز نہیں کیا جنگ میں وہ وہیں مرا پڑا ملا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو صحنِ حرم کی بددعا کے دن موجود تھے، وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بددعا کی تھی، کل کے کل بدر کے میدان میں ڈھیر ہو گئے[1]۔ اور "بطشۃ الکبریٰ" کے انتقام کی پیشین گوئی پوری ہوئی،

---

[1] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔

سورۂ انفال جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کردیا ہے کہ یہی وہ فیصلہ کا دن تھا جس کا مدت سے انتظار تھا۔

وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ	اور خدا جو چاہتا ہے کہ حق کو اپنی باتوں سے
وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ	مستحکم کردے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے
وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ	تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کردے
الْمُجْرِمُونَ (انفال-۱)	اگرچہ گنہگار اس کو پسند نہ کریں،

وسط سورہ میں فرمایا،

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ	یہ ویسا ہی ہوا جیسا فرعون والوں کا اور
مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ	ان سے پہلے کا کہ انھوں نے اپنے پروردگار
فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ	کی نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے
(انفال-۷)	گناہوں کے سبب سے ان کو ہلاک کردیا۔

یہ فیصلہ کا دن تھا،

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ	اور جو ہم نے اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن اتارا
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ (انفال-۵)	جس دن دونوں لشکر آمنے سامنے بھڑے۔

اور یہ سب اس لیے ہوا کہ

لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا	تاکہ خدا اس کام کو پورا کردے جو پہلے
(انفال-۵)	مقرر کیا جاچکا تھا،

نکتہ: بدر کے میدان میں جب تین سو بے سروسامان مسلمان، ایک ہزار لوہے میں غرق فوج سے مقابل تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی قسم کی بد دعا مانگی، جیسی حضرت نوحؑ نے طوفان سے، اور حضرت موسیٰؑ نے غرق سے پہلے، اپنی اپنی قوم کے لیے مانگی تھی، حضرت نوحؑ نے کہا "خداوندا اب زمین پر کوئی کافر بسنے والا نہ چھوڑ کہ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی، اور نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا۔" حضرت موسیٰؑ نے کہا "خداوندا! ان کے دل سخت کر دے کہ جب تک عذاب نہ دیکھ لیں گے ایمان نہ لائیں گے۔" لیکن اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ "خداوندا! اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو پھر کوئی تیرا نام لینے والا نہ رہے گا۔"

حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ نے براہ راست اپنی اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اب بھی دعا مانگی تو صرف اہلِ توحید کی فتح و نصرت کی، دشمنوں کی تباہی و بربادی کی نہیں،

حاکم نے مستدرک (جلد ۳ صفحہ ۲۱) میں یہ روایت صحیح نقل کیا ہے کہ بدر کے قیدی جب گرفتار ہو کر آئے، اور آپ نے ان کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا، اور مختلف صاحبوں نے مختلف رائیں پیش کیں، تو آپؐ نے فرمایا "یہ کفار قریش اپنے ان ہی بھائیوں کی طرح ہیں، جو ان سے پہلے تھے (یعنی گذشتہ انبیاء کی امتوں میں) نوحؑ نے دعا کی کہ "خداوندا! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی آباد گھر والا باقی نہ رکھ۔" موسیٰؑ

نے کہا "ہمارے پروردگار! ان کی دولت کو میٹ دے، اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔" ابراہیمؑ نے فرمایا "جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی، تو خدا غفور و رحیم ہے۔" عیسیٰؑ نے کہا "(الٰہی!) اگر تو ان (نافرمانوں) پر عذاب بھیجے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو غالب اور دانا ہے۔" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم لوگ وہ قوم ہو جس میں فریب اور دغا سے قتل کر دینے کا رواج ہے، تو تم میں سے کوئی زرِ فدیہ یا اپنا سر دیے بغیر لوٹ کر نہ جا سکے گا۔"

اس روایت سے ہمارے اصولِ مذکورہ کی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے یعنی یہ کہ

(۱) بدر قریش کے لیے ویسا ہی عذابِ ہلاکت کا دن تھا جیسا گذشتہ قوموں پر ہلاکت کے دن آیا کیے ہیں،

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر دو قسم کے انبیاء کے نام اور ان کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے، ایک وہ جنھوں نے سخت گیری کا پہلو اختیار کیا مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ نے، دوسرے وہ جنھوں نے نرمی کا اظہار کیا مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں سے بیچ کی راہ اختیار کی،

سحر اور معجزہ کا فرق اور ساحر اور پیغمبر میں امتیاز

گذشتہ صفحات میں انبیاء کے جو خصائص و امتیازات اور علامات و آثار بتائے گئے ہیں، ان سے خود سحر و معجزہ کا فرق

اور ساحر و پیغمبر کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے، سحر و شعبدہ صرف دل لگی کے آنی تماشے ہوتے ہیں لیکن معجزات و آیات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد، تعمیر اور تخریب، ترقی اور تنزل کے اسباب و سامان ہوتے ہیں، ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے، تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے، لیکن پیغمبر کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دنیا کی اصلاح، قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، پیغمبر، بشیر، نذیر، مزکی، ہادی، سراج منیر اور شاہد عالم ہوتا ہے، ساحر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشاگری کے سوا کوئی اور ممتاز بات اس کے اندر نہیں ہوتی،

قرآن مجید میں سحر کے متعلق جس قدر بیانات ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا، اور تخییل اور نظر بندی سے زیادہ اس کو وقعت نہیں دیتا، ہاروت و ماروت کے قصہ میں سحر کے زور و قوت کا منتہا یہ بیان کیا ہے:

مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ	سحر کا وہ فن سیکھتے ہیں جس سے خاوند اور
وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ	اس کی بیوی میں تفریق کر دیتے ہیں اور کسی کو
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ	حکم الٰہی کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور
مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ	یہ وہ چیز سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی
(بقرہ - ۱۲)	ہے اور نفع نہیں پہنچاتی۔

غرض سحر و جادو کوئی مؤثر حقیقی شے نہیں، سورہ طٰہٰ میں نہایت تصریح کے ساتھ

یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خیال سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں،

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ	پھر ناگاہ مصر کے جادوگروں کی رسیاں اور
اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى	لاٹھیاں ان کے جادو کے اثر سے موسیٰ کے
(طٰہٰ - ۳)	خیال میں معلوم ہونے لگیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں

حکم ہوا کہ موسیٰ تم بھی اپنا عصائے اعجاز ڈال دو، نتیجہ یہ ہوا کہ حق نے باطل پر فتح پائی۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى	ہم نے کہا موسیٰ! ڈرو نہیں، تم ہی سربلند
وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ	رہو گے، تمہارے داہنے ہاتھ میں جو ہے
مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ	تم اس کو ڈال دو، وہ انکی صنعت کاری
سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ	کو نگل جائے گا۔ بیشک جادوگروں نے
اَتٰى ۔	جو صنعت کی تھی، وہ جادوگر کا فریب تھا
(طٰہٰ - ۳)	اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہیں پا سکتا۔

ساحر اور نبی میں اللہ تعالیٰ نے جو فرق و امتیاز بتایا، وہ یہی ہے کہ نبی **فلاح** پاتا ہے، اور جادوگر **فلاح** نہیں پاتا، نبی کے تمام اعمال مساعی، جد و جہد اور معجزات کا مرکز و محور فلاح اور خیر ہوتا ہے، اور جادوگر کا مقصد صرف فریب، دھوکا اور شر ہوتا ہے، دوسری جگہ ایک اور آیت میں اسی مفہوم کو دہرایا گیا ہے، حضرت موسیٰؑ مصر کے جادوگروں سے کہتے ہیں،

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	جو تم لائے ہو وہ جادو ہے، اللہ اس کو

سَیُبْطِلُہٗ. اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ (یونس۔۸) — باطل کر دے گا، بیشک اللہ شریروں کے کام کو نہیں سنوارتا.

یعنی سحر و جادو ایک آنی تماشا ہوتا ہے، اور اعجاز کا اثر دائمی ہوتا ہے، اور اس کے نتائج دنیا میں نہایت عظیم الشان ہوتے ہیں، فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے اعجاز کو دیکھ کر کہا کہ یہ سب جادو کے کرشمے ہیں، حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا

اَسِحْرٌ ھٰذَا ؕ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ (یونس۔۸) — کیا یہ جادو ہے، اور جادو کرنے والے تو فلاح نہیں پاتے۔

غرض "فلاح" اور "عدم فلاح" سحر اور اعجاز کے درمیان سب سے بڑا فرق ہے،

کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہتے تھے کہ یہ شیطان کی قوت سے یہ کلام پیش کرتے ہیں اور ان کے کلام کا سرچشمہ شیطان کی تعلیم ہے، خدا نے اسکے جواب میں کہا کہ اس حقیقت کا امتیاز کہ اس کا منبع اور سرچشمہ خیر ہے یا شر، اور یہ شیطان کی قوت کا نتیجہ ہے، یا ملکوتی طاقت اس کا مظہر ہے، نہایت آسان ہے؛ اور خود مدعی کی زندگی اور اس کے اخلاق و اعمال اس کے شاہد عدل ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے قول کے مطابق کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ان دونوں قوتوں کے درمیان تفریق کچھ زیادہ مشکل نہیں، خدا نے کہا "ہم بتائیں شیطان کس پر اترتے ہیں؟

عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ ۙ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُھُمْ کٰذِبُوْنَ ؕ — شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر، لا ڈالتے ہیں وہ سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں

یعنی نبی اور متنبی کا فرق خود اس کی اخلاقی زندگی ہے، علاوہ ازیں افترا پرداز اور شریر کے کام کو مستقل اور دائمی زندگی عطا نہیں ہوتی،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ	جو لوگ کہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح
لَا یُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وَّ لَھُمْ	نہیں پاتے، چند روزہ کامیابی، اور ان
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (نحل-۱۵)	کے لیے دردناک عذاب ہے،

معجزات اور نشانات سے کن لوگوں کو ہدایت ملتی ہے

معجزات، دلائل، آیات اور آثار سے ہدایت کن لوگوں کو عطا ہوتی ہے؟ قرآن مجید نے ان کے اوصاف و شرائط بیان کیے ہیں،

(۱) سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کو خدا پر ایمان ہو، اگر اس کو سرے سے خدا پر ایمان نہیں تو اس کو معجزہ سے ہدایت نہیں مل سکتی، اس کے لیے اسکی ضرورت ہے کہ پہلے کائنات کے اسرار و عجائب کو دیکھ کر ایک قادر مطلق ہستی کے وجود پر یقین کرے، اس کے بعد معجزات اور نشانیوں کے ذریعہ سے اس کو نبوت کے باب میں ہدایت نصیب ہوگی،

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ	کہہ اے پیغمبر! کہ غور سے دیکھو کیا کچھ ہے
الْاَرْضِ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ	آسمانوں میں اور زمین میں، اور کچھ کام نہیں
وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا	آتیں نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کے
یُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس-۱۰)	جو ایمان نہیں رکھتے،

(۲) دوسری چیز جو آیات اور نشانیوں سے عبرت پذیر نہیں ہونے دیتی وہ خودی اور تکبر ہے، معاندین چونکہ عموماً دولتمند رؤسا، اور مدعیانِ عقل و خرد ہوتے ہیں،

اس لیے ان کا جذبۂ انانیت اور ترفع ان کو اعیانِ حق کے علم کے نیچے کھڑے ہونے سے باز رکھتا ہے۔ اس بنا پر آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس جذبہ سے پاک ہوں، معاندین نے ہمیشہ انبیاءؑ کو کہا "اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ" یہ پیغمبر تو ہماری طرح ایک آدمی ہے، کیا ہم اس کی پس روی قبول کرلیں۔" مصر کے بادشاہ اور سرداروں نے اسی جذبہ کی بنا پر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا، اور ان کو گوناگوں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ہدایت نہیں ملی،

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ	پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون
هٰرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ	کو نشانیاں اور کھلی قوت دے کر فرعون
اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا	اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا تو
وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ فَقَالُوْا	انھوں نے غرور کیا اور وہ مغرور لوگ تھے،
اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ	تو انھوں نے کہا کیا ہم اپنی ہی طرح کے
قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ	آدمیوں پر ایمان لائیں، درانحالیکہ
(مومنون - ۳)	ان کی قوم ہماری رعایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے منکروں اور خود پسندوں کی نسبت اپنا یہ فیصلہ سنا دیا

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ	ہم ان لوگوں کو اپنی نشانیوں کے سمجھنے سے
يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ	پھیر دیں گے، جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں،

وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا — اور اگر وہ تمام نشانیوں کو دیکھ بھی چکیں تب بھی

(اعراف - ۱۷) ایمان نہ لائیں گے۔

قریش کے معاندین جو اپنی قوم کے رؤسا، اکابر اور اہل دولت تھے، وہ بھی ان نشانیوں سے اسی لیے ہدایت نہ پا سکے کہ ان کو ایک غریب و مفلس اور بے یار و مددگار انسان کی پیروی گوارا نہ تھی، وہ کہتے تھے کہ اگر نبوت ہوتی بھی تو مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی کو ملتی،

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ — اور انھوں نے کہا کہ یہ قرآن طائف اور مکہ کے

عَلَىٰ رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (زخرف) — کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا،

سب سے آخری چیز جو ان آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کی صلاحیت اور استعداد پیدا کرتی ہے، وہ دل کا قبول حق کی طرف میلان ہے، بڑے سے بڑے خوارق اور عجیب سے عجیب معجزات ان لوگوں کے نزدیک سحر و جادو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جن کے دل انابت اور رجوع الی الحق کی استعداد سے خالی ہیں،

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا — اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی

أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ — نشانی کیوں نہیں اتری، کہدے کہ خدا جس کو

قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ — چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور اسی کو اپنی طرف راہ

وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ (رعد) — دکھاتا ہے جو خدا کی طرف اپنے کو رجوع کرتا ہے

اگر قبولیت اور اصلاح کی یہ استعداد نہ ہو تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی باطل پرستی سے زیادہ نہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر گمراہی اور شقاوت کی مہر لگی ہوئی ہے،

مشرک جو کسی مذہب حق نہیں مانتے اور علم سے بے بہرہ ہیں، ان کا یہی حال ہے،

وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولَنَّ	اور (اے پیغمبر) اگر تو ان کے پاس کوئی نشانی
الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا	لائے تو وہ جو منکر ہیں، کہیں گے کہ تم فریبی ہو
مُبْطِلُونَ ۝ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ	اسی طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہر
عَلَىٰ قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (روم)	کر دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے طلب ثبوت میں تکتے ہیں کہ اس وقت تک ہم ان کو پیغمبر حق تسلیم نہ کریں گے، جب تک اسی قسم کے معجزے وہ نہ دکھائیں جیسے ان پیغمبروں نے لوگوں کو دکھائے تھے قرآن کہتا ہے کہ فرض کرو کہ صرف ان ہی جیسے معجزوں سے پیغمبری کی سچائی تسلیم کی جا سکتی ہے، تو ان پیغمبروں نے تو وہی معجزے دکھائے تھے، پھر ان کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے کل منکرین کیوں ایمان نہ لے آئے۔ اور آخر تک وہ ان کو جادوگر ہی کیوں سمجھتے رہے،

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا	تو جب ہماری طرف سے سچائی ان کے پاس آئی
قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ	تو انھوں نے کہا کیوں نہیں (محمد کو) ویسی ہی چیز
مُوسَىٰ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ	دی گئی جیسی موسیٰ کو دی گئی تھی، کیا موسیٰ کو جو چیز دی گئی تھی
مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ قَالُوا سِحْرَانِ	اس کا انکار منکرین پہلے نہیں کر چکے، انھوں نے
تَظَاهَرَا وَقَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ	کہا کہ یہ جادوگر ہیں، جو باہم ایک دوسرے کے مددگار
(قصص - ۵)	ہیں، ہم ان سب کے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

صداقت کی نشانی صرف ہدایت ہے

قرآن مجید نے اس کے بعد ہی کہا کہ صداقت کی نشانی صرف ہدایت اور رہنمائی ہے، کہ مدعی جو پیغام اور جو احکام پیش کرتا ہے وہ انسانوں کو فلاح، نجات اور رشد کی طرف لیجاتے ہیں، اور جو ان سے انکار کرتے ہیں، وہ ظالم اور خود سر ہیں، ان کو ہدایت کی سعادت نہیں ملتی،

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

(قصص - ۵)

کہدے (اے پیغمبر!) کہ اگر تورات اور قرآن دونوں کتابیں جھوٹی ہیں اور تم سچے ہو تو ہدایت میں ان سے بڑھ کوئی کتاب الہٰی لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں، تو اگر وہ تمہارے اعلان کے مطابق نہ کر دکھائیں تو جان لے کہ صرف اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرتے ہیں، اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو ہدایت الہٰی کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرتا ہے، اللہ خودسر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

آیات و دلائلِ نبوی
کی
تفصیل

"معجزہ" کے ہر پہلو پر کلی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد اب موقع آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مافوق فہم بشری سوانح و واقعات کی تفصیل کی جائے، یہ سوانح و واقعات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو حقیقت میں لوازم نبوت ہیں، اور کم و بیش ہر پیغمبر کو وہ ایک ہی طرح پیش آئے ہیں، ہم نے ان کا نام **خصائص النبوۃ** رکھا ہے، دوسری قسم میں وہ جزئی واقعات داخل ہیں، جو ہر پیغمبر سے اس کے حالاتِ زمانہ کے مطابق مختلف صورتوں میں صادر ہوئے ہیں، اور جن کو اصطلاح عام میں **معجزات** کہتے ہیں۔

ہم نے ان معجزات کو ان کے استناد اور ماخذ کی حیثیت سے تین مختلف ابواب میں منقسم کر دیا ہے، پہلے میں وہ معجزانہ واقعات ہیں جو بنص صریح یا اشارۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں، دوسرا باب ان معجزات کا قرار دیا ہے، جو صحیح اور مستند روایات سے ثابت ہیں اور تیسرے باب میں ان معجزات پر بحث کی ہے جن کو گو بعض محدثین اور اربابِ سیر نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، مگر محدثانہ اصول کی بنا پر وہ تمامتر کمزور اور غیر مستند ہیں، اسکے

بعد کتب سابقہ کی وہ پیشین گوئیاں درج ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں، اور سب سے آخر میں خصائصِ محمدیؐ کا باب ہے، اس تفصیل کے مطابق آیندہ اوراق کی ترتیب حسبِ ذیل صورت ہوگی.

۱۔ خصائص النبوۃ،

۲۔ وہ آیات و دلائل جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے،

۳۔ صحیح اور مستند روایتوں سے جو آیات و دلائل ثابت ہیں،

۴۔ غیر مستند روایتیں اور ان پر تنقید،

۵۔ کتب سابقہ کی بشارتیں،

۶۔ خصائص محمدیؐ،

خصائص النبوۃ

دنیا میں ہر جنس اور ہر نوع کی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، جن سے وہ اپنے غیر سے ممتاز ہوتی ہے، وہ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے اُس جنس اور نوع کی کوئی فرد خالی نہیں ہوتی، اسی طرح نبوت کی بھی کچھ نہ کچھ خصوصیتیں ہیں، جو اس کے لیے بمنزلۂ لوازم حقیقت کے ہیں، چنانچہ دنیا میں جس قدر پیغمبر کسی نہ کسی قوم، اور کسی نہ کسی زمانہ میں آئے ہیں، وہ اُن خصوصیات سے ہمیشہ ممتاز ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ خدا نے کسی نہ کسی طرح ان کو اپنے کلام و ارشاد سے معزز اور اپنے احکام سے مطلع فرمایا ہے، ان کے ادراک و احساس کی قوتوں کو اس قدر بلند کیا کہ عام انسانوں کو جو چیزیں نظر نہیں آتیں ان کو نظر آئی ہیں، عامۂ بشر جن آوازوں کو نہیں سن سکتے، وہ ان کو سنائی دی ہیں، ملائکۂ الٰہی خدا کے قاصد بن ان کے پاس آئے ہیں، صداقت کے لحاظ سے ان کے خواب اور بیداری کا ایک ہی عالم رہا ہے، کیونکہ گو ان کی آنکھیں سوتی ہیں[۱] لیکن ان کے دل نہیں سوتے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے کوئی نہ کوئی نشانی بھی عطا فرمائی ہے،[۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ افضل الرسل اور خاتم النبیین تھے، اس لیے ان خصوصیات

---

[۱] صحیح بخاری کتاب المناقب باب صفۃ صلی اللہ علیہ وسلم وکتاب توحید باب وکلم اللہ موسیٰ تکلیما

[۲] صحیح بخاری باب الاعتصام

میں سے ہر خصوصیت کا وافر حصہ آپ کو عنایت ہوا تھا، اسی لیے مکالمۂ الٰہی، نزولِ ملائکہ، مشاہدۂ خواب و بیداری وغیرہ خصائص نبوت کے واقعات آپ کی سیرت میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے بیشتر اور کامل تر نظر آتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں ان کے اشارات اور احادیثِ صحیحہ میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں، مختلف انبیاءؑ میں ان خصائص کا کم و بیش ہونا بھی قرآن مجید کا فیصلہ ہے،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	ان پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر ہم نے
عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ	فضیلت بخشی ہے، ان میں سے بعض سے
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ	خدا نے باتیں کیں، بعضوں کے رتبے بلند کیے،
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو ہم نے کھلی نشانیاں
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ	دیں، اور روح القدس کے ذریعے سے
الْقُدُسِ (بقرہ - ۳۳)	اس کی تائید کی،

دیکھیے کہ مکالمۂ الٰہی، رفعِ درجات، عطائے نشان، تائید بروح القدس، یہ چاروں باتیں ایسی ہیں جن سے خدا کا کوئی فرستادہ محروم نہ تھا، تاہم چونکہ ان میں سے ہر چیز تمام پیغمبروں میں یکساں نہ تھی، بلکہ بعض کو ان میں سے کسی چیز کا حصۂ وافر دیا گیا تھا، اور بعض کو کوئی دوسری چیز زیادہ ملی تھی، اس لیے ہر پیغمبر کی طرف اس خاص چیز کی نسبت مخصوص طور سے کی گئی ہے، جس کا ان کی قسمت میں بڑا حصہ آیا تھا، اس سے یہ مقصود نہیں کہ نبوت کے ان خصائص سے کوئی پیغمبر محروم بھی تھا،

ان خصائص میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ زور، وحی اور نزولِ ملائکہ پر دیا ہے، ہر جگہ رسول اور نبی کی گویا تعریف ہی یہی کی ہے کہ ایک ایسا انسان جس کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لیے منتخب کیا ہو، اور اس پر اپنی وحی نازل کی ہو، چنانچہ سورۂ نحل اور سورۂ انبیاء میں تمام پیغمبروں کا مشترک وصف یہ بتایا ہے،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (یوسف - ۱۲)	اور ہم نے اپنا قاصد بنا کر تم سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا، لیکن وہ وہ انسان تھے جن کی طرف ہم نے اپنی وحی بھیجی،

نزولِ ملائکہ کی نسبت بھی خدا نے یہ فرمایا کہ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، فرشتوں کو اس لیے اتارتا ہے تاکہ وہ اس کی بات کو ان تک پہنچا دیں،

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (نحل - ۱)	خدا اپنی بات کی روح دیکر اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے، فرشتوں کو نازل کرتا ہے،

ان کے علاوہ رویت و مشاہدۂ غیب اور سیر ملکوت کے احوال و مشاہد کا بھی اکثر انبیاء علیہم السلام کے سوانحِ زندگی میں ان کے درجوں اور رتبوں کے مطابق پیش آنا، اسفار و کتبِ الٰہی سے ثابت ہے، جیسا کہ آیندہ اوراق کے مطالعہ سے ناظرین پر روشن ہوگا،

مکالمۂ الٰہی

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (شوریٰ)

پیغمبروں کی خصوصیات میں سے سب سے بڑی خصوصیت مکالمۂ الٰہی ہے، قرآن مجید میں بار بار پیغمبروں کے ساتھ مخاطبۂ ربانی اور مکالمۂ الٰہی کی تصریح ہے، اور مجموعۂ توراۃ میں ہر پیغمبر کے متعلق اس کی شہادتیں موجود ہیں،

خدا انبیاءؑ سے کلام کیونکر کرتا ہے؟ قرآن مجید کی ایک آیت میں اس کی حسب ذیل تصریح ہے،

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے دو بدو
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	کلام کرے لیکن وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	آڑ سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے اور اس کے
مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (شوریٰ)	حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، پہنچا دیتا ہے....

اس آیت میں مکالمۂ الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں، کلام بالوحی، کلام پس پردہ اور کلام بذریعہ قاصد و فرشتہ، ان ہر سہ اقسام میں سے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی طریقۂ کلام سے مشرف کیا گیا ہے، بعض پیغمبروں کو خصوصیت کے ساتھ کلام پس پردہ کے شرف سے ممتاز کیا گیا ہے، اسی لیے ان کے فضائل میں تکلم الٰہی کی فضیلت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے،

مثلاً حضرت موسیٰؑ کہ ان کی شان میں

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء) اور خدا نے موسیٰ سے باتیں کیں،

کی تصریح ہے، ان کو وادی سینا کے ایک درخت سے خدا کی آواز سنائی دی، سورۂ بقرہ میں اس خاص طریقۂ کلام کے دائرہ کو اور بھی وسعت دی گئی ہے، چنانچہ پیغمبروں کے وصف میں خدا نے فرمایا،

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (بقرہ) ان پیغمبروں میں سے بعض سے خدا نے باتیں کیں،

اس آیت کریمہ میں یہ تصریح نہیں کہ کن پیغمبروں کو خدا تعالیٰ نے اس مخصوص طریقۂ کلام سے مشرف کیا، اس لیے اس شرف خاص میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ دوسرے انبیاء بھی شریک ہو سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکالمۂ الٰہی کے تینوں مذکورۂ بالا طریقوں سے خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے، بلکہ واقعۂ معراج میں وہ مرتبہ بھی پیش آیا ہے، جہاں حبیب و محبوب کے درمیان قاصد و پیامبر سرے سے بیگانہ تھے، جہاں زمان و مکان اور جلوہ و نگاہ کی شرکت بھی مخل تنہائی تھی، جہاں نہ کوہ سینا تھا، نہ برق طور، نہ دشت ایمن تھا، نہ نخل وادی، صوتِ سرمدی سامعہ نواز تھی، اور حقیقت محمدی گوشِ ساماع فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (نجم) پھر اس نے اپنے بندہ سے چپ چاپ باتیں کیں، جو باتیں کیں،

وحی

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى ۝ (نجم)

گو مکالمۂ الٰہی کی متعدد صورتیں ہیں، جن میں سے ایک **وحی** بھی ہے، لیکن اسلام کے محاورہ میں **وحی** کا مفہوم اس قدر وسیع کردیا گیا ہے کہ مکالمۂ الٰہی کی تمام صورتیں اسکے تحت میں داخل ہوگئی ہیں، وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں:

الوحی، الاشارۃ والکتابۃ	وحی کے معنی، اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا،
والرسالۃ والالہام والکلام (لسان العرب)	دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم دوسرے
الخفی وکل ما القیتہ الی غیرہ	کے خیال میں ڈالو،

لکھنا، عجاج کا شعر ہے

حتی نحاھم جدنا والناحی

لقدر کان وحاہ الواحی

خط اور کتاب، لبید کہتے ہیں،

فمدافع الریان عری رسمہا ۔۔۔ خلقا کما ضمن الوحی سلامہا

توریان پہاڑ کے نالوں کے آثار پرانے ہوکر ایسے دھندلے ہوگئے جیسے پتھر میں لکھی ہوئی عبارت،

حکم دینا، عجاج کہتا ہے،

وحی لہا القرار فاستقرت وشدھا بالراسیات الثبت

زمین کو ٹھہرنے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئی اور اسے جمے ہوئے پہاڑوں سے جکڑ دیا

چھپا کر بات کرنا، ابو ذویب کا شعر ہے،

فقال لہا وقد اوحت الیہ الا لِلّٰہ اُمّکِ ما تعیف

اس مرد نے کہا جب عورت نے اس سے پوشیدہ طریقہ پر گفتگو کی کہ تیری ماں کا کیا کہنا وہ کیا فال بد لیتی ہے

اشارہ کرنا، یوحی الیہا بانقاض ونقنقۃٍ

وہ مرغ اس مرغی کی طرف کڑ کڑا کے اشارہ کرتا ہے

آواز، ابو زبید مرتجز الجوف بوحیٍ اعجم

گھوڑے کے پیٹ سے نہ سمجھنے والی آواز آتی ہے

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی "دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں" کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے کہ وحیت الیہ بالکلام واوحیہ الیہ ھو ان تکلمہ بکلام تخفیہ من غیرہ "یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ" ابو اسحاق لغوی کہتا ہے واصل الوحی فی اللغۃ کلہا اعلام فی خفاء، وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں "چھپا کر اطلاع دینے" کے ہیں،

قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے،

۱۔ فطری حکم،

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ (نحل)	تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو "وحی" کیا
بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا (زلزال)	(سیلے کہ تیرے پروردگار نے "زمین" کو وحی کیا،

عجاج کے اس شعر میں بھی یہی معنی ہیں،

وحی لہا القرار فاستقرت   وشدها بالراسیات الثبت

خدا نے زمین کو ساکن رہنے کی "وحی" کی تو وہ ساکن ہو اور اس کو مضبوط پہاڑوں سے باندھ دیا ہے،

۲- دل میں بات ڈال دینا،

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ	اور جب میں نے حواریوں کو "وحی" کیا کہ مجھ پر اور
اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (مائدہ)	میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ،
وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو "وحی کیا" کہ اس
اَرْضِعِیْهِ (قصص ۳)	بچہ کو دودھ پلاؤ،

۳- چپکے بات کرنا،

یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ	یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی بات "وحی
زُخْرُفَ الْقَوْلِ (انعام)	کرتے ہیں"
وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ	اور یہ شیطان لوگ اپنے دوستوں کو
اِلٰی اَوْلِیٰئِهِمْ (انعام)	"وحی کرتے ہیں"

وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے، اور وہ یہ ہے کہ "منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا" یا اگر الفاظ ہوں

تو وہ اس قدر پوشیدہ ادا ہوں کہ دوسرے ان کو نہ سن سکیں، اس لیے اشارہ کرنا، لکھنا، دل میں ڈال دینا، علم فطری، خط اور کتابت اور جانوروں کا اپنے حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کرنا، سب اس کے معنوں میں داخل ہیں، بہرحال اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کا لفظ جس مذہبی معنی میں مستعمل ہے، وہ درحقیقت لغوی معنی کے بہت قریب ہے، چنانچہ خود شعراے جاہلیت نے اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمۂ الٰہی اور وحی کا آغاز رویا اور خواب سے ہوا صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے،

اول مابدئ بہ رسول اللہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وحی کا آغاز
صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا	اچھے خواب سے ہوا، آپ جو خواب دیکھتے وہ
الصالحۃ فی النوم فکان لایریٰ	صبح کی روشنی کی طرح ظاہر
رؤیا الاجاءت مثل فلق الصبح	ہوتا تھا،

صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں حدیث ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کیونکر آتی ہے؟ آپ نے فرمایا،

احیانا یاتینی مثل صلصلۃ	کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح میرے پاس آتی
الجرس وھو اشدہ علی	ہے، اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے،
فیفصم عنی وقد وعیت عنہ	اور پھر یہ حالت دور ہو جاتی ہے، اور جو کچھ وہ
ما قال، واحیانا یتمثل لی الملک	کہتا ہے میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں،

صحیح بخاری باب بدء الوحی و کتاب التعبیر

رجلاً فیکلمنی فاعی — اور کبھی وہ فرشتہ (جبریل) میرے لیے انسان کی

مایقول — شکل میں نمودار ہوتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے

اور جو وہ کہتا ہے اس کو میں محفوظ کرلیتا ہوں

صلصلة الجرس، یعنی "گھنٹہ کی آواز کی طرح آواز کا آنا" اس کی تشریح متکلمین اور ارباب باطن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے لیکن ہم اس کا صاف اور صریح مطلب وہ سمجھتے ہیں جو عوام ہاتف غیب یا منادی غیب کے لفظ سے سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ آواز سنائی دے لیکن کوئی صورت نظر نہ آئے، بانگ جرس کے ساتھ اس کی تشبیہ محض اس بات میں ہے کہ جس طرح دور سے جرس کی آواز سنائی دیتی ہے، اور اس کے متعینہ اشاروں سے انسان کچھ سمجھ جاتا ہے، حالانکہ جرس یا اس کے بجانے والے کی شکل آنکھوں سے اوجھل یا بہت دور ہوتی ہے، اسی طرح پیغمبر کبھی دور سے منادی غیب کی آواز سنتا ہے لیکن کوئی مجسم شکل اس کے سامنے نہیں ہوتی، اسی کے بالمقابل آپ نے وحی کی دوسری صورت یہ بیان فرمائی کہ بولنے والا فرشتہ مجسم ہوکر سامنے آتا ہے، اور وہ باتیں کرتا ہے،

حدیثوں میں طریقۂ وحی کی اور صورت بھی آئی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا

ان روح القدس نفث فی روعی — روح القدس نے میرے دل میں پھونکا،

اور کہیں یہ صیغۂ مجہول کے ساتھ آیا ہے،

نفث فی روعی — میرے دل میں پھونکا گیا،

حافظ ابن قیم نے ان ہی حدیثوں کو پیش نظر رکھکر وحی کی حسب ذیل قسمیں قرار دی ہیں،

۱۔ رویائے صادقہ، سچ خواب دیکھنا،

۲۔ نفث فی الروع یا القاء فی القلب، دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا،

۳۔ صلصلۃ الجرس گھنٹہ کی طرح آواز آنا،

۴۔ تمثل فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا،

۵۔ فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا،

۶۔ وہ طریق مکالمہ جو معراج میں پیش آیا،

۷۔ بلا واسطہ مکالمہ،

صحیح بخاری، بدء الوحی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تیسری صورت مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، اور پھر وہ شدت جاتی رہتی ہے، آپ پر وحی آتی تھی تو آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "وحی اترنے کی حالت میں میں نے آپ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبین مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی"[1] ایک اور موقع پر حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ "وحی کی حالت میں آپ پر شدت کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ہوئی، اور وحی کے بوجھ سے جاڑوں میں آپ کی پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے[2] ڈھلکنے لگے" صحابہؓ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا، سواری کے

---

[1] بخاری، بدء الوحی [2] بخاری واقعۂ افک،

اونٹ بیٹھ بیٹھ جاتے تھے[1]، حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ پر وحی آئی اور میرا پانوں زانوے مبارک کے نیچے دبا تھا، مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پانوں بوجھ سے ٹوٹ جائے گا[2]، یعلیٰ بنؓ امیہ ایک صحابی تھے، ان کو بڑا شوق تھا کہ ایک دفعہ نزولِ وحی کے عالم میں وہ آپ کی زیارت کرتے، اتفاق سے حج کے سفر میں ان کو یہ سعادت نصیب ہوگئی، وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا ہے، اور آپ خرانٹے رہے ہیں، تھوڑی دیر میں یہ حالت دفع ہوگئی[3]،

عبادہ بنؓ صامت کہتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو بےچینی ہوتی، چہرہ کا رنگ بدل جاتا، آپؐ سر جھکا لیتے، صحابہ جو آپ کے ساتھ بیٹھے ہوتے وہ بھی سر نیچے کر لیتے، وحی کے بعد آپؐ سر اٹھاتے[4]،

فرشتہ کی زبانی سب سے پہلی وحی غارِ حرا میں آئی، اس وقت عمر شریف چالیس برس کی تھی، اور اقرأ باسم ربك الذی خلق ۝ کی ابتدائی آیتیں اس مکتب کا اولین درس تھا اس کے بعد کچھ دنوں تک وحی کا سلسلہ رکا رہا، آپ کو سخت صدمہ ہوا، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں،

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝	قسم ہے دن کی جبکہ وہ پوری روشنی پر ہو، اور قسم ہے
مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝	رات کی جبکہ وہ سنسان ہو جائے کہ تیرے پروردگار نے
(والضحیٰ)	نہ تجھکو چھوڑا ہے، اور نہ تجھ سے اس نے اپنی محبت اٹھائی،

[1] مسند ابن حنبل بسند عائشہؓ و مستدرک حاکم تفسیر سورہ مزمل [2] صحیح بخاری و جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء،
[3] صحیح بخاری کتاب الحج و باب کیف نزل الوحی [4] صحیح مسلم باب عرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لیکن صحیح بخاری تفسیر سورۂ والضحیٰ اور باب کیف نزول الوحی میں ہے کہ اس سورہ کا شان نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ بیمار تھے، چند روز راتوں کو اٹھ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف نہ ہو سکے تو ایک ہمسایہ عورت نے طعن سے کہا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا، کیونکہ وہ دو تین روز سے تیرے پاس نہیں آیا ہے" اس پر یہ سورہ نازل ہوا، اسی موقع پر دوسری روایت ہے کہ اس عورت نے کہا میں دیکھتی ہوں کہ "تمھارے رفیق نے تم سے ملنے میں تاخیر کی ہے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس کے بعد کسی اور زمانہ میں نازل ہوا ہے،

تمام محدثین[1] کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی یعنی سلسلۂ وحی کے رک جانے (فترہ) کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں، آپ حرا سے واپس آرہے تھے کہ راہ میں ایک آواز سنائی دی، آپ نے ادھر دیکھا، ادھر دیکھا، کچھ نظر نہ آیا، اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ نظر آیا، آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تو کہا مجھے کمل اوڑھاؤ، اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو، اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں،

يَآاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ	اے گلیم پوش! اٹھ اور لوگوں کو خدا سے
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (سورۂ مدثر)	ڈرا، اپنے رب کی کبریائی بیان کر،

---

[1] اس کے برخلاف صرف حضرت جابرؓ کی حدیث ہے (بخاری باب بدء الوحی و باب کیف نزول الوحی) کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ سب سے پہلی وحی میں سورۂ مدثر کی یہ آیتیں نازل ہوئیں، مگر اجماع عام یہ ہے کہ یہ حضرت جابرؓ کا وہم ہے، وہ آیتیں فترۂ وحی کے بعد سب سے پہلے اتریں،

اس کے بعد مسلسل وحی نازل ہونی شروع ہوگئی[1]۔ اور اس کا تار اُس وقت تک نہ ٹوٹا جب تک حیاتِ طیبہ کا ظاہری سلسلہ منقطع نہ ہوگیا یعنی چالیس برس کے سن سے لے کر تریسٹھ سال کے سن تک کل ۲۳ برس نزولِ وحی کے ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آخر عمر میں وحی کی کثرت ہوگئی تھی[2]، محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تھی، اطرافِ ملک سے وفود کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے، اس لیے مخاطبۂ الٰہی کی ترقی بھی اس کے ساتھ ضروری تھی،

صحابۂ کرامؓ وفاتِ نبویؐ کے بعد جب ان ایام سعادت کو یاد کرتے تھے، جب مدینہ کی گلیاں روح الامین کی گذرگاہ اور مدینہ کے در و دیوار وحی کے مطلعِ انوار تھے، تو ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ایک بوڑھی صحابیہ تھیں، انکی ملاقات کو تشریف لیجاتے تھے، آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ ان کے گھر تشریف لے گئے، دیکھا کہ انکی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، سبب دریافت کیا تو کہا آہ! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے، اور وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، یہ سن کر ان صاحبوں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے[3]۔

قرآن مجید نے **وحی** کی حقیقت کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ نبوت کی مرادف ہوگئی ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب میں نبوت کی حقیقت یا تو سراسر مفقود ہے، اور یا یہ

---

[1] صحیح بخاری باب بدء وحی تفسیر سورہ مدثر [2] صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی [3] صحیح مسلم فضائل حضرت ام ایمنؓ

اس کو انسانیت و بشریت کے پرتو سے اس قدر منزہ سمجھا ہے کہ اس کو الوہیت کا ہم تہہ قرار دیدیا ہے لیکن قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ اس اعلان کی تاکید کی ہے کہ

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ	کہدو کہ میں تمھاری ہی طرح آدمی ہوں
إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ	(فرق یہ ہے) کہ میرے پاس وحی بھیجی جاتی ہے
(کہف و فصلت)	کہ تمھارا خدا ایک ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ خدا کی طرف سے لوگوں کو سناتے تھے، وہ چیز آپ کے نفس و ارادہ سے نہیں اٹھتی تھی، بلکہ خدا کی طرف سے ان کے اندر آتی تھی،

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ	وہ خواہشِ نفس سے نہیں بولتا، بلکہ وہ وحی
إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (نجم - ۱)	ہے جو اس کو بھیجی جاتی ہے،

البتہ اس کا مورد اور مہبط آپ کا پاک اور منزہ قلب تھا،

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ	اسی نے اس کو تمھارے قلب پر خدا کے
اللَّهِ (بقرہ - ۱۲)	حکم سے اتارا ہے،
نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ	روح الامین نے اس کو تیرے قلب پر
قَلْبِكَ (شعراء - ۱۱)	اتارا ہے،

اور یہی مجموعۂ وحی آپ کی نبوت کا بڑا معجزہ ہے، ارشاد ہوا کہ "دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا، لیکن اس کو ایسی چیز دی گئی جس کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے، لیکن

مجھے جو چیز دی گئی وہ وحی ہے، جو مجھ پر اتاری گئی۔[1]

سرمایۂ وحی کی جو دولت اسلام کو ہاتھ آئی، وہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں میں اب تک محفوظ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ گنج گرانمایہ حدیث صحیح کے اوراق میں مخزون ہے، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مجھے قرآن عطا کیا گیا" اور اتنا ہی اور"[2] یعنی وہ احکام و مواعظ جن کو جان نثاروں نے حرز جان بنا رکھا اور دوسروں کو سپرد کیا، یعلی بن امیہ صحابیؓ حجۃ الوداع کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جعرانہ میں آپ تھے، کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑوں میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا، آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی، جب وہ کیفیت زائل ہوئی تو آپ نے دریافت کیا کہ وہ آدمی کہاں گیا، لوگ اس کو سامنے لائے، آپ نے فرمایا "جو خوشبو تم مل چکے ہو، اس کو تین دفعہ دھو ڈالو، اور اس کپڑے کو اتار ڈالو، پھر حسب معمول عمرہ ادا کرو۔"[3]

ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا، "روح القدس نے میرے دل میں یہ ڈالا ہے کہ کوئی انسان اُس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ اپنی روزی پوری نہ کرے، تو لوگو خدا سے ڈرو، اور روزی کی تلاش میں صحیح طریقہ کو کام میں لاؤ، رزق میں تاخیر تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ گناہ کے ذریعوں سے روزی کو تلاش کرو، کیونکہ جو

---

[1] صحیح بخاری باب کیف نزول الوحی و صحیح مسلم کتاب الایمان [2] ابوداؤد کتاب السنۃ [3] صحیح بخاری باب نزول القرآن

خدا کے پاس ہے، وہ اس کی بندگی ہی سے مل سکتا ہے۔[1] حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "مجھ سے جبریلؑ نے کہا کہ آپ کی امت میں جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا شریک نہیں کیا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔[2]

اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں تصریح ہے کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے"، یا "خدا نے مجھ سے یہ کہا ہے"، لیکن وہ قرآن مجید کے اجزاء نہیں ہیں، اسی لیے فقہا نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں، وحی متلو یعنی وہ وحی جو تلاوت کی جاتی ہے یعنی قرآن "وحی غیر متلو" جو تلاوت نہیں کی جاتی، مثلاً وہ احکام و نصائح، جو بروایت صحیح، احادیث میں مذکور ہیں، پہلی وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تواتر روایت سے ثابت ہے اور وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے لحاظ سے خدا کا کلام ہے،

دوسری قسم تواتر سے بہت کم مروی ہے، اور وہ اپنے الفاظ کے لحاظ سے خدا کا کلام نہیں، بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے خدا کا ارشاد ہے۔

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۸۰ حیدرآباد [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز و باب بدء الخلق،

نزولِ ملائکہ

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (الحج)

لفظ "ملائکہ" کا واحد "ملاک" ہے، جو عربی کے قاعدہ سے "ملک" ہوگیا ہے، یہ الوکۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی "پیغام" کے ہیں، اس لیے ملائکہ کے معنی پیغام رساں اور قاصد کے ہیں؛

ملائکۂ الٰہی، خالق اور مخلوق کے درمیان قاصد ہیں، قرآن مجید نے متعدد مقام مقام پر ان کو رُسل اور رُسُل اللہ یعنی قاصدانِ الٰہی کہا ہے،

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (الحج۔۱۰)	خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر منتخب کرتا ہے،

علاوہ ازیں یہ خدا کے حکم سے عالم کی مشین کے پرزوں کو ہلاتے اور چلاتے ہیں، اور اسی لیے خدا نے ان کو مدبّراتِ امر کے نام سے بھی یاد کیا ہے، (سورہ والنازعات) ان کی مخصوص صفت یہ ہے کہ خدا کے سراپا مطیع ہیں، اور اس کے کسی امر یا اشارہ سے کبھی روگردانی نہیں کرتے۔

عَلَیْھَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ	اس پر سخت اور مضبوط فرشتے ہیں، اللہ
لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ	ان کو جو حکم دیتا ہے وہ اس سے رُوگردانی

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ، نہیں کر سکتے، اور وہ وہی کرتے ہیں جو انکو حکم دیا جاتا ہے،

(تحریم ۱۰)

انبیاء علیہم السلام کی تمام سیرتیں فرشتوں کی آمد، ان کی بشارت اور نصرت سے معمور ہیں، تورات اور انجیل و قرآن ہر کتاب الٰہی ان کے کارناموں کی شاہد ہے، حضرت آدمؑ کی بارگاہ میں انھوں نے سجدہ کیا، حضرت ابراہیمؑ کے مہمان خانہ میں یہ بھیجے گئے، حضرت لوطؑ کی حفاظت اور ان کی قوم کی بربادی پر یہ مامور ہوئے، حضرت ہاجرہؑ کو بیابان میں یہ نظر آئے، حضرت یعقوبؑ کے خیمہ میں ان کا دنگل ہوا، حضرت ایوبؑ کے مناظرۂ جبر و اختیار میں حکم یہ قرار پائے، حضرت زکریاؑ اور مریمؑ کو بشارت انھوں نے دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بھی یہ مختلف فرائض پر مامور ہوئے، یہ آپؐ کی خدمت میں احکام الٰہی کے قاصد تھے، دشمنوں سے وجود اقدس کی محافظت ان کے سپرد تھی، کمزور اور ناتواں مسلمانوں کی دستگیری ان کا فرض تھا،

ملائکہ کے سرخیل جبریلؑ ہیں، اور وہی خدا اور پیغمبروں کے درمیان سفارت پر مامور ہیں، اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی آکر سفارت کا فرض انجام دیتے تھے، اور خدا کا پیغام پہنچاتے تھے،

نزول جبریلؑ "جبریلؑ" عبرانی لفظ ہے، جس کے لغوی معنی "مرد خدا" کے ہیں، لیکن یہ اصطلاح شریعت میں اس فرشتہ کا نام ہے، جو خدا اور خاصان خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے، توراۃ اور انجیل میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے مستعمل ہوا ہے،

چنانچہ دانیال (۸ - ۱۶ - ۹ - ۲۱) میں اس کی پیغامبری کا بیان ہے، اسی طرح انجیل (لوقا ۱ - ۱۹ - ۲۶) میں مذکور ہے کہ وہ حضرت زکریاؑ کے پاس حضرت یحییٰؑ کی بشارت، اور حضرت مریمؑ کے پاس حضرت عیسیٰؑ کی بشارت لیکر آیا تھا، قرآن مجید نے بتایا ہے کہ وہ پیامبر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خدا کے درمیانی وحی کا ایلچی تھا، وہی جبریلؑ تھا،

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ	جو جبریلؑ کا دشمن ہو وہ ہو، کیونکہ (اسے
نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ	پیغمبر) اس نے خدا کے حکم سے تیرے دل پر
(بقرہ - ۱۲)	اس کو نازل کیا ہے،

اور کہیں اسی کو الرُّوحُ الأَمِين (امانت دار روح) سے تعبیر کیا ہے،

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝	امانت دار روح اس کو لے کر تیرے دل پر
عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝	اتری، تاکہ تو لوگوں کو خدا کے خوف سے
(شعراء - ۱۱)	ڈرانے والوں میں ہو،

سورۂ نحل میں اس کو روح القدس (پاکی کی روح) کہا گیا ہے،

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ	کہدے کہ اس کو روح القدس نے تیرے پروردگار
مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (نحل - ۱۴)	کی طرف سے سچائی کے ساتھ اتارا ہے،

رسول (فرستادہ) کا لفظ بھی اس کی شان میں استعمال کیا گیا ہے،

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ (الحاقہ) یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہے،

سورۂ تکویر میں اس "رسول" کے متعدد صفات کا بھی ذکر ہے،

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ه	یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہو
ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ	جو قوت والا ہے، اور تخت والے خدا کے حضور میں
مَکِیْنٍ ه مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ه	اس کا اعتبار ہے، اس کی سب اطاعت
(تکویر)	کرتے ہیں، اور وہ امانت والا ہے،

سورہ نجم میں اس کے کچھ اور صفات بھی مذکور ہیں،

عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ذُوْمِرَّۃٍ	اس پیغمبر کو بڑی قوتوں والے اور بڑی
فَاسْتَوٰی (نجم ۱)	طاقت والے نے تعلیم دی

آغاز وحی کے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیلؑ کے لیے اَلْمَلَکُ کا لفظ فرمایا ہے، اور ورقہ نے اس کو "ناموس" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ ملک کی اصل جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے، ملأک ہو الوکہ سے نکلا ہے اور جس کے معنی پیغام کے ہیں، اس لیے ملک کے معنی پیغامبر کے ہوئے، اور لفظ ناموس کے معنی محرم اسرار اور راز داں کے ہیں، بہر حال یہ تمام مختلف الفاظ اور عنوانات ایک ہی مفہوم و معنی کو ادا کرتے ہیں،

قرآن مجید میں جبرئیلؑ کا نام تین مقام پر آیا ہے، دو جگہ سورہ بقرہ میں، اور ایک جگہ سورہ تحریم میں، لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ وحی محمدی کے پیامبر، اور قرآن کے حامل ہیں، صرف ایک ہی موقع پر قرآن مجید نے اس نام سے ان کو یاد کیا ہے، اور وہ اس آیت میں

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (بقرہ)

جو جبرئیل کا دشمن ہو وہ ہو، کیونکہ اس نے تو تیرے قلب پر خدا کے حکم سے اس کو اتارا ہے

دوسری آیتوں میں قرآن مجید نے حامل قرآن فرشتہ کی تعبیر (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں)، روح الامین، روح القدس اور رسولِ کریم کے الفاظ سے کی ہے، لیکن احادیث اور روایات میں ان الفاظ کے بجائے جبرئیلؑ ہی کا لفظ عام طور سے مستعمل ہوا ہے۔

ایک پیامبر کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جبرئیلؑ کی سب سے پہلی آمد اس وقت ہوئی ہے، جب آپؐ غارِ حرا میں معتکف تھے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ واقعہ ان الفاظ میں ادا ہوا ہے:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا آغاز خواب میں رویائے صالحہ سے ہوا، آپ جو رویا دیکھتے تھے، وہ سپیدۂ سحر کی طرح (سچا ہو کر) نمودار ہوتا تھا، پھر طبیعتِ مبارک میں تخلیہ پسندیدہ کیا گیا، غارِ حرا میں جا کر آپؐ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے، اور عبادت میں مصروف رہتے تھے، کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لیجاتے تھے، جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے، اور پھر نیا سامان لے کر غار میں چلے جاتے، یہاں تک کہ حق آپ کے سامنے آگیا، اور وہ فرشتہ آپ کے سامنے آگیا، اور اس نے کہا "پڑھ" آپ نے فرمایا "میں پڑھا نہیں ہوں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے مجھ کو پکڑ کر اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ "پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا، اس نے مجھے اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا، اور چھوڑ دیا، اور کہا کہ پڑھ، میں نے پھر کہا کہ "میں پڑھا نہیں ہوں"۔

اس نے تیسری دفعہ دبایا اور چھوڑ دیا، اور کہا،

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ	اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ	انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا،
وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ	پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے جس نے
بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ	قلم کے ذریعہ سے سکھایا اور انسان کو
يَعْلَمْ ۚ (علق)	وہ کچھ تعلیم کی جو نہیں جانتا تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے، قلب مبارک پر لرزہ تھا، حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور فرمایا "مجھے کمل اڑھاؤ، مجھے کمل اڑھاؤ" لوگوں نے آپؐ کو کمل اڑھایا، جب آپؐ کو سکون ہوا، تو حضرت خدیجہؓ سے تمام ماجرا بیان کرکے فرمایا کہ "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے" حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "ہرگز آپ کی جان کو خطرہ نہیں، خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ قرابتداروں کا حق ادا کرتے ہیں، لوگوں کے بوجھ کو آپ خود اٹھاتے ہیں، فقیروں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہیں، مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، انصاف کی خاطر آپ لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں" پھر آپ کو لیکر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہوگئے تھے، اور عبرانی یا عربی لکھنا جانتے تھے (شاید توراۃ سے مراد ہو) اور انجیل کو عبرانی یا عربی میں لکھتے تھے[1]، اور بہت بڈھے تھے،

[1] دونوں روایتیں ہیں، ایک میں ہے کہ عبرانی میں لکھتے تھے، اور دوسری میں ہے کہ عربی میں لکھتے تھے،

اور آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہی تھی، حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "اے ابن عم! اپنے بھتیجے کا ماجرا سنیئے۔ ورقہ نے کہا "اے میرے بھتیجے ہاں بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا، بیان فرمایا، ورقہ نے کہا "یہ وہی **ناموس** (محرم اسرار) ہے جو موسیٰ پر اتارا گیا تھا، اے کاشکہ میں اُس وقت جوان ہوتا۔ اے کاشکہ میں اس وقت زندہ ہوتا، جب کہ تمھاری قوم تم کو نکال دیگی"، آپ نے پوچھا "کیا میری قوم مجھکو نکال دیگی" اس نے جواب دیا "ہاں جو کچھ تم لے کر آئے ہو اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو، اور اگر اس زمانہ تک میں زندہ رہا تو تمھاری ہر طرح مدد کرونگا" اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ورقہ نے وفات پائی۔[1]

اس کے بعد جبرئیلؑ کی آمد رکی رہی، اور آپ بدستور غار حرا میں جاتے رہے، اسی اثناء میں ایک دن آپ غار حرا سے نکل کر اور پہاڑی سے نیچے اتر کر جب میدان میں پہنچے تو غیب سے ایک آواز آئی، آپ نے فرمایا "میں نے آگے پیچھے داہنے بائیں دیکھا، پھر نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف کی، تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو پہلے غار حرا میں نظر آیا تھا، آسمان اور زمین کے بیچ میں تخت پر بیٹھا ہے، میں مرعوب ہو کر گھر واپس آیا"۔

اس کے بعد حضرت جبرئیلؑ کی پے درپے آمد شروع ہوئی،

[1] صحیح بخاری بدء الوحی وکتاب التعبیر وتفسیر سورۂ مدثر میں یہ پورا واقعہ مفصل مذکور ہے، میں نے ان تینوں روایتوں کو تسلسل کے لیے یکجا کر دیا ہے، چونکہ استاذ مرحوم نے جلد اول میں ان تفصیلات کو قلم انداز کر دیا تھا، اس لیے یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت ہوئی،

جبرئیلؑ جب وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تو آپ جلد جلد اپنی زبان سے ان کے الفاظ کو ادا کرنے لگتے، اس پر حکم ہوا[1]،

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ	وحی کے الفاظ کے ساتھ اپنی زبان کو عجلت طلبی
بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ	کے لیے جنبش نہ دو، اس کی حفاظت
قُرْاٰنَهٗ (قیامہ-۱)	اور قرأت کا فرض ہم پر ہے،

اس کے بعد جب جبرئیلؑ نازل ہوتے تو آپ خاموشی سے سنتے، اور ان کے چلے جانے کے بعد آپ اس کو پڑھتے،

بارگاہ نبویؐ میں جبرئیلؑ کے آنے کا کوئی وقت متعین نہ تھا، صبح و شام، روز و شب صلح و جنگ ہر وقت فیضان الٰہی کا چشمہ ابلتا رہتا تھا، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ نصف شب کو سوتے سوتے اٹھ کر بقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے، صبح کو آپ نے فرمایا رات جبرئیلؑ نے مجھے پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع جا کر لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگوں[2]، غزوۂ بدر میں آپ نے فرمایا کہ "دیکھو یہ جبرئیل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں[3]"، غزوۂ خندق سے جب مسلمانوں کی فوج لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبرئیلؑ نے سامنے آکر کہا کہ آپ نے ہتھیار کھول دیے، حالانکہ ہم اب تک مسلح ہیں، اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا صلہ دینا ہے[4]، بایں ہمہ سب سے زیادہ جبرئیلؑ کی آمد آپ کے پاس ماہ رمضان

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] نسائی باب الاستغفار للمومنین [3] صحیح بخاری غزوۂ بدر [4] ایضاً غزوۂ خندق،

میں ہوتی تھی، جس میں وہ ہر روز آکر آپ سے قرآن مجید سنتے تھے، اور خود آپ کو سناتے[1] جبرئیلؑ اس وقت بھی آتے تھے، جب آپ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوتے تھے۔ لیکن جو کچھ آپ دیکھتے اور سنتے تھے وہ عموماً اوروں کو دکھائی اور سنائی نہیں دیتا تھا، ایک دفعہ آپ حضرت عائشہؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا، اے عائشہؓ! جبرئیلؑ تم پر سلام بھیجتے ہیں، انھوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی،[2] توراۃ میں انبیاے بنی اسرائیل کے قصوں میں اس فرشتۂ غیب کے تجسم اور تشکل کے بکثرت واقعات مذکور ہیں، انجیل میں ہے کہ روح القدس کبوتر کی شکل میں حضرت عیسیٰؑ پر اتری، حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آکر آپؐ کے پاس بیٹھا، اور سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، خدا سے ملنے پر، اور اس کے پیغمبروں پر، اور قبر سے پھر جی اٹھنے پر تم یقین رکھو" اس نے پھر پوچھا کہ "اسلام کیا ہے"؟ جواب دیا یہ کہ "تم خدا کی اطاعت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، اور نماز پڑھو، زکوٰۃ مفروضہ دو، روزے رکھو" اس نے کہا "اور احسان کیا ہے"؟ ارشاد ہوا "احسان یہ ہے کہ تم خدا کو اس طرح پوجو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے، اس نے پھر سوال کیا کہ "قیامت کب آئے گی"؟ آپؐ نے فرمایا "مجیب اس باب میں سائل سے زیادہ واقف نہیں، البتہ میں

[1] صحیح بخاری بدء الوحی [2] صحیح بخاری باب بدء الخلق،

تمھیں اس کی علامتیں بتاتا ہوں، جب لونڈی اپنے آقا کو جنے، اور جب اونٹوں کے چرانے والے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں، قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں سے ہے، جن کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی،

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ — قیامت کا علم خدا ہی کو ہے،

وہ شخص اس کے بعد اٹھ کر چلا تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ذرا اس کو واپس بلالو، لوگوں نے ادھر اودھر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا، "یہ جبریلؑ تھے، جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے"[1]

صحابہ میں دَحیہ نام ایک صحابی بہت حسین تھے، جبریلؑ اکثر ان ہی کی صورت میں مجسم ہو کر آیا کرتے، اور اس حالت میں کبھی کبھی لوگوں کو نظر بھی آجاتے تھے، حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ دحیہؓ آپ کے سامنے بیٹھے آپ سے باتیں کررہے ہیں، مجھے کچھ بھی شک نہ ہوا کہ یہ دحیہؓ نہیں ہیں، اتنے میں مسجد نبویؐ میں میں نے آپ کے خطبہ کی آواز سنی کہ آپ فرمارہے تھے کہ ابھی میرے پاس جبریلؑ آئے، ام سلمہ کہتی ہیں تب میں سمجھی کہ وہ اصل میں دحیہؓ نہیں بلکہ جبریلؑ امین تھے،[2]

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جبریلؑ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلی شکل میں دو دفعہ ملاحظہ فرمایا[3]، ایک دفعہ تو معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور دوسری دفعہ ایک اور مقام پر وہ آسمان کے کناروں میں نظر آئے، سورۂ نجم کی یہ آیتیں اسی کے متعلق ہیں،

---

[1] صحیح باب الایمان [2] صحیح بخاری کیف نزل الوحی [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ والنجم و صحیح مسلم 'معراج'

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ	بڑی قوتوں والے، طاقتور نے اسکو سکھایا،
فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى	پھر وہ برابر ہوا اور وہ بہت اوپر آسمان
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ	کے کنارہ تھا، پھر قریب ہوا، پھر لٹک آیا،
قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ	تو دو کمانوں کے بقدر تھا، یا اس سے
فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى	بھی قریب تر، تو خدا نے اپنے بندہ پر
مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى	وحی کی جو وحی کی، دل نے جھوٹ نہیں
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى	کہا جو دیکھا، کیا تم لوگ اس سے اس کے
وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى	مشاہدہ پر جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى	اس کو دوسری دفعہ اترتے دیکھا
(نجم - ۱)	سدرۃ المنتہیٰ کے پاس،

سورۂ تکویر کی حسب ذیل آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفار آپ کو مجنون اسی لیے کہتے تھے کہ آپ اس غیر مشاہد ہستی کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتے تھے،

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ	یہ ایک بزرگ پیغام رساں کی بات
ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ	ہے، قوت والا، جو عرش والے خدا
مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ	کے پاس معتبر ہے، وہاں اسکی اطاعت
وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ	کی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ	تمہارا ساتھی (یعنی پیغمبر) مجنون نہیں ہے

الْمُبِیْنِ (تکویر) یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارہ میں دیکھا،

وہ ذوق و شوق جو حضورؐ کو اس قاصد الٰہی کی آمد کے ساتھ تھا، وہ اس آرزو کی شکل میں ظاہر ہوا کہ آپ نے جبریلؑ سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آیا کرتے، جواب ملا،

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا (مریم-۴)

ہم تو تیرے پروردگار کے حکم اور اجازت سے اترتے ہیں، ہمارے آگے اور پیچھے اور درمیان سب کا علم اسی کو ہے، اور تیرا رب بھول چوک سے پاک ہے،

(صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ)

. . . .

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شب کو میں نکلا تو دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چاندنی میں ٹہل رہے ہیں، میں سمجھا کہ شاید آپ اس وقت تنہائی چاہتے ہیں، اور کسی اور کا یہاں ہونا پسند نہ فرمائیں گے، چنانچہ اسی خیال سے میں سایہ میں ہو گیا لیکن آپ کی نگاہ پڑ گئی، پوچھا کون ہے؟ عرض کیا "آپ پر قربان، میں ہوں ابوذر" آپ نے ساتھ لے لیا اور تھوڑی دیر تک ٹہلتے رہے، پھر فرمایا "جو آج دولتمند ہیں وہی کل قیامت میں غریب ہوں گے، لیکن وہ شخص کہ جس کو خدا نے جو دولت دی ہو وہ اس کو داہنے بائیں آگے پیچھے پھینک دے، اور اس میں نیکی کے کام کرے" ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر تک ساتھ ٹہلتا رہا، اس کے بعد ایک خاص جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم یہاں

ٹھہرے رہو، اور یہ کہہ کر آپ پہاڑ کی طرف گئے، اور میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے،

میں نے دور سے آواز سنی تو میں ڈرا، لیکن چونکہ آپ نے حکم دیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے نہ

ٹلوں، اس لیے ٹھہرا رہا، تھوڑی دیر کے بعد آپ سامنے سے آتے نظر آئے، اور زبان

مبارک سے یہ فرما رہے تھے کہ اگرچہ چوری کرے اور زنا کرے" میں نے کہا یا رسول اللہ!

آپ پر قربان ہوں، آپ پہاڑی کے اوٹ میں کس سے باتیں کر رہے تھے، فرمایا کیا

تم نے آواز سنی ؟ عرض کی ہاں، فرمایا جبریلؑ تھے، پہاڑی کے بیچ میں مجھے نظر آئے،

اور کہا کہ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے، کہ جو اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا

شریک نہ بنایا ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے

کہا یا جبریلؑ "کیا اس نے زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو" جواب دیا "ہاں" میں نے پھر کہا،

اگرچہ زنا، چوری ہی کیوں نہ کی ہو، وہی جواب دیا کہ ہاں، میں نے پھر کہا کہ اس نے زنا

یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو، تیسری دفعہ بھی جواب وہی تھا،[1]

فرشتہ میکائیل کا نزول جبریلؑ کے علاوہ دوسرے ملائکہ کا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں آنا ثابت ہے، قرآن مجید میں جبریلؑ کے علاوہ ایک دو اور فرشتوں کے بھی نام آئے

ہیں جن میں سے ایک میکائیلؑ ہیں، یہودیوں نے قرآن کے ماننے سے اس لیے اپنا انکار ظاہر

کیا تھا کہ یہ جبریلؑ کی وساطت سے نازل ہوتا ہے، خدا نے اس کے جواب میں کہا۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ — جو خدا کا اور اس فرشتوں کا اور اس کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق

وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ	پیغمبروں کا اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کا دشمن
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ (بقرہ ۱۲)	ہو تو خدا ان کافروں کا دشمن ہے،

یہودیوں کے اعتقاد میں یہ عرش الٰہی کے چار مخصوص فرشتوں میں سے ایک کا نام تھا، یہ خاص طور پر اسرائیل اور اس کے خاندان کا محافظ سمجھا جاتا تھا، اور لڑائیوں میں اس کی مدد کیا کرتا تھا، (دانیال ۱۰-۱۳ و ۲۱) عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہی فرشتہ تھا جو کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ سے ہمکلام ہوا تھا، (اعمال ۷-۳۸)

میکائیلؑ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوئے ہیں معراج کے موقع پر جو دو فرشتے آئے تھے، وہ جبریلؑ اور میکائیلؑ تھے، اسی طرح غزوۂ احد میں جو دو فرشتے دشمنوں سے آپ کی حفاظت کر رہے تھے، وہ بھی جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے، جبریلؑ اور میکائیلؑ تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت کے ابتدائی تین سالوں میں میکائیلؑ ہی آپ کے ساتھ تھے،

عام ملائکہ کا نزول جبریلؑ اور میکائیلؑ کے ناموں کی تخصیص کے علاوہ دوسرے عام فرشتوں کا بلا تعیین نام، آپ کی خدمت میں آنا بھی صحیح روایتوں سے ثابت ہے، اور ان ہی کی روحانی تائیدات کا اثر تھا کہ آپ کا دل ہر وقت سکینتِ الٰہی سے معمور رہتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک پر جب نبوت کا بار گراں رکھا گیا تو یقیناً آپ کو نظر آتا ہوگا کہ ایک طرف بظاہر ایک تہی دست و پا انسان ہے، جس کے قبضہ میں نہ سونے چاندی کے خزانے ہیں، اور نہ اس کے علم کے نیچے خود اس کی ذات کے سوا کوئی دوسرا سپاہی ہے،

اور دوسری طرف ایک دنیا ہے، جس کے ہاتھوں میں دنیا دی دولت کے خزانے اُبل رہے ہیں، اور جس کے پرچم کے زیر سایہ ہزاروں اور لاکھوں کا ٹڈی دل ہر وقت حق کے مٹانے کو آمادہ پیکار ہے، یہ وہ وقت تھا جب فرشتوں کو حکم پہنچا کہ میرے پیغمبر کو اپنی بشارتوں اور خوشخبریوں سے مطمئن کرو،

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ	بیشک خدا اور اس کے فرشتے اس پیغمبر پر
عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (احزاب)	رحمت بھیجتے ہیں، اے مسلمانو! تم بھی اس
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا	پر درود وسلام بھیجو،

رئیس قریش اپنی قوت وطاقت پر نازاں ہو کر اعلان کرتا ہے کہ روسائے قریش ہمارے ساتھ ہیں، پیغمبر کی طرف سے خدا منادی فرماتا ہے،

فَلْیَدْعُ نَادِیَہٗ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَۃَ	وہ اپنی مجلس کے لوگوں کو بلائے، ہم بھی
(علق)	اپنے فرشتوں کو آواز دیں گے،

اس وقت جب منافقین آپ کی بزم خاص میں نفاق ڈالنا، اور گھر میں خانہ جنگی کے سامان بہم پہنچانا چاہتے ہیں، بعض ازواج سے آپ آزردہ ہیں، تو ارشاد ہوتا ہے،

فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ وَجِبْرِیْلُ	تو خدا پیغمبر کا والی وناصر ہے اور جبریل
وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ	اور نیک مسلمان اور اس کے بعد فرشتے سب
بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ (تحریم-۱)	مددگار ہیں،

ایک بار ابوجہل نے کفار سے پوچھا کہ "کیا محمد کبھی تمہارے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں"

سبھوں نے کہا "ہاں"۔ اس نے کہا "لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں ان کو سجدہ کرتے دیکھوں گا تو ان کی گردن توڑ ڈالوں گا، اور ان کی پیشانی کو زمین میں رگڑ دوں گا"۔ چنانچہ ایک دفعہ جب آپ مصروفِ نماز تھے، وہ اسی نیت سے آپ کی طرف بڑھا، لیکن فوراً سہم کر پیچھے ہٹ گیا، کفار نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ "میرے اور محمد کے درمیان آگ کی ایک خندق اور بہت سے پر (یعنی فرشتوں کے) حائل ہو گئے"۔ آپ نے فرمایا "اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کی تکا بوٹی کر دیتے"۔ قرآن مجید کی اس آیت میں

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا — تم نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو

إِذَا صَلَّىٰ (علق) — نماز سے مانع آتا ہے

اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔[1]

سفرِ طائف سے جب آپ ناکام واپس آرہے تھے تو حسبِ اقتضائے بشری آپ دل شکستہ تھے، جب آپ قرن الثعالب میں پہنچے اور سر اٹھایا تو دیکھا کہ ابر کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے، اس میں آپ کو ایک فرشتہ نظر آیا جس نے پکار کر کہا "یا محمد! میں پہاڑوں پر مؤکل (ملک الجبال) ہوں، آپ کے پروردگار نے آپ کی اور آپ کی قوم کی گفتگو سنی، مجھے بھیجا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں پہاڑوں کے نیچے ان کو کچل ڈالوں"۔ فرمایا کہ "شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو"۔[2]

اسلام کی تاریخ میں ابتلاء و امتحان کا سب سے زیادہ سخت اور سب سے پہلا موقع

---

[1] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وما کان اللہ لیعذبھم۔ [2] صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ و صحیح مسلم غزوۂ احد

غزوۂ بدر میں پیش آیا مسلمانوں کی تعداد تین سو انیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن اس شرذمۂ قلیلہ کے مقابلہ کے لیے کفار کا ٹڈی دل امڈا ہوا چلا آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس منظر کو دیکھا تو قبلہ رو ہو کر درگاہ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، دفعۃً ایک ہزار فرشتوں کی روحانی فوج مسلمانوں کی صفِ جنگ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ قرآن مجید میں ہے:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ	جب تم خدا سے فریاد کر رہے تھے تو خدا نے
لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ	تمھاری فریاد کو سنا اور کہا کہ میں ایک ہزار
الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (انفال-۱)	ہم رکاب سواروں سے تمھاری مدد کرتا ہوں

اس فوج نے جس طرح مسلمانوں کی مدد کی، اس کی کیفیت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اس طرح بیان کی ہے کہ "ایک مسلمان ایک کافر کا تعاقب کر رہا تھا کہ اس نے کافر کے اوپر سے کوڑے کی آواز سنی، اور سوار کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "آگے بڑھ اے حیزوم" یہ کہنا تھا کہ کافر چت زمین پر گر پڑا، مسلمانوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کی ناک میں سوراخ ہوگیا تھا جس میں نکیل لگی ہوئی تھی، اور تمام چہرہ پھٹ گیا تھا، اور اس میں نیلی بدھیاں پڑ گئی تھیں، ان صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس واقعہ کو بیان کیا آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو، یہ تیسرے آسمان کی مدد ہے۔"[1]

غزوۂ اُحد میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی، مسلمانوں کو یہ دیکھ کر اضطراب ہوا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی کہ "اپنی قلتِ تعداد اور

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲، کتاب الجہاد، باب امداد الملائکہ۔

بے سروسامانی پر نہ جاؤ، خدا اپنے ہزاروں فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا،" خدا نے کہا کہ "ہاں بیشک اگر مسلمان جرأت وہمت اور صبر سے کام لیں گے تو میں پانچ ہزار فرشتوں کی فوج ان کی مدد کو اتاروں گا۔" سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بہ تفصیل بیان کیا ہے،

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ	اے پیغمبر! جب تم مسلمانوں سے کہتے تھے
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ	کہ کیا تم کو یہ بس نہیں کرتا کہ خدا تین ہزار
اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ	فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا، ہاں بیشک
بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَ	اگر تم صبر کرو اور تقوی کرو، اور تمھارے
يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا	دشمن بڑے زوروں سے بڑھ کر آئیں تو
يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ	وہ پانچ ہزار بہادر فرشتوں سے تمھاری
اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ	مدد کرے گا، خدا نے اس وعدہ کو تمھارے
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى	لیے ایک خوشخبری بنایا، اور تاکہ تمھارے
لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ	دلوں میں طمانیت پیدا ہو، مدد تو خدا ہی
وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	کے پاس سے آتی ہے،

(آل عمران ۱۳)

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے صبر کا سررشتہ چھوٹ گیا، اس لیے خدا کے وعدۂ نصرت سے وہ محروم رہ گئے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود اقدس کی حفاظت کے لیے دو فرشتے ساتھ تھے، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں،

کہ "میں نے غزوۂ احد میں دو سفید پوش آدمیوں کو دیکھا جو آپ کی طرف سے سخت جانبازی کے ساتھ لڑ رہے تھے، اور میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا، نہ اس کے بعد دیکھا"[1]

صحیح مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ دونوں فرشتے جبریلؑ و میکائیلؑ تھے،[2]

غزوۂ اُحد کے بعد غزوۂ خندق پیش آیا، اس غزوہ میں بھی مسلمانوں کی بیچارگی اور بے سروسامانی کا وہی عالم تھا، اسلامی فوج کی رسد کی یہ کیفیت تھی کہ خود مقدس سپہ سالارؐ اپنے سپاہیوں کے ساتھ کئی وقت کا بھوکا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ روحانی فوج نازل کی جو بھوک اور پیاس سے بے نیاز ہے، سورۂ احزاب میں اللہ تعالےٰ مسلمانوں پر اپنا احسان جتاتا ہے،

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا	اے ایمان والو! خدا کے اس احسان کو
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَاءَتْکُمْ	یاد کرو کہ جب کفار نے تم کو آکر گھیر لیا تو
جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا	ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور اس فوج کو بھیجا
وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ	جس کو تم نے نہیں دیکھا، اور اللہ تعالےٰ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا (احزاب۔۲)	کاموں کو دیکھ رہا تھا،

یہ غیرمرئی فوج روحانی سپاہیوں کے دستے تھے،

حضرت ابوذرؓ سے جو قدیم الاسلام صحابی تھے، روایت ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ آپ کو پہلے پہل کیونکر معلوم ہوا کہ آپ پیغمبر ہیں، فرمایا

[1] صحیح بخاری جلد ۲ باب غزوۂ احد ص ۵۸۰ [2] صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل باب قتال جبریلؑ و میکائیلؑ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم

"میں ایک دفعہ جارہا تھا کہ آسمان سے دو فرشتے اترے، ایک آسمان کی طرف گیا، اور ایک زمین پر آیا، ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ "کیا یہ وہی ہے"؟ دوسرے نے کہا "ہاں یہ وہی ہے"۔ پھر اس نے کہا ان کو ایک آدمی سے تولو، تو میرا پلہ بھاری رہا، پھر دس سے، پھر سو سے، پھر ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں تولا گیا، تب بھی میرا ہی پلہ بھاری رہا، دوسرے فرشتے نے کہا کہ "اگر ان کی تمام امت کو بھی ایک پلہ میں رکھو، اور ان کو دوسرے میں تب بھی ان ہی کا پلہ جھکتا رہے گا"۔[1]

یہ حقیقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بشری کی تمثیل تھی،

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مکہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ایک شب عشا کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میرا ہاتھ پکڑ کر مکہ کے باہر میدان میں لے گئے، اور ایک جگہ خط کھینچکر فرمایا کہ یہاں ٹھہرو، اور اگر تم کو کچھ لوگ نظر آئیں تو ان سے بولنا نہیں، وہ بھی تم سے نہیں بولیں گے"۔ یہ کہکر آپ ایک طرف تشریف لے گئے، اس اثنا میں مجھے کچھ لوگ نظر آئے، جو زطی قوم کی طرح معلوم ہوتے تھے، نہ وہ برہنہ تھے، اور نہ ان کے کپڑے نظر آتے تھے، وہ میری طرف آکر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے جاتے تھے، اور خط سے آگے نہیں بڑھتے تھے، آدھی رات کے بعد آپ واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ آج شب میں سویا نہیں، یہ کہکر میرے زانو پر سر رکھ کر سو گئے، اتنے

[1] یہ حدیث سنن دارمی باب کیف کان اول شان النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے، اسکا سلسلۂ سند یہ ہے اخبرنا عبد اللہ بن عمران ثنا ابو داؤد حدثنا جعفر بن عثمان القرشی عن عثمان بن عروۃ بن الزبیر عن ابیہ عن ابی ذر الغفاری تیسرے راوی جعفر بن عثمان القرشی کا صحیح نام جعفر بن عبد اللہ بن عثمان القرشی ہے اور جو محدثین میں معتبر نہیں،

میں کچھ لوگ اُجلے اُجلے کپڑے پہنے جن کے حسن و جمال کا حال خدا ہی جانے کہ کیا تھا، پاس آکر بیٹھ گئے، کچھ آپ کے سرہانے بیٹھے اور کچھ آپ کے پاؤں کے پاس آکر بیٹھے، دونوں نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی ایک تمثیل بیان کی، اور کہا کہ یہ وہ پیغمبر ہے جس کی آنکھیں گویا سوتی ہیں، مگر دل ہشیار رہتا ہے، اس کے بعد وہ چلے گئے، آپ بیدار ہوئے تو فرمایا ان لوگوں نے جو باتیں کیں وہ میں نے سنیں، تم جانتے ہو کہ یہ کون تھے؟ عرض کی خدا اور خدا کا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا، یہ فرشتے تھے، انکی تمثیل کی تفسیر یہ ہے،[1]

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ نماز عشا پڑھ کر آپ چلے تو میں آپ کے پیچھے ہولیا، فرمایا "کون! حذیفہ؟" عرض کی "جی ہاں" فرمایا "آج وہ فرشتہ مجھ پر اترا جو آج تک زمین پر نہیں اترا تھا، اس نے خدا سے اذن مانگا کہ وہ میرے پاس آکر مجھے یہ بشارت سنائے کہ "فاطمہؓ" جنتی بی بیوں کی اور حسنؓ اور حسینؓ جنتی جوانوں کے سردار ہیں"۔[2]

---

[1] ترمذی ابواب الامثال، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب صحیح کہا ہے [2] ترمذی مناقب حسنین، حدیث حسن غریب،

عالمِ رویا

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا بِالْحَقِّ (فتح)

رویا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز طلسم ہے۔ علمائے نفس کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے قوائے نفسی دماغی ہر وقت اور ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں، جب وہ سو جاتا ہے اور اسکے ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں، اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے، مگر چونکہ عموماً انسان عمیق اور پرسکون نیند سوتا ہے، اس لیے جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالتِ خواب کا احساس نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی جب اس کی نیند مستغرق اور گہری نہیں ہوتی تو اس کو اپنی گذشتہ سیرِ دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے۔

یہ تو فلسفۂ قدیمہ کا "فرسودہ خیال" تھا، اب جدید عہد ترقی میں سائیکالوجی اور نفسیات کے علماء کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالمِ بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات اور ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں، عالمِ خواب میں جب ہمارے تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے، تو ان کو ابھرنے

کا موقع ملتا ہے اور وہ جسم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں، بہر حال یہ شاید اس رویا کی توجیہ ہو گی،
جن کو "خوابِ پریشاں" یا "اوہام دماغی" کہنا زیادہ موزوں ہے،

عرفائے روح اس خواب پریشاں یا اوہام دماغی کے منکر نہیں ہیں، لیکن رویا کی حقیقت
ان کے نزدیک کچھ اور ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم و روح سے عبارت ہے، روح جب تک
جسم کے اندر ہے، اس کی جلوہ نمائی کے دو رُخ ہیں، جسمانی و روحانی، اپنے جسمانی دروازہ سے وہ
جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادہ کی سطح پر رنگارنگ کے نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں، یہ
اس کے وہ تعلقات اور دلچسپیاں ہیں، جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں،
لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے، جہاں سے وہ روحانیت کے عالم کی سیر کر سکتی
ہے، جس قدر اس کا تعلق، انس، دل بستگی، شیفتگی اور مشغولیت، عالم جسم سے زیادہ ہو گی، اسی قدر
دوسرے عالم کی طرف سے فراموشی، غفلت اور بے تعلقی زیادہ ہو گی، حالتِ خواب میں روح
کی ظاہری جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہو جاتی ہیں، اس لیے اس کو دوسری کھڑکی کی طرف جھانکنے
کی فرصت مل جاتی ہے، اور پھر روح کو جس قدر تعلقاتِ خارجی سے بیگانگی زیادہ ہوتی ہے،
شہرستانِ ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک، اور وہاں کے تمثیلی مناظر
و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ صحیح اور سچی ہوتی ہے، جو روحیں کہ اس عالم
جسمانی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار و مقید نہیں، ان کے لیے عالمِ بیداری بھی
اقلیم روح کی گلگشت سے مانع نہیں، اسی کا نام مشاہدہ اور مکاشفہ ہے،

انبیاء علیہم السلام کے مقدس قالبوں میں جو ارواحِ طیبات ہیں، وہ عالمِ ظاہری کی

گرفتاریوں کے بعد بھی جس حد تک آزاد اور بے تعلق رہتی ہیں، وہ عام حد انسانی سے بہت آگے اور بہت بلند ہے، اسی لیے عالم مشاہدہ اور عالم رویا دونوں میں حقائق و اسرار کی بستیاں اُن کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں، بیداری تو بیداری وہ سوتے بھی ہیں تو بیدار رہتے ہیں، ان کے جسم سوتے ہیں لیکن ان کی روحیں ہمیشہ جاگتی رہتی ہیں،

تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم ۔ پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں، لیکن ان کے دل ہمیشہ بیدار رہتے ہیں،

(بخاری باب الانبیاء)

غافل انسان ادھر التفات نہیں کرتا، ورنہ درحقیقت نیند اور خواب کا معاملہ ایک سرِ ملکوتی اور ایک راز الٰہی ہے،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ،

(روم - ۳)

خدا کی نشانیوں میں سے (اے انسانو!) راتوں میں اور دنوں میں تمھاری نیند ہے، (اور پھر بیدار ہو کر اپنے کاروبار میں تمھارا مصروف ہونا) اور اسکی دولت کو تلاش کرنا ہے، اس میں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں بڑی بصیرتیں ہیں،

موت اور نیند دونوں کم و بیش ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں، فرق اس قدر ہے کہ موت کی حالت میں جسم سے روح کو دائمی مفارقت ہو جاتی ہے، اور نیند میں عارضی، موت میں تمام تعلقاتِ ظاہری کے بند ٹوٹ جاتے ہیں، اور نیند میں کچھ نہ کچھ گرہیں

باقی رہ جاتی ہیں، قرآن مجید نے اسی روزانہ پیش آنے والے حیرت افزا واقعۂ قدرت کی طرف ہم کو اس آیت میں متوجہ کیا ہے،

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ	وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت
مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا	اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا،
فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ	ان کو نیند میں ان (کی مصروفیت دنیاوی)
وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ	کا وقت پورا کر دیتا ہے، پھر جن پر موت کا
مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ	فرمان جاری ہو چکا ہے، انکو اپنے پاس
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	روک لیتا ہے، اور دوسروں کو ایک وقت
	مقررہ تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اس میں سوچنے
(زمر - ۵)	والوں کے لیے نشانیاں ہیں،

حضرت امام ربانیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں،

"توفی نوم از آں قبیل است کہ شخصے از وطنِ مالوف خود بہ شوق و رغبت از برائے سیر و تماشا بیروں آید تا فرح و سرور حاصل کند، وخرم وشاداں بہ وطن خود باز رجوع نماید، و سیر گاہ او عالم مثال است کہ متضمن عجائب ملک و ملکوت است"

(مکتوب سی و یکم، جلد سوم)

عربی زبان میں خواب کے لیے دو لفظ ہیں، ایک حُلُم جس کی جمع احلام آتی ہے، اس کے معنی "خواب و خیال" کے ہیں یعنی محض وہم و تخیل، دوسرا رؤیا، یہ اس

خواب کو کہتے ہیں جس میں حقیقت بینی اور رمز شناسی ہو، ان دونوں لفظوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ پہلے میں وسوسۂ شیطانی کا دخل ہوتا ہے، اور دوسرا اس سے پاک ہے یہ فرق سورۂ یوسف کی ان آیتوں میں صاف نظر آئے گا، عزیز مصر نے خواب دیکھا ہے، اپنے درباریوں سے اس کی تعبیر پوچھتا ہے، اہل دربار کہتے ہیں کہ یہ محض خواب خیال اور وہم ہے

يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ	اے درباریو! میرے اس خواب کے بارہ
إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ	میں مجھے رائے دو، اگر خواب کی تم تعبیر
قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا	بیان کر سکتے ہو، انھوں نے کہا یہ تو محض
نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ	اوہام و خیالات کا مجموعہ ہے، ان اوہام
(سورۂ یوسف ۶)	اور خیالات کی تعبیر سے ہم واقف نہیں

گو عالم رویا کا نظارہ ہر اس ہستی کو کبھی کبھی پیش آتا ہے، جو روح سے وابستہ ہے، اور جس میں کالے گورے، مومن و کافر، شقی و سعید اور نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں، لیکن جس طرح ایک نہایت نازک اور باریک یا کسی دور سے آنے والی چیز کو بہت سی آنکھیں دیکھ سکتی اور دیکھتی ہیں، لیکن ان میں حقیقت اور صحت کے قریب اسی کی رویت ہوتی ہے جس کی بینائی تیز، آلاتِ باصرہ صحیح اور فہم و استنباط کی قوت لطیف ہوتی ہے، اسی طرح عالم رویا کے مشاہدات کی حقیقی اور صحیح رویت بھی ان ہی کے لیے ہے، جن کی روح و دل کی بینائی تیز اور بصیرت کی آنکھیں روشن اور ادراک و عرفان کے حواس لطیف ہوں، اور جن کے نفس کے آئینہ میں صلاح و تقویٰ کا صیقل زیادہ ہو،

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ	اور جو یہاں اندھے ہیں، وہ وہاں بھی
فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (اسرائیل)	اندھے ہوں گے۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ	خدا سے تقویٰ کرو، اور وہ تم کو علم بخشتا ہے
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (بقرہ)	اور خدا کو ہر چیز کا علم ہے،

اسی لیے دنیا کے تمام مذاہب نے رویا کو خاص اہمیت دی ہے، اسلام اور شارعِ اسلام نے جس طرح دین کے اور شعبوں کی تکمیل کی ہے، اس حقیقت کو بھی نہایت واضح اور روشن کر دیا ہے، قرآن مجید کی آیت ہے

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ	جو ایمان لائے اور وہ متقی ہیں ان کے لیے
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	اس دنیا میں بشارت ہے، اور آخرت میں
وَفِي الْاٰخِرَةِ، لَا تَبْدِيْلَ	بھی، خدا کی باتوں میں تبدیلی نہیں،
لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یونس)	یہی بڑی کامیابی ہے،

جب یہ آیت اتری تو صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ! اس دنیا میں بشارت کیا ہے؟ فرمایا کہ "وہ رویاے صالحہ ہے جو ایک مردِ مسلم دیکھتا ہے"[1] آپ نے فرمایا کہ "نبوت اور رسالت ختم ہو گئی، لیکن صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے، اور وہ مبشرات (خوشخبریاں) ہیں، لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا" مسلم کی رویاے صالحہ نبوت کے اجزا میں سے ایک جز ہے"[2] بخاری، مسلم اور ترمذی کی متعدد روایتوں میں مختلف صحابیوں[3]

---

[1] صحیح ترمذی کتاب الرویا، [2] ایضاً [3] ان کتابوں میں کتاب التعبیر اور کتاب الرویا دیکھو

سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مومن کی رؤیاے صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے" اس سے زیادہ رؤیا کی اہمیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ نبوت کا ایک حصہ ہے لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ وہ کونسی رویا ہے، ابھی ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ عربی میں خواب کے لیے دو لفظ ہیں، حلم (خواب پریشاں یا خیالات نفسانی) اور رویا، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا

الرویا من الله والحلم من الشیطان[1]	رؤیا خدا کی طرف سے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے،

آغاز مضمون میں علماے نفس اور عرفاے روح کی تشریحات کی تفصیل ہو چکی ہے، ذیل کی حدیث سے یہ حقیقت بہت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے، صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اصدقکم رویا اصدقکم حدیثا" "تم میں سے سب سے سچا خواب دیکھنے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ سچ بولتا ہے" حقیقت میں انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہے جس کی زبان سچ بولیگی، اس کی روح بھی یقیناً سچ دیکھے گی، علماے نفسیات حدیث کے اس ایک فقرہ کی گرہ کشائی پورے ایک باب میں کر سکتے ہیں،

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خواب تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک رؤیاے صالحہ، یہ خدا کی طرف سے خوشخبری ہوتی ہے، دوسرا غم پیدا کرنے والا خواب یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، تیسرا وہ خواب ہوتا ہے جو انسان کی اپنے دل کی باتیں اور خیالات ہوتے ہیں[2]" اس تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علماے نفس اور عرفاے روح جس

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی [2] صحیح مسلم و ترمذی کتاب الرویا،

خواب اور رویا کی تشریح کرتے ہیں، وہ اپنی اپنی حقیقت کی رو سے بالکل الگ ہیں، اس عالم رویا کے تحت میں جس قسم سے بحث ہے، وہ صرف پہلی قسم ہے،

عام انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کی رویا میں وہی نسبت ہے، جو اُن دونوں کی ذات میں ہے، جب عام انسانوں کی آنکھیں سوتی ہیں تو کم و بیش ان کے دل بھی سوتے رہتے ہیں لیکن انبیاے کرامؑ کی آنکھیں جب سوتی ہیں تو بھی اُن کے دل بیدار رہتے ہیں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے بڑی دیر تک تہجد کی نماز پڑھی لیکن ابھی وتر نہیں پڑھی تھی کہ لیٹ گئے، حضرت عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ! آپ بے وتر پڑھے سوتے ہیں، فرمایا "اے عائشہؓ! میری آنکھیں سوتی ہیں، لیکن میرا دل نہیں سوتا"[1] معراج کے ذکر میں ہے "کہ آپ اس حالت میں تھے کہ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں، لیکن دل بیدار تھا، اور انبیاءؑ کا یہی حال ہوتا ہے۔ کہ انکی آنکھیں تو سوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار رہتے ہیں"[2]

ان ہی حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر جمہور علماے اسلام کا فیصلہ ہے کہ انبیاے کرامؑ کی رویا بھی اسی قدر قطعی اور یقینی ہے، جس قدر آپ کے عام احکام وحی اور مخاطبات الٰہی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خواب اپنے پہلوٹے بیٹے کی قربانی کے متعلق دیکھا، اس کے حکم الٰہی ہونے میں انھیں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہوا، اور انھوں نے اس کی تعمیل ویسی ہی ضروری سمجھی جیسی اس حکم کی جو عالم بیداری میں انھیں خدا کی طرف

---

[1] صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل [2] صحیح بخاری و مسلم باب الاسراء،

ملتا، دوسرے پیغمبروں کے حالات میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ ان کو اپنی رویا کی صحت و صداقت اور واجب العمل ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہ تھا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح مبارک میں بہ احوال بہ کثرت پیش آئے ہیں، اور اس عالم میں جو احکام اور علوم آپ کو دیے گئے ہیں، وہ بھی اسی طرح قطعی ہیں جس طرح وہ احکام اور علوم جو وحی کے دوسرے طریقوں سے آپ کو مرحمت ہوئے، چنانچہ ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ رُؤیا الانبیاء وحیٌ "انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے"[1]

اوپر اشارہ گذر چکا ہے کہ بعض علمائے اسلام اور اصحابِ کشف و عرفان عالم غیب اور عالم ملکوت اور اس عالم شہادت اور عالم جسمانیات کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں جس کا نام انھوں نے عالم برزخ (درمیانی مقام) اور **عالم مثال** رکھا ہے، چنانچہ علماء میں امام خطابی، امام غزالی، علامہ سیوطی، شاہ ولی اللہ صاحب اور صوفیہ میں حضرت امام ربانی، اور تمام حضراتِ مجددیہ اس عالم کے قائل ہیں، شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کا ایک خاص باب باندھا ہے جس میں متعدد احادیث اور علامہ سیوطی اور امام غزالی کی تحریروں سے اس عالم کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، عالم مثال ان کے نزدیک گویا ایک صاف پانی کی غیر محدود نہر یا شیشہ ہے جس میں عالم شہادت کی وہ چیزیں جو جاندار یا مجسم نہیں ہیں، مثلاً صفات، اعراض، نیکی و بدی، ایمان و علم وغیرہ وہاں اپنی مناسب اور موزوں شکلوں میں جاندار اور مجسم ہو کر نظر آتی ہیں، نیکی ایک

---

[1] ترمذی مناقب عمر فاروق رضی اللہ عنہ

حسین و جمیل کی شکل میں، بدی ایک کریہ المنظر صورت میں، ایمان آفتاب بن کر، علم دریا کے رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی طرح عالم غیب کی چیزیں، جنت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ اسی نہر و آئینہ میں منعکس ہو کر اس عالمِ شہادت کے لوگوں کو نظر آتی ہیں، اور جس طرح تصویر کی شبیہ، اور نہر و آئینہ کے عکس میں اور اصل جسمانی شکلوں میں کامل مشابہت اور مماثلت ہوتی ہے، اسی طرح عالمِ غیب کی اشیا اور عالمِ مثال کی شبیہوں اور تصویروں میں پوری مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے،

بہر حال اس عالم کا مستقل وجود ہو یا نہ ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں ایسے واقعات، حالات، مشاہدات اور کیفیات مذکور ہیں جن کی تشریح اس عالم میں بخوبی کی جا سکتی ہے، انجیل اور قرآن مجید دونوں میں ہے کہ جبریل حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی بشارت لے کر

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم) — مریم کے سامنے ایک پورے انسان کی مثال بنکر آئے

احادیث میں ہے کہ ایک دفعہ نماز کی حالت میں آپ کے سامنے جنت اور دوزخ کی صورتیں جلوہ گر کی گئیں، اس موقع پر مختلف صحابیوں نے اس مفہوم کو حسب ذیل مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے، آپ نے فرمایا،

انه صورت لی الجنة والنار حتی — میرے لیے جنت اور دوزخ مصور کی گئی یا میرے

رأیتهما دون الحائط — سامنے جنت اور دوزخ کی صورت پیش کی گئی،

(بخاری باب التعوذ من الفتن) — یہاں تک کہ میں نے ان اس دیوار کے پاس دیکھا،

لقد رأيت الآن منذ صليت	میں نے ابھی جب تم کو نماز پڑھا رہا تھا
بكم الصلوٰة الجنة والنار	جنت اور دوزخ کو اس دیوار کے
ممثلتين فی قبلة هذا الجدار	رُخ میں مثل دیکھا یا میرے سامنے جنت
(بخاری باب رفع البصر فی الصلوٰة)	اور دوزخ کی مثال پیش کی گئی،
انی رأیت الجنة او رأیت النار	میں نے جنت کو دیکھا اور دوزخ مجھے
(بخاری باب الکسوف)	دکھائی گئی
فعُرضت علی الجنة وعرضت	مجھ پر جنت اور دوزخ پیش کی گئی
علی النار (مسلم باب الکسوف)	
لقد جیٔ بالنار ثم جیئ بالجنة (")	میرے پاس جنت اور دوزخ لائی گئی،
اطلعت فی الجنة واطلعت	میں جنت اور دوزخ میں جھانکا،
فی النار (بخاری باب صفة الجنة)	

ایک ہی مفہوم کو مختلف راویوں نے ان مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے، لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ الفاظ کی احتیاط بھی جس قدر امام بخاری کے ہاں ہے کسی اور کے ہاں نہیں، اس لیے امام بخاری کے الفاظ تصویر اور تمثیل یا صورت اور مثال یا امام مسلم کے الفاظ لایا جانا اور پیش کیا جانا پر ذرا تامل درکار ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زبان اس درجہ ادائے مطلب میں قاصر ہے کہ وہ اپنے الفاظ سے عالم محسوس کی کیفیتوں کی بھی پردہ دری نہیں کرسکتی، پھر اس سے یہ توقع کس قدر بیجا ہے

کہ غیر محسوس عالم کی کیفیتوں کو وہ کبھی الفاظ کا جامہ پہنا سکتی ہے، جو ہم کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ صحیح مستند اور محفوظ ذریعہ سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، وہ دوسروں تک پہنچا دیں،

وحی نبوی کا آغاز رویاے صالحہ سے ہوا، آپ کو چیزیں رویا میں دکھائی جاتی تھیں، اور وہ سپیدۂ صبح کی طرح ٹھیک ٹھیک پوری اترتی تھیں[1]،

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد صحابہؓ کی طرف منہ کرکے آپ جاے نماز پر بیٹھے رہتے اور اُن سے دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ لوگ بیان کرتے، اگر وہ رویائے صالحہ ہوتی تو آپ اس کی تعبیر کرتے، اگر وہ خواب و خیال ہوتا تو کہدیتے کہ یہ محض خواب و خیال ہے، اسی اثنا میں اس شب میں اگر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی رویا دکھائی گئی ہوتی تو آپ اس کو سناتے[2]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر رویا احادیث میں مذکور ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہیں جو تمثیلی رنگ میں دکھائی گئی ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعبیر و تشریح خود اپنی زبان مبارک سے کردی ہے، دوسری وہ رویا ہیں جو بعینہ واقعہ اور حقیقت ہیں، اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیان کرتے وقت ان کی تاویل و تشریح نہیں کی، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں بعض اوقات دنیا کے متعلق پیش گوئی اور اخبارِ غیب ہے، دوسری وہ جس میں احوالِ آخرت اور اسرارِ غیب کا اظہار ہے، ذیل میں ہم ہر قسم کے واقعات کو الگ الگ عنوانوں کے تحت میں بیان کرتے ہیں،

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی کتاب التعبیر وغیرہ و صحیح مسلم بدء الوحی [2] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الرؤیا و کتاب التعبیر

رویائے تمثیلی | ابھی آپ مکہ معظمہ میں تھے، اسلام پر سختی اور مصیبت کے دن تھے، صدائے حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد کم تھی کہ آپ کو عالم رویا میں دکھایا گیا کہ آپ اپنی جماعت کے ساتھ عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں، اور ابن طاب کی تر و تازہ کھجوریں لاکر آپ کو اور آپ کے رفقا کو دی گئی ہیں، آپ نے اس کی تعبیر یہ کی کہ دنیا میں مسلمانوں کو ترقی اور آخرت میں عاقبت بخیر ہوگی، اور ان کا مذہب پھلے اور پھولے گا،[۱]

ابھی آپ نے ہجرت نہیں کی تھی، لیکن ہجرت کا زمانہ قریب تھا کہ آپ کو ہجرت اور ہجرت کے بعد کے تمام اہم واقعات رویا میں دکھائے گئے، آپ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ "میری ہجرت کی سرزمین چھوہاروں کا باغستان ہے" میرا خیال تھا کہ یہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر یثرب نکلا، اسی خواب میں نظر آیا کہ "میرے ہاتھ میں تلوار ہے میں نے اس کو ہلایا تو وہ ٹوٹ گئی" یہ اُحد کی شکست کی طرف اشارہ تھا، "پھر میں نے اس کو ہلایا تو وہ ایک نہایت عمدہ تلوار ہوگئی" یہ اس واقعہ کی تمثیل تھی کہ اُحد کے بعد اللہ تعالیٰ فتح و کامیابی اور مسلمانوں کا اجتماع نصیب کرے گا "میں نے اسی خواب میں گائے کو ذبح ہوتے دیکھا" یہ وہ مسلمان ہیں جو اُحد میں شہید ہوئے، اس کے بعد بھلائی دیکھی، یہ وہ بھلائی ہے جو اسلام کو نصیب ہوئی،[۲]

مسلمانوں نے جب مدینہ کو ہجرت کی ہے تو یہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہ تھی، وبا بھی پھیلی تھی، مہاجرین میں اضطراب سا تھا، آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک

[۱] صحیح مسلم کتاب الرویا و صحیح بخاری کتاب التعبیر [۲] صحیح مسلم کتاب الرویا،

کالی سیاہ عورت جس کے سر کے بال الجھے اور پریشاں ہیں، وہ مدینہ سے نکل کر جحفہ کی طرف جارہی ہے، اس کی تعبیر یہ ارشاد فرمائی کہ مدینہ کی وبا جحفہ میں منتقل کر دی گئی، چنانچہ[1] ایسا ہی ہوا، اور مدینہ منورہ اس سے پاک ہو گیا۔

ایک دفعہ رویا میں آپ کو دکھایا گیا کہ آپ کے دونوں ہاتھوں میں سونے کا ایک ایک کنگن ہے، اس سے آپ کو تکلیف ہوئی، حکم ہوا کہ ان کو پھونک دو، آپ نے پھونکا تو دونوں کنگن ہاتھوں سے علحدہ ہو کر اڑ گئے، آپ نے فرمایا کہ "میں نے اس کی تعبیر یہ کی کہ یہ نبوت کے دو جھوٹے مدعی ہیں (مسیلمہ اور اسود عنسی) جو میرے بعد پیدا[2] ہوں گے؛

آپ نے دیکھا کہ "آپ کے سامنے دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا، آپ نے اس کو اسقدر سیر ہو کر پیا کہ انگلیوں سے دودھ بہنے لگا، پیالہ کا بچا ہوا دودھ آپ نے حضرت عمرؓ کو عطا فرمایا"۔ آپ نے لوگوں سے جب یہ خواب بیان کیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! اس کی تعبیر آپ نے کیا کی، فرمایا "علم"[3]؛ اسی طرح آپ نے ایک دفعہ فرمایا "آج شب کو جب میں سویا تھا، میرے سامنے کچھ لوگ پیش کیے گئے، ان میں سے کسی کے بدن پر کرتہ سینہ تک تھا کسی کا اس سے نیچے تک، عمرؓ جب سامنے آئے تو ان کے جسم پر کرتہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے دامن زمین پر لوٹ رہے تھے،" سننے والوں

[1] صحیح بخاری و ترمذی کتاب الرویا [2] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الرویا والتعبیر [3] صحیح بخاری کتاب التعبیر و مناقب عمرؓ و جامع ترمذی ابواب الرویا۔

نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر کی، فرمایا "دین"[1]

ایک شب میں آپ کو ذات محمدیؐ پر ختم نبوت اور تکمیل دین کی تمثیل دکھائی گئی، آنکھیں خواب آلودہ تھیں لیکن قلب اقدس بیدار تھا کچھ فرشتے اتر کر آپ کے پاس آکر بیٹھے، اور آپس میں ایک دوسرے سے بولے کہ "اس پیغمبر کی کوئی تمثیل بیان کرو، اسکی مثال ایسی ہے: جیسے کوئی آقا ہو، اس نے ایک محل تیار کیا، اور اس میں دسترخوان بچھایا، اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی، اب جس نے اس کی بات کو قبول کیا، وہ آیا اور کھا پی کر سیر ہوا، اور جو نہیں آیا اس کو اس نے سزا دی"، بیدار ہو کر آپ نے عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ وہ آقا تو خدا ہے، جنت اس کا محل ہے، جس نے اس کی دعوت کو قبول کیا وہ جنت میں داخل ہوا، اور جس نے انکار کیا اس کو اس نے عذاب دیا،[2]

ایک دفعہ آپ کو یہ دکھایا گیا کہ آپ ایک کنوئیں کے اندارے پر کھڑے ہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے دیکھا کہ میں حوض کوثر پر کھڑا ہوں، اور گرد لوگوں کا جماؤ ہے، آپ ڈول سے پانی کھینچ کھینچ کر ان کو پلا رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ "اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ابوبکر آئے، اور انھوں نے میرے ہاتھ سے ڈول لے کر مجھے سبکدوش کر دیا، اور پھر وہ پانی کھینچ کھینچ کر پلانے لگے، مگر خدا ان پر رحم کرے، ذرا کھینچنے میں کمزوری معلوم ہوتی تھی، اس کے بعد عمر آئے تو ڈول بڑھ کر بڑا ہو گیا، اور عمر نے اس قوت اور تیزی سے پانی کھینچا کہ حوض کنارے کناروں تک پر ہو گیا، اور لوگ پی کر سیر ہو ہو گئے"[3]

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر و مناقب عمرؓ و جامع ترمذی ابواب الرویا [2] جامع ترمذی ابواب الامثال
[3] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب التعبیر کتاب الرویا مناقب عمرؓ ،

یہ خواب اتنا واضح تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر کی ضرورت نہیں سمجھی، کون نہیں سمجھا کہ ڈول اور پانی کھینچنے سے مراد خلافت اور خدمتِ خلق کی بجا آوری ہے،

حضرت عمرؓ ان چند سعید لوگوں میں ہیں جن کو اسی دنیا میں جنت کی بشارت دیجا چکی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "رات میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں، سامنے ایک محل ہے، ایک عورت اس میں بیٹھی وضو کر رہی ہے، میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے؟ جواب دینے والے نے جواب دیا کہ یہ عمرؓ کا مسکن ہے، میں نے چاہا کہ اندر جاؤں، مگر عمرؓ کی غیرت یاد آئی تو الٹا پھر گیا" حضرت عمرؓ سن کر رو پڑے اور کہا "یا رسول اللہ! میں آپ سے غیرت کرتا"[1] ایک دفعہ آپ نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ "اے بلالؓ! تم کون سا ایسا نیک عمل کرتے ہو کہ میں جب جنت میں گیا تو تمھارے جوتوں کے چاپ کی آواز سنی"۔ عرض کیا "یا رسول اللہ! ہمیشہ باوضو رہتا ہوں، اور جب نیا وضو کرتا ہوں، دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں"[2]

ورقہ بن نوفل کا نام آغاز وحی کے ضمن میں ابھی گذر چکا ہے، یہ حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار تھے، اور اسلام سے پہلے سچے عیسائی ہو گئے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ سے نزولِ جبریلؑ کا حال سنا تو انھوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی، اور کہا کہ "اگر زندہ رہا تو اس وقت جب آپ کی قوم آپ کو شہر بدر کرے گی، میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔" حضرت خدیجہؓ نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! ورقہ جنت میں گئے یا دوزخ میں، انھوں نے تو آپ کی تصدیق کی تھی، لیکن آپ کے ظہور سے پہلے

---

[1] صحیح بخاری و مسلم، ترمذی کتاب التعبیر و کتاب الرویا مناقب عمرؓ [2] بخاری و مسلم مناقب بلالؓ و ترمذی مناقب عمرؓ

مرگئے" فرمایا "مجھے وہ خواب میں دکھائے گئے کہ وہ سپید کپڑے پہنے ہیں، اگر وہ دوزخ میں ہوتے تو ان کے جسم پر لباس نہ ہوتا"[1]

ایک شب کو جب آپ مصروفِ نماز تھے، جمال الٰہی بے نقاب ہو کر سامنے آگیا۔ صحیحین کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صبح کی نماز کے لیے آپ دیر کو برآمد ہوئے، نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے رہیں، پھر فرمایا کہ آج شب کو جب میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں، جتنی میرے لیے مقدر تھیں، تو نماز ہی کے اندر میں اونگھ گیا، میں نے دیکھا کہ جمال الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہے، خطاب ہوا "یا محمد! تم جانتے ہو کہ فرشتگان خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں، عرض کی "نہیں، اے میرے رب میں نہیں جانتا" اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی، اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں، سوال ہوا "یا محمد! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں" عرض کی "ہاں اے میرے رب ان اعمال کی نسبت گفتگو کر رہے ہیں جو گناہوں کو مٹا دیتے ہیں" پوچھا "وہ کیا ہیں" عرض کی "نماز باجماعت کی شرکت کے لیے قدم اٹھانا، نماز کے بعد مسجد میں ٹھہر جانا، اور ناگواری کے باوجود اچھی طرح وضو کرنا، جو ایسا کرے گا، اس کی زندگی اور موت دونوں بخیر ہونگی، وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہو جائے گا، جیسا اس دن تھا جب اسکی ماں نے اسکو جنا تھا" پھر

[1] مشکوٰۃ کتاب الرویا، بحوالہ ترمذی کتاب الرویا و مسند احمد

پھر سوال ہوا کہ "یا محمد! درجات کیا ہیں؟" گذارش کی "کھانا کھلانا، نرمی سے باتیں کرنا جب دنیا سوتی ہو تو اٹھ کر نماز پڑھنا۔" پھر حکم ہوا کہ "اے محمد مجھ سے مانگو" میں نے عرض کی "خداوندا! میں نیک کاموں کے کرنے اور برے کاموں سے بچنے اور غریبوں سے محبت کرنے کی توفیق چاہتا ہوں، میری مغفرت کر مجھ پر رحم فرما، جب کسی قوم کو تو آزمانا چاہے مجھے بے آزمائے اٹھا لینا، میں تیری محبت کا اور تجھ سے جو محبت رکھے اس کی محبت کا اور جو عمل مجھ کو تیری محبت کے قریب کردے، اس کی محبت کا خواستگار ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے لوگوں سے کہا کہ "یہ جو کچھ تھا، حق تھا، اور اس دعا کو پڑھا کرو۔"[1]

آثار قیامت کے بعض واقعات بھی اسی عالم میں آپ پر پیش کیے گئے، آپ نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک دن فرمایا کہ رات مجھے ایک رویا دکھائی گئی، میں نے دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں، اسی اثنا میں میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کا رنگ گندم گوں تھا، بہتر سے بہتر گندم گوں آدمی جو تم نے دیکھا ہو، اس کے گیسو پڑے ہوئے تھے، بہتر سے بہتر گیسو جو تم نے دیکھے ہوں، کنگھی سے بال درست کئے ہوئے تھے، اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ طواف کر رہا تھا، میں نے پوچھا یہ کون ہے، جواب ملا کہ مسیح بن مریمؑ! میں ادھر دیکھنے کو مڑا تو ان کے پیچھے ایک اور آدمی نظر آیا، سرخ رنگ، موٹا، بھدا، بالوں میں بہت گھونگھر پڑے ہوئے

---

[1] یہ روایت جامع ترمذی تفسیر سورۂ ص و مسند ابن حنبل بہ سند معاذ جلد ۵ صفحہ ۲۴۳ ترمذی نے اس حدیث کو حسن و صحیح کہا ہے۔

ایک آنکھ سے کانا، آنکھ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا کہ ابھرا ہوا انگور ہے، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ معلوم ہوا دجال[1]،

ام المومنین زینب بنت جحش بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ سونے سے جاگ اٹھے، چہرۂ مبارک سرخ تھا، اور زبان پر یہ کلمات تھے، لا الٰہ الا اللہ افسوس ہے عرب پر! برائی نزدیک آگئی، یاجوج ماجوج کی دیوار میں آج اتنا سوراخ ہوگیا[2]۔

حضرت جبریلؑ اور دوسرے فرشتے جس طرح آپ کے عام مشاہدہ میں آتے تھے، اسی طرح اس عالم رویا میں حاضر ہوتے تھے، حضرت سمرہ بن جندبؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے فرمایا کہ آج شب کو میں نے خواب میں دو شخص دیکھے جو مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ "دوزخ کی آگ کو جو جلاتا ہے وہ مالک داروغۂ دوزخ ہے، میں جبریلؑ ہوں اور یہ میکائیل ہیں[3]"

نظارۂ جمال الٰہی کے بعد اس عالم کا سب سے بڑا مشاہدہ وہ تھا جس میں آپ کو دوزخ کے مہیب و ہولناک مناظر اور بہشت کی بعض دلکش اور مسرت افزا جلوے آپ کو دکھائی گئیں، حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد آپ ہم لوگوں کی طرف منہ کرکے بیٹھ جاتے، اور پھر دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ بہرحال حسب معمول آج بھی آپ نے دریافت فرمایا، ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! ارشاد ہوا کہ آج شب کو مجھے رویا میں یہ نظر آیا کہ دو آنے والے میرے پاس آئے، انھوں نے مجھے اٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک مقدس سرزمین میں لے گئے۔ میں نے

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر و صحیح مسلم باب الاسراء، [2] صحیح بخاری کتاب الفتن، صحیح مسلم باب اشراط الساعۃ [3] بخاری بدء الخلق

دیکھا کہ ایک آدمی پڑا ہے، دوسرا شخص ایک بڑا پتھر ہاتھ میں لیے اس کے پاس کھڑا ہے وہ زور سے پتھر اس کے سر پر مارتا ہے، جس سے اس کا سر چور چور ہو جاتا ہے، اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے، وہ دوڑ کر پتھر اٹھاتا ہے، تو اس کا سر پھر درست ہو جاتا ہے، وہ پھر آکر اسی طرح مارتا ہے اور سر کے پرخچے اڑ جاتے ہیں، میں نے پوچھا سبحان اللہ یہ کیا ہے؟ میرے ساتھیوں نے کہا آگے چلو آگے چلو، میں آگے چلا تو دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہے، دوسرے شخص کے ہاتھ میں ایک لوہے کا آنکڑا ہے، وہ ایک طرف اس کے منھ میں آنکڑا ڈال کر کھینچتا ہے، تو باچھیں پھٹ کر گدی سے مل جاتی ہیں، پھر آنکھ میں، پھر نتھنے میں آنکڑا ڈال کر کھینچتا ہے، اور چیر ڈالتا ہے، ادھر سے فرصت کرکے دوسری جانب جاتا ہے اور ادھر کے بھی جبڑے اور آنکھ اور نتھنے کو اسی آنکڑے سے پیچھے تک چیر ڈالتا ہے، اسی اثنا میں پہلی طرف کے سب زخم بھر آتے ہیں، اور پھر آکر وہ ان کو چیرتا ہے، تو دوسری طرف کے بھر جاتے ہیں، میں نے کہا سبحان اللہ یہ کیا ہے، جواب ملا آگے چلو آگے چلو، میں اور آگے بڑھا، دیکھا کہ ایک تنور ہے، اس میں آگ روشن ہے، کچھ مرد و عورت اس میں ننگے ہی ڈالے گئے ہیں، جب نیچے سے آگ کا شعلہ اٹھتا ہے، تو چیختے ہیں، چلاتے ہیں، تھوڑی دیر میں وہ آگ دب جاتی ہے اور پھر بلند ہوتی ہے، اور پھر وہ چیختے ہیں، اور چلاتے ہیں، میں نے کہا سبحان اللہ یہ کیا ہے، انھوں نے پھر آگے بڑھنے کو کہا، اب آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک خون کی سرخ ندی ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے، اور کنارہ پر ایک شخص پتھر لیے کھڑا ہے، وہ آدمی چاہتا ہے کہ تیر کر کنارے لگ جائے، مگر جب

قریب آتا ہے، وہ شخص پتھر اس زور سے تاک کر مارتا ہے کہ وہ اس کے منھ میں جا کر لگتا ہے اور حلق سے نیچے اتر جاتا ہے، وہ آدمی ہٹ کر پھر جہاں تھا، وہیں پہنچ جاتا ہے، اور پھر وہ کنارہ پر آنے کا قصد کرتا ہے کہ پھر اسی طرح پتھر آکر اس پر پڑتا ہے، میں نے دریافت کیا یہ کیا ہے، انھوں نے کہا آگے چلو آگے چلو، میں اور آگے چلا تو ایک شخص نظر آیا، کریہہ منظر سے کریہہ منظر آدمی جو تم نے دیکھا ہو، وہ اس سے بھی زیادہ کریہہ منظر تھا، آگ اس کے سامنے دہک رہی تھی اور اس کو وہ اور دہکا رہا تھا، اور اس کے چاروں طرف پھر رہا تھا، میں نے اپنے ساتھیوں سے پھر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ انھوں نے آگے بڑھنے کو کہا، میں آگے بڑھا تو ایک ہرا بھرا گنجان باغ نظر آیا، جس میں نوبہار کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے تھے، باغ کے بیچ میں ایک نہایت ہی خوبصورت عمارت دکھائی دی کہ میں نے ویسی کبھی نہیں دیکھی تھی، اس میں بچے، بوڑھے، جوان، عورت، مرد ہر طرف نظر آئے، آگے بڑھا تو ایک اور عمارت جو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت تھی، نظر آئی، اس میں بھی کچھ لوگ مختلف سن و سال کے دکھائی دیے، ایک باغ میں ایک درخت کے پاس ایک دراز قد انسان دیکھا، جس کا سر اتنا اونچا تھا کہ آسمان تک پہنچ گیا تھا، اور مجھے نظر نہیں آتا تھا، اس انسان کے چاروں طرف اتنے بچے نظر آئے کہ میں نے اتنے نہیں دیکھے تھے، میں نے اپنے ہمراہیوں سے پھر سوال کیا، مگر انھوں نے اور آگے بڑھایا تو ایک بہت بڑے باغ کے قریب جس سے زیادہ بڑا اور زیادہ خوبصورت باغ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، پہنچا، اندر گیا تو ایک شہر نظر آیا جس کی چاردیواری ایک ایک سونے

اور ایک ایک چاندی کی اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھی، دروازہ کے پاس پہنچکر دروازہ کھلوایا دروازہ کھلا اور ہم اس کے اندر داخل ہوئے، تو وہاں ہم کو ایسے لوگ نظر آئے جن کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت تھا، اور آدھا دھڑ نہایت بدصورت، میرے ہمراہیوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اس نہر میں غوطے لگاؤ، ناگاہ ایک نہایت صاف شفاف نہر نظر پڑی، وہ گئے اور جاکر اس میں غوطے لگائے، غوطے لگاکر باہر آئے، تو انکی بدصورتی جاتی رہی، اور وہ نہایت خوبصورت ہوگئے، ساتھیوں نے کہا یہ شہر جنت عدن ہے، اور آپ کی منزل وہ ہے، میری نگاہ اوپر اٹھی، تو ایک محل سپید بادل کی طرح دکھائی دیا، میں نے کہا خدا تمہارا بھلا کرے، مجھے وہاں جانے دو، انھوں نے جواب دیا کہ ابھی نہیں، مگر آپ وہاں یقیناً جائیں گے، پھر میں نے کہا آج رات کو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، بتاؤ یہ کیا تھیں، انھوں نے کہا اب ہم آپ کو سب بتادیں گے، پہلا آدمی جس کا سر پتھر سے توڑا جا رہا تھا، وہ تھا جو قرآن پڑھ کر پھر اس کو چھوڑ دیتا ہے، اور فرض نماز سے غافل ہوکر سو جاتا ہے، وہ شخص جس کی آنکھ، ناک، اور منہ چیرا جا رہا تھا وہ تھا جو جھوٹ بولتا ہے، تنور میں جو عورت مرد ننگے بدن نظر آئے، وہ زناکار ہیں، خون کے دریا میں جو غوطے لگا رہا تھا اور پتھر نگل رہا تھا، وہ سودخوار ہے (کہ وہ لوگوں کا خون چوس کر حرام کھاتا تھا) کریہہ منظر شخص جو آگ دہکا رہا تھا، دوزخ کا داروغہ مالک تھا، باغ میں جو دراز قد انسان اور اس کے چاروں طرف بچے نظر آتے تھے وہ ابراہیم تھے، اور یہ بچے وہ کمسن تھے جو دین فطرت پر مرے، یہاں پر حاضرین مسجد میں سے ایک

مسلمان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوک کر کہا "یا رسول اللہ! اور مشرکین کے بچے؟" فرمایا "اور وہ بھی" (کیونکہ وہ ہوش میں آنے سے پہلے دین فطرت ہی پر مرے) پھر سلسلۂ گفتگو آگے بڑھایا، اور فرمایا کہ فرشتوں نے بتایا کہ پہلی عمارت جس میں ہر عمر کے لوگ تھے، عام اہل ایمان کا مسکن ہے، دوسری عمارت جو اس سے بہتر تھی اور جس میں ہر سن و سال کے کچھ آدمی ملے، وہ شہیدوں کا مقام ہے، اور یہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، وہ تھے جنھوں نے نیک اعمال کے ساتھ برے اعمال بھی کیے ہیں، خدا نے ان سے درگذر کیا۔"[1]

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر و کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین،

مُشاہدات و مسموعات

عالمِ بیداری

أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (نجم)

پیغمبر جو کچھ دیکھتا ہے کیا اس پر تم اس سے جھگڑتے ہو

انبیاء علیہم السلام کے حواس یا عام اصناف انسانی کے حواس سے زیادہ لطیف ہوتے ہیں، یا ہمارے حواس کے ماسوا اُن کے کچھ اور بھی حواس ہوتے ہیں، جن سے عام انسان اسی طرح بیگانہ ہیں، جس طرح مادر زاد نابینا، ایک تیز نگاہ نوجوان کی قوتِ بینائی اور لطفِ نظر سے ناآشنا ہو۔

مشاہدات نبویؐ، عام مادی واقعات نہیں جن کی روایت صحابۂ کرام خود اپنے علم یا رویت یا سماعت سے کر سکتے، بلکہ وہ ان واقعات سے اسی قدر جان سکتے تھے، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے کبھی کبھی ظاہر فرمایا، اس لیے روایاتِ حدیث میں مشاہداتِ نبوی کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے، اور نہ عام امت کے عمل دین کے لیے ان کیفیاتِ مافوق کا علم ضروری ہے، بہر حال لفظ و عبارت کے حدود میں جہاں تک ممکن ہے ہم ان کے احاطہ کی کوشش کرتے ہیں۔

مشاہداتِ نبویؐ کی فہرست میں سب سے پہلی چیز روح القدس یا روح الامین یا جبریل نام فرشتہ کی رویت ہے، جو سب سے پہلے غار حرا میں نظر آیا۔ اور اس کے بعد کچھ زمانہ تک وہ آپ کی نگاہ سے اوجھل رہا،[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکی وجہ سے تکلیف رہی، صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مکہ میں آپکے چند سال ایسے گذرے کہ آپ کو صرف غیب کی آوازیں سنائی، اور روشنی دکھائی دیتی تھی، اور کوئی چیز آپ کو نظر نہیں آتی تھی۔[2] غالباً یہی فترۃ الوحی کا زمانہ ہے، یہ زمانہ ختم ہو گیا تو آپنے ایک دن آواز سنی، نظر اٹھا کر دیکھا تو آسمان و زمین کے بیچ میں ایک کرسی پر وہی فرشتہ بیٹھا ہوا نظر آیا،[3] مگر عموماً وہ کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا، صحیح روایتوں میں ہے کہ جبریلؑ صرف دو دفعہ اپنی اصلی صورت میں آپ کو نظر آئے، آپنے اس وقت دیکھا کہ ان کے جسم میں چھ سو پر ہیں، اور ان کے دونوں بازووں نے افق کو گھیر لیا ہے،[4] جبریل کے علاوہ دوسرے فرشتگانِ الٰہی بھی بارگاہِ نبوت میں آیا کرتے تھے جس کی تفصیل نزولِ ملائکہ کے عنوان میں گذر چکی،

فرشتوں کے مقابل دوسری ہستی **شیطان** کی ہے، یہ وہ قوتِ شر ہے جس سے کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا، سب سے پہلے اس سے حضرت آدمؑ کی آزمایش ہوئی اور خدا نے یہ نتیجہ ظاہر کیا کہ

---

[1] صحیح بخاری و مسلم باب بدء الوحی [2] صحیح مسلم باب کم اقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ [3] صحیح مسلم بدء الوحی،
[4] صحیح بخاری بدء الخلق و تفسیر والنجم و صحیح مسلم باب الاسراء،

لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا (طٰہٰ) ہم نے آدم میں استقلال نہیں پایا،

سفرِ ایوبؑ اور قرآن میں ہے کہ اس سے حضرت ایوبؑ کی بھی آزمایش ہوئی، اور وہ اس امتحان میں پورے اترے، انجیل میں ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی شیطان سے آزمائے گئے، اور انھوں نے کامیابی سے اس میدان کو سر کیا، حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے، پوچھنے والے نے پوچھا "یا رسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے"؟ فرمایا "ہاں لٰکِنَّہٗ اَسْلَمَ لیکن وہ مسلمان ہوگیا ہے، یا مطیع ہوگیا ہے،" ایک دفعہ کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ شیطان مجھے چھیڑنے لگا اور میری نماز توڑنے لگا، تو خدا نے مجھے اس پر غلبہ عطا کیا،[1]

جنت و دوزخ گو اور عالم کی چیزیں ہیں لیکن ممکن ہوں سے پردہ اٹھ جائے تو سامنے آجائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ سورج گرہن ہوا، آپ صحابہؓ کے ساتھ نماز کو کھڑے ہوئے، اور بہت دیر دیر تک قراۃ، رکوع اور سجود میں مصروف رہے، اسی اثنا میں صحابہؓ نے دیکھا کہ آپ نے ایک بار ہاتھ آگے کو بڑھایا، پھر دیکھا کہ آپ کسی قدر پیچھے ہٹے، نماز کے بعد لوگوں نے دریافت کیا، تو فرمایا کہ اس وقت میرے سامنے وہ تمام چیزیں پیش کی گئیں، جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، جنت اور دوزخ کی تمثیل اسی دیوار کے پاس دکھائی گئی میں نے بہشت کو دیکھا کہ انگور کے خوشے لٹک رہے ہیں، چاہا کہ توڑ لوں، اگر میں توڑ سکتا تو تم تا قیامت اس کو کھا سکتے، پھر میں نے دوزخ کو

---

[1] صحیح بخاری بدء الخلق باب صفۃ ابلیس

دیکھا جس سے زیادہ کوئی بھیانک چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی، لیکن میں نے اس میں زیادہ تر عورتوں کو پایا، لوگوں نے سوال کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ کیوں" فرمایا کہ "اپنے خاوند کی ناشکری کے سبب، اگر ایک عورت پر تم عمر بھر احسان کرو اور صرف ایک دفعہ وہ تمھارے کسی فعل سے آزردہ ہو جائے تو وہ کہے گی کہ میں نے کبھی تمھارا اچھا برتاؤ نہیں دیکھا،" میں نے اس دوزخ میں اُس چور کو دیکھا جو حاجیوں کا اسباب چرایا کرتا تھا، میں نے اس میں ایک یہودی عورت کو دیکھا جس پر اس لیے عذاب ہو رہا تھا کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ دیا تھا۔ اس کو نہ کچھ کھانے کو دیتی تھی، اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین پر گری پڑی چیزیں کھائے، آخر اسی بھوک سے اُس نے جان دیدی۔[۱]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "میں جنت میں جا نکلا، تو دیکھا، یہاں کے باشندوں میں بڑی تعداد اُن کی ہے، جو دنیا میں غریب تھے، اور دوزخ میں جا کر دیکھا تو ان میں بڑی تعداد عورتوں کی پائی۔"[۲]

عمر کے اخیر سال میں آپ شہدائے اُحد کے مقبرے میں تشریف لے گئے، اور وہاں سے واپس آکر آپ نے ایک خطبہ دیا، اسی درمیان میں آپ نے فرمایا "میں اپنے حوض (کوثر) کو یہیں سے دیکھ رہا ہوں اور مجھ کو زمین کے خزانہ کی کنجیاں حوالہ کی گئیں، اے لوگو! مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے، لیکن ڈرتا اس سے ہوں کہ

---

[۱] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب صلوٰۃ الکسوف و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب رفع البصر و باب التعوذ من الفتن [۲] صحیح بخاری باب صفۃ الجنۃ

اس دنیا کی دولت میں پڑ کر آپس میں رشک وحسد نہ کرنے لگو۔[1]

منبر مبارک مسجد نبویؐ میں تھا، اور اسی سے متصل ازواج مطہرات کے حجرے بھی تھے، جن میں سے ایک میں جسد اقدس سپرد خاک ہے، آپ نے فرمایا "میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے، اور میرا منبر میرے حوض پر رکھا ہے"[2] محدثین نے اس حقیقت کو مختلف تاویلوں سے ظاہر کرنا چاہا ہے، لیکن ہمارے نزدیک اس کی صحیح تشریح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا مشاہدہ کرایا گیا،

معمول تھا کہ تہجد کی نماز کے لیے جب آپ بیدار ہوتے تو امہات المومنینؓ کو بھی جگا دیتے، ام المومنین ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ آپ ایک شب خواب سے بیدار ہوئے، تو فرمایا سبحان اللہ! آج شب کو کیا کیا دولت کے خزانے اور کیا کیا فتنے نازل ہوئے ہیں، ان حجروں میں رہنے والیوں (ازواج مطہراتؓ) کو کون جگائے، اے افسوس دنیا میں کتنی عورتیں سامانِ آرایش سے آراستہ ہیں، مگر آخرت میں وہ ننگی ہونگی"[3] (کہ دنیا میں وہ جامۂ عمل سے برہنہ تھیں)

اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آپ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، ایک ٹیلے پر چڑھے، پھر فرمایا "اے لوگو! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم دیکھ رہے ہو؟ لوگوں نے عرض کی "نہیں یا رسول اللہ! فرمایا "میں تمھارے گھروں کے درمیان فتنوں کو بارش کی طرح برستے دیکھ رہا ہوں"[4] (یہ غالباً حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد کے واقعات کا مشاہدہ تھا)

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز و باب یحذر من زہرۃ الدنیا [2] صحیح بخاری کتاب الحوض و باب فضل ما بین القبر والمنبر۔
[3] صحیح بخاری کتاب التہجد [4] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الفتن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر حال میں اپنی امت کی فکر دامنگیر رہتی تھی، ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام کناروں کو میری نگاہوں کے سامنے کردیا، میں نے اُن کے مغرب و مشرق کو دیکھا، میری امت کی سلطنت ان تمام کناروں تک پہنچ جائیگی، جو مجھے دکھائے گئے ہیں، مجھے سُرخ و سپید (سونا چاندی) کے دونوں خزانے دیے گیے، میں نے خدا کے حضور میں دعا کی کہ بارالٰہا! میری امت کو کسی عالمگیر قحط سے برباد نہ کرنا اور نہ اپنی ان کے سوا کسی غیر دشمن کو مسلط کرنا، حکم ہوا کہ "میرے دربار میں فیصلہ کی تبدیلی نہیں ہوتی میں نے تمھاری یہ دعا قبول کی" تو اب میری امت کو کوئی دوسرا تباہ نہ کریگا، بلکہ وہ خود ایک دوسرے کو تباہ کریں گے"۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس مشاہدۂ اقدس کی تفسیر ہے،

گذشتہ انبیاے کرامؑ کی تمثیلیں اکثر آپ کو دکھائی گئی ہیں، اور معراج اور عالم رؤیا کے علاوہ بیداری کے عالم میں بھی تماشاہدے ہوئے ہیں، صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ سفر میں (غالباً سفر حج) جاتے ہوئے وادی ازرق سے گذرے، آپ نے دریافت فرمایا "یہ کون وادی ہے"، لوگوں نے کہا یہ وادی ازرق ہے، فرمایا "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ موسیٰؑ گھاٹی سے اتر رہے ہیں، اور ان کی زبان پر تلبیہ (صدائے حج) جاری ہے"، اس کے بعد ہرشا کی گھاٹی آئی، فرمایا "یہ کونسی گھاٹی ہے" لوگوں نے بتایا کہ یہ ہرشا کی گھاٹی ہے، فرمایا "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ متی کے بیٹے یونسؑ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں

۱؎ صحیح مسلم باب الفتن

کمبل کا جبہ پہنے ہیں، اونٹنی کی نکیل کھجور کی چھال کی ہے، اور وہ لبیک اللّٰھم لبیک کہتے جارہے ہیں[1]"

معراج کے واقعہ میں یاد ہو گا کہ جب کفار نے بیت المقدس کا نقشہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا کہ دفعۃً اللہ تعالیٰ نے اس کو میری نگاہوں کے سامنے کر دیا، وہ ایک ایک چیز کو پوچھتے جاتے تھے اور میں جواب دیتا جاتا تھا[2]،

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ قبرستان سے گذر رہے تھے، فرمایا کہ ان دو قبروں پر عذاب ہو رہا ہے، یہ عذاب کسی گناہ کبیرہ کی پاداش میں نہیں ہے، ایک کو اس بات پر سزا دی جارہی ہے کہ وہ طہارت کے وقت پردہ نہیں کرتا تھا، یا یہ کہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا، دوسرے کے عذاب کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگوں کی چغلی کھایا کرتا تھا، اس کے بعد آپ نے ایک درخت کی سبز ٹہنی کو دو ٹکڑے کرکے دونوں پر کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ شاید انکی تسبیح و تہلیل سے ان کی سزاؤں میں تخفیف ہو[3]"

حضرت ابو ایوب انصاریؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ آپ دوپہر کو گھر سے نکلے تو آپ کے کانوں میں ایک آواز آئی، فرمایا کہ یہ یہود ہیں ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے[4] یہ بخاری کی روایت ہے، طبرانی میں ہے کہ آپ نے فرمایا "یہود کو ان کی قبروں میں جو عذاب دیے جارہے ہیں، ان کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں[5]"، ایک جہاد میں مسلمانوں

---

[1] صحیح مسلم باب الاسراء [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الاسراء [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] کتاب الجنائز

[5] قسطلانی شرح حدیث مذکور

کی طرف ایک آدمی مارا گیا تھا، لوگوں نے کہا وہ شہید ہوا، آپ نے فرمایا ہرگز نہیں، میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے، کیونکہ اس نے مال غنیمت میں سے ایک عبا چرائی تھی، اس کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ جنت میں صرف اہل ایمان جائیں گے[1]

عمرو بن عامر خزاعی عرب میں پہلا شخص ہے جس نے جانوروں کو دیوتاؤں کے نام نذر کرنے کی بدعت پیدا کی، بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "آپ نے فرمایا کہ "میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کے شعلے ایک دوسرے کو توڑ رہے ہیں، اور اس میں عمرو بن عامر کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے"[2]

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ایک دفعہ بنی نجار کے نخلستان میں جا نکلے، آپ ایک خچر پر سوار تھے، اور جاں نثار ساتھ ساتھ تھے کہ دفعۃً خچر اس زور سے بھڑکا کہ قریب تھا کہ آپ گر پڑیں، پاس پانچ چھ قبریں تھیں، دریافت فرمایا کہ ان قبروں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک نے کہا ہاں یا رسول اللہ! میں جانتا ہوں، فرمایا "یہ لوگ کب مرے ہیں"؟ عرض کیا کہ یہ لوگ شرک کی حالت میں مرے ہیں، فرمایا "ان لوگوں کی ان کی قبروں میں آزمائشیں ہو رہی ہیں اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ تم مُردوں سے ڈر کر ایک دوسرے کو دفن کرنے میں ڈرنے لگو گے، تو میں خدا سے دعا کرتا کہ تم کو بھی عذاب قبر کی وہ آواز سنائے جو میں سن رہا ہوں"[3]

ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی طرف کو تشریف لیے جا رہے تھے، اتنے میں ایک سخت بدبو پھیلی، فرمایا جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے، جو مسلمانوں کی غیبت

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی الغلول [2] مسند ابن حنبل بسند جابر بن عبداللہ [3] ایضاً

کرتے ہیں[۱]، حاکم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت بلالؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی طرف کو جا رہے تھے، آپؐ نے فرمایا "اے بلالؓ! جو میں سن رہا ہوں، تم سن رہے ہو"؟ عرض کی نہیں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا کہ تم نہیں سنتے کہ مردوں پر عذاب کیا جا رہا ہے، مستدرک[۲] حاکم، کتاب الزہد امام احمد، بزار اور بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ حضرت زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تھے، حضرت ابوبکرؓ نے پینے کی کوئی چیز مانگی تو لوگ شہد اور پانی لے آئے، حضرت ابوبکرؓ یہ دیکھ کر رونے لگے، لوگوں نے گریہ کا سبب دریافت کیا، تو فرمایا کہ "ایک دن میں خدمت نبویؐ میں حاضر تھا تو دیکھا کہ آپ ہاتھ سے کوئی چیز ہٹا رہے ہیں، اور مجھے کوئی چیز ہٹانے کی نظر نہیں آتی تھی تو میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کس چیز کو ہٹا رہے ہیں؟ فرمایا یہ دنیا ہے، جو میرے سامنے ممثل ہو کر آئی ہے، میں نے اس سے کہا کہ "میرے پاس سے چلی جا"، تو اس نے کہا "اگر آپ مجھ سے بچ گئے تو آپ کے بعد کے لوگ مجھ سے نہیں بچ سکتے"۔

---

[۱] مسند ابن حنبل بسند جابر بن عبداللہؓ [۲] مستدرک ج ۴ ص ۳۰۹، ذہبی نے لکھا ہے کہ بخاری وغیرہ نے اس کے ایک راوی (عبدالصمد) کو متروک کہا ہے،

اسراء یا معراج

سُبْحَانَ الَّذِی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ

اسراء کے معنی "رات کو چلانے یا لیجانے کے ہیں" چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حیرت انگیز معجزانہ سفر رات کو ہوا تھا، اس لیے اسکو اسراء کہتے ہیں، اور قرآن مجید نے اسی لفظ سے اس کو تعبیر کیا ہے، سُبْحٰنَ الَّذِی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً (پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندہ کو لے گیا)

معراج "عروج" سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، چونکہ احادیث میں آپ سے لفظ عُرِجَ بی مجکو اوپر چڑھا گیا، مروی ہے، اس لیے اس کا نام معراج پڑا،

انبیاء اور سیر ملکوت انبیاء علیہم السلام کے روحانی حالات اور واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اولوالعزم پیغمبروں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ منصبِ رفیع حاصل ہوتا ہے، اور اس وقت شرائطِ رویت کے تمام مادی پردے انکی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیے جاتے ہیں، اسباب سماعت کے دنیاوی قوانین ان کے لیے منسوخ کر دیے جاتے ہیں، قیود زمانی و مکانی کی تمام فرضی بیڑیاں انکے پاؤں سے کاٹ ڈالی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ ان کے سامنے آتے ہیں، اور وہ اس کے بعد نور کا حلقۂ بہشتی پہنکر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں، اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ

کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیض ربانی سے معمور اور غرق دریاے نور ہو جاتے ہیں،
یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوتگاہ قدس میں بار پاکر
قَابَ قَوْسَیْنِ (دو کمانوں کے فاصلہ) سے بھی نزدیک تر ہو جاتے ہیں، اور پھر وہاں سے اپنے
منصب کا فرمان خاص لیکر اسی کاشانۂ آب و خاک میں واپس آجاتے ہیں،

حضرت ابراہیمؑ کو جب نبوت عطا ہوئی ہے تو ارشاد ہوتا ہے وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کی بادشاہی دکھاتے ہیں،
یہ سیر ملکوت یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی کا مشاہدہ کیا ہے، یہی اسراء اور معراج ہے۔

حضرت یعقوبؑ کے متعلق توراۃ میں مذکور ہے:

"یعقوب بیر سبع سے نکلا اور حاران کی طرف روانہ ہوا، اور وہاں ایک مقام پر
جا کر لیٹا، کیونکہ سورج ڈوب گیا تھا، اور اسی مقام سے کچھ پتھر اپنے سر کے نیچے رکھ لیے، اور
وہیں سو رہا، وہاں خواب دیکھا کہ زمین سے آسمان تک ایک زینہ لگا ہوا ہے جس پر سے خدا کے
فرشتے چڑھتے اور اترتے ہیں، اور خدا اس پہ کھڑا ہے، اور اس نے کہا میں ہوں خداوند، تیرے
باپ ابراہیم، اور اسحٰق کا خدا جس زمین پر تو سو رہا ہے وہ تجھکو اور تیری نسل کو دونگا۔" (پیدائش ۲۸)

حضرت موسیٰؑ کو طور پر جلوۂ حق کا پرتو نظر آیا، وہی ان کی معراج ہے، دیگر انبیاے بنی اسرائیل
کے مشاہدات ربانی اور سیاحت روحانی کی تفصیل سے تورات کے صفحات معمور ہیں، عیسائیوں
کے مجموعۂ انجیل میں یوحنا رسول کا مکاشفہ بہ تفصیل مذکور ہے، جس میں ان کو خواب کے اندر
بہت سے روحانی مناظر دکھائے گئے ہیں، اور قیامت کے واقعات تمثیلی رنگ میں

ان کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، یہ پورا مکاشفہ جس کو ہم سفرنامۂ ملکوت کہہ سکتے ہیں،
۲۲ بابوں میں ختم ہوا ہے، اور اُن میں آثارِ قیامت، جزا و سزا، اور جنت و دوزخ وغیرہ
کے متعلق اکثر ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں، جو قرآن مجید کے بالکل مطابق ہیں، اور انکو
تمام مسلمان پسند کرتے ہیں، مجوس اپنے پیغمبر زردشت کے متعلق بھی معراج کا ایک
طویل افسانہ سناتے ہیں جس میں زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ معراج
کے نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پیروانِ بودھ بھی نخلِ حکمت کے سایہ میں بودھ کے
مشاہدۂ ربانی کا ایک قصہ بیان کرتے ہیں،

بہرحال اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ سے یہ سیر ملکوت انبیا، مقربانِ الٰہی اور
مدعیانِ قربِ الٰہی کے سوانح کا جزو رہی ہے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے منصب اور رتبہ
کے مطابق اس عالم کے مشاہدہ کا فیض حاصل کیا ہے، اسلام نے اس خزانہ کو یہانتک عام
کیا ہے کہ اہل ایمان کے لیے دن میں پانچ دفعہ اس دربار کے کسی نہ کسی گوشہ تک رسائی
ممکن کردی ہے، کہ الصلوٰۃ معراج المومنین۔

معراج نبوی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سرورِ انبیاءؑ اور سید اولاد آدم تھے، اس لیے
اس حظیرۂ قدس اور بارگاہ لامکان میں آپ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی، جہاں تک
کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا، اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو ابتک دوسرے
مقربانِ بارگاہ کی حد نظر سے باہر رہا تھا۔

معراج نبوی کا وقت و تاریخ اور تعداد وقوع اس امر میں اختلاف ہے کہ معراج کب اور کس

تاریخ کو واقع ہوئی، ایک دفعہ ہوئی یا مختلف اوقات میں، صحیح و مستند روایات کے مطابق اور جمہور علماء کی رائے کے موافق معراج صرف ایک دفعہ واقع ہوئی، جو لوگ تعدد کے قائل ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ روایتوں میں جزئیاتِ معراج کے بیان میں اختلاف ہے، اس لیے انھوں نے رفعِ اختلاف کے لیے متعدد دفعہ معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے[1]، تاکہ ہر مختلف فیہ واقعہ ایک ایک جداگانہ معراج پر منطبق کیا جائے لیکن درحقیقت یہ ایک فرضِ محض ہے، جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں مستند اور صحیح روایات ہمارے سامنے ہیں، اور ان میں تعددِ معراج کا اشارہ تک نہیں ہے، ایک ایسے اہم مافوق مشاہدۂ بشری اور طویل واقعہ کے متعلق جو اس وقت واقع ہوا، جب مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، اور جس قدر تھی، وہ بھی پراگندہ حال اور منتشر الخیال تھی، اور ایک ایسے واقعہ کے متعلق جس کے رواۃ اکثر وہ لوگ ہیں، جو اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے یا بہت چھوٹے تھے، یا مدنی لوگ ہیں جنکو قبل ہجرت کے واقعات کی ذاتی اور بلا واسطہ واقفیت نہ تھی، اگر جزئیات میں معمولی اختلاف یا بعض واقعات کی ترتیب میں تقدم و تاخر واقع ہوا ہے تو انکی تطبیق کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں، خود ہمارے سامنے روزانہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں، ان کے جزئیات کی تفصیل اگر مختلف راویوں سے سنیں، یا مختلف اوقات میں ہم خود بیان کریں، تو ترتیب واقعات اور دیگر جزئی امور میں بیسیوں اختلافات پیدا ہوجائیں گے، بایں ہمہ اصل معاملہ اور اس کے اہم اجزا کے وقوع میں شک و شبہ نہ ہوگا،

[1] امام سہیلی نے روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام میں اسی استدلال کی بنا پر تعدد کا میلان ظاہر کیا ہے
ج اول ص ۲۴۴ مصر

بعض ارباب سیر نے دو دفعہ معراج کا ہونا ظاہر کیا ہے جن میں وہ ایک کو اسرأ اور دوسرے کو معراج کہتے ہیں کہ قرآن میں اسرا، اور احادیث میں معراج کا نام آیا ہے، انھوں نے اس کی ضرورت اس لیے سمجھی ہے کہ قرآن مجید کے پندرہویں پارہ میں اسرا کا جو بیان ہے اس میں صرف مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر مذکور ہے، اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوا، حالانکہ معراج میں تو آسمان تک کا سفر ہوا ہے اور عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں، اور بعض روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا، بہرحال یہ بھی استنباط اور قیاس سے آگے نہیں بڑھتا، قرآن مجید کے الفاظ خواب و بیداری دونوں کے متحمل ہیں، اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج ایک ہی دفعہ واقع ہوئی ہے، علامہ زرقانی نے تصریح کی ہے کہ "یہی جمہور محدثین، متکلمین اور فقہا کی رائے ہے، اور روایات صحیحہ کا تواتر بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے، اور اس سے عدول نہیں کرنا چاہیے"[1] حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں تعدد معراج کے قول کو بالکل لغو اور بے سند اور خلاف سیاق احادیث ٹھہرایا ہے۔

معراج کے وقت اور زمانہ کی تعیین میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے، جبکہ تاریخ اور سنہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی، اور عرب میں عموماً اسلام سے پہلے کسی خاص سنہ کا رواج نہ تھا، تاہم وقت کے متعلق اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ رات کا وقت تھا، خود قرآن مجید میں ہے اسری بعبدہ لیلاً (یعنی لے گیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رات کے وقت) اور تمام روایات بھی اس پر متفق اللفظ ہیں، لیکن صحیح دن اور تاریخ

[1] شرح مواہب جلد اول ص ۳۵۵

کا پتہ لگانا نہایت مشکل ہے، محدثین کے ہاں کسی سے بھی بروایت صحیحہ اس کی تصریح موجود نہیں ہے۔ ارباب سیر نے بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے کچھ روایتیں کی ہیں، لیکن انکی تصریحات مختلف ہیں، تاہم اتنی بات پر بلا اختلاف سب کا اتفاق ہے کہ یہ بعثت اور آغاز وحی[1] کے بعد اور ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جو مکہ معظمہ میں پیش آیا،

مہینہ کی تعیین کے متعلق ارباب سیر کے پانچ اقوال ہیں، کوئی ربیع الاول کہتا ہے کسی[2] نے ربیع الآخر کی روایت کی ہے، بعض رجب کی تعیین کرتے ہیں، بعض رمضان یا شوال کہتے ہیں، یہ آخری روایت سدی کی ہے جس کو ابن جریر طبری اور بیہقی نے نقل کیا ہے، اس کی روایت ہے کہ "معراج ہجرت سے ۱۶ مہینے پیشتر واقع ہوئی، ہجرت اوائل ربیع الاول میں ہوئی ہے، اس بنا پر، ۱۶ مہینے پیشتر آخر رمضان ہوگا، یا آغاز شوال لیکن کون نہیں جانتا کہ سدی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے، واقدی سے ابن سعد نے دو روایتیں کی ہیں[2]، ایک یہ کہ سنیچر کی شب تھی، ۱۷ تاریخ تھی، رمضان کا مہینہ تھا، ہجرت (ربیع الاول سنہ) سے ۱۸ مہینے پیشتر کا یہ واقعہ ہے،" دوسری یہ ہے کہ "یہ ہجرت سے ایک سال پہلے ۱۷ ربیع الاول کا واقعہ ہے،" واقدی نے ان روایات میں کسی قدر تصریح کے ساتھ دن، تاریخ اور وقت بتا دیا ہے لیکن ہمارے علمائے رجال کی عدالت میں انکی شہادت کوئی

---

[1] صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں معراج کے بیان میں شریک نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہو کہ "یہ قبل آغاز وحی کے ہوا" اس سے مطلب محض فرشتوں کا آنا ہو نفس معراج نہیں تفصیل آگے آئیگی [2] ابن سعد جلد اول حصہ ۱ ص ۱۴۳

بڑی قدر وقیمت نہیں رکھتی، چنانچہ ان روایتوں میں بھی جس روایت میں وقت، روز یا تاریخ کی جس قدر تفصیل زیادہ ہے، اسی قدر وہ زیادہ نامعتبر ہے، کیونکہ اس کی سند ناتمام ہے، دوسرے مہینوں کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں۔ ابن قتیبہ دینوری (المتوفی ۲۶۷ھ) اور علامہ ابن عبد البر (المتوفی ۴۶۳ھ) نے رجب کی تعیین کی ہے، اور متاخرین میں امام رافعی اور امام نووی نے (روضہ میں) اسی کو تیقن کے ساتھ ظاہر کیا ہے، اور محدث عبد الغنی مقدسی نے بھی اسی مہینہ کو اختیار کیا ہے، بلکہ ۲۷ تاریخ کی بھی تصریح کر دی ہے، اور علامہ زرقانی نے لکھا ہے کہ "لوگوں کا اسی پر عمل ہے اور بعضوں کی رائے ہے کہ یہی قوی ترین روایت ہے، کیونکہ اصول یہ ہے کہ جب کسی بات میں سلف کا اختلاف ہو، اور کسی رائے کی ترجیح پر کوئی دلیل قائم نہ ہو تو بظن غالب وہ قول صحیح ہوگا جس پر عمل درآمد ہو، اور جو لوگوں میں مقبول ہو[1]"

اس مسئلہ کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ متاخرین کے نقول، قیاسات، استنباطات اور مجادلات سے جو دس سے زیادہ مختلف اقوال پر مشتمل ہیں، قطع نظر کر لیا جائے، اور دیکھا جائے کہ قدیم راویوں کی اصل تصریحات کیا کیا ہیں، اور کثرتِ روایت اور گمانِ صحت کا راجح پہلو کس کی جانب ہے، چنانچہ یہ تصریحات حسب ذیل ہیں،

نام راوی	روایت	کیفیتِ سند
ابن سعد بواسطہ واقدی از حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ	۱۷ ربیع الاول ہجرت سے ایک سال قبل	ابن سعد نے یہ روایت متعدد مسلسل طریقوں سے صحابہؓ

[1] یہ تمام تفصیل زرقانی جلد ۱ ص ۳۵۵ - ۳۵۸ میں مذکور ہے،

نام راوی	روایت	کیفیت سند
وامّ سلمہ و عائشہ و ابن عباس وامّ ہانی رضی اللہ عنہم	"	سے نقل کیا ہے،
۲- موسیٰ بن عقبہ، بواسطۂ زہری	ہجرت سے ایک سال قبل	موسیٰ بن عقبہ کی سیرۃ معتبر ترین کتبِ سیرۃ ہے
۳- زہری، بواسطۂ سعید ابن مسیب	" "	. .
۴- عروہ بن زبیر، از حضرت عائشہ رضؓ	"	. .
۵- قتادہ ،	"	یہ تابعی ہیں ،
۶- مقاتل ،	"	.
۷- ابن جریج	"	.
۸- ابراہیم بن اسحٰق الحربی	۲۷ ربیع الآخر ہجرت سے ایک سال پہلے	. .
۹- مسلم بن قتیبہ	ہجرت سے ۱۸ ماہ پیشتر	یہ مورخ ہیں
۱۰- عمرو بن شعیب از حضرت عمرو بن العاصؓ	۷ ربیع الاول ، ہجرت سے ایک سال پہلے ،	. .

نام راوی	روایت	کیفیت سند
۱۱ - سُدی	ہجرت سے ۱۶ یا ۱۷ مہینے پیشتر	سُدی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے

متاخرین نے امام زہری کے انتساب سے دو اور مختلف اقوال نقل کیے ہیں، ایک ہجرت سے پانچ سال قبل اور دوسرا بعثت سے پانچ سال بعد، پہلے قول کے ناقل علامۂ ابن حجر (فتح الباری جلد، ص ۱۵۵ مصر) ہیں، اور ان کا بیان ہے کہ قاضی عیاض، امام قرطبی اور امام نووی شارحین صحیح مسلم اسی کے موئد ہیں، لیکن امام نووی کی شرح صحیح مسلم مطبوعہ ہندستان ص ۹۱) اور قسطلانی کی سیرۃ مواہب لدنیہ (مطبوعۂ مصر مع زرقانی) میں دوسرا قول منقول ہے زرقانی نے (جلد اول فصل معراج میں) اس اختلاف پر حیرت ظاہر کی ہے، افسوس ہے کہ قلمی نسخے موجود نہیں، ہمارا خیال ہے کہ یہ اختلاف کتابت کی غلطی اور مسامحت سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح اسد الغابہ ابن اثیر مطبوعہ مصر (ص ۲۰) میں سدی کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ کہتا ہے کہ معراج ہجرت سے ۶ مہینے (ستۃ اشہر) پہلے ہوئی" یہ ۶ درحقیقت ۱۶ ہے، "ستۃ اشہر" کے بجائے "ستۃ عشر شہراً" چاہیے جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے اس سے (تفسیر اسراء) نقل کیا ہے، اور جو اسکی ۱۷ مہینے والی روایت کے قریب قریب ہے، جو طبری و بیہقی میں ہے، چھٹی صدی میں علامہ ابن اثیر نے کسی قیاس یا استنباط تاریخی کی بنا پر ہجرت سے تین سال پہلے معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے، مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے

لہ یہ تمام روایات مختلف ماخذوں سے جمع کیگئی ہیں، اول ابن سعد میں ہے، دوم، چہارم یازدہم تفسیر ابن کثیر (سورۂ اسراء ص ۲۰) میں ہے، ہشتم تفسیر ابن جریر (۱۵ - ۲،) میں ہے، پنجم و ششم تفسیر ابن حبان (اسراء ص ۵) میں ہے، بقیہ اقوال روایات کیلیے فتح الباری زرقانی، شرح شفاء عیاض، استیعاب ابن عبد البر، اسد الغابہ ابن اثیر اور روض الانف (ذکر معراج) دیکھیے

کسی اور نے ان کا ساتھ نہیں دیا ہے، اور نہ کہیں سیرت کی امہات کتب میں یہ تاریخ مذکور ہے، بجز اس قیاس کے کہ ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں واقعۂ معراج کو ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات سے پہلے نقل کیا ہے، اور یہ دونوں حادثے ہجرت سے تین سال پہلے پیش آئے تھے اس سے اشارۃً یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ابن اسحاق کا خیال تھا کہ معراج ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی،

ہم نے مقدمہ کی پوری روداد ناظرین کے سامنے رکھدی ہے جس سے معلوم ہوا ہوگا کہ قدیم راویوں کا بڑا حصہ ایک سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرتا ہے، ایک دو بزرگ، یا ۶ مہینے کی مدت اور بڑھا دیتے ہیں، متاخرین میں سے بعض اصحاب نے جو قیاس تاریخی سے تین سال یا پانچ سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرنا چاہا ہے، اس کا مبنی یہ ہے کہ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نماز پنجگانہ کی فرضیت سے پہلے وفات پا چکی تھیں، یہ نماز پنجگانہ بالاتفاق معراج میں فرض ہوئی، پھر بخاری ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے ہجرت سے تین سال پہلے وفات پائی، اور دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے کہ ہجرت سے پانچ سال پہلے انتقال کیا، ان مقدمات کو یکجا کر کے انھوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے (بقول ابن اثیر) یا پانچ سال پہلے (بقول قاضی عیاض وغیرہ) پیش آیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال اُس وقت درست ہو سکتا تھا جب یہ ثابت ہوتا کہ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور حضرت خدیجہؓ کی وفات دونوں ایک ساتھ ہوئیں، یا کم از کم یہ کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کے چند روز بعد پیش آیا، حضرت عائشہؓ کی روایت

سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے معراج (فرضیت نماز پنجگانہ) سے پہلے وفات پائی، اب یہ نہیں معلوم کہ ایک مہینہ پہلے یا سال بھر پہلے یا چند سال پہلے، اس لیے ان قیاسات سے معراج کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔

بہر حال ابتدائی راویوں کی کثیر جماعت جن میں بعض نہایت معتبر اور ثقہ ہیں، اسی جانب ہے کہ یہ ہجرت یعنی ربیع الاول ۱۳ھ سے ایک سال یا ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے، امام بخاری نے جامع صحیح میں گو کوئی تاریخ نہیں بیان کی ہے لیکن ترتیب میں وقائعِ قبلِ ہجرت کے سب سے آخر میں، اور بیعتِ عقبہ اور ہجرت سے متصلاً پہلے واقعۂ معراج کو جگہ دی ہے، اور ابن سعد نے بھی سیرت میں واقعۂ معراج کا یہی موقع ترتیب میں رکھا ہے، اس سے حدیث اور سیرت کے ان دو اماموں کا یہی منشا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہجرت سے کچھ ہی زمانہ پہلے خواہ وہ ایک سال ہو یا اور کچھ کم و بیش، معراج کا زمانہ متعین کرتے ہیں، آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ ہمارے نزدیک قرآن مجید سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے، کہ معراج اور ہجرت کے بیچ میں کوئی زمانہ حائل نہ تھا، بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا۔

مہینہ کی تعیین مشکل ہے، جو لوگ ہجرت یعنی ربیع الاول ۱۳ھ سے ایک سال پہلے کہتے ہیں، ان کے حساب سے اگر یہ ربیع الاول ادھر شامل کر لیا جائے، تو اُدھر معراج کا ایک مہینہ ربیع الآخر پڑے گا، اور اگر شامل نہ کیا جائے تو ربیع الاول رہے گا، اور اگر عام و مشہور و معمول بہ رجب کی تاریخ اختیار کیجائے تو ہجرت سے ایک سال، مہینے پیشتر کا واقعہ تسلیم کرنا ہوگا،

معراج کی صحیح روایتیں

واقعۂ معراج چونکہ نہایت اہم، ہماری مادی کائنات سے ماوراء اور قیاس، استنباط اور عقلِ انسانی کی سرحد سے بالاتر ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس باب میں صحیح و خالص روایتوں کی پیروی کی جائے، احادیث و سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو کثیر التعداد صحابیوں نے بیان کیا ہے، علامۂ زرقانی نے ۴۵ صحابیوں کو نام بنام گنایا ہے، اور حدیث و سیر و تفسیر کی جن جن کتابوں میں ان کی روایتیں مذکور ہیں، ان کی تصریح کی ہے، علامۂ ابن کثیر نے تفسیر (بنی اسرائیل) میں ان میں سے اکثر روایتوں کو یکجا کر دیا ہے ان میں صحیح، مرفوع، قوی، ضعیف، موقوف، مرسل، منکر سبھی قسم کی روایتیں ہیں، صحاح ستہ میں معراج کا واقعہ مستقلاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں ضمناً اور مختصراً یہ واقعات مختلف ابواب میں کہیں کہیں آگئے ہیں، امام بخاری اور مسلم نے اس واقعہ کو حضرت ابو ذرؓ، حضرت مالکؓ بن صعصعہ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابرؓ بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، سات اکابر صحابہ سے روایت کیا ہے، ان میں چار پچھلے صحابیوں نے صرف چند متفرق جزئیات بیان کیے ہیں،

صحیحین میں واقعۂ معراج کا مسلسل اور مفصل بیان حضرت ابو ذرؓ، حضرت مالکؓ ابن صعصعہ اور حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے، حضرت انسؓ نے تین طرق سے روایت کی ہے، ایک طریقہ میں (صحیح مسلم باب الاسراء، اور صحیح بخاری کتاب التوحید) اخیر راوی وہی ہیں، لیکن اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا

یا کسی صحابی نے اُن سے بیان کیا، دوسرے طریقہ میں (صحیح بخاری باب فی ذکر الملائکہ و باب المعراج اور صحیح مسلم باب الاسرا) یہ تصریح ہے کہ انھوں نے حضرت مالکؓ بن صعصعہ سے سنا، اور تیسرے طریقہ (صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ و کتاب الانبیاء) میں یہ صراحت ہے کہ انھوں نے حضرت ابو ذرؓ سے بھی سنا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ نے متعدد اکابر صحابہ سے معراج کا واقعہ سنا تھا، اور اسی لیے ان کا بیان سب سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، تابعین میں سے متعدد بزرگوں نے حضرت انسؓ سے اس روایت کو صحیحین میں نقل کیا ہے، مثلاً ثابت البنانی، ابن شہاب زہری، قتادہ اور شریک بن عبد اللہ بن ابی نمر، ان میں محفوظ تر بیان ثابت کا ہے، شریک کی روایت متعدد امور میں ثقات کی روایت کی مخالف ہے، اور اسی لیے امام مسلم نے صحیح مسلم باب الاسرا میں اس کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے، اور لکھ دیا ہے کہ "ان کی روایت میں تقدم و تاخر اور زیادت و نقص ہے"

حضرت مالکؓ بن صعصعہ اور حضرت ابو ذرؓ نے یہ تصریح کی ہے کہ انھوں نے معراج کے واقعہ کو لفظ بلفظ اور حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے، گو یہ دونوں بزرگوار جلیل القدر صحابی ہیں، لیکن حضرت ابو ذرؓ میں ایک مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ سابقین اسلام میں ہیں، اور وقوعِ معراج سے پہلے ہی مکہ میں آکر اسلام لا چکے تھے حضرت مالکؓ بن صعصعہ انصاری ہیں، اس بنا پر معراج کی تمام روایتوں میں حضرت ابو ذرؓ کی روایت کو ہم سب سے مقدم سمجھتے ہیں،

معراج کا واقعہ | الغرض جب اسلام کی سخت اور پرخطر زندگی کا باب ختم ہونے کو تھا،

اور ہجرت کے بعد سے اطمینان وسکون کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا، تو وہ شب مبارک آئی، اور اس شب مبارک میں وہ ساعت ہمایوں آئی، جو دیوانِ قضا میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرِ ملکوت کے لیے مقرر تھی، اور جس میں پیش گاہِ ربانی سے احکام خاص کا اجرا، اور نفاذ عمل میں آنے والا تھا، رضوانِ جنت کو حکم ہوا کہ آج مہمان سرائے غیب کو نئے ساز و برگ سے آراستہ کیا جائے کہ شاہدِ عالم آج یہاں مہمان بن کر آئے گا، روح الامین کو فرمان پہنچا کہ وہ سواری جو بجلی سے زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام ہے اور جو خطۂ لاہوت کے مسافروں کے لیے مخصوص ہے، حرم ابراہیم (کعبہ) میں لے کر حاضر ہو، کارکنانِ عناصر کو حکم ہوا کہ مملکتِ آب و خاک کے تمام مادی احکام و قوانین تھوڑی دیر کے لیے معطل کر دیے جائیں، اور زمان و مکان، سفر و اقامت، رویت وسماعت، تخاطب و کلام کی تمام طبعی پابندیاں اٹھا دی جائیں،

صحیحین میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے، کہ آپ کے گھر کی چھت کھلی، اور جبریل علیہ السلام نازل ہوئے، انھوں نے پہلے آپ کا سینۂ مبارک چاک کیا، پھر اس کو آب زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے بھر لائے، اور ان کو سینۂ مبارک میں ڈال کر بند کر دیا، پھر آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر لے گئے، جب آپؐ آسمان پر پہنچے تو جبریل علیہ السلام نے آسمان کے داروغہ سے کہا کہ "کھولو" اس نے کہا کہ "کون؟" انھوں نے جواب دیا "جبریل"، اس نے پوچھا کیا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟" انھوں نے کہا "ہاں میرے ساتھ محمدؐ ہیں"، اس نے

سوال کیا "کیا وہ بلائے گئے ہیں"؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا، بہرحال آپ جب پہلے آسمان پر چڑھے تو آپ کو ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا، جس کے دائیں بائیں بہت سی پرچھائیاں تھیں، جب وہ دائیں جانب دیکھتا تھا تو ہنستا تھا، اور جب بائیں جانب نگاہ جاتی تھی تو روتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھکر اُس نے کہا "مرحبا اے نبی صالح اور اے فرزند صالح"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا، "یہ کون ہیں؟" انھوں نے کہا "یہ آدمؑ ہیں، اور ان کے دائیں بائیں کی پرچھائیاں ان کی اولاد کی روحیں ہیں، دائیں جانب والے جنتی، اور بائیں جانب والے دوزخی ہیں، اس لیے وہ دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں، اور جب بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو روتے ہیں"، اس کے بعد آپ دوسرے آسمان پر پہنچے، تو اسی قسم کا سوال وجواب ہوا اور ہر آسمان پر کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی، پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ اور چھٹے پر حضرت ابراہیمؑ سے، (حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے مجھ سے پیغمبروں کے منازل کی تعیین نہیں بیان کی) بہرحال حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو ادریس علیہ السلام کے پاس سے لیکر گذرے، انھوں نے آپ کو دیکھ کر کہا، "مرحبا اے نبی صالح اور برادر صالح"، آپ نے نام پوچھا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نام بتایا، پھر یہی واقعہ حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے ساتھ پیش آیا، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے نبی صالح اور برادر صالح کہکر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبی صالح اور فرزند صالح کہکر آپکا خیر مقدم کیا، اس کے بعد حضرت جبرئیلؑ آپ کو اور اوپر لے گئے، اور آپ اُس مقام پر پہنچے

جہاں قلمِ (قدرت) کے چلنے کی آواز آتی تھی، اس موقع پر خداوند تعالیٰ نے آپ کی امت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عطیۂ ربانی کو لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، تو انھوں نے پوچھا کہ "خدا نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے"، آپ نے فرمایا "پچاس وقت کی نماز"، انھوں نے کہا "خدا کے پاس دوبارہ جائیے کہ آپ کی امت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گئے، اور خدا نے ایک حصہ کم کر دیا، آپ واپس آئے تو حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ "دوبارہ خدا کے پاس جائیے، آپ کی امت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی"، آپ گئے تو خدا نے ایک حصہ کی پھر تخفیف کر دی حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ آپ کی امت میں اس کی بھی قوت نہیں"۔ آپ پھر گئے تو خدا نے اس تعداد کو گھٹا کر پانچ وقت کر دیا، اور ارشاد ہوا کہ "گو نمازیں پانچ وقت کی ہوں گی، لیکن ثواب اُن ہی پچاس وقتوں کا ملے گا، کیونکہ میرے حکم میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تخفیف مزید کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر خدا کے پاس مراجعت کا مشورہ دیا، لیکن آپ نے فرمایا کہ "اب تو مجھے شرم آتی ہے"، اس کے بعد آپ کو سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کرائی گئی، جو ایسے مختلف رنگوں سے ڈھکا ہوا تھا، جن کو آپ جان نہ سکے، پھر آپ کو حضرت جبریل علیہ السلام جنت میں لے گئے، وہاں آپ کو موتی کی عمارتیں نظر آئیں، اور آپ نے دیکھا کہ اس کی مٹی مشک کی ہے۔[۱]

کتبِ حدیث میں واقعۂ معراج کے متعلق یہ مقدم ترین اور معتبر ترین روایت ہے،

---

[۱] بخاری جلد اول باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء

اس کے بعد حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت کا درجہ ہے، اس روایت میں بہت سی باتیں پہلی روایت سے زائد ہیں، حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں ان کی تصریح نہیں کہ کہ آپ اس وقت بیدار تھے یا خواب میں تھے، اس میں یہ ہے کہ آپ خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھے، پہلی روایت میں ہے کہ "آپ نے دیکھا کہ آپ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے۔" اور اس میں ہے کہ "آپ حطیم یا حجر[1] میں لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت جبریلؑ آئے"، حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں براق کا ذکر نہیں، اور اس روایت میں ہے کہ "آپ براق پر سوار ہو کر گئے"۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں منازلِ انبیاء نہیں بیان کیے گئے ہیں، لیکن اس روایت میں نام بنام تصریح ہے حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقات نماز کی تعداد تین مرتبہ میں گھٹائی گئی[2]، لیکن اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس غرض سے خدا کے پاس پانچ بار گئے، ان دونوں روایتوں میں درحقیقت اجمال و تفصیل کا فرق ہے، حضرت ابوذرؓ کی روایت مجمل ہے، اور حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت میں واقعات کی کسی قدر تفصیل ہے، تاہم یہ دوسری روایت بھی معراج کے تمام واقعات و سوانح کو محیط نہیں ہے، اب ذیل میں ہم صحیحین کی تمام روایتوں کو ملا کر معراج کے سوانح و مشاہدات کا ایک جامع بیان لکھتے ہیں

حضرت ابراہیمؑ نے اصل کعبہ کی جو عمارت بنوائی تھی وہ سیلاب سے کئی دفعہ گر چکی تھی، اور پھر

---

[1] حطیم اور حجر ایک ہی مقام کے دو نام ہیں، یہ وہ مختصر سی جگہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے اصل تعمیر کردہ کعبہ میں سے قریش کے بنائے ہوئے کعبہ کی چار دیواری سے باہر رہ گئی ہے اور اندر داخل نہ ہو سکی ہے [2] بخاری باب الانبیاء و باب المعراج

بنی تھی، اسی طرح قریش کے زمانہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز پیغمبر نہیں ہوئے تھے، سیلاب سے گر گئی، قریش نے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہا، تو سرمایہ کی کمی کے باعث ایک طرف اندر کی تھوڑی سی زمین چھوڑ کر دیوار کے طول کو کم کر دیا، اس طرح کعبہ کی تھوڑی سی زمین چار دیواری سے باہر رہ گئی، اور ابتک اسی طرح ہے، اس زمین کا نام حجر اور حطیم ہے، قریش کے نوجوان اور رؤسا، اکثر یہاں رات کو سویا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی یہاں آرام فرمایا کرتے تھے، نبوت سے پہلے بھی آپ کو حالتِ رویا میں فرشتے نظر آتے تھے،[1] جس شب کو معراج ہوئی آپ اُسی مقام پر[2] استراحت فرما رہے تھے، بیداری اور خواب کی

---

[1] بخاری کتاب التوحید وباب صفۃ صلی اللہ علیہ وسلم [2] اس شب کو جس مقام پر آپ استراحت فرماتے تھے اور جہاں معراج کا واقعہ پیش آیا، اس کی تعیین میں اختلاف بیان کیا جاتا ہے صحیحین میں حضرت مالکؓ اور حضرت انسؓ کی جو روایتیں ہیں، ان میں بتصریح تمام یہ مذکور ہے کہ آپ مسجد حرام (کعبہ) میں تھے، اور اسی کے ایک بیرونی گوشہ میں جس کا نام حجر اور حطیم ہے، آپ سو رہے تھے، یہ تو صحیحین کا بیان ہے، بعض نیچے درجہ کی روایتوں میں ہے کہ ام ہانیؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے ہی گھر میں معراج ہوئی، ام ہانیؓ کا گھر شعب ابی طالب میں تھا، یہ روایت مشہور دروغگو کلبی کی ہے، اس میں حد درجہ لغو (غریب و منکر) باتیں مذکور ہیں، مسند ابو یعلیٰ میں ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشا کی نماز پڑھکر ہم لوگوں کے ساتھ میرے ہی مکان میں سوئے، شب کو میری آنکھ کھلی تو آپ کو نہ پایا، رؤسائے قریش کی دشمنی کے باعث دل میں عجیب عجیب بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں، نیند نہ آئی، صبح اٹھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا واقعہ بیان کیا، اور فرمایا کہ میں رؤسائے قریش سے کہنے جاتا ہوں، میں نے آپ کا دامن پکڑ لیا کہ خدا کے لیے ان سے یہ نہ کہیے، وہ تکذیب کریں گے اور آپ کی جان پر حملہ کریں گے، لیکن

ایک درمیانی حالت تھی کہ آپ نے دیکھا کہ آپ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے ان کے ساتھ چند اور فرشتے بھی تھے، پہلے وہ آپ کو چاہ زمزم کے پاس لے گئے، اور وہاں آپ کے سینۂ مبارک کو چاک کیا، اور قلب اطہر کو نکال کر آب زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان وحکمت سے معمور لایا گیا، جبریلؑ نے اس طشت سے ایمان وحکمت کے خزانہ کو لیکر آپ کے سینہ میں رکھکر اس کو برابر کر دیا،

اس کے بعد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا سپید رنگ کا ایک لنبا جانور براق نامی لایا گیا، جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ اس کا ہر قدم وہاں پڑتا تھا، جہاں نگاہ کی آخری حد ہوتی تھی[1]، آپ اس پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے، اور براق کو اس قلا

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۰) آپ نے فرمایا اور دامن جھٹک کر چلے گئے" ان روایتوں میں علاوہ اور لغویات کے عشا اور صبح کی نماز وجماعت کی تصریح کسقدر غلط ہے، کہ یہ نماز پنجگانہ تو عین شب معراج میں فرض ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایتیں صحیحین کے مقابلہ میں کیا رتبہ اور اعتبار ہو سکتا ہے، اسلیے اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج کی شب آپ خانۂ کعبہ میں تھے، البتہ بخاری ومسلم میں حضرت ابوذرؓ کی روایت میں ہے کہ "میں مکہ میں تھا کہ میرے گھر کی چھت کھلی اور جبریلؑ آئے" ہمارے نزدیک اسکی صحیح تعبیر یہ ہے کہ آپ آرام تو خانہ کعبہ ہی میں فرما رہے تھے، لیکن مشاہدہ آپ کو یہ کرایا گیا کہ آپ اپنے گھر میں ہیں اور اسکی چھت کھلی اور حضرت جبریل نازل ہوئے، [1] مسند احمد میں بروایت انس اور ترمذی اور ابن جریر طبری میں ہے کہ جب آپ نے براق پر سوار ہونے کا قصد کیا، تو اس نے شوخی کی، جبریل نے کہا کیوں شوخی کرتا ہے، تیری پشت پر آج تک محمدؐ سے زیادہ خدا کے نزدیک برگزیدہ کوئی دوسرا سوار نہیں ہوا، یہ سنکر براق پسینہ پسینہ ہو گیا، ابن جریر کی روایت کی نسبت حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس کے بعض الفاظ میں نکارت وغرابت ہے، ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ غریب ہے، غریب لا نعرفہ الا من حدیثہ۔

ہیں باندھ کر جس میں انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ آپؐ نے مسجد اقصیٰ کے اندر قدم رکھا اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی۔ یہاں سے نکلے تو جبرئیلؑ نے شراب اور دودھ کے دو پیالے آپؐ کے سامنے پیش کیے، آپؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، جبرئیلؑ نے کہا: آپؐ نے فطرت کو پسند فرمایا، اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ بعد ازیں جبرئیلؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آسمان پر چڑھے، پہلا آسمان آیا تو جبرئیلؑ نے دربان کو آواز دی، اس نے کہا "کون ہے؟" جبرئیلؑ نے اپنا نام بتایا، پوچھا تمہارے ساتھ اور کون ہے؟" جواب دیا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔" پھر دریافت کیا "کیا وہ بلائے گئے ہیں؟" کہا "ہاں"۔ یہ سن کر فرشتہ نے دروازہ کھول دیا، اور مرحبا خوش آمدید کہا، اور کہا کہ "اس خبر کو سن کر آسمان والے خوش ہوں گے، خدا اہل زمین کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، جبتک وہ آسمان والوں کو اس کا علم نہ بخشے وہ جان نہیں سکتے"۔ اب آپؐ پہلے آسمان میں داخل ہوئے، تو ایک شخص نظر آیا، جس کی داہنی اور بائیں طرف بہت سی پرچھائیاں تھیں، جب وہ داہنی طرف دیکھتا تو ہنستا، اور جب بائیں طرف دیکھتا تو رو دیتا تھا۔ وہ آپؐ کو دیکھکر بولا "مرحبا اے نبی صالح و اے فرزند صالح!" آپؐ نے جبرئیلؑ سے دریافت کیا کہ "یہ کون ہیں؟" جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ آپؐ کے باپ آدمؑ ہیں، ان کی داہنی اور بائیں طرف جو پرچھائیاں ہیں، یہ انکی اولادوں کی روحیں ہیں، داہنی طرف والے اہل جنت ہیں، اور بائیں طرف والے دوزخی ہیں، اس لیے جب اُدھر دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، اور ادھر دیکھ کر آزردہ ہوتے ہیں، اسی آسمان میں آپؐ کو آمنے سامنے

دو نہریں نظر آئیں، پوچھنے پر جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ نیل اور فرات کی سوتیں ہیں، چلتے پھرتے آپ کو ایک اور نہر نظر آئی، جس پر لولو و زبرجد کا ایک محل تعمیر تھا، اور اسکی زمین مشک اذفر کی تھی، جبرئیل نے کہا "یہ نہر کوثر ہے، جس کو پروردگار نے مخصوص آپکے لیے رکھا ہے"

اسی طرح ہر آسمان پر گذرتے گئے اور ہر آسمان کے دربان اور جبرئیلؑ سے اسی قسم کی گفتگو ہوتی گئی، اور ہر ایک میں کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی، دوسرے میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے جو دونوں خالہ زاد بھائی تھے، ملاقات ہوئی، تیسرے میں حضرت یوسفؑ جن کو حسن کا ایک حصہ عطا ہوا تھا، چوتھے میں حضرت ادریسؑ سے ملاقات ہوئی جن کی نسبت خدا نے قرآن میں فرمایا ہے، وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (ہم نے اس کو ایک بلند مقام تک اٹھایا ہے) اور پانچویں میں حضرت ہارونؑ سے ملے، اور ہر ایک نے "اے پیغمبر صالح اور اے برادر صالح" کہکر خیر مقدم کیا، چھٹے میں حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے کہا "مرحبا اے پیغمبر صالح اور اے برادر صالح!" جب آپؐ آگے بڑھے تو حضرت موسیٰؑ رو پڑے، آواز آئی کہ "اے موسیٰؑ! اس گریہ کا کیا سبب ہے"۔ موسیٰؑ نے عرض کیا "خداوندا! میرے بعد تو نے اس نوجوان کو مبعوث کیا ہے، اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ بہشت میں جائیں گے"۔

ساتویں آسمان میں داخل ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ نے "مرحبا اے پیغمبر صالح اور اے فرزند صالح" کہکر خیر مقدم کیا، جبرئیلؑ نے بتایا کہ "یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ ہیں"، حضرت ابراہیمؑ بیت معمور (آباد گھر) سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے، جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، آپؐ کو جنت کی سیر کرائی گئی، جس کے گنبد موتی کے تھے، اور زمین مشک

کی تھی،[1] اس مقام تک پہنچے جہاں قلم قدرت کے چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی، آگے بڑھکر آپؐ سدرۃ المنتہیٰ (انتہا کی بیری کا درخت) تک پہنچے، اس درخت پر شان ربانی (امر اللہ) کا پرتو تھا جس نے آکر جب اس کو چھا لیا، تو اس کی ہیئت بدل گئی، اور اس میں حسن کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس کو کوئی زبان بیان نہیں کر سکتی، اور اس میں رنگ برنگ کے ایسے انوار کی تجلی نظر آئی جن کو الفاظ ادا نہیں کر سکتے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں نیچے زمین پر اترتی ہیں، اور زمین سے چڑھ کر اوپر وہاں جاتی ہیں، یہاں پہنچکر حضرت جبرئیل اپنی اصلی کمالی صورت میں آپ کے سامنے نمودار ہوئے، پھر شاہد مستور ازل نے چہرہ سے پردہ اٹھایا، اور خلوت گاہ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام ادا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی، فاوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ،

---

[1] کتب روایت کی غیر محتاط کتابوں میں مثلاً ابن ابی حاتم (تفسیر) ابن جریر طبری (تفسیر بنی اسرائیل) بیہقی (دلائل النبوۃ) میں جنت و دوزخ کے بہت سے عجیب و غریب مناظر و مشاہدات اور پیغمبروں اور فرشتوں کی تعجب انگیز ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی تفصیل ہے، ان روایتوں کے ناقل ابو ہارون العبدی، ابو جعفر رازی اور خالد بن یزید ہیں، ابو ہارون عبدی اور خالد بن یزید تو مشہور دروغ گو ہیں، ابو جعفر رازی کو گو بعضوں نے ثقہ کہا ہے، لیکن اکثروں کے نزدیک وہ ضعیف اور راوی منکرات ہیں، اور ان کی تنہا روایت قبول نہیں کیجاتی، نیز ان روایتوں میں بہت سی لغو و منکر باتیں مذکور ہیں، جن کو محدثین تسلیم نہیں کرتے، علاوہ ازیں یہ مناظر و مشاہدات جیسا کہ صحیح بخاری (باب الرویا) میں ہے کہ معراج کے سوا ایک اور موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے گئے تھے، سرے سے یہ معراج کے مشاہدات ہی نہیں،

اس وقت آپ کو بارگاہ الٰہی سے تین عطیے مرحمت ہوئے، سورۂ بقر کی آخری آیتیں جن میں اسلام کے عقائد و ایمان کی تکمیل اور اُس کے دور مصائب کے خاتمہ کی بشارت ہے، رحمتِ خاص نے مژدہ سنایا کہ امتِ محمدی میں سے ہر ایک جو شرک کا مرتکب ہوا ہو، کرم مغفرت سے سرفراز ہوگا، اور ندا آئی۔ امت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی، آپ ان عطیوں کو لیکر واپس پھرے، اور حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچے، تو انھوں نے دریافت کیا کہ بارگاہِ خاص سے کیا احکام عطا ہوئے؟ فرمایا "امت پر پچاس وقت کی نماز" موسیٰؑ نے کہا "میں نے بنی اسرائیل کا خوب تجربہ کیا ہے، آپ کی امت سے یہ بار نہ اٹھ سکے گا۔" "آپ واپس جائیے اور عرض کیجیے"۔ آپ نے حضرت کی اور عرض پرداز ہوئے کہ "بارالٰہا میری امت نہایت کمزور اور اسکے قویٰ نہایت ضعیف ہیں"، حکم ہوا کہ "دس وقت کی نمازیں معاف ہوئیں"۔ لوٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر ٹوکا، اور دوبارہ عرض کرنے کا مشورہ دیا، اس پر دس اور معاف ہوئیں، اسی طرح آپ چند بار حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے بارگاہ الٰہی میں عرض پرداز ہوتے رہے، یہانتک کہ شب و روز میں صرف پانچ وقت کی نمازیں رہ گئیں، حضرت موسیٰؑ نے پھر بھی مشورہ دیا کہ اب بھی مزید تخفیف کی درخواست کیجیے۔ فرمایا "اب مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے"۔ ندا آئی کہ "اے محمد! میرے حکم میں تبدیلی نہیں، نمازیں پانچ ہوں گی، لیکن ہر نیکی کا بدلہ دہ گونہ بخشوں گا، یہ پانچ بھی پچاس ہونگی میں نے اپنے بندوں پر تخفیف کر دی، اور اپنا فیصلہ نافذ کر دیا۔"

اب آسمان سے اتر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر تشریف لائے، اور بیت المقدس میں داخل ہوئے، دیکھا کہ یہاں انبیا علیہم السلام کا مجمع ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ

نماز میں مصروف ہیں، آپ نے ان میں سے چند پیغمبروں کی شکل وصورت بھی بیان کی، حضرت موسیٰؑ کی نسبت فرمایا کہ "ان کا لمبا قد اور گندمی رنگ تھا، اور الجھے ہوئے گھونگروالے بال تھے، از دشنوہ کے قبیلہ کے آدمی معلوم ہوتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کا قد میانہ اور رنگ سرخ سپید تھا، سر کے بال سیدھے اور لمبے تھے، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں، عروہؓ بن مسعود ثقفی (صحابی)، سے ان کی صورت ملتی تھی، حضرت ابراہیمؑ کی صورت ہمارے پیغمبر (خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سی تھی) بہرحال اسی اثناء میں نماز (غالباً صبح کی نماز کا وقت) آ گیا، سرور انبیاء علیہ السلام منصبِ امامت سے سرفراز ہوئے، نماز سے فراغت ہوئی، تو ندا آئی کہ "اے محمد دوزخ کا داروغہ حاضر ہے، سلام کرو" آپ نے مڑکر دیکھا تو داروغۂ دوزخ نے سلام کیا،

بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ شبِ معراج میں دجال بھی آپ کو دکھایا گیا، (باب بدء الخلق)

لہ مسند احمد اور سیرت ابن اسحاق کی بعض روایتوں میں ہے کہ آسمان پر جانے سے پہلے ہی بیت المقدس میں انبیاءؑ نے آپ کی اقتدا میں یہ نماز پڑھی تھی، صحیح بخاری میں اس کا ذکر نہیں، صحیح مسلم میں وقت کی تصریح نہیں، مگر قرینہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واپسی کا واقعہ ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اسی کو صحیح لکھا ہے، (تفسیر سورۂ اسراء) اور ہم نے اسی کی تقلید کی ہے، ترمذی (تفسیر سورۂ اسراء) اور مسند ابن حنبل میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد اقصیٰ میں آتے جاتے سرے سے نماز ہی نہیں پڑھی، مگر صحیح مسلم کے مقابلہ میں اس کو کون تسلیم کرے گا،

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد آپ مسجد حرام (کعبہ) میں صبح کو بیدار ہوئے[1]

کفار کی تکذیب خانۂ کعبہ کے آس پاس رؤسائے قریش کی نشست رہتی تھی، آپ بھی وہیں مقام حجر میں تشریف فرما تھے۔ صبح کو آپ نے اُن سے اس واقعہ کو بیان کیا تو انکو سخت اچنبھا ہوا، جو زیادہ کور باطن تھے، انھوں نے آپ کو (نعوذ باللہ) جھٹلایا، بعضوں نے مختلف سوالات کیے، ان میں اکثر شام کے تاجر تھے، اور انھوں نے بیت المقدس کو بارہا دیکھا تھا، اور انھیں معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس نہیں گئے ہیں، اسلیے آخر میں خاتمۂ دلائل کے طور پر سب نے کہا کہ "اے محمدؐ تم کہتے ہو کہ صرف ایک شب میں تم خانۂ کعبہ سے بیت المقدس گئے، اور واپس آئے، اگر یہ سچ ہے تو بتاؤ بیت المقدس کی کیا ہیئت ہے"؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میرے ذہن میں عمارت کا صحیح نقشہ نہ تھا، بہت بیقراری ہوئی کہ ناگاہ نظر کے سامنے پوری عمارت جلوہ گر کر دی گئی، وہ سوال کرتے جاتے تھے، اور میں اس کو دیکھکر جواب دیتا جاتا تھا"

اتنا واقعہ تو صحیحین میں مذکور ہے لیکن واقدی، ابن اسحاق، ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم، بیہقی اور حاکم میں جن کا مرتبہ کتب روایات میں بلند نہیں ہے، اس واقعہ پر لوگوں نے عجیب و غریب حاشیے لگائے ہیں، حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ "صبح اٹھ کر

[1] معراج کے یہ تمام واقعات صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ، کتاب التوحید، کتاب الانبیاء، باب المعراج، باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور باب بدء الخلق میں اور صحیح مسلم باب المعراج اور اس کے بعد کے متفرق ابواب متعلقۂ معراج میں حرفاً حرفاً مذکور ہیں، ہم نے ان واقعات کے لکھنے میں صرف ترتیب و ترجمہ کا فرض ادا کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر والوں سے شب کا واقعہ بیان کرکے باہر جانا چاہا کہ اور لوگوں سے بیان کریں، تو میں نے دامن تھام لیا کہ اس کا قصد نہ کیجئے، کفار صریح جھٹلائیں گے"۔ ایک روایت میں ہے کہ "رات کو جب آپ کے اعزہ نے آپ کو بستر پر نہ پایا تو ان کو قریش کا خوف ہوا کہ انھوں نے تو آپ کو گزند نہیں پہنچایا، اور پہاڑوں اور غاروں میں آپ کو ڈھونڈنے لگے"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ "معراج کی واپسی میں قریش کے ایک تجارتی قافلہ سے آپ کی ملاقات ہوئی، اور ان کے ساتھ کچھ واقعات پیش آئے، جب لوگوں نے جھٹلایا، تو آپ نے فرمایا کہ "اچھا تمھارا قافلہ کل پرسوں تک آجائے گا، اس سے پوچھ لینا" چنانچہ وہ آیا، اور اس نے تصدیق کی"۔ ان ہی روایتوں کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ "کچھ کفار دوڑے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے کہ آج محمدؐ کعبہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ رات کو وہ بیت المقدس گئے اور آئے"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ "کیا واقعی آپ یہ فرما رہے ہیں"؟ لوگوں نے کہا "ہاں" حضرت ابوبکرؓ نے کہا "میں تو آپ کو سچا جانتا ہوں، اور اس پر ایمان لاتا ہوں"۔ کفار نے کہا "تم کھلا کھلا ایسی خلافِ عقل بات کیونکر صحیح سمجھتے ہو"! جواب دیا "میں تو اس سے بھی زیادہ خلافِ عقل بات پر یقین رکھتا ہوں، میں تو یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہر روز آپ کی خدمت میں آسمان سے فرشتے آتے ہیں، اسی دن سے حضرت ابوبکرؓ کا لقب صدیق ہو گیا۔

لیکن یہ تمام قصے سرتاپا لغو اور باطل ہیں، ابن اسحٰق اور ابن سعد نے تو سرے سے ان واقعات کے اسناد ہی نہیں لکھے ہیں، ابن جریر طبری، بیہقی، ابن ابی حاتم، ابو یعلی، ابن عساکر

اور حاکم نے ان کی سندیں ذکر کی ہیں، ان کے رواۃ ابو جعفر رازی، ابو ہارون عبدی اور خالد بن یزید بن ابی مالک ہیں جن میں پہلے صاحب گو بجائے خود ثقہ ہیں، مگر بے سر و پا حدیثوں کے بیان کرنے میں بیباک ہیں، بقیہ دو مشہور دروغ گو، کاذب اور قصہ خواں ہیں، ان ہی لغو قصوں کا اختتامی جزو یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے معراج کا واقعہ بیان کیا تو بہت سے مسلمانوں کے ایمان بھی متزلزل ہو گئے، اور مرتد ہو گئے، فارتد کثیر من اسلم، یہ قصہ غالباً قرآن مجید کی اس آیت کی غلط توضیح میں گھڑا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ	ہم نے یہ دکھاوا جو تجھ کو دکھایا ہو اس کو
إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ (اسراء ۶)	لوگوں کی آزمایش ہی کے لیے کیا ہے،

ابن سعد اور واقدی نے اس قصہ کو یوں ہی بے سند بیان کیا ہے، طبری، ابن ابی حاتم، اور بیہقی وغیرہ کے معتمد ارکان وہی اصحاب ثلثہ ہیں، جن کے اوصاف گرامی ابھی اوپر گذر چکے ہیں، ابن جریر نے اس آیت کے تحت میں جو روایتیں درج کی ہیں، ان میں سے حسن، قتادہ اور ابن زید سے یہ واقعۂ ارتداد مذکور ہے، لیکن ان کا سلسلہ ان سے آگے نہیں بڑھتا، اس واقعہ کے انکار کی سب سے پرزور دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ اس وقت تک مکہ میں جو اصحاب اسلام لائے تھے، وہ گنے چنے لوگ تھے، جو ہم کو نام بنام معلوم ہیں، ان میں سے کسی کی پیشانی پر ارتداد کا داغ نہیں، واقعہ کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کافروں میں بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اس سے پہلے آپ کے سخت

مخالف نہ ہوں اور اگر آپ کو پیغمبر نہ جانتے ہوں مگر آپ کو مفتری اور کاذب بھی نہ کہتے ہوں لیکن اس واقعۂ معراج کے بعد سے انھوں نے بھی آپ کے ساتھ اس نیکی اور حسن ظن کے خیال کو اٹھا دیا ہو، قرآن مجید نے اس کو فتنة للناس لوگوں کے لیے آزمایش کہا ہے، فتنة للمومنين یعنی مومنوں اور مسلمانوں کے لیے آزمایش نہیں کہا ہے، اور اگر ان کے لیے بھی آزمایش ہو تو اس آیت سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس آزمایش میں پورے نہیں اترے!

کیا آپ نے معراج میں خدا کو دیکھا معراج کے مشاہدات شئون وصفات کی جلوہ انگیزی اور آیات اللہ کی نیرنگی تو آپ نے دیکھی، لیکن کیا ذاتِ الٰہی بھی جلوۂ حجاب سے باہر اگر منصۂ حقیقت پر رونما ہوئی؟ یعنی دیدار الٰہی سے بھی آپ مشرف ہوئے، بعض روایتوں میں اسکا جواب اثبات میں ملتا ہے، صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے شریک بن عبد اللہ نے جو معراج کی روایت کی ہے، اس کے آخر میں ہے،

حتی جاء سدرة المنتهی و	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہی تک پہنچے
دنا الجبار رب العزة فتدلی	تو عزت والا جبار (خدا) یہاں تک قریب ہوا
حتی کان منه قاب قوسین	اور جھک آیا کہ اسکے اور آپکے درمیان دو
او ادنی (بخاری کتاب التوحید)	کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا،

محدثین نے شریک کی اس روایت کے اس حصہ پر سخت اعتراضات کیے ہیں اور سب سے پہلے امام مسلم نے اس کی نسبت بے احتیاطی کا الزام قائم کیا ہے، صحیح مسلم باب المعراج

میں شریک کی اس سند کو اور کسی قدر متن کو لکھ کر ناتمام چھوڑ دیا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے فنقد مرفیہ واخرونراد ونقص "شریک نے اس روایت میں واقعات کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور گھٹا بڑھا دیا ہے، امام خطابی نے لکھا ہے کہ "صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو بظاہر اس قدر قابلِ اعتراض ہو جس قدر یہ حدیث"، اس کے بعد اس حدیث کی تاویل بیان کر کے لکھا ہے،

فانہ کثیر التفرد بمناکیر	شریک ایسے منکر الفاظ خود تنہا بکثرت
الالفاظ التی لایتابعہ علیھا	روایت کرتے ہیں جن کی تائید ان کے
سائر الرواۃ	دیگر ہم درس راوی نہیں کرتے۔

اور حضرت انسؓ سے واقعۂ معراج کو اور بہت سے لوگوں نے نقل کیا ہے، مگر شریک کے سوا کسی اور نے ان الفاظ کی روایت نہیں کی ہے، امام بیہقی نے بھی یہی کہا ہے، اور یہی حافظ ابن کثیر کی بھی تحقیق ہے[1]، علامہ ابن حزم نے بھی اس کے متعلق قریب یہی رائے ظاہر کی ہے[2] بعض علماے رجال نے بھی شریک کی نسبت اچھی رائیں نہیں ظاہر کی ہیں، نسائی اور ابن جارود کا قول ہے کہ "وہ قوی نہیں"، یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ "اس سے حدیث نہ بیان کی جائے"، البتہ ابن سعد اور ابو داؤد نے ان کے وثوق کی شہادت دی ہے اس لیے محدثین کا فیصلہ ان کے حق میں یہ ہے کہ "جب وہ تنہا کسی بات کو بیان کریں تو

---

[1] بیہقی اور ابن کثیر کا قول تفسیر ابن کثیر سورۂ اسراء میں ہے [2] امام خطابی اور ابن حزم کے اقوال ابن حجر نے فتح الباری جلد ۱۳ ص ۴۰۳ و ۴۰۴ (مصر) میں نقل کیے ہیں،

اُن کی وہ بات شاذ اور منکر قرار دیجائیگی، چنانچہ اس روایت میں یہ فقرہ بھی اسی قسم کا ہے،

اصل یہ ہے کہ شریک کی یہ روایت سورۂ والنجم کی ان آیتوں کی تعبیر پر مبنی ہے،

عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ذُوْمِرَّۃٍ	محمدؐ کو پرزور اور طاقتور نے تعلیم دی، وہ
فَاسْتَوٰی وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی	آسمان کے بلند تر افق پر تھا، پھر قریب ہوا
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ	اور جھک آیا، یہانتک کہ دو تیر یا کمان کے برابر
قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحٰی اِلٰی	یا اس سے بھی قریب تر ہو گیا، پھر اسکے بندے
عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی مَاکَذَبَ الْفُؤَادُ	کیطرف جو کچھ وحی کرنا تھی، کی، دل نے جو کچھ
مَارَاٰی اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی	دیکھا غلط نہیں دیکھا، وہ جو کچھ دیکھتا ہے
وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی عِنْدَ	کیا تم لوگ اس سے اسکے متعلق آپس میں تک
سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی عِنْدَھَا	کرتے ہو، حالانکہ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک
جَنَّۃُ الْمَاْوٰی اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ	جس کے پاس جنت الماویٰ ہے، اس نے
مَا یَغْشٰی مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا	دوسری مرتبہ یقیناً اور بیشک اترتے ہوئے
طَغٰی وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ	دیکھا، جبکہ سدرۃ کو چھالیا تھا جس نے
رَبِّہِ الْکُبْرٰی	چھالیا تھا، نگاہ نہ جھپکی نہ بہکی، اور اس نے
(والنجم - ۱)	اپنے پروردگار کی عظیم الشان نشانیاں دیکھیں،

یہی آیتیں ہیں جن کی بنا پر صحابہ میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ آپ کو خود خدا نظر آیا اور اکثر صحابہ یہ کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا، ترمذی (تفسیر سورۂ نجم) میں حضرت عبداللہؓ

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس خود خدا کو دیکھا تھا، ترمذی ہی میں ہے کہ ایک مقام پر کعب احبار (نومسلم یہودی عالم) سے حضرت ابن عباسؓ کی ملاقات ہوئی، کعب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور اپنے دیدار کی موسیٰ اور محمد علیہما السلام میں تقسیم کر دی، چنانچہ حضرت موسیٰؑ کو دو دفعہ شرفِ کلام حاصل ہوا، اور آپ دو دفعہ خدا کے دیدار سے مشرف ہوئے، مسروق حضرت عائشہؓ کے ایک شاگرد نے یہ گفتگو ان سے جا کر نقل کی، وہ نہایت برہم ہوئیں اور قرآن مجید کی آیتوں سے انھوں نے اس خیال کی تردید کی کہ خدا خود فرماتا ہے، لا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ "آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں"، حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے اس آیت کو پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ "ہاں سچ ہے، مگر اس وقت جب خدا اپنے اصلی نور میں نمایاں ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دو دفعہ دیکھا تھا[۱]"

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے خدا کو بھی دیکھا ہے"؟ فرمایا "وہ تو نور ہے، میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں"، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "میں نے صرف ایک نور دیکھا[۲]"

---

[۱] یہ تمام روایتیں ترمذی تفسیر سورۂ والنجم میں ہیں اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے [۲] مسلم جلد ۱ صفحہ ۹۳ باب الاسراء و ترمذی تفسیر سورۂ نجم۔

اکابر صحابہ میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کا مذہب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو نہیں دیکھا، بلکہ جبریلؑ کو دیکھا تھا، اور ان ہی نے آپ کی طرف وحی کی تھی، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ کو اس حالت میں دیکھا کہ اُن کے چھ سو پر تھے، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے، تمام صحابہ میں حضرت عائشہؓ کو اس مسئلہ پر سخت اصرار تھا، صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ حضرت مسروقؒ نے حضرت عائشہؓ سے ایک بار پوچھا کہ "مادرمن! کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا کو دیکھا تھا؟" بولیں "یہ سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، تین باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق اگر کوئی شخص روایت کرے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ جھوٹ کہتا ہے، جس نے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا، اس نے جھوٹ کہا، خدا خود کہتا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ	خدا کو نگاہیں نہیں پاسکتیں، اور وہ
يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ	نگاہوں کو پالیتا ہے، اور وہ
اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (انعام-۱۳)	لطیف وخبیر ہے

پھر فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ	اور کسی آدمی میں یہ قوت نہیں کہ وہ خدا سے کلام
إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ (شوریٰ)	کرے لیکن یہ کہ بذریعۂ وحی کے یا پردے کے آڑ سے،

ان آیتوں کو پڑھکر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو نہیں دیکھا، البتہ حضرت جبریلؑ کو ان کی اصلی صورت میں دو بار دیکھا، امام نووی شارح صحیح مسلم نے لکھا ہے[1] کہ "حضرت عائشہؓ کا یہ قول حجت نہیں ہو سکتا، کیونکہ انھوں نے قرآن مجید کی آیات سے صرف عقلی استدلال کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع روایت نہیں بیان کی کہ آپ نے خدا کو نہیں دیکھا تھا" لیکن خود صحیح مسلم میں جس کی شرح میں امام نووی رح نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے، اسی مقام پر حضرت مسروقؓ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ کے پاس تکیہ لگائے ہوئے بیٹھا تھا، انھوں نے کہا "اے ابو عائشہ: تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی نے ایک کو بھی کہا تو اس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا" میں نے پوچھا وہ کیا باتیں ہیں، فرمایا جس شخص نے یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا، اس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی ہے، میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا، یہ سن کر سیدھا اٹھ بیٹھا، اور کہا کہ اے ام المومنین! جلدی نہ کیجئے، کیا خدا خود نہیں فرماتا

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (تکویر-۱) — اور اس نے اس کو افق المبین پر دیکھا،

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (نجم-۱) — اور اس نے اس کو دوسری مرتبہ اترتے ہوئے دیکھا،

بولیں سب سے پہلے خود میں نے اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا، آپ نے فرمایا یہ جبریلؑ تھے، میں نے ان دو مرتبوں کے سوا ان کو اصلی صورت میں کبھی نہیں دیکھا[2] " اس سے زیادہ مستند مرفوع روایت کیا ہو سکتی ہے، برخلاف اس کے حضرت ابن عباسؓ نے

---

[1] شرح صحیح مسلم نووی نولکشور ص ۹۷، [2] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۹۸ مصر، باب ذکر سدرۃ المنتہیٰ؛

(جن سے روایتیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا) کبھی اپنی روایت میں یہ تصریح نہیں کی ہے کہ انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ صحابہ میں سے کوئی حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر کا مخالف نہیں ہے (تفسیر سورہ اسرا)

بلکہ اصل یہ ہے کہ بقول ابن حجر حضرت ابن عباسؓ کے خیال کی تشریح میں بعض راویوں سے غلط فہمی ہوئی ہے حضرت ابن عباسؓ کا یہ منشا نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھا، بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی آنکھوں سے جلوۂ ربانی کا مشاہدہ کیا، صحیح مسلم (متعلقاتِ اسراء) اور جامع ترمذی (تفسیر والنجم) میں ان کے یہ الفاظ ہیں، رائی بقلبہ مرتین بفوادہ، دل کی آنکھوں سے دیکھا چشم قلب سے مشاہدہ کیا، مردویہ نے اس سے بھی زیادہ انکے تصریحی الفاظ نقل کیے ہیں۔

لم یرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعینہ انما راہ بقلبہ (فتح الباری جلد ۸ ص۴۶۸)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا بلکہ اپنے قلب سے دیکھا۔

اس تشریح کے بعد اس باب میں کوئی نزاع باقی نہیں رہجاتی، رہی یہ بات کہ دل کا دیکھنا اور قلب کا مشاہدہ کیا ہے؟ تو اس رمز کو وہی سمجھے جس کے دل میں نور بصیرت اور جس کے دل میں مشاہدہ کی طاقت ہو

معراج جسمانی تھی یا رُوحانی خواب تھا یا بیداری

ہمارے متکلمین اور شراح حدیث نے اس باب میں بے سود مباحث کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ فیصلہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ متکلمانہ اعتراضات فلسفیانہ خدشات اور عقلی محالات اور نیز عامیانہ ظواہر پرستی اور جمہور کے خیالات کی بیجا حمایت کے وسوسوں سے خالی الذہن ہو کر صحیح روایتوں کے اصل الفاظ پر غور کیا جائے، اس

سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ سورہ اسرا (معراج) کی اس آیت کی نسبت

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنٰكَ	ہم نے جو رویا (دکھاوا) تجھکو دکھایا، اس کو
إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (بنی اسرائیل)	ہم نے لوگوں کے لیے صرف آزمایش بنایا ہے،

بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ معراج کے متعلق ہے رویاء عربی زبان میں "دکھاوا" کو کہتے ہیں، یعنی "جو دیکھنے میں آئے" اور عام طور سے اس کے معنی "خواب" کے ہیں، اس لیے جو فریق معراج کو خواب بتاتا ہے، وہ اس آیت کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتا ہے، لیکن صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت میں یہ اُن کی تصریح ہے کہ اس آیت میں رویا کے معنی مشاہدۂ چشم کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ واقعۂ معراج خواب نہ تھا، بلکہ آنکھوں کا مشاہدہ تھا، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ	ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں کہ ہم نے
وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ	جو رویا تجھ کو دکھایا اس کو نہیں بنایا لیکن
إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ، قال	لوگوں کے لیے آزمایش" کہتے ہیں کہ یہ
هِيَ رُؤْيَا عين اریها	آنکھ کا مشاہدہ تھا، جو رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا، جب آپؐ کو
لما اسری بہ الی بیت	رات کے وقت بیت المقدس
المقدس (بخاری باب الاسراء)	لے جایا گیا،

اس پر یہ لغوی بحث چھڑ گئی کہ رویا لغت میں "آنکھ کے دیکھنے" کو نہیں کہتے.

مگر ذرا غور کیجئے کہ حضرت ابن عباسؓ سے بڑھ کر لغت عرب کا واقفکار اور کون ہو سکتا ہے جب وہ رویاے عین کہتے ہیں تو کس کو انکار ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں راعی اور متنبیؔ بعض عرب شعراء نے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کو بھی "رویا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے،

راعی کہتا ہے:- فکبّر للرؤیا وھشّ فؤادہ

متنبیؔ کا مصرع ہے: ورؤیاك احلیٰ فی العیون من الغمض

صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل اور حدیث کی دیگر معتبر کتابوں میں جن میں معراج کے مسلسل اور تفصیلی واقعات درج ہیں، ان سب کو ایک ساتھ پیش نظر رکھنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ صحیحین کی دو روایتوں کے سوا باقی روایتوں میں خواب کا مطلق ذکر نہیں ہے، چنانچہ بخاری و مسلم اور مسند ابن حنبل میں حضرت ابوذرؓ کی جو صحیح ترین روایت ہے، اور حضرت انسؓ کی وہ روایت جو ثابت البنانی کے ذریعہ سے ہے، خواب کے ذکر سے قطعاً خالی ہے، اس لیے حسب محاورۂ عام اس کو بیداری کے معنی میں سمجھنا قطعی ہے، لیکن حضرت انسؓ کی اس روایت میں جو شریک کے واسطہ سے ہے، یہ مذکور ہے کہ یہ واقعہ آنکھوں کے خواب اور دل کی بیداری کی حالت میں پیش آیا، بخاری میں یہ حدیث کتاب التوحید اور باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم دو مقامات میں ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

سمعت انس بن مالك یقول	انس بن مالک کو میں نے اس شب کا واقعہ
لیلۃ اُسری برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	جب آپ کو کعبہ کی مسجد سے لیجایا گیا (معراج)

من مسجد الكعبة انه جاءه	بیان کرتے ہوئے سنا کہ اس سے پہلے کہ آپ کی
ثلثة نفر قبل ان یوحیٰ الیه	طرف وحی بھیجی جائے، آپ کے پاس تین شخص
وهو نائم فی المسجد الحرام	آئے اور اس وقت مسجد حرام میں سوئے
فقال اولهم ایهم هو فقال	ہوئے تھے، پہلے نے کہا وہ کون ہے؟ بیچ والے
اوسطهم هو خیرهم	نے کہا ان (سونے والوں) میں جو سب سے
اٰخرهم خذوا خیرهم فکانت	بہتر ہے، پچھلے نے کہا ان میں جو سب سے
تلك اللیلة فلم یرهم حتیٰ	بہتر ہے اس کو لے لو، یہ رات ہو گئی، پھر آپ نے
اتوه لیلة اخریٰ فیما یریٰ	اُن کو نہیں دیکھا، یہاں تک کہ ایک اور رات
قلبه وتنام عینه ولا ینام	کو وہ آئے[1]، اس حالت میں کہ آپ کا
قلبه وکذالك الانبیاء	دل دیکھتا تھا اور آپ کی آنکھ سوتی تھی،
تنام اعینهم ولا تنام قلوبهم	لیکن آپ کا دل نہیں سوتا تھا، اور اسی طرح
(کتاب التوحید)	پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں مگر انکے دل نہیں سوتے،
سمعت انس بن مالك یحدثنا	انس بن مالک ہم لوگوں سے آپ کی شب معراج
عن لیلة اسری بالنبی صلی الله علیه وسلم	کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اس سے پہلے کہ آپ
من مسجد الکعبة جاءه	پر وحی آئے آپ مسجد حرام میں سو رہے تھے۔

[1] ان دونوں راتوں میں کم از کم بارہ برس کا فصل ہوگا، کیونکہ پہلی رات آغاز وحی سے پہلے کی تھی،
اور دوسری رات جو شب معراج تھی، نبوت کے بارھویں سال تھی۔

ثلثة نفر قبل ان یوحیٰ الیہ	آپ کے پاس تین آدمی آئے، پہلے نے کہا
وھو نائم فی المسجد الحرام فقال	وہ کون ہے؟ بیچ والے نے کہا وہ ان میں
اولھم ایھم ھو فقال اوسطھم	سب سے بہتر ہے، پچھلے نے کہا جو اُن میں سب سے
ھو خیرھم وقال اٰخرھم	بہتر ہو اسکو لے لو، یہ تو ہو گیا، پھر آپ نے
خذوا خیرھم، فکانت تلک	ان کو نہیں دیکھا، یہانتک کہ وہ ایک
فلم یرھم حتی جاؤا لیلۃ	اور رات آئے، اس حالت میں کہ آپ کا
اخریٰ فیما یری قلبہ، والنبی	دل دیکھتا تھا، اور آپ کی آنکھیں سوتی
صلی اللہ علیہ وسلم نائمۃ عیناہ و	تھیں لیکن آپ کا دل نہیں سوتا تھا،
لا ینام قلبہ وکذلک الانبیاء	انبیاؑ کا یہی حال ہوتا ہے کہ انکی آنکھیں
تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم	سوتی ہیں اور ان کے دل نہیں سوتے،
فتولاہ جبرئیل ثم عرج بہ	پھر جبرئیلؑ نے آپ کو اپنے اہتمام میں لیا،
الی السماء (باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)	پھر وہ آپ کو لے کر آسمان پر چڑھے،

بخاری نے اس باب میں اس حدیث کو یہیں تک لکھا ہے، لیکن کتاب التوحید میں اس کے بعد معراج کے تمام واقعات بیان کر کے آخر میں حضرت انسؓ کا یہ فقرہ روایت کیا ہے،

فاستیقظ وھو فی المسجد الحرام	پھر آپ بیدار ہوئے تو مسجد حرام میں تھے،

صحیح مسلم میں یہ روایت نہایت مختصر ہے، سند کے بعد صرف اس قدر لکھ کر کہ آپ

مسجد حرام میں سوتے تھے" اس کو ختم کر دیا ہے، اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ "شریک نے اس روایت میں واقعات کو گھٹا بڑھا اور آگے پیچھے کر دیا ہے، اسی لیے ائمہ نے جیسا کہ قاضی عیاض نے شفا میں اور امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ شریک کی اس روایت میں بہت سے اوہام ہیں، اور اسی لیے اس کو انھوں نے رد کر دیا ہے، دوسری روایت صحیحین میں وہ ہے جس میں حضرت مالکؓ بن صعصعہ انصاری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بیان کرتے ہیں، کہ آپ نے معراج کا واقعہ دہراتے ہوئے فرمایا:

بینا انا عند البیت بین النائم والیقظان[1] — میں کعبہ کے پاس خواب بیداری کی درمیانی حالت میں تھا،

صحیح بخاری باب المعراج اور مسند ابن حنبل میں مالک بن صعصعہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

بینما انا فی الحطیم مضطجعاً — اس اثنا میں کہ میں (خانۂ کعبہ کے مقام) حطیم میں لیٹا ہوا تھا،

لیکن یہ شب معراج میں آغاز کی کیفیت کا بیان ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے، دلائل بیہقی میں ایک روایت ہے، جس میں حضرت ابوسعید خدریؓ کے واسطہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں عشاء کے وقت خانۂ کعبہ میں سو رہا تھا، ایک آنے والا (جبریلؑ) آیا اور اس نے آکر مجھے جگایا

[1] صحیح بخاری ذکر الملائکہ، وصحیح مسلم باب الاسراء،

میں جگا" اس کے بعد واقعۂ معراج کی تفصیل ہے، اس میں سونے کے بعد جگائے جانے کی تصریح ہے[1] لیکن اس کا دوسرا ہی راوی جھوٹا، دروغ گو اور ناقابلِ اعتبار ہے، اور اس میں جو منکرات اور غرائب امور بیان کیے گئے ہیں، وہ سرتاپا لغو ہیں، ابن اسحٰق نے سیرت میں اور ابن جریر طبری نے تفسیر میں (سورۂ اسراء) حضرت حسن بصریؒ سے بھی اس قسم کی روایت کی ہے کہ "میں سو رہا تھا کہ جبریلؑ نے پاؤں سے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھایا۔" لیکن اس کا سلسلہ حضرت حسن بصریؒ سے آگے نہیں بڑھتا، سیرت ابن ہشام اور تفسیر ابن جریر طبری میں محمد بن اسحاق کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ سے دو روایتیں ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ یہ بزرگوار معراج کو روحانی اور رویائے صادقہ کہتے تھے، یہ روایتیں مع سند کے حسب ذیل ہیں:

عن محمد بن اسحٰق قال حدثنی یعقوب بن عتبة بن المغیرة ان معاویة بن ابی سفیان کان اذا سئل عن مسریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت رؤیا من اللہ صادقة	(ابن ہشام ذکر معراج، تفسیر ابن جریر)	محمد بن اسحٰق سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ نے بیان کیا کہ معاویہ بن سفیان سے جب معراج کا واقعہ پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک سچا خواب تھا۔

[1] حافظ ابن کثیر نے تفسیر سورۂ اسراء ص ۱۹ میں اس روایت کو نقل کیا ہے، اس کے سلسلۂ سند میں دوسرا راوی وہی ابو ہارون العبدی ہے جس کو علمائے رجال نے بالاتفاق ساقط الاعتبار قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ ھو اکذب من فرعون وہ فرعون سے بھی زیادہ جھوٹا ہے۔

لیکن یہ روایت منقطع ہے، یعقوب نے حضرت معاویہؓ سے خود نہیں سنا ہے، کیونکہ انھوں نے ان کا زمانہ نہیں پایا ہے' دوسری روایت ہے،

حدثنا ابن حمید، قال حدثنا سلمة عن محمد قال حدثنی بعض آل ابی بکران عائشة کانت تقول ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن اسریٰ بروحه (حوالۂ مذکور)	ابن حمید نے ہم سے بیان کیا، ان سے سلمہ نے، سلمہ سے محمد بن اسحاق نے، انھوں نے کہا کہ حضرت ابوبکرؓ کے خاندان کے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نہیں کھویا گیا، بلکہ آپ کی روح شب کو لیجائی گئی

اس روایت کے سلسلہ میں بھی محمد بن اسحاق اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک راوی یعنی خاندانِ ابوبکرؓ کے ایک شخص کا نام و نشان مذکور نہیں ہے' اس لئے یہ بھی پایۂ صحت سے فروتر ہے تاہم ان روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ معراج کو رویا یا روحانی کہنا قرنِ اوّل میں بعض لوگوں کا قول تھا، ابن اسحاق میں ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے سامنے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ یہ رویا تھا تو وہ اس کی تردید نہیں کرتے تھے۔"

لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ معراج جسمانی تھی، اور بیداری کی حالت میں تھی، قاضی عیاض نے شفا میں اور امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے

اختلف الناس فی الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیل	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج میں لوگوں کا اختلاف ہے کہا گیا ہے کہ یہ سارا واقعہ خواب میں

انما کان جمیع ذلک فی المنام، والحق الذی علیہ اکثر الناس و معظم السلف وعامۃ المتاخرین من الفقہاء والمحدثین والمتکلمین انہ اسری بجسدہ صلی اللہ علیہ وسلم والآثار تدل علیہ لمن طالعہا وبحث عنہا ولا یعدل عن ظاہرہا الا بدلیل ولا استحالۃ فی حملہا علیہ فیحتاج الی تاویل
(شرح مسلم باب الاسراء)

پیش آیا، اور حق یہ ہے جس پر اکثر لوگ اور سلف صالحین کا بڑا حصہ اور عامۂ متاخرین میں سے فقہاء و محدثین اور متکلمین سب متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جسم کے ساتھ معراج ہوئی اور جو شخص تمام آثار و احادیث کا غائر مطالعہ اور تحقیق کریگا اس پر یہ حق واضح ہو جائے گا، اور اس ظاہر سے بے دلیل انحراف نہیں کیا جائیگا، اور نہ ظاہر پر ان کو محمول کرنے میں کوئی محال لازم آتا ہے جو تاویل کی حاجت ہو،

مفسرین میں سے ابن جریر طبری سے لے کر امام رازی تک نے جمہور کے اس مسلک کی چار عقلی دلیلیں بھی قائم کی ہیں جو حسب ذیل ہیں،

۱۔ قرآن مجید میں ہے "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" پاک ہے وہ خدا جو (شب معراج میں) لے گیا اپنے بندہ (عبد) کو" اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اپنے "بندہ" کو لے گیا "بندہ" یا "عبد" کا اطلاق جسم پر یا جسم و روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے تنہا روح کو "عبد" یا "بندہ" نہیں کہتے،

۲۔ واقعاتِ معراج میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ براق پر سوار ہوئے، دودھ کا پیالہ

نوش فرمایا، سوار ہونا، پینا، یہ سب جسم کے خواص ہیں، اس لئے یہ معراج جسمانی تھی،

۳- اگر واقعۂ معراج رؤیا اور خواب ہوتا تو کفار اس کی تکذیب کیوں کرتے، انسان تو خواب میں خدا جانے کیا کیا دیکھتا ہے، محال سے محال چیز بھی اُس کو عالم خواب مین واقعہ بن کر نظر آتی ہے،

۴- خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے کہ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ کہ اس مشاہدۂ معراج کو ہم نے لوگون کے لئے معیار آزمایش بنایا ہے، اگر یہ عام خواب ہوتا تو یہ آزمایش ایمان کی کیا چیز تھی، اور اس پر ایمان لانا مشکل کیا تھا.

معراج کے بحالتِ بیداری ہونے پر صحیح استدلال

میرے نزدیک معراج کے بحالتِ بیداری کے ثبوت کا صاف صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلام کا فطری قاعدہ یہ ہے کہ جب تک متکلم اپنے کلام مین یہ ظاہر نہ کردے کہ یہ خواب تھا تو طبعاً یہی سمجھا جائے گا کہ وہ واقعہ بحالتِ بیداری پیش آیا، قرآن پاک کے ان الفاظ مین سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا (پاک ہے وہ جو اپنے بندہ کو ایک رات لے گیا) میں کسی خواب کی تصریح نہیں، اسی طرح حضرت ابوذرؓ کی صحیح ترین روایت میں بھی اس کی تصریح نہیں، اس لئے بے شبہہ یہ بیداری ہی کا واقعہ سمجھا جائیگا اور یہی جمہور اُمت کا عقیدہ ہے، اور وہ بھی بجسم، اسی طرح صحیح احادیث مین بھی خواب کی تصریح نہین، اس لئے زبان کے محاورۂ عام کی بنا پر اس کو بیداری کا واقعہ سمجھا جائے گا،

مدعیانِ رؤیا کا مقصود بھی رؤیا سے عام خواب نہیں

جو لوگ اس کو رؤیا کہتے بھی ہیں، اس سے اُن کا مقصود بھی وہ عام خواب نہین ہے جو ہر روز ہر شخص دیکھا کرتا ہے، اُن کا کہنا یہ ہے کہ

لوگون نے انبیا علیہم السلام کے رویا کی حقیقت پر غور نہین کیا ہے، وہ غلطی سے انبیا کے رویا کو بھی عام انسانی خواب سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل صرف لفظ کا اشتراک ہے، ورنہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے، یہ وہ "رویا" ہے جس مین گو آنکھین بند ہوتی ہین، مگر دل بیدار ہوتا ہے، کیا یہی عام رویا کی حقیقت ہے؟ یہ وہ حالت ہے جو بظاہر خواب ہے، مگر دراصل ہشیاری بلکہ مافوق ہشیاری ہے، عام خواب اور اس رویا میں مشابہت صرف اس قدر ہے کہ اس عالم مادی اور کاروبار حواس ظاہری سے پہلے مین تغافل ہے تو دوسرے میں تعطل ہے لیکن پہلے میں عالم روح اور کائنات ملکوت کو دخل نہین، اور دوسرے میں سراپا ہشیاری، بیداری، حقیقت بینی اہم سفری ناموس، سیر سماوات، لقاے ارواح، رویت حق سب کچھ ہے، اسی لئے جن لوگون نے اس کو "منام" یا "رویا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، انھون نے درحقیقت مجاز و استعارہ سے کام لیا ہے، ورنہ اصل مقصود یہی کیفیت روحانی اور یہی حالت ملکوتی ہے، اور یہی سبب ہے کہ ہمارے ظاہری حواس کے مادی قوانین طبعی کے رو سے جو چیزین محال معلوم ہوتی ہین، وہ اس عالم مین محال نہیں ہیں،

رویاے صادقہ کی تاویل | بہرحال جو لوگ اس کو رویاے صادقہ کہتے ہین، اُن کو گویہ مغالطہ بعض روایات حدیث سے پیش آیا ہے، جن کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے، اور جن میں سب سے مستند شریک کی روایت ہے جس کے الفاظ مین کمی بیشی پر اکثر محدثین نے اعتراض کیا ہے، اسی لئے انھون نے اس کو رد کر دیا ہے تاہم محدثین میں سے امام خطابی صاحب معالم السنن شریک کی اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

واما من اعتبراول الحديث باخرہ فانہ یزول عنہ الاشکال فانہ مصرح فیھما بانہ کان رؤیا القول فی اولہ وھو نائم وفی آخرہ استیقظ وبعض الرؤیا مثل یضرب لیتاول علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ معنی التعبیر فی مثلہ وبعض الرؤیا لا یحتاج الی ذالک بل یاتی کالمشاھدۃ، (فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۴۰۴)	لیکن جو شخص اس حدیث کے ابتدائی الفاظ کو آخری الفاظ سے ملا کر دیکھے گا اس سے یہ اشکال اس سے دور ہو جائیگا کہ ان میں یہ تصریح ہے کہ یہ رویا تھا، کیونکہ اس روایت کے شروع میں ہے کہ "آپ سو رہے تھے" اور آخر میں ہے کہ آپ جاگ پڑے، بعض رویا تمثیلی رنگ میں ہوتے ہیں جن کی تاویل ضروری ہے کہ اسی طرح کی جائے جس طرح اس قسم کے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض رویا اس کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ عینی کی طرح پیش آتے ہیں

رویا سے مقصود روحانی ہے | لیکن جو لوگ ان مین آشنائے راز ہین وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ ایک عام قسم کا خواب تھا، جو ہر انسان تقریبًا ہر شب کو دیکھتا ہے، بلکہ وہ اس کیفیت پر رویا کا اطلاق محض مجازی اور انسانی طریقۂ ادا کے قصور کے باعث کرتے ہیں، انسان روح اور جسم سے مرکب ہے، یہ روح جو جسم سے وابستہ ہے، اس کا یہ تعلق محض عارضی ہے اور یہی عارضی تعلق عالم نور سے اس کے حجاب کا باعث ہے جس قدر اس تعلق کا رشتہ ڈھیلا ہوتا جائے گا، اسی نسبت سے وہ حجاب اٹھتا جائے گا، انسان جب بیداری میں

ہوتا ہے، تو حواسِ ظاہری کی مصروفیت، روح کو مشاہدہ باطن سے باز رکھتی ہے نیند کی حالت میں کسی قدر اس کو ظاہری مشغولیت سے آزادی ملتی ہے تو اس کو رنگارنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں، یہ حالت انسان کی باطنی و روحانی قویٰ کی ترقی و تنزل پر موقوف ہے، ایک دن تو ہر انسان مرجاتا ہے یعنی اس کی روح کا تعلق اس کے جسم سے منقطع ہوجاتا ہے لیکن انسانوں کی ایک صنف ایسی بھی ہے جس کا طائر روح خدا کے فضل و موہبت کے بازوؤں سے پرزور ہو کر اپنے قفسِ عنصری کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ کر عالم ملکوت کی سیر کرتا پھرتا ہے اور پھر اسی قفسِ عنصری کی طرف رجعت کر جاتا ہے، یہی حالت ہے جس کو وہ اپنی محدود زبان میں مجازاً رویائے صادقہ یا رویائے نبوت کہتے ہیں، اور اسی عالم کو عالمِ رؤیا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ممکن ہے کہ اُسی کو قرآن مجید کی آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ میں رویا کہا گیا ہے، یہی وہ دنیا ہے جس میں آنکھیں سوتی ہیں، اور دل بیدار ہوتا ہے اور اسی کی طرف وحی کی حدیثوں میں اشارہ ہے، اور ابن ہشام میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف جو روایت منسوب ہے کہ

ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	(یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج
ولکن اُسری بروحه،	روح کے ذریعہ ہوئی)

کا بھی یہی مطلب ہے،

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد[1] میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

---

[1] جلد اول ص ۲۰۴ مصر

فصل وقد نقل ابن اسحاق
عن عائشة ومعاوية انهما
قالا انما كان الاسراء بروحه
ولم يفقد جسده ونقل
عن الحسن البصري نحو ذلك
ولكن ينبغي ان يعلم الفرق
بين ان يقال كان الاسراء
مناما وبين ان يقال كان
بروحه دون جسده وبينهما
فرق عظيم وعائشة ومعاوية
لم يقولا كان منامًا وانما
قالا اسري بروحه ولم يفقد
جسده وفرق بين الامرين
فان ما يراه النائم قد يكون
امثالاً مضروبة للمعلوم
في الصور المحسوسة فيرى كانه
قد عرج به الى السماء او ذهب

فصل ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ
اور معاویہؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ ان دونوں نے
کہا کہ معراج میں آپ کی روح لے جائی
گئی، اور آپ کا جسم کھویا نہیں گیا،
(یعنی وہ اسی دنیا میں اپنی جگہ پر موجود
تھا) اور حسن بصریؒ سے بھی اس قسم کی روایت
ہے لیکن یہ جاننا چاہیے کہ یہ کہنا کہ معراج
منام (خواب) تھا اور یہ کہنا کہ بذریعہ
روح کے تھی، جسم کے ساتھ نہ تھی، ان
دونوں میں بڑا فرق ہے حضرت عائشہؓ اور
معاویہؓ نے یہ نہیں کہا کہ وہ منام (خواب)
تھا، انھوں نے یہی کہا ہے کہ معراج میں
آپ کی روح کو لیجایا گیا، اور آپ کا جسم
کھویا نہیں گیا، ان دونوں میں بڑا فرق
یہ ہے کہ سونے والا جو کچھ دیکھتا ہے کبھی محسوس
صورتوں میں جو کچھ معلوم ہے اس کی تمثیلیں
اس کے سامنے کیجاتی ہیں پس وہ دیکھتا ہے

به الی مكة واقطار الارض وروحه لم تصعد ولم تذهب وانما ملك الرؤيا ضرب له المثال والذين قالوا عرج برسول الله صلى الله عليه وسلم طائفتان طائفة قالت عرج بروحه وبدنه وطائفة قالت عرج بروحه ولم يفقد بدنه وهؤلاء لم يريدوا ان المعراج كان مناماً وانما ارادوا ان الروح ذاتها اسري بها وعرج بها حقيقة وباشرت من جنس ما تباشر بعد المفارقة وكان حالها في ذالك كحالها بعد المفارقة في صعودها الى السمٰوٰت سماءً سماءً حتى ينتهي بها الى السماء السابعة فتقف بين يدي الله عزّ وجل فيامرُ فيها بما يشاءُ

کہ گویا وہ آسمان پر چڑھایا گیا، یا مکہ اس کو لیجایا گیا، اور زمین کے گوشوں میں اُس کو پھرایا گیا، حالانکہ اس کی روح نہ چڑھی، نہ گئی، نہ پھری، صرف یہ ہوا کہ خواب کے فرشتے نے اُس کے لئے ایک تمثیل اس کے سامنے کر دی، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر چڑھایا گیا، ان میں دو فرقے ہیں، ایک فرقہ کہتا ہے کہ آپ کو معراج روح و بدن دونوں کے ساتھ ہوئی، اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ صرف روح کے ساتھ ہوئی، اور بدن کھویا نہیں گیا، (یعنی اس عالم سے) ان لوگوں کا یہ مقصد نہیں کہ وہ خواب تھا بلکہ یہ مقصد ہے کہ خود بذاتہ روح کو معراج ہوئی، اور وہی درحقیقت اوپر چڑھائی گئی اور اُس نے اس طرح کیا جس طرح جسم سے مفارقت کے بعد کرتی ہے اور

ثم تنزل الارض فالذی کان
لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ
الاسراء اکمل مما یحصل للروح
عند المفارقۃ ومعلوم ان
ھذا امر فوق ما یراہ النائم
لکن لما کان رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) فی مقام خرق العوائد
حتی شق بطنہ وھو حی لا یتألم
بذلک عرج بذات روحہ
المقدسۃ فی غیر اماتۃ ومن
سواہ لا ینال بذات روحہ
الصعود الی السماء الا بعد الموت
والمفارقۃ فالانبیاء انما استقرت
ارواحھم ھناک بعد مفارقۃ
الابدان وروح رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم صعدت الی ھناک فی
حال الحیاۃ ثم عادت وبعد

اس میں اس کی حالت وہی تھی جو مفارقت
جسم کے بعد آسمانوں پر ایک ایک آسمان
پر کر کے چڑھنے میں ہوتی ہے یہاں تک کہ
ساتویں آسمان پر جا کر ٹھہر جاتی ہے اور
اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی
ہے، پھر وہ جو چاہتا ہے اس کی نسبت
حکم دیتا ہے، پھر زمین پر واپس آجاتی
ہے بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو
شبِ معراج میں جو حاصل ہوا وہ اس
سے بھی زیادہ کامل تھا جو روح کو مفارقت
جسم کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ
کہ یہ درجہ اس سے بڑا ہے جو سونے والے کو خواب
میں نظر آتا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم خرقِ عادات کے مقام میں تھے یہاں تک
کہ آپ کا سینہ چاک کیا گیا، اور آپ زندہ
تھے لیکن آپ کو تکلیف نہیں ہوئی
اسی طرح خود روح مبارک بذاتہ اور

وفاته استقرت في الرفيق الاعلىٰ
مع ارواح الانبياء ومع هذا
فلها اشراف على البدن و
اشراق وتعلق به بحيث يرد
السلام على من سلّم عليه
وبهذا التعلّق رای موسیٰ
قائماً يصلّي في قبره وراه في
السّماء السادسة ومعلوم انّه
لم يعرج بموسىٰ من قبره ثمّ
ردّ اليه وانّما ذلك مقام روحه
واستقرارها وقبره مقام
بدنه واستقراره الى يوم
معاد الارواح الى اجسادها
فرآه يصلّي في قبره ورآه في
السّماء السّادسة كما انه صلّى الله
عليه وسلّم في ارفع مكان في الرفيق
الاعلىٰ مستقراً هناك وبدنه

چڑھائی گئی، بغیر اس کے کہ آپ پر موت
طاری کی جائے آپکے علاوہ اور کسی کی
روح کو موت اور مفارقت تن کے بغیر
یہ عروج نصیب نہ ہوا، انبیاء کی روحیں
جو یہاں ٹھہری تھیں وہ مفارقت جسم
کے بعد تھیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی روحِ پاک زندگی کی حالت میں وہاں
گئی ، اور واپس آئی ، اور مفارقت
کے بعد انبیاء کی روحوں کیساتھ رفیق
اعلیٰ میں جاکر ٹھہر گئی لیکن باوجود اس کے
روح پاک کو اپنے جسم کیساتھ ایک نوع
کا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر آپ پر کوئی سلام
بھیجے تو آپ سلام کا جواب دیتے ہیں،
اسی تعلق سے آپنے شب معراج میں دیکھا
کہ موسیٰ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں
پھر آپنے اُن کو چھٹے آسمان میں دیکھا حالانکہ
معلوم ہے کہ موسیٰ کو اپنی قبر سے اٹھا کر نہیں

فی ضریحہ غیر مفقود واذا سلم	لے جایا گیا تھا اور نہ پھر واپس کیا گیا تھا
علیہ المسلم ردّ اللہ علیہ	اس کی گرہ یوں کھلتی ہے کہ ہاں آسمان پر جو
روحہ حتّی یرد علیہ السلام	موسیٰ کو آپنے دیکھا تو وہ اُن کی روح کا مقام
ولم یفارق الملأ الاعلی	و مستقر تھا اور قبر اُن کے جسم کا جہاں وہ
من کثف ادراکہ وغلظت	قیامت میں مُردوں کے لوٹانے کے وقت
طباعہ عن ادراک ھذا	تک رہیگا اس طرح آپنے اُن کو انکی قبر میں
فلینظر الی الشمس فی علو محلها	نماز پڑھتے بھی دیکھا اور چھٹے آسمان پر
وتعلقها وتاثیرها فی الارض	بھی دیکھا جس طرح کہ (بعد وفات) آنحضرت
وحیاة النبات والحیوان	صلی اللہ علیہ وسلم اسے بلند تر مقام یعنی رفیق اعلیٰ
بها، هذا، وشان الارواح	میں بھی قرار گیر ہیں اور جسم مبارک قبر شریف میں
فوق هذا، فلها شان ولابدان	بھی موجود ہے جب سلام کرنیوالا آپ پر سلام کرتا
شان وهذه النار تکون فی	ہے تو اللہ آپ کی روح کو واپس کرتا ہے تا آنکہ
محلها وحرارتها تؤثر فی الجسم	آپ جواب دیتے ہیں حالانکہ مقام رفیق اعلیٰ
البعید عنها مع ان الارتباط	سے آپ علیحدہ نہیں ہوئے جو موٹی سمجھ اور
والتعلق الذی بین الروح	بھدی طبیعت کا آدمی اس معاملہ کو سمجھ سکے
والبدن اقوی واکمل	اس کو چاہیئے کہ آفتاب کی طرف دیکھے کہ اس
من ذالک واتم فشان الروح	دوری اور بلندی کے باوجود اس کا تعلق

اعلیٰ من ذالک والطف، | اور شعاع زمین سے قائم ہی اور اُس کے اندر وہ اثر ڈالتا ہی اور نباتات وحیوانات کی زندگی میں اسکو دخل ہی پھر روح کا مرتبہ تو اس سے بدرجہا زیادہ ہی کیونکہ روح کا معاملہ اور ہی اور جسم کا معاملہ اور ہی دیکھو کہ آگ اپنی جگہ پر رہتی ہی اور اس کی گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے، روح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی زیادہ قوی اور کامل ہے، اس لئے کہ روح آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہی

فقل للعیون الرُّمدُ ایاک ان تری | سنا الشمس فاستغشی ظلام اللیالیا

گر وآلود آنکھوں سے کہدو کہ وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں تو راتوں کی تاریکی کو اوڑھ لیں،

صوفیہ اور ارباب حال نے معراج کے واقعات کی تشریح اپنے مذاق اور ادراک رنگ میں کی ہے، علمائے اسلام میں کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے جو صوفی اور صاحب حال بھی ہے، اور محدث اور متکلم بھی، یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ صاحب کے متعلق معلوم ہے کہ وہ دیگر اہل باطن کی طرح عالم برزخ اور عالم مثال، نام اور عالم جسد اور عالم روح کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں، جہاں جسم پر روح کے خواص طاری ہوتے ہیں، اور روح اپنی خصوصیت اور مناسبت کے مطابق جسمانی شکل وصورت میں نمایاں

ہوتی ہے، شاہ صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ معراج بیداری میں اور جسم کے ساتھ ہوئی،
لیکن یہ عالم برزخ کی سیر تھی، جہاں آپ کے جسم پر روحانی خواص طاری کئے گئے، اور معانی و واقعات
مختلف اشکال وصورتین مشاہدہ کرائے گئے، چونکہ ایک بیگانہ کے لئے اس نادیدہ شہرستان کی
ہو بہو تشریح اپنی زبان مین مشکل ہے، اس لئے ہم اس ملک کے ایک سیاح کا بیان نقل کردینا
کافی سمجھتے ہیں،

شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ مین معراج کی حقیقت ان الفاظ میں لکھتے ہیں،

واسری بہ الی المسجد الاقصیٰ	آپ کو معراج میں مسجد اقصیٰ میں لیجایا گیا،
ثم الی سدرۃ المنتہیٰ والی	پھر سدرۃ المنتہیٰ، اور جہان خدا نے چاہا،
ماشاء اللہ، وکل ذلک لجسدہٖ	اور یہ تمام جسم مبارک کے لئے بیداری کی
صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ ولکن	حالت مین ہوا لیکن اس مقام میں جو عالم
ذلک فی موطن ھو برزخ	مثال اور عالم ظاہر کے بیچ میں ہے اور جو
بین المثال والشہادۃ جامع	دونوں عالموں کے احکام کا جامع ہے اس لئے
لاحکامھما فظھر علی الجسد	جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے اور روح
احکام الروح وتمثل الروح	پر معاملات روحانی جسم کی صورت میں نمایان
والمعانی الروحیۃ اجسادًا	ہوئے اور اسی لئے ان واقعات میں سے ہر واقعہ
ولذلک بان لکل واقعۃ	کی ایک تعبیر ظاہر ہوئی اور اسی طرح کے
من تلک الوقائع تعبیر وقد	واقعات حضرت حزقیل اور موسیٰ وغیرہ علیہم السلام

ظهر لحزقيل و موسى و غيرهما عليهم	کے لئے ظاہر ہوئے تھے اولیاء امت کے سامنے
السلام بنحو من تلك الوقائع وكذلك لاولياء	ظاہر ہوتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ان کے درجہ
الامة ليكون علو درجاتهم عند الله	کی بلندی مثل اس حالت کے ہوتی ہے جو رؤیا
كحالهم في الرؤيا، والله اعلم	میں اُن کو معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم،

اس کے بعد شاہ صاحب نے معراج کے مشاہدات میں سے ایک ایک کی تعبیر کی ہے خود احادیث صحیحہ اور معتبر روایات میں جہاں یہ واقعہ مذکور ہے کہ "آپ کے سامنے دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کئے گئے تو آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، اس پر فرشتہ نے کہا کہ آپ نے فطرت کو اختیار کیا، اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی تمام اُمت گمراہ ہو جاتی"

اس عالم تمثیل میں گویا فطرت کو دودھ اور ضلالت کو شراب کے رنگ میں مشاہدہ کرایا گیا ہے،

شاہ صاحب معراج کو عالم برزخ کا واقعہ بتا کر اسی طرح معراج کے تمام واقعات کی تشریح کرتے ہیں، فرماتے ہیں،

اما شق الصدر وملؤه ايمانا	لیکن سینہ کا چیرنا اور اس کا ایمان سے
فحقيقته غلبة انوار الملكية	بھرنا تو اس کی حقیقت ملکیت کے انوار کا
وانطفاء لهيب الطبيعة و	غلبہ اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا بجھنا،
خضوعها لما يفيض عليها	اور طبیعت کی فرمانبرداری اس فیضان کے
من حظيرة القدس، اما	قبول کرنے کیلئے جو حظیرۃ القدس سے خدا اس کے

وركوبه على البراق فحقيقته استواء
نفسه النطقية على نسمته التى
هى الكمال الحيوانى فاستوى
راكبًا على البراق كما غلبت
احكام نفسه النطقية على
البهيمة وتسلطت عليها
وآما اسراءه الى المسجد
الاقصى فلانه محل ظهور
شعائر الله و متعلق همم
الملاء الاعلى ومطمح انظار
الانبياء عليهم السلام
فكانه كوة الى الملكوت
وآما ملاقاته مع الانبيا
صلوٰت الله عليهم ومفاخرته
معهم فحقيقتها اجتماعهم
من حيث ارتباطهم بحظيرة
القدس وظهور ما اختص

فائض کرتا ہے لیکن آپ کا براق پر سوار ہونا
تو اسکی حقیقت آپ کے نفسِ ناطقہ (بشری)
کا اپنے اس روحِ حیوانی پر استیلا حاصل کرنا
ہے جو کمالِ حیوانی ہے تو آپ براق پر
اسی طرح سوار ہو گئے جس طرح آپ کی
روح بشری کے احکام آپ کی روح حیوانی
پر غالب آگئے اور اس پر مسلط ہو گئے'
لیکن آپ کا رات کو مسجد اقصیٰ لیجانا
تو وہ اس لئے کہ یہ مقام شعائرِ الٰہی کے
ظہور کا مکان ہے اور ملاء اعلیٰ کے ارادوں
کا تعلق گاہ ہے اور انبیاء علیہم السلام
کی نگاہوں کا نظارہ گاہ ہے گویا وہ ملاء اعلیٰ
کی طرف ایک روشندان ہے (جہاں سے
روشنی چھن چھن کر اس روشندان کے
ذریعہ اس کرۂ انسانی پر فائض ہوتی ہے)
لیکن آپ کی انبیاء علیہم السلام سے ملاقات
اور مفاخرت (اور امامت) تو اس کی

من بينهم وجوه الكمال و
امّا رقيه الى السّموات سماء
سماء فحقيقة الانسلاخ
الى مستوى الرحمان منزلة
بعد منزلة ومعرفة حال
الملائكة الموكلة بها و
من الحق بهم من افاضل
البشر التى بها الذى اوحاه
الله فيها والاختصام الذى
يحصل فى ملئها، وامّا بكاء موسىٰ
فليس بحسد ولكنه مثال
لفقد عموم الدعوة وبقاء
كمال يحصله ممّا هو فى
وجهه، وامّا سدرة المنتهىٰ
فشجرة الكون وترتيب بعضها
على بعض وانجماعها فى
تدبير واحد كانجماع الشجرة

حقیقت تو ان کا اجتماع ہی بحیثیت اس کے
کہ وہ سب ایک ہی رشتہ میں حظیرۃ القدس
سے مربوط ہیں اور آپ کی ان حیثیات
کمال کا ظہور ہی جو ان تمام پیغمبروں میں
آپ کی ذات سے مخصوص تھیں لیکن آپکا
آسمانوں پر ایک ایک آسمان کرکے چڑھنا
(اور فرشتوں اور مختلف پیغمبروں سے
ملاقات) تو اسکی حقیقت درجہ بدرجہ
(تحت کی منزلوں سے) کھینچ کر عرش الٰہی
تک پہنچنا ہے اور ہر آسمان پر جو فرشتے متعین
ہیں اور کامل انسانوں میں سے جو جب
جس جس درجہ تک پہنچ کر انکے ساتھ مل
گیا ہی ان کے حالات سے اور اس تدبیر سے
جو ہر آسمان میں خدانے وحی کی اور اسکے
مباحثہ سے جو اس آسمان کے فرشتوں
کی جماعت میں ہوتا ہے آگاہی ہو لیکن
حضرت موسیٰ کا رونا تو از راہ حسد تھا

في الغاذية والنامية ونحوهما
ولم يتمثل حيوانا لان التدبير
الجملي الاجمالي الشبيه
بسياسة الكلي (لا) فراده
وانما اشبه الاشياء به
الشجرة دون الحيوان، فان
الحيوان فيها قوى تفصيلية
والارادة فيه اصرح من سنن
الطبيعة، واما الانهار
في اصلها فرحمة فائضة
في الملكوت حذو الشهادة
وحياة وانماء فلذلك
تعين هنالك لبعض الامور
النافعة في الشهادة كالنيل
والفرات، واما الانوار التي
غشيتها فتدليات الهية
وتدبيرات رحمانية

بلکہ وہ اس بات کی تمثیل تھی کہ انکو دعوت
عامہ نہیں ملی تھی اور اس کمال کی بقاان کو
عنایت نہیں ہوئی تھی جو عموم دعوت سے
حاصل ہوتی ہے لیکن سدرۃ المنتہیٰ تو
وجود کا درخت ہے اس کا ایک دوسرے
پر مترتب ہونا اور پھر ایک ہی تدبیر میں
مجتمع ہونا ہے جس طرح درخت (اپنی شاخوں
کے بے شمار افراد کے اختلاف کے باوجود)
اپنی قوت غاذیہ اور اپنی قوت نامیہ کی
تدبیر میں متحد و مجتمع ہوتا ہے، سدرۃ المنتہیٰ حیوان
کی شکل میں نمایاں نہیں ہوا، اس لئے کہ اجمالی
اور مجموعی تدبیر اس طرح ہے جس طرح کلی
اپنے افراد کی سیاست (اجمالی) کرتی ہے
اور اس تدبیر اجمالی کی بہترین شبیہ درخت
ہے نہ کہ حیوان، کیونکہ حیوان میں تفصیلی قوتیں
ہوتی ہیں اور خصوصاً اس میں ارادہ قوتِ
طبعی سے زیادہ مصرح صورت میں ہوتا ہے

تلعلعت في الشهادة حيثما
استعدت لها وأما بيت
المعمور فحقيقته التجلي
الالهي الذي يتوجه اليه
سجدات البشر وتضرعاتها
تمثل بيننا على حذو ما
عندهم من الكعبة وبيت
المقدس ثم اتى باناء من
لبن واناء من الخمر فاختار
اللبن، فقال جبرئيل هديت
الفطرة ولو اخذت الخمر
لغوت امتك فكان هو
صلى الله عليه وسلم جامع امته
ومنشأ ظهورهم وكان اللبن
اختيارهم الفطرة والخمر
اختيارهم لذات الدنيا
وامر بخمس صلوت بلسان

لیکن نہروں کی جڑوں اور سوتوں کا وہاں
نظر آنا، تو وہ رحمت و حیات نشو و نما کا منبع ہے
جو عالم ملکوت میں اسی طرح جاری ہے جس طرح عالم
ظاہر میں اسی لئے وہاں بھی بعض وہ پر فیض ہو
نظر آئے جو یہاں اس عالم میں ہیں جیسے دریا
نیل اور نہر فرات لیکن وہ انوار جو اس درخت کو
ڈھانکے تھے تو وہ تنزلات الٰہیہ و تدبیرات
رحمانیہ ہیں جو اس عالم ظاہر میں وہاں چمکتی ہیں
جہاں جہاں ان کے قبول کی استعداد ہوتی ہے
لیکن بیت معمور تو اسکی حقیقت وہ تجلی الٰہی ہے
جس کی طرف انسانوں کے تمام سجدے اور بندگیاں
متوجہ ہوتی ہیں وہ گھر کی صورت میں اس لئے
نمایاں ہوا کہ وہ ان قبلوں کی طرح ہو جو انسانوں
کے درمیان کعبہ و بیت المقدس کی صورت میں
ہیں پھر آپ کے سامنے ایک دودھ کا پیالہ اور ایک
شراب کا پیالہ لایا گیا، آپ نے دودھ پسند فرمایا
تو جبرئیل نے کہا کہ فطرت کی طرف آپ نے ہدایت پائی

النجوم لانها خمسون باعتبار
الثواب ثم اوضح الله مراده
تدريجا ليعلموا ان الحرج
مدفوع وان النعمة كاملة
وتمثل هذا المعنى مستندا
الى موسى عليه السلام فانه
اكثر الانبياء معالجة للامة
ومعرفة بسياستها:

(باب الاسراء)

اگر شراب پسند فرماتے تو آپ کی امت
گمراہ ہو جاتی) آپکے پسند قبول کو امت کا پسند
وقبول کہنا اس لئے تھا کہ آپ ہی امت کے جامع و
مرکز اور اسکے ظہور کے منشا ہو، لیکن اور دودھ کا لینا
پسند کرنا فطرت کا پسند کرنا تھا اور شراب کا لینا
دنیا ہی لذتوں کو پسند کرنا تھا اور آپ کو بزبان
مجاز پانچ وقتوں کی نمازوں کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ
درحقیقت ثواب کے اعتبار سے پچاس وقت ہیں
اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصد کو (کہ وہ وقتوں سے
وہ وقت مقصود ہیں) بدفعات اور تدریج اس لئے
ظاہر کیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ (وہ وقت کہ وہ کر دینے
میں) تنگی دور کر دی گئی ہے، اور نعمت پوری
ہوئی ہے اور یہ بات حضرت موسیٰ کے کلام کی
طرف منسوب ہو کر اس لئے ظاہر ہوئی کہ تمام

[illegible]

ہم نے ارباب حال اور محدثین کے یہ انکشافات وحقائق اور جسم و روح کے یہ گوناگوں
احوال ومناظر خود انہی کی زبانوں سے بتائے اور دکھائے ہیں، ورنہ ہم خود اس باب میں سلف
صالحین کا عقیدہ رکھتے ہیں، جو ابن اسحاق کی عبارت میں حسب ذیل ہے،

وکان فی مسراہ وما ذکر منہ
بلاء وتمحیص وامر من امر اللہ
فی قدرتہ وسلطانہ، فیہ
عبرۃ لاولی الالباب وھدًی
ورحمۃ وثبات لمن اٰمن باللہ
وصدّق وکان من امر اللہ
علی یقین فاسری بہ کیف
شاء وکما شاء لیریہ من اٰیات
ربہ ما اراد حتی عاین ما عاین
من امرہ وسلطانہ العظیم و
قدرتہ التی یصنع بہا ما یرید۔
(سیرۃ ابن ھشام باب الاسراء)

آپ کے اس سفر شبانہ اور جو کچھ اس کے متعلق
بیان کیا گیا ہے، اس میں آزمایش اور کافر
و مومن کی تمیز ہے، اور خدا کی قدرت اور
سلطنت میں سے کوئی الٰہی شان ہے، اور اس
میں اہلِ عقل کے لئے عبرت ہے اور جو اللہ پر
ایمان لایا، اور تصدیق کی، اور خدا کے کاموں
پر یقین رکھا، اُس کے لئے اس میں ہدایت،
رحمت اور ثابت قدمی ہے، پس اللہ تعالیٰ
اپنے بندہ کو راتوں رات لے گیا جس طرح
چاہا اور جیسے چاہا، تاکہ وہ اُس کو اُس کے
پروردگار کی نشانیوں میں سے جو چاہے دکھائے
یہاں تک کہ آپ نے خدا کی شان، اور
اس کی عظیم الشان قوت کے مناظر دیکھے جو
کچھ دیکھے، اور اس قدرت کو دیکھا جس

قرآن مجید اور معراج

معراج کے اسرار اعلانات احکام بشارتیں اور انعامات

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معراج کا بیان سورۂ اسرار (جس کو سورۂ بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں) کی صرف ابتدائی تین چار آیتوں میں ہے یعنی

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا	پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ	کے وقت مسجد حرام (کعبہ) سے اس مسجد
الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ	اقصی (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے گردا
مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ	گرد ہم نے برکت نازل کی، تاکہ ہم اپنے
(بنی اسرائیل ع-۱)	بندہ کو اپنی نشانیاں دکھائیں، وہی سننے
	والا اور دیکھنے والا ہے،

لیکن ہم نے اس سورہ کو شروع سے اخیر تک بار بار پڑھا، اور ہر بار اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ یہ پوری سورہ معراج کے اسرار و حقائق، نتائج و عبر اور احکام و اعلانات سے معمور ہے سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سورہ کے جلی عنوانات کیا ہیں،

۱۔ یہ اعلان کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی القبلتین (یعنی کعبہ اور بیت المقدس دونوں کے پیغمبر) ہیں۔

۲۔ یہود جو اب تک بیت المقدس کے اصلی وارث اور اس کے نگہبان و کلید بردار بنائے گئے تھے، اُن کی تولیت اور نگہبانی کی مدت حسب وعدۂ الٰہی ختم کی جاتی ہے، اور آلِ اسمٰعیل کو ہمیشہ کے لئے اس کی خدمت گذاری سپرد کی جاتی ہے،

۳۔ کفار قریش کو اعلان کہ تمہارے مہلت و موعظت کا عہد گذر گیا، فیصلۂ حق کے ثبوت کے لئے جس عذاب کو تم مانگتے تھے، اب وہ آتا ہے کہ رسول اب ہجرت کرتے ہیں،

۴۔ رسولوں کی سنت کے مطابق اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا اذن دیا جائیگا جس کے بعد نافرمان قوم پر عذاب آئے گا،

۵۔ معراج کے احکام و شرائع،

۶۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت،

۷۔ نبوت، قرآن، قیامت، اور معجزات پر اعتراضات کے جوابات،

۸۔ حضرت موسیٰؑ کے حالات اور واقعات سے استشہاد،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی القبلتین ہونا

حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا تھا، اور اُن کو ارض مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا جس کے حدود خدا نے خواب میں حضرت ابراہیمؑ کو دکھائے تھے لیکن اسی کے ساتھ تورات میں بار بار اعلان کر کے یہ بھی اُن کو سنا دیا گیا تھا۔ کہ اگر انھوں نے خدا کے احکام کی اطاعت اور پیغمبروں کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب اُن سے چھین لیا جائیگا، حضرت ابراہیمؑ کو اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ دو بیٹے عطا ہوئے تھے

اور ارضِ مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی شام کا ملک حضرت اسحاقؑ کو اور عرب کا ملک حضرت اسمٰعیلؑ کو ملا تھا، شام میں بیت المقدس اور عرب میں کعبہ واقع تھا، حضرت اسحاقؑ کے فرزندوں کو جن کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے، (اسرائیل حضرت اسحاقؑ کے بیٹے یعقوبؑ کا لقب تھا) بیت المقدس کی تولیت عطا ہوئی تھی، اور بنو اسمٰعیلؑ کو کعبہ کا متولی بنایا گیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں جس قدر پیغمبر پیدا ہوئے، اُن میں سے بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس اور اسمٰعیلؑ کا کعبہ تھا، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیاء عرب یا شام میں مبعوث ہوئے وہ ان دونوں قبلوں میں سے صرف ایک کے متولی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام دوسرے پیغمبروں کے متفرق اوصاف و خصوصیات کا جامع اور برزخ بنایا تھا، اسی طرح حضرت اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی ذاتِ محمدی ہی کو قرار دیا یعنی حضرت ابراہیمؑ کی وراثت جو صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آتی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پھر ایک جگہ جمع ہوگئی اور گویا وہ حقیقتِ ابراہیمیہ جو خاندانوں اور نسلوں میں منقسم ہوگئی تھی ذاتِ محمدیؐ میں پھر یکجا ہوگئی، اور آپ کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی، اور نبی القبلتین کا منصب عطا ہوا، یہی نکتہ تھا جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا، اور اسی لئے معراج میں آپ کو مسجدِ حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے جایا گیا، اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاءؑ کی صف میں آپ کو امامت پر مامور کیا گیا، تاکہ آج اس مقدس دربار میں اس کا اعلان عام ہو جائے کہ دونوں قبلوں کی تولیت سرکارِ محمدی ہی کو عطا ہوتی ہے، اور وہ نبی قبلتین نامزد ہوتے ہیں، اور قرآن مجید میں

سورۂ اسراء کی ابتدا اور واقعۂ معراج کا آغاز اسی حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے،

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ	پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے
لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی	بندہ کو مسجد حرام سے اُس مسجد اقصیٰ تک
الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا	لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں نازل
حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ	کی ہیں تاکہ ہم اپنے اس بندہ کو اپنی چند
ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝ (بنی اسرائیل)	نشانیاں دکھائیں، بیشک خدا سننے والا

بنی اسرائیل کی مدتِ تولیت کا اختتام

بنو اسرائیل کو ارضِ مقدس کی تولیت کا شرف بہت سے شرائط اور معاہدوں کے ساتھ عطا ہوا تھا اور یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جب وہ غیر معبودوں کی طرف جھکیں گے، اور احکام الٰہی کی عدم پیروی کے ملزم ہوں گے، تو یہ منصب اُن سے چھین لیا جائے گا، اور محکومی و غلامی کی زنجیر اُن کی گردنوں میں ڈال دی جائے گی، حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے عہد میں اُن کو جو نیابت اور وراثت عطا کی گئی تھی، عدم ایفاے عہد کی پاداش میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (بنوخذ نذر) کے ہاتھوں اُن سے چھین لی گئی، ارض مقدس سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے، شہر اور شلیم کھنڈر کر دیا گیا، بیت المقدس کی ایک ایک اینٹ چور چور کر دی گئی، اور توراۃ کے پرزے پرزے اڑا دیئے گئے،

اس پُرغم سانحہ پر انبیاے بنی اسرائیل نے ماتم کیا، خدا کے سامنے دستِ تضرع دراز کیا، بنی اسرائیل کو توبہ و انابت کی دعوت دی تو پھر اُن کو معاف کیا گیا، اور ایرانیوں کے عہد میں ارضِ مقدس کی دوبارہ تولیت سے وہ سرفراز ہوئے لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنے

عہد پر قائم نہ رہے، بتوں کو سجدے کئے توراۃ کے احکام سے روگردانی کی، تو اُن پر یونانیوں اور رومیوں کو مسلط کیا گیا جنھوں نے بیت المقدس کو جلا کر خاکستر کر دیا یہودیوں کا قتل عام کیا، قربانگاہ کے مقدس ظروف توڑ پھوڑ دیئے، اب اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوتی ہے، اور بنو اسرائیل کو توبہ و انابت کا آخری موقع دیا جاتا ہے، اگر انھوں نے حق پسندی کو راہ دیا، تو خدا ان پر رحم فرمائے گا، ورنہ ہمیشہ کے لئے وہ اس منصب سے محروم کر دیئے جائیں گے

چنانچہ آیاتِ بالا کے بعد ارشاد ہوتا ہے،

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسکو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت نامہ ٹھہرایا کہ ہمارے سوا کسی کو کارساز نہ بنائیں، اے اُن لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، دیکھو کہ اُن کا جنھوں نے اپنا کارساز دوسروں کو بنا لیا تھا کیا حشر ہوا تم کو اس احسان کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کیونکہ تمہارا باپ نوح شکر گذار بندہ تھا اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کے متعلق فیصلہ کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی زیادتیاں کرو گے، جب اُن میں سے پہلے

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ○ إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ○ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۔

(بنی اسرائیل - ۱)

فساد کا وقت آیا تو ہم نے تم پر ایسے بندوں کو کھڑا کر دیا، جو بڑے سخت گیر تھے، وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہوا، پھر ہم نے تمہارے دن پھیرے اور تم کو مال داولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد بہت بڑھا دی (اور کہہ دیا کہ) اگر تم نے اچھے کام کئے تو اپنے ہی، اور بُری کام کئے تو اپنے لئے پھر جب (تمہارے) دوسرے فساد کا وقت آیا تو پھر ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو کھڑا کر دیا) کہ وہ تمہارے چہروں کو خراب کر دیں اور یہ بھی بیت المقدس میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح تمہارے پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر وہ قابو پائیں اس کو توڑ پھوڑ ڈالیں (اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد) ممکن ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے، اور اگر تم نے پھر وہی کیا، تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے، اور حق کے منکروں کے لئے ہم نے جہنم کا احاطہ بنا رکھا ہے۔

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی تھی، وہاں بنی اسرائیل سے تعلقات نہ تھے، اسی لئے مکی سورتوں میں بنو اسرائیل کو عموماً مخاطب نہیں کیا گیا ہے، یہ پہلا موقع ہے کہ بنو اسرائیل کو مخاطب

کیا جارہا ہے، کیونکہ اب اسلام کے نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے، اور آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت ملنے والی ہے، جہاں اُن سے تعلقات کا آغاز ہوگا، اور اُن کو از سر نو خدا کے سامنے اپنی شرمساری کے اظہار کا موقع ملے گا، اور خدا اُن پر اپنی رحمت کا دروازہ کھولے گا لیکن اگر انھوں نے قبولِ حق سے انکار کیا، تو اُن کے لئے پھر وہی سزا ہے، جو اُن کو اس سے پہلے دو دفعہ مل چکی ہے لیکن افسوس کہ انھوں نے عملاً اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا، اور حق کو قبول نہیں کیا، حالانکہ خدا نے اُن سے کہا :۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ (بقرہ) تم میرا عہد پورا کرو تو میں تمھارا عہد پورا کرونگا،

اس لئے خدا نے اُن پر رحمت کا دروازہ نہیں کھولا، اور اُن کو تیسری دفعہ بھی وہی سزا ملی، اور وہ مدینہ اطرافِ مدینہ، خیبر، اذرعات وغیرہ سے بے دخل کر دیئے گئے اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے سپرد کی گئی،

کفارِ مکہ کے نام آخری اعلان آج کفارِ مکہ کے نام آخری اعلان ہے، اُن کا مطالبہ تھا کہ اگر اسلام سچا، اور ہمارا مذہب باطل ہے، تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا، وہ کہتے ہیں کہ ہم پر عذاب آئے، اُن کو یہ سنتِ الٰہی بتائی گئی کہ قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں آتا، جب تک اس میں مبلغِ الٰہی مبعوث نہیں ہو لیتا، اور اس کو بالکل اس کی طرف سے مایوسی نہیں ہو جاتی، اس وقت قوم کا دولت مند اور مغرور طبقہ اُس حق کی بیخ کنی کے لئے آگے بڑھتا ہے، بہت سے دوسرے لوگ جن کو اُن کی قوت پر بھروسہ ہوتا ہے، اُن کا ساتھ دیتے ہیں، مومنوں کا طبقہ جو بظاہر کمزور اور ضعیف ہوتا ہے اس حق کو قبول کر لیتا ہے، ایک دنیا کے نفعِ عاجل کا طالب ہے، اور دوسرا

آخرت کے نفعِ جاوید کو ترجیح دیتا ہے، دنیا میں بظاہر دونوں کو برابر زندگی کی نعمتیں ملتی ہیں مگر ایک دن آتا ہے جب رات اور دن کی روشنی الگ ہو جاتی ہے، دنیا میں کوئی ایک دوسرے کا ذمہ دار نہیں، مصلح اور ہادی اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں، ایمان و کفر کے وہ ذمہ دار نہیں، اس دنیا میں ہر شخص اپنا آپ ضامن ہے، اسی انکار و کفر کی بدولت قریش مکہ بھی تولیتِ کعبہ کے شرف سے معزول کئے جاتے ہیں، اور مسلمانوں کو فتحِ مکہ کی خوشخبری سنائی جاتی ہے،

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ	یہ قرآن وہ راستہ بتاتا ہے جو سب سے زیادہ
هِیَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ	سیدھا ہے اور اُن مومنوں کو جو نیک کام کرتے
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا	ہیں بشارت دیتا ہے کہ اُن کیلئے بڑی مزدوری
كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	ہے اور یہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ جن کو آخرت پر ایمان
بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا	نہیں ہم نے اُن کیلئے دردناک عذاب تیار کیا ہے
وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ	انسان کبھی برائی (عذاب) کو بھی اسی طرح چاہتا ہے،
بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا	جس طرح بھلائی کو انسان بڑا ہی عجلت پسند واقع
وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ	ہوا ہے ہم نے دن اور رات کو دو نشانیاں بنایا ہے
فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ	نشانِ شب کو ہم مٹا دیتے ہیں اور نشانِ روز کو
النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا	روشن کر دیتے ہیں کہ اس روشنی میں اپنے خدا کی
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ	مہربانی کو ڈھونڈو اور ماہ و سال کا شمار اور حساب
وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا	جانو ہم نے ہر چیز کھول کر بیان کر دی اور ہر انسان کے

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ	نیک و بد کو اسی کی گردن میں ڈال دیا ہے،
عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن ہم اُس کے اعمالنامہ کو نکالیں گے
كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ	جس کو وہ کھلا ہوا پائیگا (اور اس وقت ہم اُس
كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا	سے کہیں گے کہ لو) اپنا اعمالنامہ پڑھلو آج تم ہی
مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ	اپنا حساب لینے کو بس ہو جو ہدایت کو قبول کرتا ہے
لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ	وہ خود اپنے لئے کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ
عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ	اپنے لئے کوئی ایک دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھاتا
اُخْرٰى ۝ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى	اور ہم اس وقت تک عذاب نہیں نازل
نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ	کرتے جب تک ایک پیغمبر نہ بھیج لیں اور جب
نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا	کسی آبادی کو ہلاک کرنا ہوتا ہے تو ہم وہاں
فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ	کے دولتمندوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں
فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ وَكَمْ	فسق و فجور کرتے ہیں تو اُس پر قانون الٰہی کے مطابق)
اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ	سزا واجب ہو جاتی ہے تو ہم اُس آبادی کو تباہ
نُوْحٍ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ	و برباد کر دیتے ہیں اور یاد کرو نوح کے بعد سے
خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ	ہم کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں تیرا رب
الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ	اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھتا ہے اور دیکھتا ہے
لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ	جو اس دنیا کا (نفع) عاجل چاہتے ہیں تو اُن

يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝	ہیں سے جس کے لئے ہم چاہتے ہیں (اسی دنیا کا
مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا	نفع) عاجل اُس کو دیدیتے ہیں پھر دوزخ کو اُس
سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ	کا ٹھکانا بناتے ہیں جس میں وہ ہر طرح برا ٹھہر کر
كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا	اور راندہ درگاہ بن کر داخل ہوگا اور جو آخرت
نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ	کو چاہے گا اور آخرت کیلئے کوشش کریگا!
عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ	وہ مومن ہوگا تو اُس کی کوشش خدا کے ہاں
مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا	مشکور ہوگی، ہم نیک و بد ہر ایک کو تیرے پروردگار
بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ	کے عطیہ سے دیتے ہیں، تیرے پروردگار کا عطیہ
اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝	محدود نہیں ہے، دیکھو! ہم نے کیونکر دنیا میں
(بنی اسرائیل-۲)	ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے لیکن سب سے

[illegible]

معراج کے احکام و وصایا! یہود اور قریش دونوں کی معزولی کے بعد بیت المقدس اور خانہ کعبہ دونوں کی تولیت کا منصب عطا کرنے کے لئے شہنشاہ عالم اپنے بندۂ خاص کو اپنے حضور میں طلب کرتا ہے اور اس روحانی حکومت کے شرائط و احکام کا ایک نسخہ عطا کرتا ہے جیسا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو عطا ہوا تھا،

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ	خدا کیساتھ کسی اور کو خدا نہ بنانا ورنہ تو برا
مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝ وَقَضٰى رَبُّكَ	ٹھہر کر اور بے یار و مددگار رہ جائیگا اور تیرے
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ	پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی اور کو نہ پوجنا

إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ
أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا
أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا
قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا رَّبُّكُمْ
أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِن تَكُونُوا
صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا
وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ
وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا
إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ
الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ
لِرَبِّهِ كَفُورًا وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ
ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا
فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا وَلَا
تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ
وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اگر ان میں ایک
یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں
تو اُن کی بات میں اونھ اُنک نہ کرنا اور ان
کو نہ جھڑکنا اُن سے ادب کے ساتھ بات کرنا اور
اُن کے سامنے نرم دلی سے اطاعت کا بازو
جھکا دینا اور اُن کے حق میں یہ دعا مانگنا کہ
پروردگار! میرے والدین پر اسی طرح رحم فرما
جس طرح انھوں نے جب میں چھوٹا تھا مجھ پر
رحم کیا تھا، تمھارا پروردگار تمھارے دلوں کے
راز سے خوب واقف ہے، اگر تم نیک ہو تو وہ
توبہ کرنیوالوں پر بخشش کرتا ہے اور قرابت دار
کو اُس کا حق ادا کر، اور غریب و مسافر کا حق
بھی دے اور فضول خرچی نہ کیا کر فضول خرچ
شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے آقا کا
بڑا ہی ناشکر گذار ہے، اگر اپنے پروردگار
کے فضل کے انتظار میں جس کی تجھ کو توقع ہو ان
مستحقین میں سے کسی سے تجھ کو منھ موڑنا پڑے

مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَيَقْدِرُ ۭ
اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ۝
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ
قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا
تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً
وَسَاۤءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ
قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ
سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ
اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا
مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ
حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ
الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ
اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ
خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ

تو اُن کو نرمی سے سمجھا دو۔ اور اپنا ہاتھ نہ اتنا
سکیڑ لے کہ گویا گردن میں بندھا ہوا اور نہ اتنا
پھیلا ہی دو کہ ہر طرف سے تجھ کو لوگ ملامت
کریں اور تہی دست ہو جائے تیرا پروردگار جس
کی روزی چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے جس کی
چاہتا ہے کم کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے
حال کا دانا اور بینا ہے اور تم افلاس کے ڈر
سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو ہم ہی جو اُن کو
اور تم کو دونوں کو روزی پہنچاتے ہیں اُن کا
قتل کرنا درحقیقت بڑا گناہ ہے اور زنا کے
پاس بھی نہ جانا کہ وہ بےحیائی ہے اور بُری راہ
ہے اور جس جان کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے
اُس کو ناحق قتل نہ کرو اور جو شخص ظلم سے مارا
جائے تو اسکے والی وارث کو قصاص کا حق ہم نے
دیا ہے تو چاہیے کہ وہ اس خون میں زیادتی
نہ کرے کیونکہ اسی میں اس کو جیت ہے اور یتیم
جب تک اپنی عقل و شعور و جوانی کو نہ پہنچ جائے

عِلْمٌ، اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا، ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ، وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

(بنی اسرائیل - ۴)

اس کے مال وجائداد کے قریب بھی نہ جانا لیکن اس طریقہ سے جاسکتے ہو جو اسکے حق میں بہتر ہو عہد کو پورا کیا کرو کہ اسکی باز پرس ہوگی، اور جب ناپ کردو تو پورا ناپ کردو اور تول کردو تو سیدھی ترازو سے تول کردو، یہ طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بھی بہتر ہے اور جس بات کا تجھ کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ ہولے کیونکہ کان، آنکھ، دل سب سے مواخذہ ہوگا اور زمین میں اکڑ کر نہ چل کہ تو نہ اس چال سے زمین کو چیر ڈالیگا، اور نہ پہاڑوں کے برابر اونچا ہو جائیگا ان تمام باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، یہ تمام احکام دانشمندی کی ان باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں، اور خدا کے ساتھ کوئی اور دوسرا خدا نہ بنانا ورنہ تو ملامت اور راندۂ درگاہ ہو کر[۲]

۲ دوزخ میں ڈال دیا جائیگا

ان احکام کی تفصیل کے بعد آخر میں خدا فرماتا ہے،

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَیْكَ رَبُّكَ

یہ تمام باتیں دانشمندی کی اُن باتوں میں

مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل - ۴) سے ہیں جو خدا نے تم پر وحی کی ہیں،

معراج کے روحانی احوال کی تشریح کے ضمن میں خدا نے جو یہ فرمایا ہے،

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی پھر خدا نے اپنے بندہ کی طرف وحی کی جو کچھ وحی کی

اس اجمال اور ابہام کے اندر جس قدر احکام و شرائع کا حصہ تھا، شاید وہی ہیں جن کی اس مقام پر تفصیل کی گئی ہے؟

ان آیتوں میں جو احکام مذکور ہوئے ہیں، وہ تعداد میں بارہ ہیں، اور یہی احکام دوازدہ گانہ درحقیقت دنیا کے تمام خیر و شر کی بنیاد و اساس ہیں، کوئی اخلاق کی تفصیل پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے تاہم ان احکام دوازدہ گانہ کے حلقہ سے باہر نہ نکل سکے گا، مختصر اور سادہ عبارت میں احکام حسب ذیل ہیں:

۱- شرک نہ کر،	۷- ناحق کسی کی جان نہ مار،
۲- ماں باپ کی عزت و اطاعت کر،	۸- یتیم سے بہتر سلوک کر
۳- حق والوں کا حق ادا کر،	۹- اپنا عہد پورا کر کہ تجھ سے اس کی پوچھ ہوگی،
۴- اسراف نہ کر اور افراط و تفریط کے بیچ میں اعتدال و میانہ روی کی راہ چل،	۱۰- ناپ تول میں پیمانہ اور ترازو کو بھرپور رکھ،
۵- اپنی اولاد کو قتل نہ کر	۱۱- نامعلوم بات کی پیروی نہ کر،
۶- زنا کے قریب نہ جا	۱۲- زمین پر مغرور نہ بن،

یہ انہی احکام عشرہ کا نقش ثانی اور تکملہ ہے، جو حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور کی معراج میں عطا

ہوئے تھے، (توراۃ سفر استثنار ۵-۶)

۱- میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو،

۲- تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے، (یعنی جھوٹی قسم نہ کھا)

۳- سبت کے دن کی یاد کر،

۴- اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے،

۵ تو خون مت کر،

۶- تو زنا نہ کر،

۷- تو چوری نہ کر،

۸- تو اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دے،

۹- تو اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ،

۱۰- تو اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر،

سورہ کے آخر میں حضرت موسیٰؑ کو جو یہ احکام عشرہ ملے تھے اُن کی طرف اشارہ آئے گا،

ہجرت اور عذاب جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالم مادی میں کچھ طبعی و فطری قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن میں عموماً تخلف نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح عالم روحانی میں بھی اُس نے کچھ اصول و نوامیس بنا دیئے ہیں جن کے خلاف نہیں ہوا کرتا منجملہ ان اصول و نوامیس کے ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا ہے، تو ہر طرح اس کو سمجھایا جاتا ہے، تبلیغ کا ہر فرض اس کے سامنے ادا کیا جاتا ہے، شریر قوم معجزات طلب کرتی ہے، بالآخر اس کے سامنے معجزے پیش کئے جاتے ہیں، اور جب اُس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتی، تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے، اور اس کے بعد اُس بدبخت قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے، چنانچہ انبیائے کرامؑ کی سیرتیں اس اصول کی بہترین تشریح ہیں، آج اسی قاعدہ کی تعمیل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے، آپ کو معراج کی سب سے بڑی نشانی عطا کی گئی، مگر اس کو بھی وہ جھٹلاتے ہیں،

وَاِنْ مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝

(بنی اسرائیل ۔ ۷)

(دنیا میں نافرمانوں کی) کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کر ڈالیں یا اس پر سخت عذاب نہ نازل کریں، یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے، اور ہم کو (فرمائشی) معجزات کے بھیجنے سے سوا اس کے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اگلوں نے بھی ان نشانیوں کی فرمائش کی اور جب ہم نے اُن کو بھیجا تو انھوں نے جھٹلا دیا، ہم نے ثمود کو ناقہ کی سوجھانیوالی نشانی دی تو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم ان نشانیوں کو تو ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں۔ یاد کرو اے پیغمبر کہ یہ کفار تیری ایذا بلکہ قتل کے درپے ہیں لیکن) ہم نے تم سے کہہ دیا کہ تیرا رب لوگوں سے تیری حفاظت کئے ہوئے ہے اور ہم نے (معراج کی جو) رویا تجھ کو دکھائی تو وہ لوگوں کیلئے آزمائش ہے، اور اسی طرح اس درخت کا ذکر جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے وہ بھی لوگوں کے لئے آزمائش ہے اور ہم انکو آیندہ عذاب سے ڈراتے ہیں لیکن اس

[illegible]

اس لئے حضرت آدمؑ اور شیطان کے قصہ سے اس واقعہ پر استدلال ہی پھر ارشاد ہوتا ہی

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ	ہم نے جو تم پر وحی کے ذریعہ سے نازل کیا ہی قریب
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ	تھا کہ لوگ تم کو اس سے آزمایش میں ڈالدیں
وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ	کہ اس وحی کے علاوہ تم کوئی اور وحی بنا کر ہماری
اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ	طرف جھوٹ منسوب کرو اور اس وقت وہ
اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ	تم کو اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت
ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ	قدم نہ رکھتے تو کچھ ان کی طرف تم جھک چلے
ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝	تھے اگر تم ایسا کرتے تو ہم تم کو زندگی اور موت
وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	کے دوگونہ عذاب کا مزہ چکھا دیتے اور پھر تم کو ہمارے
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا	مقابلہ میں اپنے لئے کوئی مددگار بھی نہ ملتا اور
لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝	تم کو اس سرزمین (مکہ) سے قریب تھا کہ دل برداشتہ
سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ	کر دیں تاکہ تم کو یہاں سے نکال دیں اگر ایسا
مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا	ہوا تو پھر وہ تمہارے چلے جانے کے بعد اطمینان
تَحْوِيْلًا ۝	سے بہت کم رہ سکیں گے، تم سے پہلے جتنے رسول
(بنی اسرائیل - ۸)	ہم نے بھیجے ہیں سب کے ساتھ یہی دستور رہا ہی

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگا کہ معراج ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کی وہ نشانی تھی جس کے

نہ تسلیم کرنے پر عذابِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے،

نمازِ پنجگانہ کی فرضیت | اور پر گذر چکا ہے کہ نماز پنجگانہ اسی معراج میں فرض ہوئی ہے ارشاد ہوتا ہے،

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ	آفتاب کے ڈھلنے کے وقت (ظہر، عصر، مغرب)
اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ	سے لیکر رات کے اندھیرے (عشا) تک
اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ	نمازیں پڑھا کرو، اور صبح کی نماز میں حضورِ قلب
اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ	خوب ہوتا ہے اور رات کے ایک حصہ میں تہجد
عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا	پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لئے نفل ہے عجب نہیں
مَّحْمُوْدًا ۝ (بنی اسرائیل - ۹)	کہ تمہارا پروردگار تم کو مقامِ محمود میں پہنچادے،

لفظ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (آفتاب کے ڈھلنے کے وقت) میں ظہر، عصر اور مغرب، نماز کے تین اوقات اور اوقات کی تعیین کی طرف لطیف اشارہ ہے، یہ معلوم ہے کہ دینِ محمدی ملتِ ابراہیمی کا نقشِ ثانی ہے، حضرتِ ابراہیمؑ کے زمانہ میں آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی، اور جس کی رسمِ کہن دنیا میں آج بھی قائم ہے، اس مذہب میں آفتاب کی پرستش کے وہ اوقات تھے جن میں اس کی روشنی کا ظہور یا کمال ہوتا ہے، اور اسی لئے طلوع سے لیکر نصف النہار تک اس کی پرستش کی جاتی ہے، ملتِ ابراہیمی نے اس کے برخلاف اپنے لئے وہ اوقات متعین کئے جو آفتاب کے زوال کے ہیں، یعنی سورج ڈھلنے سے لیکر آفتاب کے غروب تک، کہ یہ تمام اوقات اس کے انحطاطِ نور اور زوال کے ہیں، آفتاب کے انحطاط اور زوال کی تین منزلیں ہیں، ایک وہ جب سمتِ راس (سر) سے وہ ڈھلتا ہے، یہ ظہر کا وقت ہے اور دوسری منزل وہ ہے

جب وہ برابر کی نگاہ سے نیچے اترتا ہی، یہ عصر کا وقت ہے، اور تیسری منزل وہ ہے، جب وہ سمت افق سے نیچے گر جاتا ہے، اور یہ مغرب کا وقت ہے، چوتھی نماز کا وقت رات کی تاریکی کا مقرر کیا ہے، جب آفتاب کے بقیہ وجود کی سُرخ نشانی جس کو عرفِ عام میں شفق کہتے ہیں، وہ بھی مٹ جاتی ہے، اور صبح کی نماز وادبار النجوم یعنی ستاروں کی روشنی کے ماند ہونے کے بعد ہے، غرض آیاتِ بالا میں پنجگانہ نماز کی فرضیت نہایت لطیف اور خوبی[۱] سے ادا کی گئی ہی،

ہجرت کی دعا | اس کے بعد ہجرت کے لئے دعا بتائی جاتی[۲] اور اس کے بعد فتحِ مکہ کی فوراً بشارت بھی سُنائی جاتی ہے کہ نماز کے ساتھ قبلہ کا فوراً خیال آتا ہے، جہاں اس وقت تین سو ساٹھ بت پوجے جا رہے تھے،

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ	اے پیغمبر یہ دعا مانگو کہ خداوندا! مجھے
صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ	اچھی جگہ پہونچائیو، اور (مکہ) سے اچھی طرح
وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا	نکالیو، اور دشمنوں پر اپنی طرف سے فتح و
نَّصِیْرًا ۝ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ	نصرت دیجیو، اور اے پیغمبر اعلان کر دے کہ
الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا	حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل کو مٹ
(بنی اسرائیل - ۹)	ہی جانا تھا،

یہ آخری الفاظ اسلام کے ایک نئے دور کی بشارت اور فتحِ مکہ کی نوید ہیں، اس لئے

---

[۱] یہ نکتہ مخدومی مولانا حمید الدین صاحب مفسر تفسیر نظام القرآن کا افادہ ہی [۲] صحیح بخاری و مستدرک حاکم کتاب الہجرۃ (صحیح ترمذی تفسیر سورۂ مذکور) و مسند احمد عن ابن عباسؓ،

فتحِ مکہ کے دن جب خلیلِ بُت شکن کا گھر بتوں سے پاک کیا جا رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یہی آیت جاری تھی،[1]

نبوت، قرآن، قیامت، معراج اور معجزات پر اعتراض

کفارِ مکہ کو اِن مسائل پر جو معاندانہ اعتراضات تھے اس موقع پر جب پیغمبر کی ہجرت اور اُن کے لئے عذابِ الٰہی کے نزول کا وقت قریب آرہا ہے، اُن کے جوابات دیئے جارہے ہیں کہ اب بھی اُن کی تشفی ہوجائے تو یہ بلائے آسمانی جو پیغمبر کے ہجرت کرتے ہی ان پر نازل ہونا شروع ہوجائے گی وہ رُک جائے،

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ	(یہ کفارِ قریش اپنے مال اور دولت پر
وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ وَاِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ	بھولے ہوئے ہیں) انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم
یَئُوْسًا ہ قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی	اس پر انعام کرتے ہیں تو الٹا ہم سے منہ پھیر
شَاکِلَتِہٖ فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ	لیتا ہے اور پہلوتہی کرتا ہے اور جب اسکو کوئی تکلیف
ھُوَ اَھْدٰی سَبِیْلًا ہ وَیَسْئَلُوْنَكَ	پہونچتی ہے تو آس توڑ بیٹھتا ہے، اے پیغمبر! ان
عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ	سے کہدو کہ اپنے اپنے طور پر عمل کئے جاؤ،
رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا	تمھارا پروردگار، اُن کو خوب جانتا ہے جو زیادہ
قَلِیْلًا ہ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْھَبَنَّ	سیدھے راستہ پر ہیں، وہ تم سے روحِ امین کی
بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا	(جو قاصدِ وحی ہے) حقیقت دریافت کرتے
تَجِدُ لَكَ بِہٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًا ہ اِلَّا	ہیں کہدو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک بات ہے،

[1] صحیح بخاری باب فتحِ مکہ وتفسیر آیتِ مذکورہ،

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ اِنَّ فَضْلَهٗ
كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝ قُلْ لَّئِنِ
اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى
اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ
لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا
لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ
مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا
كُفُوْرًا ۝ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ
حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا
اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ
نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا
اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ
زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۚ وَلَنْ

تم کو علم نہیں دیا گیا ہے لیکن بہت تھوڑا (اسی
وحی کے معجزۂ صداقت کے لئے یہ بات کیا کم
ہے کہ باوجود اُمّی ہونے کے وہ لفظاً بہ لفظاً تم
کو یاد ہو اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تم پر وحی
کی وہ سب تمہارے سینہ سے لیجائیں پھر تم کو
اُس کیلئے ہمارے مقابل کوئی حمایتی بھی نہ ملے
لیکن یہ تیرے پروردگار کی رحمت ہے کہ اس کا
لفظاً لفظاً تم کو محفوظ ہے) بیشک اسکی تم پر بڑی
مہربانی ہے (ان شک کرنے والوں سے)
کہدو کہ اگر تمام انس و جن بھی اکھٹے ہو کر چاہیں
کہ اس قرآن کی طرح کا کوئی اور کلام
بنا لائیں تو یہ ناممکن ہے اگرچہ وہ ایک دوسرے
کی پشتی پر کیوں نہ ہوں باوجودیکہ ہم نے اس
قرآن میں لوگوں کے سمجھنے کیلئے ہر قسم کی مثالیں
طرح طرح سے بدل کر بیان کیں مگر اکثر لوگ
انکار کئے بدون نہ رہے اور یہ کفار مکہ کہتے ہیں کہ ہم
تو اس وقت تک تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک

وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا	تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ بہا دو یا کھجوروں
كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ	اور انگوروں کا ایک باغ تمہارے لئے ہو جائے
هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا	اور تم اس میں نہریں بہا دو یا یہ کہ جیسا تم کہتے
وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ	ہو کہ ہم ایمان نہ لائیں گے تو ہم پر آسمان ٹوٹ
جَآءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا	پڑیگا تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے لا گرا دو یا خدا اور فرشتوں
اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا قُلْ	کو ہمارے سامنے کھڑا کر دو یا یہ کہ تمہارے
لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ	رہنے کے لئے ایک سونے کا گھر بن جائے یا آسمان
يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ	پر چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے
مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا قُلْ كَفٰى	کو بھی ہم اس وقت تک باور نہیں کریں گے،
بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ	جبتک ہاں سے ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لاؤ جسکو
اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا	ہم کو پڑھیں کہدو اے پیغمبر سبحان اللہ! میں تو
وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ	خدا کا ایک قاصد بندہ ہوں ہدایت آجانے
وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ	کے بعد لوگوں کو اسکے قبول سے بجز اس کے کوئی
اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ وَنَحْشُرُهُمْ	امر مانع نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بشر
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا	کو اپنا قاصد بنایا ہے کہدو کہ اگر زمین پر فرشتے
وَّبُكْمًا وَّصُمًّا مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ	بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ ہی کو
كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا	ان کے پاس قاصد بنا کر بھیجتے کہدو کہ اب دلیلوں

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا
وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا
جَدِيْدًا ۝ وَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ
الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ
جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ
فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝
قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ
رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ
خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ
الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝

(بنی اسرائیل - ۱۱)

جنون کا وقت گذر گیا) اب میرے اور تمھارے درمیان
فیصلہ کے لئے خدا بس ہے وہ اپنے بندوں کے حال کا
دانا اور بینا ہے جس کو وہ راست دکھائے وہی
راست پر ہے اور جنکو وہ گمراہ کرے تو اسکے سوا انکا
کوئی یار و مددگار نہیں پھر ہم انھیں قیامت کے دن اوندھے
منہ اندھے اور بہرے کر کے اٹھائینگے (کہ وہ اس دنیا میں
حق کے دیکھنے اور سننے سے اندھے اور بہرے تھے) ان
کا ٹھکانا دوزخ ہوگا جب وہ بجھنے کو ہوگی تو ہم
پھر اسکو بھڑکا دینگے، یہ ہماری نشانیوں کے انکار
کا بدلہ ہوگا اور وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر کر ہڈیاں
اور ریزہ ریزہ ہو جائینگے تو کیا ہم پھر از سر نو پیدا
پیدا کر کے اٹھائے جائینگے یہ کیسے ممکن ہے کیا وہ نہیں سمجھتے
کہ وہ خدا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے بیشک
اس پر قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی پھر پیدا کر دے
اور اس نے ان کیلئے ایک میعاد مقرر کر رکھی ہے جس میں
کوئی شک نہیں لیکن یہ ظالم انکار کئے بدون نہ رہے
اے پیغمبر یہ کفار مکہ اس حد سے تم پر ایمان نہیں لانا

ان آیتون مین یہ بھی بتایا گیا ہو کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمان پر تشریف لیجانے پر بھی یقین نہیں رکھتے ہیں یعنی واقعۂ معراج کو تسلیم نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ اس واقعہ کو ہم اس وقت تک تسلیم نہین کریں گے جب تک آپ ہمارے سامنے آسمان پر نہ چڑھ جائیں، اور وہان سے پورا قرآن مکمل لکھا ہوا لاکر ہمارے ہاتھ میں نہ دیدین،

حضرت موسیٰؑ کے واقعات اور حالات سے استشہاد

حضرت موسیٰ اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واقعاتِ زندگی مین متعدد حیثیتوں سے مماثلت ہے، اور خود قرآن مجید نے اس مماثلت کو ظاہر کر دیا ہے،

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا	(لوگو!) ہم نے جس طرح فرعون کی طرف
عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ	ایک رسول بھیجا تھا، اسی طرح تمھاری طرف
رَسُوْلًاo (مُزَّمِّل - ۱)	بھی ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے

اسی سبب سے قرآن مجید میں بار بار حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دہرا گیا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنون کے اندر زندگی بسر کی، یہی حال آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تھا، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار کو ہر طرح سمجھایا مگر وہ ایمان نہ لائے، اور بالآخر حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنا پڑی، اسی طرح صنادید قریش بھی آپؐ پر ایمان نہ لائے، اور بالآخر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کو لیکر مکہ سے ہجرت فرمائی، جس طرح ہجرت سے کچھ پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر خدا کی ہم کلامی نصیب ہوئی اور احکام عشرہ عطا ہوئے، اسی طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج ہوئی

اور احکامِ دوازدہ گانہ عطا ہوئے، جس طرح حضرت موسیٰؑ کی ہجرت کے بعد فرعونیون پر بحرِ احمر کی سطح پر عذاب نازل ہوا، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد صنادید قریش پر بدر کے میدان میں عذاب آیا اور جس طرح اس کے بعد فرعون کی شامی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے، اسی طرح مکہ معظمہ کی حکومت بھی ہجرت کے بعد آپ کو عطا کی گئی،

ان امور کو پیشِ نظر رکھکر کفارِ قریش کو معلوم ہونا چاہئے کہ قانونِ الٰہی معراج کے بعد ہجرت کا حکم دیگا، اور اس کے بعد اُن پر عذابِ الیم کا نزول ہوگا، چنانچہ سورۂ اسرار کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے؛

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ	اور ہم نے (کوہِ طور پر) موسیٰ کو ۹ کھلے احکام دیئے
بَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ	(جس طرح محمد کو معراج میں عطا کئے) تو پوچھ
جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ	تو بنی اسرائیل سے کہ جب موسیٰ بنی اسرائیل کے
لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۞ قَالَ	پاس آیا، تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ
لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا	میں سمجھتا ہون کہ تم پر کسی نے جادو کر کے
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ	(تمھاری عقل کھودی ہی) موسیٰ نے کہا اے فرعون
وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۞	تجکو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان حکموں کو آسمان
فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ	اور زمین کے مالک کے سوا کسی اور نے انکو دانائی
الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ	بنا کر نہیں اُتارا ہے اور اے فرعون میں سمجھتا ہون کہ
جَمِيْعًا ۞ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ	تم اب ہلاک و برباد ہو جاؤ گے فرعون نے چاہا کہ

لہ سبت کا حکم خاص یہود کے لئے تھا، اسلئے شمار میں اس کو چھوڑ دیا گیا ہو جیسا کہ آیندہ حدیث سے معلوم ہوگا،

اِسْرَآئِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝

(بنی اسرائیل - ۱۲)

بنی اسرائیل کو ملک دیا

بنی اسرائیل کو ملک اکھیڑ دی تو ہم نے اسکو اور اسکے ساتھیوں کو سب کو غرق دیا، اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم ملک میں رہو جب قیامت کا وعدہ پورا ہوگا، تو سب کو ہم

ان آیتون کے آغاز میں جن ۹ نشانیون کے دیئے جانے کا حکم ہی بعض مفسرین نے اس سے حضرت موسیٰ کے ۹ معجزات مراد لئے ہیں، مگر بعض احادیث مین مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، سامنے سے دو یہودی گذرے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں" دوسرے نے کہا کہ "پیغمبر نہ کہو سُن لیگا تو اسکی چار آنکھیں ہوجائیں گی" (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپؐ کی خدمت میں آئے، اور دریافت کیا، کہ موسیٰ کو ۹ آیتیں کونسی دی گئین" آپنے فرمایا" وہ یہ ہیں، کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ، اور میدانِ جہاد سے نہ بھاگو (اس نوین حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمھارے لئے اے یہودیو دسوان حکم ہے کہ "سبت کے دن زیادتی نہ کرو" یہ سُن کر دونون یہودیوں نے آپکے دست و پا کو بوسہ دیا،

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابنِ ماجہ، ابن جریر مین ہے، امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے ایک تفسیر بنی اسرائیل مین اور دوسرے باب ما جاء فی قبلۃ الید والرجل ہیں، اور دونون جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح"

اس حدیث میں جن دس احکام کی تفصیل ہے اور موجودہ ترجمۂ توراۃ میں یہ احکام جن الفاظ میں مذکور ہیں، اُن میں کسی قدر فرق ہے، خصوصاً حدیث کا نواں حکم جس کے متعلق شعبہ راوی خود اقرار کرتے ہیں کہ اس کو یہ نویں بات اچھی طرح یاد نہیں، یہ نواں حکم دراصل ماں باپ کی اطاعت اور عزت ہے، باقی احکام وہی ہیں، جو توراۃ میں مذکور ہیں، صرف طریقۂ ادا اور تعبیر کا فرق ہے، توراۃ کے موجودہ تراجم لفظی تو ہیں نہیں، علاوہ ازیں اس حدیث کے ایک راوی عبداللہ ابن سلمہ کا حافظہ اچھا نہ تھا، ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں اس کی تصریح کی ہے، بہرحال اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ان احکامِ عشرہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامِ دوازدہ گانہ میں ایک وجہِ مماثلت ہے اس لئے ان دونوں کے منکرون کا ایک ہی حال ہوگا۔

معراج کے انعامات | ان احکام، بشارت، اور نمازِ پنجگانہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اور خاص عطیے عنایت ہوئے ایک بشارت کہ اُمتِ محمدیہ میں سے جو شخص شرک کا مرتکب نہ ہوگا وہ امنِ مغفرت کے سایہ میں اُس کو پناہ مل سکے گی، دوسرے سورۂ بقرہ کا اختتامی رکوع اسی بارگاہ میں فرمانِ خاص کے طور پر مرحمت ہوا[1]، اس رکوع میں سب سے پہلی مرتبہ ایمان کی تکمیل کے اصول اور عفو و مغفرت کے سبق انسانوں کو سکھائے گئے ہیں، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پہلے عطیہ کی بشارت بھی درحقیقت انہی آیات میں مذکور ہے،

---

[1] صحیح مسلم باب الاسراء، اس روایت میں یہ ہو کہ سورۂ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں مرحمت ہوئیں، یہ تفصیل نہیں کہ وہ کس قدر آیتیں ہیں لیکن حدیث کی دوسری کتابوں میں جن خاتم سورہ بقرہ کی فضیلت آئی ہو وہی ہیں،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ
مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ
وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ
اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ
الْمَصِيْرُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا
اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ
عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ
اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ
اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا
مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا
وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا
فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

(بقرہ ۴۰ - ۴۰)

پیغمبر اس پر ایمان لایا، جو اس پر اترا اور
تمام مسلمان بھی اس پر ایمان لائے، یہ سب کے سب خدا
پر اسکے فرشتوں پر، اسکی کتابوں پر اور اسکے
پیغمبروں پر ایمان لائے اور کہتے ہیں کہ ہم خدا کے
پیغمبروں میں تفرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں
اور بعض کو نہ مانیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کے احکام
کو سنا اور انکی اطاعت کی تو اے ہمارے پروردگار،
مجھ پر بخشش فرما اور تیری ہی طرف آخر لوٹ کر
جانا ہے، خدا کسی شخص پر اسکی طاقت سے زیادہ
بوجھ نہیں ڈالتا جس نے اچھے کام کیے تو اپنے
ہی لئے کیے اور برے کام کیے تو اس کا نقصان
بھی وہی اٹھائیگا، اے ہمارے پروردگار، اگر ہم بھول
جائیں یا چوک جائیں تو اس کی بازپرس ہم سے نہ کر،
اے ہمارے پروردگار، اور ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈال
جس طرح ہم سے پہلوں پر تونے ڈالا، اے ہمارے پروردگار،
اور اتنا بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہم سے
نہ اٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگزر، ہمارے قصوروں

ہم کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مددگار ہے تو ان لوگوں کے مقابلہ میں جو تیرے منکر ہیں، ہماری مدد فرما،

معراج کا پر اسرار منظر | سورۂ اسرا کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے معراج کے روحانی مناظر کا بیان صرف دو لفظوں میں ختم کر دیا ہے،

لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا — ہم نے اپنے بندہ کو یہ سیر اس لیے کرائی کہ

(اسراء-۱) — ہم اپنی کچھ نشانیاں اسکو دکھائیں،

یہ "نشانیاں" کیا تھیں؟ کیا اُن کی تفصیل کے لیے عاجز و درماندہ انسان کی زبان میں کچھ الفاظ ہیں؟ ہاں ہیں، مگر ناتمام، ہماری فہم، ہمارا علم، ہمارا خیال، ہمارا قیاس، غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کا دائرہ ہمارے محسوسات اور ہمارے تعقلات سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اور ہمارے ذخیرۂ لغت میں صرف ان ہی کے لیے کچھ الفاظ ہیں، اس بنا پر وہ معانی جو نہ عام محسوساتِ انسانی کی حدود میں داخل ہیں اور نہ تعقل و تصور کے احاطہ کے اندر ہیں، وہ الفاظ و کلمات میں کیونکر سما سکتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے کمالِ قدرت سے ان کو حروف و کلمات کا جامہ پہنا بھی دے تو دماغِ انسانی ان کے فہم و تحمل کی قدرت کہاں سے لائے گا؟

وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (اسراء) اے انسانو! تمکو علم کا بہت تھوڑا سا حصہ عطا کیا گیا ہے۔

اسی لیے سورۂ والنجم میں جہاں ان اسرار کے چہرہ سے کچھ پردہ ہٹایا گیا ہے، ایسی تفصیل ہے جو تمامتر اجمال ہے، اور ایسی توضیح ہے جو سرتاپا ابہام ہے، دو دو لفظ کے فقرے ہیں، ضمیریں محذوف ہیں، فاعل کا ذکر ہے تو مفعول کا نہیں، مفعول بیان ہوا ہے تو فاعل نہیں، متعلقاتِ فعل کی تشریح نہیں، ضمائر کے مرجعوں کی تعیین نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ اس مقام کا مقتضا یہی ہے، ع

عبارت از سخنداں ہم نہ گنجد

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ
وَمَا غَوٰی ۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۔
اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۔ عَلَّمَہٗ
شَدِیْدُ الْقُوٰی ۔ ذُوْمِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی
وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی
فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۔
فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی ۔ مَا
کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۔ اَفَتُمٰرُوْنَہٗ
عَلٰی مَا یَرٰی وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً
اُخْرٰی ۔ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی ۔
عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی اِذْ یَغْشَی
السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا
طَغٰی ۔ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ
الْکُبْرٰی (سورۂ والنجم ۱)

قسم ہی ستارہ کی جب وہ گرے کہ تمھارا رفیق (محمد)
نہ تو بھٹکا ہی اور نہ بہکا ہی اور نہ وہ یہ باتیں اپنے دل سے
بنا کر کہتا ہی، بلکہ وہ تو وحی ہی جو اسکو بتایا جاتا ہی،
اسکو تو بڑی طاقتوں والا اور بڑی عقل والا تعلیم دیتا
ہی، وہ آسمان کے اونچے کنارے میں سیدھا ہو کر
نمودار ہوا، پھر قریب آیا اور جھکا تو دو کمانوں کا
فاصلہ رہ گیا، اس سے بھی کم، پھر اس کے بندے سے
جو باتیں کیں کیں، دل نے جو دیکھا اس نے جھوٹ
نہیں بیان کیا، اے لوگو! کیا وہ جو دیکھتا ہی اس میں
تم اس سے نزاع اور مناظرہ کرتے ہو، اس نے یقیناً
دوبارہ اسکو اترتے دیکھا، انتہا کے درخت کے پاس
جس کے قریب (نیک بندوں کے) رہنے کی بہشت ہے،
جب بیری کے درخت پر چھا رہا تھا، جو چھا رہا تھا،
نہ نظر بہکی نہ اچٹی، اس نے یقیناً اپنے پروردگار کی بڑی
بڑی نشانیاں دیکھیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معراج کے روحانی مشاہدات و مناظر اور ملکوتی آیات و مظاہر کا قریش سے تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ راہ حق سے دیدہ و دانستہ (غوایت) یا نادانستہ (ضلالت) بھٹک گیا ہی، یا اپنے دل سے بنا کر یہ جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے، یہ انھوں نے

کیوں کہا؟ اس لیے کہا کہ روحانی جلووں کے دیکھنے کی اُن کے پاس آنکھیں نہ تھیں، صوتِ سرمدی کے سننے کی اُن کے کانوں میں طاقت نہ تھی، اسرارِ ملکوتی کے سمجھنے کے لیے اُن کے سینوں میں دل نہ تھے، خدا نے کہا، جو کچھ تھا، اور جو کچھ معلوم ہوا، یہ بڑی طاقت وقدرت اور علم وعقل والی ہستی کی جلوہ انگیزیاں تھیں، وہ کبھی اتنا دور تھا کہ آسمان کے کناروں میں نظر آیا، اور کبھی اتنا قریب کہ دو کمانوں کے فاصلہ سے بھی قریب تر تھا، کون جھکا؟ کون قریب آیا؟ کون دو کمانوں کے فاصلہ تک آکر رہ گیا؟ کیا خدا؟ نہیں! کیا جلوۂ خدا؟ شاید، کس نے باتیں کیں؟ معلوم نہیں، کیا باتیں کیں؟ بتائیں نہیں، سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟ انسانی فہم وادراک کی اخیر سرحد پر ایک درخت[۱]! کیا اس کو شئون وصفاتِ الٰہی کی نیرنگی نے ڈھانک لیا[۲]؟ کیا انسانی فہم وادراک کی اخیر سرحد کا درخت صرف شئون وصفات کی نیرنگی کا مظہر ہے؟ کیا یہاں پہنچکر کون ومکان اور وجوب وامکان کا عقدۂ مشکل حل ہوگیا؟ کیا دل بھی دیکھتا ہے؟ حضورؐ نے دل کی آنکھوں سے کیا دیکھا؟ دیدۂ چشم سے کیا نظر آیا؟ آپؐ کو اس سفر میں آیاتِ ربانی دکھائی گئیں، مگر یہ مشاہدۂ قلب تھا، یا معائنۂ چشم؟ ع

"رازِ ایں پردہ نہان است ونہاں خواہد بود"

---

[۱] اکابر تابعین سے یہی روایت طبری نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے [۲] بخاری شریف میں ہے فغشیہا من امر اللہ ما غشی یعنی جلوۂ الٰہی اس پر چھا گیا، ۱۲

شقِ صدر یا شرحِ صدر

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ

"کیا اے پیغمبر! ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا"

منجملہ نبوت کے اُن خصائص کے جو ایک پیغمبر کو عطا ہوتے ہیں، شقِ صدر یا شرحِ صدر بھی ہے، چنانچہ یہ رتبۂ خاص بیش گاہِ الٰہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت ہوا، شقِ صدر سے مراد یہ ہے کہ سینۂ مبارک کو چاک کر کے اس کو بشری آلودگیوں سے پاک اور ایمان و حکمت کے نور سے منور کیا گیا، بعض روایتیں ایسی بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی یہ کیفیت آپ پر گذری تھی، ان روایتوں میں بعض جزئیات کی تفصیل اور وقت کی تعیین میں اختلافات ہیں، چنانچہ تمام روایتوں کے جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپ پر اس کیفیت کا گذرنا ظاہر ہوتا ہے، ایک جب آپ چار پانچ سال کے تھے، اور حضرت حلیمہؓ کے ہاں پرورش پا رہے تھے، دوسرے جب عمر شریف دس برس کی تھی، تیسرے جب آپ بیس برس کی عمر کو پہنچے، چوتھے جب حضرت جبریلؑ سب سے پہلی دفعہ وحی لیکر آئے، پانچویں معراج کے موقع پر۔

یہ مسئلہ کہ شق صدر واقع ہوا، تمام صحیح روایتوں سے ثابت ہے، اور اس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں، البتہ وقت کی تعیین اور بعض جزئیات کی تفصیل میں

روایتیں مختلف ہیں، تیسری دفعہ کی روایت جس میں بیس برس کی عمر میں اس کیفیت کا گذرنا بیان کیا گیا ہے، محدثین[1] بلکہ خود ارباب سیر[2] کے نزدیک قطعاً غیر ثابت ہے، باقی چار موقعوں کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے جو ہر اختلاف روایت کو ایک نیا واقعہ تسلیم کر کے مختلف روایتوں میں توفیق اور تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، تسلیم کیا ہے، امام سہیلی روض الانف میں صرف دو موقعوں کی روایت کو صحیح سمجھتے ہیں، ایک دفعہ صغر سنی میں اور دوسری دفعہ معراج میں، اور اس کی مصلحت یہ بتائی ہے کہ صغر سنی میں اس لیے یہ ہوا کہ بچپن ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے ذمائم کے حصہ کو نکال دیا جائے، اور معراج کے وقت تو ظاہر ہے اس لیے تاکہ حضور ربانی کے موقع پر حکم صلوٰۃ کا جو طہارت محض ہی تحمل کیا جائے، اور ملائکہ الٰہی کی امامت نماز میں فرما سکیں (ص ۱۱۰ مصر) لیکن یہ بات ہر شخص کو کھٹک سکتی ہے کہ سینۂ مبارک کا آلودگیوں سے پاک صاف ہو کر منور ہو جانا ایک ہی دفعہ میں ہو سکتا ہے اور وہ ایک دفعہ پاک منور ہو کر پھر دوبارہ پاکی و طہارت کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اس بنا بعض محدثین جیسے قاضی عیاض وغیرہ اس کو ایک ہی دفعہ کا واقعہ سمجھتے ہیں، اور وہ صغر سنی میں جب آپ حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پا رہے تھے، اور معراج کے موقع پر شق صدر کے واقعہ کو راویوں کا سہو جانتے ہیں[3]، لیکن یہ پوشیدہ نہیں کہ واقعہ

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۹۹ مصر [2] زرقانی بر مواہب ج ۱ ص ۱۸۰ [3] فتح الباری کتاب الصلوٰۃ باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء ج ۱ ص ۳۸۹ و کتاب التوحید ج ۳ ص ۱۱۶۲ باب ما جاء فی قولہ عزوجل وکلم اللہ موسیٰ تکلیما روض الانف سہیلی ص ۱۱۰ مصر، زرقانی بر مواہب ج ۱ ص ۱۷۹، قاضی عیاض شفا میں لکھتے ہیں: وقد خلط فیہ غیرہ لاسیما من روایۃ شریک بن ابی نمر فقد ذکر اولہ مجیئ الملک لہ وشق صدرہ وغسلہ بماء زمزم وھذا انما کان وھو صبی وقبل الوحی (نسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض ج ۲ ص ۱۲۶۵)

شق صدر کی روایت جن طریقوں کے ساتھ آئی ہے، ان میں سب سے صحیح، سب سے مستند اور معتبر طریقہ وہی ہے جس میں اس کا شب معراج میں ہونا بیان ہوا ہے، اس لیے اس موقع کو راویوں کا سہو قرار دینا اور بچپن میں اس کا ہونا تسلیم کرنا اصول روایت سے صحیح نہیں،

شق صدر کی ضعیف روایتیں

اصل یہ ہے کہ شق صدر کے وقت یا اوقات کی تعیین اور اس کا تکرر اور بار بار پیش آنا صرف مختلف روایات کے پیش کر دینے سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے کیا ہے، اور قسطلانی اور زرقانی نے اس کی تقلید کی ہے، بلکہ ضرورت ہے کہ ان روایات کے سلسلۂ سند پر بھی بحث اور راویوں کی قوت وضعف کی بھی تنقید کی جائے

دس برس کے سن میں شق صدر والی روایت جس میں یہ تصریح ہے کہ سب سے پہلی دفعہ آپ پر نبوت کی یہ علامت طاری ہوئی، حسب ذیل ہے:

" حضرت ابو ہریرہؓ آپ سے نبوت کا ابتدائی نشان پوچھتے ہیں، آپ فرماتے ہیں: میں دس برس کا تھا کہ میدان میں دو آدمی میرے سر پر آئے، ایک نے کہا یہ وہی ہیں، دوسرے نے کہا ہاں، پھر دونوں نے پیٹھ کے بل مجھے پچھاڑا، اور میرے پیٹ کو پھاڑا، ایک سونے کے طشت میں پانی لاتا رہا، اور دوسرا پیٹ کو دھوتا رہا، پھر ایک نے کہا سینہ کو چاک کرو، تو ناگاہ دیکھتا ہوں کہ سینہ چاک ہے، اور کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوتی، پھر ایک نے کہا کہ دل کو چاک کرو، تو اس نے دل کو چاک کیا، پھر اس نے کہا اس میں سے کینہ اور حسد نکال لو، تو اس میں سے جمے ہوئے خون کی طرح کی کوئی چیز نکالی، پھر کہا اس میں مہربانی اور رحمت رکھدو، تو اس نے چاندی کی طرح کی کوئی چیز رکھدی، پھر اس نے

چند گھنڈیاں جو اس کے پاس تھیں نکالیں اور وہ گھنڈیاں میرے سینہ پر لگادیں، پھر میرے انگوٹھے کو کھونٹ کر مجھ سے کہا جاؤ، جب میں لوٹا تو اپنے میں وہ لیکر لوٹا جو لیکر نہیں آیا تھا یعنی چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کے ساتھ نرمی"۔ یہ روایت زوائد مسند احمد، ابن حبان، حاکم، ابن عساکر اور ابونعیم میں ہے، لیکن ان تمام کتابوں میں مرکزی سلسلۂ سند ایک ہی ہے یعنی یہ کہ معاذ بن محمد اپنے باپ محمد بن معاذ اور وہ اپنے باپ معاذ ابن محمد سے، اور وہ اپنے دادا ابی بن کعب سے، روایت کرتے ہیں، محدث ابن المدینی نے اپنی کتاب العلل میں اس حدیث کے تحت میں لکھا ہے،

حدیث مدنی واسنادہ	یہ مدنی حدیث ہے، اسکی سند تمام تر مجہول ہے
مجہول کلہ ولا نعرف محمداً	ہم لوگ نہ محمد کو جانتے ہیں اور نہ اس کے
ولا اباہ ولا جدہ (تہذیب التہذیب ج۱ ص۱۹۷)	باپ کو اور نہ اس کے دادا کو،

حافظ ابونعیم نے دلائل میں جہاں یہ حدیث نقل کی ہے، صاف لکھدیا ہے،

وھذا الحدیث تفرد بہ معاذ	یہ حدیث صرف معاذ بن محمد نے نقل کی ہے،
ابن محمد وتفرد بذکر السن	اور وہی اس عمر کی تعیین کے بیان میں جس میں
الذی شق فیہ عن قلبہ	شق صدر ہوا منفرد ہیں (یعنی اس روایت
(صفحہ ۱۷، حیدرآباد)	کی کسی اور نے تائید نہیں کی ہے)

بیس برس کے سن کی روایت بھی بعینہ ان ہی لوگوں سے تھوڑے تغیر کیساتھ ان ہی الفاظ میں زوائد احمد، صحیح ابن حبان، حاکم، بیہقی اور مختارہ ضیا میں ہے (کنز العمال جلد ۶ ص۹۶)

لیکن اس سلسلۂ روایت کا حال آپ سن چکے کہ وہ معتبر نہیں۔

آغاز وحی کے موقع پر شق صدر کی روایتیں دلائل ابونعیم، دلائل بیہقی، مسند طیالسی اور مسند حارث میں ہیں۔ یہ روایتیں حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی آغاز وحی والی حدیث بخاری، مسلم اور ابن حنبل وغیرہ تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے، اور اس باب میں یہی روایت سب سے زیادہ مفصل، صحیح اور محفوظ ہے لیکن ان کتابوں میں اس موقع پر شق صدر کا مطلق ذکر نہیں، اس سے اس واقعہ کی بے اعتباری ظاہر ہوتی ہے علاوہ بریں ابونعیم، بیہقی، طیالسی اور حارث والی اس روایت کی مرکزی سند ابوعمران الجونی عن یزید بن بابنوس عن عائشہ" ہے، یزید بن بابنوس مجہول ہے، اور اس سے صرف ابوعمران الجونی ہی نے روایت کی ہے کسی اور نے اس کو نہیں لیا ہے، طیالسی میں (صفحہ ۲۱۵ حیدرآباد) اس روایت کی سند یہ ہے کہ حماد بن سلمہ ابوعمران جونی سے اور وہ ایک شخص سے، اور وہ حضرت عائشہؓ سے راوی ہے" معلوم نہیں یہ نامعلوم شخص کون ہے؟ اور ابوعمران نے اس کا نام کیوں نہیں لیا ہے، ابونعیم میں (صفحہ ۶۹ حیدرآباد) اس روایت کا جو سلسلۂ سند ہے اس میں یہ خالی جگہ یزید بن بابنوس کے نام سے پُر کی گئی ہے جس کا حال ابھی اوپر گذر چکا، علاوہ ازیں ابونعیم کی روایت میں اس کے نیچے داؤد بن المجر ایک شخص آتا ہے جس کو اکثر محدثین ضعیف بلکہ دروغگو تک کہتے ہیں، اسی کے ساتھ اس روایت کے اندر بعض ایسی لغو باتیں بھی ہیں جو اس کو صحت کے پایہ سے ساقط کرتی ہیں۔

ایک اور روایت حضرت ابوذرؓ سے ہے کہ" انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کو نبی بنانا چاہا گیا تو آپ کو اپنی پیغمبری کا حال کیونکر معلوم ہوا، اور آپ نے کیونکر یقین کیا کہ آپ پیغمبر ہیں"؟ فرمایا "اے ابو ذر! میں مکہ کی ترائی میں تھا کہ دو فرشتے میرے پاس آئے، ایک زمین پر آیا اور دوسرا آسمان پر تھا، ایک نے دوسرے سے کہا یہی وہ ہیں، پھر کہا ان کو تولو، پہلے ایک سے، پھر دس سے، پھر سو سے، پھر ہزار سے مجھ کو تولا، لیکن میرا پلہ بھاری رہا، تو کہا کہ یہ تمام امت سے بھاری ہیں، بعد ازیں میرا شکم چاک کیا (اس کے بعد شق صدر کے مختلف واقعات کا ذکر ہے، اس کے بعد ہے) کہ ان فرشتوں نے پھر میرے شانہ پر مہر کی"۔ اس روایت میں گو وقت کی تعیین نہیں، مگر یہ ذکر ہے کہ یہ واقعہ مکہ کی ترائی میں پیش آیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرت حلیمہؓ کے پاس، بنو ہوازن میں قیام کے زمانہ کے بہت بعد کا واقعہ ہے، پھر اس میں یہ ہے کہ "جب آپ کو نبی بنانا چاہا گیا" اور نبوت کی سب سے پہلی علامت کا سوال ہے اور امت کا ذکر ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آغاز وحی کا واقعہ ہے، یہ روایت مسند دارمی (صفحہ ۲) اور دلائل ابو نعیم (صفحہ ۱۷) میں ہے، ان کے مشترک راوی بہ ترتیب ابو داؤد، جعفر بن عبد اللہ بن عثمان القرشی، عثمان بن عروہ بن زبیر ہیں، جعفر بن عبد اللہ کی نسبت محدث عقیلی نے تنقید کی ہے، کہ اس میں "وہم" تھا، یعنی الفاظ کی صحیح یادداشت نہ تھی، اور "اضطراب" تھا، یعنی ایک ہی واقعہ اور سند کو کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح بیان کرتا تھا، پھر اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ "اس کی متابعت نہیں کی جاتی" یعنی اس کے ہم شیخ اور ہم درس اس کی تائید نہیں کرتے[۱]، پھر بعینہ یہی واقعات

[۱] دیکھو میزان الاعتدال ذہبی اور تہذیب التہذیب ابن حجر

شداد بن اوسؓ کی روایت سے ابونعیم، ابو یعلیٰ اور ابن عساکر نے عتبہ بن عبد سلمی کی روایت سے دارمی اور ابن اسحاق نے (مرسلاً) بچپن کے شق صدر میں بیان کیا ہے، جن سے انکا باہم تعارض واضح ہے،

اب رہ گئی وہ روایت جس میں حلیمۂ سعدیہ کے ہاں قیام کے زمانہ میں شقِ صدر کا ذکر ہے، یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمامتر خالی ہیں، اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں جو اس کو درجۂ اعتبار سے گرادیتی ہیں،

۱- اس روایت کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ جہم بن ابی جہم، عبداللہ بن جعفر سے اور عبداللہ بن جعفر خود حلیمہ سعدیہ سے راوی ہیں، اس طریقہ سے یہ روایت ابن اسحاق اور دلائل ابی نعیم میں ہے، جہم بن ابی جہم مجہول ہے، اور عبداللہ بن جعفر کی حلیمہ سعدیہ سے ملاقات ثابت نہیں، اور ابن اسحاق، جہم بن ابی جہم کا شک ظاہر کرتا ہے، اس نے کہا کہ "عبداللہ ابن جعفر نے خود مجھ سے کہا یا ان سے سن کر کسی اور نے مجھ سے کہا" ابونعیم میں گو یہ شک مذکور نہیں ہے، بلکہ اس میں تصریحاً عبداللہ بن جعفر کا نام لیا گیا ہے، مگر اس میں اس کے نیچے کے راوی مجروح ہیں،

۲- دوسرا طریقہ واقدی کا ہے، ابن سعد نے اس روایت کو اسی سلسلہ سے ذکر کیا ہے (جلد ا صفحہ ۷۰)، مگر علاوہ اس کے کہ واقدی کا اعتبار نہیں، اس کی تفصیلی سند تک اس میں

مذکور نہیں، اوپر کے راویوں کا نام مطلق نہیں بتایا گیا ہے،

۳۔ ابونعیم نے ایک اور سلسلہ سے اس کو بیان کیا ہے، جو یہ ہے" عبدالصمد بن محمد السعدی اپنے باپ سے، وہ اپنے باپ سے، اور وہ ایک شخص سے جو حضرت حلیمہؓ کی بکریاں چرایا کرتا تھا، بیان کرتے ہیں" یہ تمام تر مجہول لوگ ہیں،

۴۔ بیہقی اور ابن عساکر نے ایک اور سند سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے، لیکن اس سند میں محمد بن زکریا الغلابی جھوٹا اور وضاع ہے، اس کا شمار قصہ گویوں میں ہے،

۵۔ ابن عساکر نے شداد بن اوس صحابی کے واسطہ سے ایک نہایت طویل داستان نقل کی ہے، جس میں مذکور ہے کہ قبیلۂ بنی عامر کے ایک پیرمرد نے خدمتِ نبوی میں آکر آپ سے آپ کے ابتدائی حالات دریافت کیے، آپ نے پورا پورا حال بیان کیا، منجملہ اس کے ایک واقعہ اپنے بچپن کے شق صدر کا بیان کیا، لیکن خود ابن عساکر اس روایت کو "غریب" (یعنی ثقات کے بیان سے مختلف) کہتے ہیں، اس کے سوا اس سلسلۂ سند کے بیچ میں ایک بے نام ونشان راوی ہے، اس سے اوپر ایک اور قابل اعتراض راوی اس میں ابویعفا ہے، جو شداد بن اوسؓ صحابی سے اس قصہ کا سننا بیان کرتا ہے، امام بخاری نے تاریخ صغیر (ص ۱۳۰، الہ آباد) میں اس کی نسبت لکھا ہے فی حدیثہ نظر، اس کی حدیث بحث طلب ہے، ابوحاتم کہتے ہیں لیس حدیثہ بالقائم، یعنی اس کی حدیث ٹھیک نہیں، (تہذیب التہذیب ومیزان)

حضرت شداد بن اوسؓ سے مکحول شامی کے واسطہ سے، ابو یعلیٰ اور ابن عساکر نے بعینہ اسی واقعہ کو ایک اور سلسلہ سے نقل کیا ہے، جس میں گو کوئی مجہول راوی بیچ میں نہیں آیا ہے، مگر اس میں یہ کمی ہے کہ مکحول اور شداد صحابیؓ کے بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے، یا چھوڑ دیا گیا ہے، یعنی روایت منقطع ہے، کیونکہ مکحول نے حضرت شدادؓ کا زمانہ نہیں پایا ہے، مکحول تدلیس میں بدنام تھے، یعنی ان کی عادت یہ تھی کہ بیچ میں اگر کوئی کمزور راوی آجاتا تو وہ اس کا نام چھپا دیتے تھے، یا بیچ سے اس کو حذف کر کے اگلے سے سلسلہ جوڑ دیتے تھے، میرا خیال ہے کہ مکحول اور حضرت شدادؓ کے بیچ میں دراصل وہی ابو العجفاء تھا، مکحول نے یہ دیکھ کر کہ وہ مجروح ہے اس کو بیچ سے نکال دیا ہے، اسلیے یہ سلسلہ بھی نامعتبر ہے،

۴- عتبہ بن عبد السلمیؓ ایک کمسن صحابی ہیں، ان سے ایک ہی سلسلۂ سند کے ذریعہ سے حاکم، دارمی، ابو یعلیٰ، ابن عساکر اور ابن حنبل نے اس واقعہ کی یوں روایت کی ہے کہ آپنے فرمایا ایک دن میں اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چرانے گیا، کھانا ساتھ نہ تھا، میں نے اس کو ماں (دایہ) کے پاس کھانا لانے کے لیے بھیجا، وہ گیا تو دیکھا کہ گدھ کی طرح کے دو پرندے آئے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ یہی ہے، دوسرے نے کہا "ہاں"، پھر دونوں نے جھپٹکر مجھے پکڑا، اور زمین پر پچھاڑ کر میرا پیٹ چاک کیا، اور اس میں سے دو سیاہ جمے ہوئے خون کے قطرے نکالے اور برف اور ٹھنڈے پانی سے دھویا" یہ حاکم کے الفاظ ہیں، دارمی وغیرہ میں اس کے بعد اتنا زیادہ ہے کہ "دھونے کے بعد ایک نے کہا کہ سکینت یعنی تسکینِ قلبی

لاؤ۔ اس کو لاکر میرے سینہ میں چھڑک دیا، پھر دونوں چھوڑ کر مجھے چلے گئے، میں ڈرا اور اپنی ماں کے پاس گیا اور حال کہا، وہ ڈری کہ بچہ کی عقل ٹھیک نہیں رہی، اس نے کہا میں تم کو خدا کی پناہ میں دیتی ہوں اور پھر وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر میری والدہ کے پاس لائی، والدہ نے کہا تم نے امانت پوری طرح ادا کی، دایہ نے میرا حال اور اپنا خوف بیان کیا، لیکن والدہ کو یہ واقعہ سن کر کوئی خوف یا تعجب نہیں ہوا، فرمایا "جب یہ بچہ پیدا ہوا تو میں نے دیکھا تھا کہ ایک نور میرے بدن سے نکلا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے، حاکم نے اس حدیث کو مسلم کی شرط کے مطابق کہا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ روایت کا پہلا مشترک راوی بقیہ بن ولید ہے جس کو گو بذاتِ خود بعضوں نے ثقہ کہا ہے، تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سخت بے احتیاط تھا، ابن مبارک کہتے ہیں، وہ راست گو ہے، مگر وہ آگے پیچھے کے ہر شخص سے روایت لے لیا کرتا تھا، ابن عیینہ کہتے ہیں" بقیہ سے احکام کی روایتیں نہ لیا کرو، ثواب (فضائل) کی روایتیں خیر لے لیا کرو، امام ابن حنبل اور امام یحییٰ کا قول ہے کہ" اگر وہ مشہور لوگوں سے روایت کرے تو خیر، ورنہ مت لو" ابو حاتم کہتے ہیں کہ" اس کی حدیث لکھی جائے، مگر وہ دلیل میں نہ پیش کی جائے"، امام نسائی فرماتے ہیں "جب وہ اخبرنا اور حدثنا کہے تو خیر اور جب عن عن کرکے بیان کرے تو نہ لو" (یہ یاد رہے کہ یہ روایت مذکورہ بطریق عن عن ہی ہے) ابن عدی کا قول ہے کہ اس کی بعض روایتیں ثقہ اور معتبر راویوں کے خلاف ہیں، امام احمد بن حنبل ایک شخص سے فرماتے ہیں کہ" میں سمجھتا تھا کہ بقیہ مجہول الحال لوگوں سے سن کر حدیثیں نقل کرتا ہے لیکن دیکھا تو وہ مشہور

لوگوں سے بھی اسی قسم کی حدیثیں بیان کرتا ہے. تم نے جانا وہ کہاں سے یہ روایتیں لاتا ہے؟ مخاطب نے جواب دیا "ہاں تدلیس کے ذریعہ" (یعنی بیچ کے کمزور راوی کو حذف کرکے، آگے کے معتبر راوی سے سلسلہ جوڑ دیا کرتا تھا) ابوعبداللہ حاکم کہتے ہیں کہ اوزاعی وغیرہ مشہور لوگوں سے وہ ایسی روایتیں کرتا ہے، جو موضوعات کے مشابہ ہیں، اور اسکی صورت یہ کرتا ہے کہ بیچ کے ضعیف راوی کو حذف کر دیتا ہے" خطیب کہتے ہیں کہ "اس کی اکثر روایتیں منکر ہیں، گو وہ بذاتِ خود راست گو تھا" ابن القطان کا قول ہے کہ "وہ ضعیف راویوں سے تدلیس کرکے بیان کرتا ہے، اور اس کو وہ جائز سمجھتا ہے، یہ الزام اگر اس پر سچ ہے تو اس کے معتبر ہونے میں خلل انداز ہے"

حماد بن سلمہ کی روایت میں ان کا وہم | بچپن میں شق صدر کا سب سے صحیح اور محفوظ سلسلۂ سند وہ ہے جو حماد بن سلمہ ثابت بنانی سے اور ثابت، انسؓ بن مالک سے روایت کرتے ہیں، چنانچہ یہ روایت صحیح مسلم، مسند احمد، ابن سعد اور دلائل ابونعیم میں ایک ہی سلسلۂ سند سے مذکور ہے، یعنی حضرت انسؓ سے ثابت البنانی، اور ان سے حماد بن سلمہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، کہ حضرت جبریلؑ آئے اور آپ کو پکڑ کر زمین پر لٹایا، اور قلب مبارک کو چاک کیا، اور اس کو نکال کر اس میں سے ذرا سا جما ہوا خون نکالا اور کہا کہ یہ اتنا شیطان کا حصہ تم میں تھا، پھر اس کو سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا، پھر شگاف کو جوڑ دیا، پھر اسکو اپنی جگہ پر رکھدیا، لڑکے دوڑے ہوئے آپ کی ماں (دایہ حلیمہ) کے پاس گئے اور جاکر کہا کہ محمد مار ڈالے گئے، لوگ آپ کے

پاس پہنچے، دیکھا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہے۔ انسؓ کہتے ہیں کہ سینۂ مبارک میں زخم کے سینے کے نشان یعنی ٹانکے مجھ کو نظر آتے تھے۔" مسند ابن حنبل میں یہی حدیث اسی سلسلۂ سند سے حضرت انسؓ سے مروی ہے، اور اس میں آخر میں واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم ہے، یعنی یہ کہ "مجھ کو نظر آتے تھے"۔ کی جگہ پر یہ ہے کہ "ہم کو زخم کے ٹانکے نظر آتے تھے"۔

اس سلسلۂ سند کے صحیح اور محفوظ ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحاح میں معراج اور شقِ صدر کی جس قدر روایتیں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ان کے دوسرے راوی تابعین میں حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے قتادہ، زہری، شریک اور ثابت بنانی چار شخص ہیں، ثابت بنانی سے دو آدمی ان واقعات کو نقل کرتے ہیں، سلیمان بن مغیرہ اور حماد بن سلمہ، حماد کے علاوہ اور جو طرق اوپر مذکور ہوئے، اُن سب میں معراج کے واقعات کے آغاز میں شقِ صدر کا ذکر ہے، لیکن حماد نے اپنی روایت میں یوں کیا ہے کہ معراج کے سلسلہ میں وہ شقِ صدر کے ذکر کو ترک کر دیتے ہیں، اور شقِ صدر کے واقعہ کو الگ اور مستقل بچپن کے زمانہ کی تخصیص کے ساتھ بیان کرتے ہیں، حالانکہ نہ صرف حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے کوئی، بلکہ حماد کے دوسرے ہم درس طلبہ میں سے بھی کوئی انکی تائید نہیں کرتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے معراج کی حدیث، حماد کے واسطہ سے نقل نہیں کی ہے، حماد کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے کہ "آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا"۔ اسی سبب سے امام بخاری نے ان کی روایتیں نہیں لی ہیں، امام مسلم اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کر کے خرابی حافظہ سے پہلے کی جو ان کی روایتیں ہیں، ان ہی کو چن کر اپنی کتاب

میں لاتے ہیں: "میرا میلانِ تحقیق یہ ہے کہ حماد کی یہ روایت اسی خرابی حافظہ کے زمانہ کی ہے کہ انھوں نے تمام معتبر راویوں کے خلاف شقِ صدر اور معراج کے مشترک واقعہ کو دو کردیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ امام مسلم بھی اپنی ترتیبِ بیان کے اشارات سے ایسا ہی کچھ بتانا چاہتے ہیں کہ معراج اور شق صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد سے غلطی ہوئی ہے، چنانچہ واقعاتِ معراج کے ذکر میں امام مسلم یہ کرتے ہیں کہ پہلے حضرت انسؓ سے ثابت کے شاگرد حماد کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں جس میں معراج کے شق صدر کا ذکر نہیں، پھر حماد کے ساتھی اور ثابت کے شاگرد سلیمان بن مغیرہ کی روایت ہے، جس میں شقِ صدر کے ساتھ معراج کا ذکر ہے۔ اس کے بعد حماد کی وہ روایت ہے جس میں تنہا بچپن کے شقِ صدر کا تذکرہ ہے، بعد ازیں حضرت انسؓ کے دوسرے شاگردوں کی روایتیں ہیں، جس میں شقِ صدر اور معراج کا ایک ساتھ واقع ہونا مذکور ہے۔

حماد کی اس روایت میں بعض ایسے معنوی وجوہ بھی ہیں جن کی تائید کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوتی، مثلاً یہ کہ شق صدر کی یہ کیفیت کسی عمر میں بھی گذری ہو، مگر بہر حال اس کا تعلق روحانی عالم سے تھا، گذشتہ تمام مستند اور مجروح روایتوں میں حسد، بغض حصۂ شیطانی، سکینت، تسلی، رحمت، شفقت، ایمان اور حکمت وغیرہ جن امور کا سینۂ مبارک سے نکالنا یا اس میں رکھنا بیان ہوا ہے، ان میں سے کسی چیز کا تعلق جسمانیات سے نہیں، بایں ہمہ حماد حضرت انسؓ سے روایت کرکے کہتے ہیں کہ "آپ کے سینہ پر زخم کے ٹانکے کے نشان مجھ کو (جیسا کہ مسلم میں ہے) یا ہم کو (جیسا کہ مسند احمد میں ہے) نظر آتے تھے۔" اگر یہ

جسمانی واقعہ بھی تھا، تو حضرت انسؓ کی دیگر مروی روایات میں سے جو حمادؔ کے علاوہ دوسرے راویوں نے نقل کی ہیں، یہ مذکور نہیں، علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل شمائل کا ایک ایک حرف، جسمِ اطہر کے ایک ایک خط و خال کی کیفیت صحابہؓ نے بیان کی ہے مگر کسی نے سینۂ مبارک کے ان نمایاں ٹانکوں کا نام تک نہیں لیا۔ ایسی حالت میں واقعہ کی یہ صورت کیونکر تسلیم ہو سکتی ہے۔

وقوعہ شق صدر ہو تو اسکی تاویل اس تشریح اور تفصیل کے بعد بھی اگر کسی کو حمادؔ کی اس روایت کے قبول کرنے پر اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت کے مطابق بچپن میں جب عقل و ہوش کا آغاز ہوا تو سینۂ مبارک سے حصۂ شیطانی، جو ہر انسان کے اندر ہے، اس کو نکالا گیا۔ صحیح مسلم کی اس روایت میں اسی قدر ہے، ابھی علم و حکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی، مگر معراج کی رات جب اس عقل و ہوش کی تکمیل ہوئی تو وہ دھو کر علم و حکمت سے معمور کیا گیا، جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے

شق صدر کی صحیح کیفیت شقِ صدر کی صحیح کیفیت حالتِ معراج کے سلسلہ میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور نسائی وغیرہ میں متعدد روایتوں اور طریقوں سے مذکور ہے کہ ایک شب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے، آنکھیں سوتی تھیں، مگر دل بیدار تھا، کہ ناگاہ حضرت جبرئیلؑ چند فرشتوں کے ساتھ نظر آئے، آپ کو اٹھا کر وہ چاہ زمزم کے پاس لے گئے، یا آبِ زمزم لے کر کوئی آپ کے پاس آیا، سینۂ مبارک کو چاک کیا، پھر آبِ زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان اور حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا، پھر اس طشت کے سرمایہ کو سینۂ مبارک میں بھر کر شگاف کو برابر کر دیا گیا، اس کے بعد فرشتے آپ کو آسمان

کی طرف لے چلے[1]،

شق صدر کی حقیقت | علماے ظاہر بیں اس واقعہ کے ظاہر الفاظ کے جو عام اور سیدھے سادے معنی سمجھتے ہیں کہ واقعی سینۂ مبارک چاک کیا گیا، اور قلب اقدس کو اسی آب زمزم سے دھو کر ایمان اور حکمت سے بھر دیا گیا، اس کو ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے، لیکن صوفیاے حقیقت بیں اور عرفاے رمز شناس ان الفاظ کے کچھ اور ہی معنی سمجھتے ہیں، اور ان تمام غیر محتمل الالفاظ معنی کو تمثیل کے رنگ میں دیکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ عالم برزخ کے حقائق ہیں، جہاں روحانی کیفیات جسمانی اشکال میں اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح حالت خواب میں تمثیلی واقعات جسمانی رنگ میں نمایاں ہوتے ہیں، اور جہاں معنی اجسام کی صورت میں متمثل ہوتے ہیں،

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں،

اما شق الصدر وملؤہ ایمانا	لیکن سینہ کا چاک کرنا، اور اس کو ایمان سے
فحقیقتہ غلبۃ انوار الملکیۃ	بھرنا اس کی حقیقت انوار ملکیہ کا روح پر غالب
وانطفاء لھیب الطبیعۃ	ہو جانا اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا بجھ جانا
وخضوعھا لما نفیض علیھا	اور عالم بالا سے جو فیضان ہوتا ہے اس کے قبول
من حظیرۃ القدس[2]،	کے لیے طبیعت کا آمادہ ہو جانا ہے،

ان کے نزدیک معراج بھی اسی عالم کی چیز تھی، اسلیے شق صدر بھی اسی دنیا کا واقعہ ہوگا،

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و نسائی، ابواب معراج یا فرض الصلوٰۃ و مسند احمد روایات انس وغیرہ

[2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۲۰۴ ۱۵

ہمارے نزدیک صحیح اصطلاح شرح صدر ہے، جیساکہ صحیح مسلم باب الاسرا میں حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت میں مذکور ہے، فشرح صدری الی کذا وکذا (میرا سینہ یہاں سے یہاں تک کھولا گیا) اور قرآن مجید کی اس سورہ میں جیساکہ ترمذی میں ہے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَ	کیا ہم نے تیرے لیے سینہ کو کھول نہیں دیا،
وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ	اور تجھ سے تیرے اس بوجھ کو ہٹا نہیں دیا،
الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (انشراح)	جس نے تیری پیٹھ کو توڑ دیا تھا،

"شرح" کے لغوی معنی عربی میں "چیرنے پھاڑنے" کے ہیں، اسی سے طب کی اصطلاح "علم تشریح" اور "تشریح اجسام" نکلی ہے، چونکہ چیرنے اور پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہوجاتی ہے، اس لیے اس سے "تشریح امر" اور "تشریح کلام" "شرح بیان"، اور "شرح کتاب" وغیرہ مجازی معنی پیدا ہوئے ہیں، اسی سے ایک اور محاورہ "شرح صدر" کا پیدا ہوا ہے جس کے معنی "سینہ کھول دینے" کے ہیں، اور کلام عرب میں اس سے مقصود "بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کر دینا" ہوتا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے، حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی تو آپ نے دعا مانگی رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ (پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں")

انبیاء علیہم السلام کا علم اور فہم، انسانی تعلیم و تعلم اور مادی حکمت و دانائی سے پاک و مبرا ہوتا ہے، اور وہ اپنے اخذ نتائج اور اثباتِ دعوی کے لیے گذشتہ تجربات اور منطق کے استقراء و تمثیل اور ترتیبِ مقدمات کے ممنون نہیں ہوتے، بلکہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیم الٰہی، القاے ربانی اور فہم ملکوتی ہوتا ہے، اسی کا نام علم لدنی ہے، "لدن" کے معنی عربی زبان میں "پاس اور نزدیک" کے ہیں، چونکہ یہ علم انکو کسب و تحصیل کے بغیر خدا کے پاس سے اور اس کے نزدیک سے عطا ہوتا ہے، اس لیے عرف عام میں علم لدنی کہلاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا (کہف)	ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

كَذَٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِن لَّدُنَّا ذِكْرًا (طٰہٰ - ۵)	اسی طرح ہم تجھ سے گذشتہ زمانہ کی باتیں بیان کرتے ہیں، اور ہم نے اپنی طرف سے تجھ کو علم (ذکر) بخشا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ	ہم تجھ کو قرآن کی وحی بھیجکر ایک بہترین قصہ سناتے ہیں جس سے تو قطعاً اس سے

وَاِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِيۡنَ (یوسف ۱) — پہلے بے خبر تھا،

سورۂ شوریٰ میں ہے،

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰـكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ (شوریٰ ۵)

اور اسی طرح ہم نے (اے محمد) تیری طرف اپنے حکم سے ایک رُوح کو وحی کیا، تو تو پہلے بھی نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان سے واقف تھا لیکن ہم نے اس کو روشنی بنایا ہے جس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہم راستہ دکھا دیتے ہیں،

دوسرے پیغمبروں کی نسبت بھی یہی ارشاد ہے، حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ سے کہتے ہیں:

يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ قَدۡ جَآءَنِىۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ يَاۡتِكَ (مریم ۳) — اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا،

حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے متعلق ہے،

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ عِلۡمًا (نمل ۲) — اور ہم نے داؤد و سلیمان کو علم بخشا،

حضرت یوسفؑ کی نسبت ارشاد ہے،

اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا (یوسف ۳) — ہم نے یوسف کو حکم اور علم عطا کیا

حضرت یوسفؑ کہتے ہیں

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىۡ رَبِّىۡ (یوسف ۲) — یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں،

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے،

وَلُوطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء) — اور لوط کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا

حضرت سُلیمانؑ اور چند دیگر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے بعد ہے،

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَیْنَا — ہم نے یہ بات سلیمان کو سمجھا دی، اور ہم نے

حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء) — ان سب کو حکم اور علم عطا کیا،

الغرض انبیاء علیہم السلام کا یہ علم محض تعلیم الٰہی اور القاے ربانی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور غور و فکر، تجربہ و امتحان، تحصیل و اکتساب اور جمع معلومات اور ترتیب مقدمات کے بغیر ان کے علم کی باتیں ان کے سامنے آئینہ ہو کر آجاتی ہیں، صرف فہم و تمثیل کے لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ کبھی کبھی شعراء، مصنفین، موجدین اور دیگر عقلاء کے ذہن میں بے غور و تامل ایک بات اس طرح خطور کر جاتی ہے کہ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سینہ یا دماغ کا دروازہ ایک بیک کھل گیا، اور ایک چیز اندر داخل ہو گئی، لیکن یہ شرح صدر کی نہایت معمولی مثال ہے، اس منصب خاص کے سیکڑوں مدارج ہیں، جو انبیاء کو، اولیاء کو اور دیگر مومنین کو اپنے اپنے رتبہ کے مطابق عطا ہوتے ہیں،

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ — جس کی رہنمائی خدا چاہتا ہے، اس کے سینہ

صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (انعام ۱۵) — کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے،

یعنی بلا حجت و برہان اسلام کی صداقت اس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہے،

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کی خلافت کے زمانہ میں

مشورہ دیا، اور بہ اصرار کہا کہ قرآن مجید کو اوراق و مصاحف میں لکھوا دیجئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے مخالفت کی کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں نہیں کیا، وہ ہم لوگ کیونکر کر سکتے ہیں، حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار اور حضرت ابوبکرؓ کو انکار رہا، مگر چند ہی روز میں یک بیک ان کی سمجھ میں بات آگئی، اس موقع پر انھوں نے فرمایا

حتیٰ شرح اللہ صدری	یہانتک کہ خدا نے اس کام کے لیے
لذالک (بخاری تالیف القرآن)	میرے سینہ کو کھول دیا،

مفسر ابن جریر طبری نے متعدد صاحبوں سے روایت کی ہے کہ صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! شرحِ صدر کیونکر ہوتا ہے"؟ فرمایا "قلب میں ایک نور داخل ہوتا ہے جس سے سینہ کھل جاتا ہے" پھر سوال کیا کہ "یا رسول اللہ! اس کی نشانی کیا ہے"؟ ارشاد ہوا "حیات جاوید کے گھر کا اشتیاق، اور اس فریب کدۂ عالم سے دل برداشتگی اور موت سے پہلے موت کی تیاری"[1] یہ تو حقیقت ہے، اور اس حقیقت کی جسمانی تمثیل سینۂ مبارک کا چاک کیا جانا اور اس میں نور و حکمت کا بھرا جانا ہے۔

شرح صدر کیلیے مناسب موقع اور مصلحت

جن آیتوں میں دیگر انبیاء علیہم السلام کو عطیۂ علم کے دیے جانے کا ذکر ہے، ان میں اکثر "علم" کے ساتھ "حکم" کا لفظ بھی ہے

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۸ صفحہ ۱۹، مطبوعۂ مصر و حاکم فی المستدرک جلد ۴ صفحہ ۳۱۱ بسند فیہ عدی بن الفضل

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ خالص شرعی ضرورتوں کے، نظم و حکومت اور فیصلۂ احکام کے لیے بے غور و فکر کے بدیہی، صحیح اور حاضر علم کی ضرورت ہے، چونکہ معراج ہجرت کا اعلان اور اسلام کے مستقبل کا عنوان تھا، جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کی طاقت عطا کی جانے والی تھی، اس لیے شرحِ صدر کے عطیہ کے لیے یہی مناسب موقع تھا، علاوہ ازیں معراج کے حقایق و مناظر جو نفوس نبویہ کے ادراکات کی آخری سرحد ہیں، ان کے احاطہ کے لیے بھی شرحِ صدر کی ضرورت تھی،

آیات و دلائلِ نبوی

قرآن مجید میں

یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں انبیاے سابقین کے معجزے جس تفصیل اور تکرار کیساتھ بیان ہوئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے اس تفصیل اور تکرار کے ساتھ اس میں مذکور نہیں، اس سے ایک طرف تو مخالفینِ اسلام نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذات پاک اس عطیۂ الٰہی سے محروم تھی، دوسری طرف اسلام کے عقل پرست فرقہ کو اس سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ اسلام نے خوارقِ عادت کے ظہور سے انکار کیا ہے کیونکہ جب اس کے نزدیک خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان سے خالی تھی تو گذشتہ انبیاء کے سوانح میں جو اعجاز نظر آتا ہے، وہ بھی سمجھنے والوں کے لیے فہم کا قصور ہے۔

قرآن مجید میں آپ کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے

لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیگر انبیاے کرام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آیات و دلائل میں جو اختلاف منظر نمایاں ہے، اس کے متعدد وجوہ اور اسباب ہیں، جن پر ان کوتاہ بینوں کی نظر نہیں پڑی، اس لیے وہ مختلف قسم کے شکوک و شبہات میں گرفتار ہو گئے،

(۱) اس اختلافِ منظر کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جس نے قرآن مجید کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے، یا گذشتہ صفحات میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے معجزہ کی جو حقیقت

واضح کی گئی ہے، اس کو سمجھا ہے، وہ تسلیم کرے گا، کہ اسلام نے نبوت کی تصدیق کے باب
میں ظاہری اور مادی معجزات کو وہ اہمیت نہیں دی ہے، جو خصوصیت کے ساتھ
عیسائی مذہب اور اس کے مقدس صحیفہ میں نظر آتی ہے، بلکہ وہ انسانوں کو زیادہ تر
غور و فکر، فہم و تدبر، سوچ اور سمجھ کی دعوت دیتا ہے، اور نبوت کے اندرونی خصوصیات
اور روحانی دلائل کو ایمان و تصدیق کی بنیاد قرار دیتا ہے، اس بنا پر اس کے لیے اپنے
پیش کرنے والے کی سچائی کے ثبوت میں اس کے خوارق اور معجزات کو تفصیل اور
تکرار کے ساتھ ہر جگہ پھیلانا اور دہرانا اس کے اصول کے خلاف تھا، چنانچہ اسی کا
نتیجہ ہے کہ اسلام ان گمراہیوں سے پاک رہا، جن کی تاریکیوں کے پردہ میں عیسوی مذہب
کا نور چھپ کر رہ گیا۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گذشتہ انبیا علیہم السلام کو جو نشانیاں ملی تھیں، وہ
چند محدود گنی ہوئی اور متعین شکل میں تھیں، اس لیے قرآن مجید کو جب کبھی ان پیغمبروں
کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے، تو خواہ مخواہ ان کے ان ہی چند حیرت انگیز
واقعات کو بار بار دہرانا پڑتا ہے، اور اس کی تفصیل اور تکرار سے کوتاہ بینوں کی نگاہوں
میں ان پیغمبروں کی یہ نشانیاں اجاگر ہو کر نظر آتی ہیں، اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو جو نشانیاں عطا ہوئیں، وہ اس قدر متنوع، مختلف اور غیر محدود تھیں کہ ان کے
تذکرے کے وقت ایک ہی نشانی کو بار بار پھیلانے اور دہرانے کی حاجت نہ تھی، اس لیے
یہ دلائلِ محمدی قرآن مجید کے سیکڑوں صفحات کے مختلف گوشوں میں اس طرح بکھرے

ہوئے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے معجزوں کی طرح وہ اجاگر اور نمایاں ہوکر کم سوادوں کو نظر نہیں آتے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ گذشتہ مباحث میں یہ پوری تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے معجزات، خوارق اور نشانیاں پیغمبر کی قوت اور اختیار سے نہیں، بلکہ خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ و مشیت سے ظہور پذیر ہوتی ہیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آیات و دلائل بھی ذاتِ محمدیؐ کی طرف منسوب ہوکر نہیں بلکہ قدرت الٰہی کی طرف منسوب ہوکر بیان ہوئے ہیں، اس لیے عام لوگوں کا خیال ان کو دلائل محمدیؐ سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پاس ایک ہی مستند چیز یعنی ان کا صحیفہ ہے جس میں ان کے ربانی احکام، ان کے پیغمبروں کے اقوال، حالات، سوانح معجزات سب کچھ ملے جلے ہیں لیکن اسلام کے قبضہ میں دو چیزیں ہیں، ایک صحیفۂ الٰہی جس میں صرف خدائی احکام و مطالب ہیں، دوسرے حدیث و سنت، جس میں پیغمبر کے حالات، اقوال اور معجزات وغیرہ الگ اور مستقل حیثیت سے مذکور ہیں، اور وہ بجائے خود روایتی استناد کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے صحیفوں سے کہیں بلند تر ہے، اس لیے خدا نے پیغمبر کے ان دلائل و معجزات کو عدم اہمیت کے باعث بہ تفصیل اپنے صحیفہ میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ اس کے لیے احادیث کے مستند ذخیرۂ روایات کی موجودگی کو کافی قرار دیا۔

قرآن مجید سے آپ کے صاحب معجزہ ہونے کی دلیل

غرض یہ اسباب ہیں جنکی بنا پر بعض کم سواد اس دعویٰ

کی جرأت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتیں آپ کو معجزات اور نشانیوں سے معرا ظاہر کرتی ہیں لیکن اس سلسلہ میں غور کے قابل سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے آپ کے متعلق آپ کے زمانہ کے کافروں کے جو اقوال تردید کی غرض سے نقل کیے ہیں، ان میں متعدد موقعوں پر آپ کو (نعوذ باللہ) "کاہن" اور "ساحر" کہا گیا ہے، اور قرآن مجید پر سحر کا الزام لگایا گیا ہے، عرب میں کاہنوں کا کام پیشین گوئی کرنا اور غیب کا حال بتانا تھا، اور ساحر کی نسبت تو عام طور پر معلوم ہے کہ وہ عوام کے نزدیک عجائب و خوارق کا پیکر ہوتا ہے، اب اگر آپ امور غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے، اور معجزات و خوارق کا صدور آپ سے نہیں ہوا کرتا تھا، تو کفار آپ کو کاہن اور ساحر کے خطابات سے کیوں یاد کرتے تھے؟ اس حقیقت کو پیش نظر رکھکر حسب ذیل آیتوں پر غور کی ایک نگاہ ڈالیے۔

فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ (طور - ۲)	اے محمد! تو اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہے،
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (حاقہ)	یہ (قرآن) کسی کاہن کا کلام نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے خدا کفار قریش کا حال بتاتا ہے،

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (صافات)	جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے،

اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ کفار کو جو نشانیاں نظر آتی تھیں، وہ ان کا ٹھٹھا اڑاتے تھے، اور ان کو جادو کہتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی خارق عادت نشانیاں

ان کے مشاہدہ میں آتی تھیں، اور دوسری آیتوں میں بھی سحر کی نسبت آپ کی طرف کفار کی زبان سے کی گئی ہے،

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هٰذَا	اور جب ان کے پاس سچی بات آئی تو انھوں نے
سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا	کہا یہ تو جادو ہے اور ہم اسکو نہیں مانتے، اور
لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى	انھوں نے کہا کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی
رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف ۳)	بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا،
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ	حق کے منکروں نے جب انکے پاس حق
هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (احقاف ۱)	آیا تو کہا یہ تو کھلا جادو ہے،
هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ	یہ محمد تو تمھاری ہی طرح ایک آدمی ہیں، کیا تم
السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء)	جان بوجھ کر جادو کے پاس آتے ہو،
قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (یونس)	کافروں نے کہا یہ (محمد) تو کھلا جادوگر ہے؛

حضرت عیسیٰؑ نے آپ کی آمد کی جو بشارت دی تھی، اس کے بعد ہے،

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا	پس جب وہ آنے والا پیغمبر کھلی آیتیں لیکر آیا
هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (صف ۱)	تو کافروں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے،

کفار کے ان اقوال سے ثابت ہو کہ آپ کی ذاتِ بابرکات سے کچھ تو ما فوق العادة باتیں ظاہر ہوتی تھیں، جن کی تعبیر کہانت اور جادوگری کے الفاظ سے کرکے وہ اپنے نادان دل کو تسلی دیتے تھے، اور اسی سے آپکے صاحبِ معجزہ ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت قرآن مجید

سے ملتا ہے۔

قرآن مجید میں آپ کے دلائل و معجزات مذکور ہیں

اس اجمالی ثبوت کے بعد ضرورت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آیات و دلائل کے بکھرے ہوئے موتیوں کو جو قرآن مجید کے اوراق میں منتشر ہیں، ایک خاص ترتیب کے رشتہ میں منسلک کر دیں کہ وہ نمایاں ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائیں، تنوع کے لحاظ سے یہ آیات و دلائل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو کفار کی ہدایت و دعوت اور مسلمانوں کی مزید ایمانی تسلی کے لیے معجزانہ نشانیاں، دوسری مصیبتوں کی گھڑیوں میں تائیداتِ غیبی کا ظہور، اور تیسری وہ پیشین گوئیاں جن کا لفظ لفظ صداقت کے معیار پر صحیح اترا ہے۔ آیندہ اوراق میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔

معجزۂ قرآن

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ۔ (بنی اسرائیل - ۱۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگاہ الٰہی سے جو معجزات عطا ہوئے، ان میں سب سے بڑا معجزہ خود **قرآن مجید** ہے، چنانچہ جب کفار نے معجزہ طلب کیا تو خدا نے فرمایا

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّہٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ، اَوَلَمْ یَکْفِہِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْہِمْ (عنکبوت - ۵)	اور انھوں نے کہا کہ پیغمبر پر اسکے خدا کیطرف سے نشانیاں کیوں نہ اتریں، کہدے کہ نشانیاں خدا کی قدرت میں ہیں، میں تو صاف صاف خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے اس پر کتاب اتاری جو انکو پڑھ کر سنائی جاتی ہے،

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات کے مقابلہ میں اپنی اسی وحی آسمانی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا، چنانچہ گویا اسی آیت پاک کی تفسیر میں آپ نے ارشاد فرمایا:

ما من الانبیاء نبی الا اعطی	پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے

من الآيات ما مثله او من	اسقدر معجزات عنایت کیے، جن کو دیکھکر
او امن عليه البشر، وانما	لوگ ایمان لائے لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا
كان الذی اوتيت وحيًا اوحاه	وہ وحی (قرآن) ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے
الله الی فارجوانی اکثرهم تابعا	مجھ پر اتارا، اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ
يوم القيامة (صحیح بخاری باب الاعتصام)	قیامت کے دن میرے پیروؤں کی تعداد سب سے

اس حدیث سے متعدد نکتے حل ہوتے ہیں،

۱۔ ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا ہوا ہے،

۲۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات وقتی اور عارضی تھے، ہوئے اور ہو کر مٹ گئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ اعظم یعنی قرآن مجید قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہیگا

۳۔ چونکہ وہ معجزے وقتی اور عارضی تھے، اس لیے ان سے جو اثر پیدا ہوا، وہ بھی وقتی اور عارضی تھا، برخلاف اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہو، اسلیے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، اور قیامت تک نئے نئے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ربانی نشانیاں خدا کی طرف سے عنایت ہوئیں، ان میں صرف یہی ایک معجزہ ہو جس کی اللہ تعالیٰ نے تحدی کی ہو، اور اعلان عام کیا ہے کہ کوئی اسکی مثال پیش کرے، اور پھر خود ہی اس کی پیشین گوئی بھی کر دی ہے کہ دنیا ہمیشہ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہے گی،

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	کہدے اے پیغمبر! اگر تمام جن وانس ملکر
عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنا لائیں تو
لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ	نہیں لاسکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل)	کی مدد پر کیوں نہ ہوں،

سورہ ہود میں پورے قرآن کے بجائے صرف دس سورتوں کا جواب مانگا گیا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا	کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنے جی سے
بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ	بنالیا ہے، تو کہدے کہ وہ ایسی بنائی ہوئی
وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اس ہی سورتیں لے آئیں اور اپنی مدد کیلیے
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (ھود-۲)	خدا کے سوا جسکو چاہیں بلالیں اگر وہ سچے ہیں،

اس کے بعد کی آیتوں میں دس سورتوں سے گھٹا کر ایک ہی سورہ کا جواب لانے کی تحدید کیگئی ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي	اور اگر تم کو اس میں بھی کچھ شک ہو تو جو
عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَ	ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے، تو اس جیسی ایک ہی
ادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	سورہ لاؤ، اور خدا کے سوا اپنے تمام گواہوں
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ ۳)	کو بلاؤ، اگر تم سچے ہو،
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَا	تو اگر تم ایسی سورہ بنا کر نہ لاسکو اور یقیناً نہ
النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَ	لاسکو گے تو اس آتش دوزخ سے بچو جسکے ایندھن
الْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (بقرہ ۳)	آدمی اور پتھر (جنکو تم پوجتے ہو) سب ہونگے جو

اسی کے ہم معنی دوسری آیت سورۂ یونس میں ہے،

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ	کیا یہ کفار یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس قرآن کو
مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ	اپنی طرف سے بنا لیا ہے، ان سے کہدے کہ اس جیسی
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	ایک سورہ تم تو لاؤ، خدا کے سوا اور جسکو
(یونس - ۴)	چاہو مدد کیلیے بلا لو، اگر تم سچے ہو،

پھر سورہ طور میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس جیسی ایک ہی بات پیش کرو

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ	کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسکو گھڑ لیا ہے،
فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا	بات یہ ہے کہ انکو ایمان نہیں، اگر وہ سچے ہیں
صٰدِقِيْنَ (طور - ۲)	تو اس جیسی ایک بات بھی پیش کریں،

اس امر پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ اور وجہ اعجاز کیا ہے؟

(۱) بعض معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید کا **نظم کلام** (اسٹائل) معجزہ ہے یعنی اہل عرب کا کلام جس طرز اور اسلوب پر ہوا کرتا تھا، قرآن مجید نے ان کو چھوڑ کر ایک اور بدیع طرز اور عجیب اسلوب اختیار کیا جو عرب میں موجود نہ تھا، ان کے کلام کا تمام تر نمونہ شعر تھا، قرآن مجید نے نثر کا ایک اسلوب اختیار کیا. کاہنانِ عرب کا کلام بھی نثر ہوتا تھا، مگر اس میں تکلف اور آورد تھا قرآن مجید نے نظم و نثر کے درمیان ایک ایسا پسندیدہ اسلوب اختیار کیا جو بلغاے عرب کے تخیل میں نہ تھا، قرآن کے مطالعہ، مقاطع اور فواصل یعنی جس طرح قرآن کسی بیان کا آغاز اور اس کا خاتمہ کرتا ہے اور جس طرح ایک ایک آیت کو توڑتا جاتا ہے، وہ حد اعجاز میں داخل ہے.

۲۔ معتزلہ سے جاحظ اور تمام اشاعرہ قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کی حیثیت سے معجزہ قرار دیتے ہیں،

۳۔ نظام معتزلی اور ابن حزم ظاہری[1]، یہ اعتقاد رکھتے ہیں، اور امام رازیؒ بھی اسکو اقرب الی الصواب کہتے ہیں[2]، کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام بلغائے عرب و عجم کی زبانیں اس کے مقابلہ میں گنگ کر دیں اور اسلیے وہ اسکا جواب نہیں لاسکتے،

۴۔ بعض متکلمین کے نزدیک وجہ اعجاز، قرآن مجید کا اظہار غیب اور پیشینگوئیاں ہیں جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہیں،

۵۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دل کے چھپے ہوئے اسرار کو فاش کرتا تھا، جو انسانی دسترس سے باہر ہے،

۶۔ کسی نے وجہ اعجاز یہ بتائی ہے کہ اور انسانوں کے کلام بلند و پست، کامل و ناقص صحیح و غلط، غرض مختلف المراتب ہوتے ہیں، لیکن قرآن مجید شروع سے اخیر تک یکساں بلندی کمال اور صحت کے لحاظ سے ایک ہی نوعیت کا ہے،

۷۔ ایک دو آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ معجزہ یہ ہے کہ ایک امی کی زبان سے ایسا کلام بلاغت نظام نکلا،[3]

---

[1] الفصل فی الملل والنحل ابن حزم جلد سوم باب اعجاز القرآن [2] تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۳۲۵ تفسیر آیہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ [3] متکلمین کے یہ مذاہب شرح مواقف اعجاز قرآن باقلانی، الاتقان سیوطی فصل فی الملل والنحل ابن حزم میں مذکور ہیں،

۸- قرآن مجید کے اعجاز کی ایک وجہ اس کی خارقِ عادت تاثیر اور قلوبِ انسانی کی تسخیر بھی قرار دی جا سکتی ہے۔

۹- بعضوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اعجاز اسکے احکام، تعلیمات اور ارشادات ہیں،[1] حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اختلافات باہم متضاد نہیں ہیں جو ایک جگہ مجتمع نہ ہو سکیں، اور نہ یہ ضروری ہے کہ وجہ اعجاز صرف ایک ہی میں محدود ہو، قرآن مجید کے وجوہ اعجاز اسقدر کثیر ہیں کہ انکا احاطہ نہیں ہو سکتا، جس شخص کو اپنے مذاق کے مطابق جو بات نمایاں نظر آئی ہے، اسی کو اس نے وجہ اعجاز قرار دے لیا ہے، کوئی حسین اور خوبصورت چیز جب نقادانِ فن کی نگاہوں کے سامنے آتی ہے، تو کوئی اس کے رنگ روغن کا مداح ہوتا ہے، کوئی اس کے اعتدالِ قامت کی تعریف کرتا ہے، کوئی اس کی وضع قطع کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے، کوئی اس کی زیبایش و آرایش کی مدح کرتا ہے، تو درحقیقت اس کی ذات ان تمام اوصاف کا مجموعہ ہوتی ہے، اور ہر ناقد اپنی چشم اعتبار سے جو کچھ دیکھتا ہے، اسی کو اس کے حسن کا معیار قرار دے لیتا ہے، حافظ و سعدی کے کلام کا معترف کون نہیں، لیکن لوگوں سے اسکے حسن و خوبی کی تفصیل پوچھو تو کوئی ایک بات نہیں کہے گا کسی کے نزدیک ان کے کلام کا حسن یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں کے لیے بحریں نہایت مطربانہ اور موسیقیانہ اختیار کرتے ہیں، کوئی طریقۂ ادا اور اسلوب تعبیر کی تعریف کریگا، بعض ناقدین سخن الفاظ کی شیرینی اور ترکیب کی ندرت پیش کریں گے، کوئی تشبیہ و استعارہ کی جدت پر زور دے گا، دوسرے اصحاب ان کی نازک خیالی کے معترف ہوں گے بعضوں کے نزدیک

[1] شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں اور مولانا شبلی نے اپنے مضمون اعجاز القرآن میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

ان کی معنی آفرینی، عمیق فلسفہ وحکمت اور دلپذیر موعظت ان کے کلام کا نمغائے کمال ہے،

عبارا تنا شتی وحسنک واحد　　　　وکل الی ذاک الجمال یشیر

ہماری عبارتیں گو مختلف ہیں لیکن تیرا حسن ایک ہی ہے، ہر شخص اپنی عبارت میں اسی ایک حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے

قرآن مجید کی ان آیتوں کا اگر استقصا کیا جائے جن میں اس کے وجوہ اعجاز کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے تو وہ ہم کو خود مختلف نظر آتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے وجوہ اعجاز اس قدر متعدد اور کثیر الاطراف ہیں کہ اُن کو کسی ایک میں محدود نہیں کیا جا سکتا، اس نے کہیں تو اپنی تعلیم وارشاد کی مدح کی ہے، کہیں اپنی تاثیر اور قوتِ جذب کی طرف اشارہ کیا ہے، کہیں اپنی یکسانی اور عدم اختلاف کو اپنے خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی بتائی ہے، کہیں اس نے اپنی عربیت اور حسنِ کلام کو ظاہر کیا ہے کہیں ایک امی کی زبان کا پیغام ہونا اپنا معجزہ بتایا ہے، ایک موقع پر اپنی ہدایت ورہنمائی کو مخصوص ترین وصف قرار دیا ہے، کہیں وہ خود کو نور، ھدیٰ، حکمۃ بینۃ اور دیگر مختلف اوصاف معنوی کا حامل کہتا ہے، چنانچہ ذیل میں ہم ان آیتوں کو بہ ترتیب لکھ دیتے ہیں،

فصاحت وبلاغت	لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ	جسکی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اسکی زبان تو
	اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ	عجمی ہے اور یہ ایسی زبان ہے جو عربی
	مُّبِیْنٌ (نحل - ۱۴)	ہے اور اپنے مدعا ولی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے،
	بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ	یہ قرآن ایک ایسی زبان میں ہے جو اپنے
	(شعراء - ۱۱)	مدعائے دلی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے،

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (زمر)	قرآن عربی زبان میں ہے جسمیں کوئی کجی نہیں،
قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (یٰسین و حجر)	اپنے مدعا کو خوبی سے ظاہر کرنے والا قرآن،
یکسانی اور عدم اختلاف | اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ	کیا یہ کافر قرآن میں غور نہیں کرتے، اگر یہ
الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ	خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا، تو وہ
اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا	اس میں بہت سے اختلاف پاتے،
قوت تاثیر | وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ	ان کو (قرآن کے ذریعہ سے) اگلی امتوں کے
مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ	اتنے حالات سنائے جاچکے ہیں جو انکی تنبیہ کو
فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ	کافی تھی، یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی
(قمر ۱)	ہے لیکن انکو ڈرانا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا،

کفار قرآن مجید کو سحر اور جادو کہتے تھے، یہ کیوں؟ اسکی اسی تاثیر اور قوت تسخیر کی بنا پر!

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ	جب ان کافروں پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ	ہیں تو وہ لوگ جو سچائی کے آنے کے بعد اس کا
هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (احقاف)	انکار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے،

کفار کہتے تھے کہ جب محمد لوگوں کو قرآن پڑھکر سنانے لگیں تو شور کرو تاکہ لوگ سنکر متاثر نہ ہوں،

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا	کفار نے کہا کہ اس قرآن کو سنا نہ کرو اور اس کے
الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ	پڑھتے وقت شور وغل کرو، شاید تم جیت جاؤ
تعلیم و ہدایت | ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ	یہی ہے وہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ہے،

فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ)	یہ پرہیزگاروں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے
اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ	یہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے
هِيَ اَقْوَمُ (اسراء-۱۰)	زیادہ صحیح اور سیدھی ہے
قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	کہدے قرآن اور تورات سے بڑھکر کوئی ہدایت
هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ (قصص)	والی کتاب لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں،
قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ	تمھارے پاس روشنی اور مدعا کو ظاہر
مُّبِيْنٌ (مائدہ-۳)	کرنے والی کتاب آچکی،
(بقرہ) وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ	ہم نے تیری طرف کھلی ہوئی آیتیں اتاریں،
وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ	یہ مبارک کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی
فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ	کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تاکہ تم پر رحم
اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ	کیا جائے اور یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے یہود و نصاریٰ
عَلٰي طَاۗىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ	دو قوموں پر کتاب اتاری گئی، اور ہم ان کے
كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ	پڑھنے سے بیخبر تھے، یا یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب
تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ	اتاری جاتی، تو ہم ان دونوں قوموں سے زیادہ
لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاۗءَكُمْ	راہ راست پر ہوتے تو لو یہ تمھارے رب کی
بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ (انعام-۲۰)	طرف سے دلیل ہدایت و رحمت آئی ہے
وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ	اور قرآن سے ہم وہ اتارتے ہیں، جو مومنوں

وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (اسراء-۹)	کے لیے شفا اور رحمت ہے،
وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ	یہ عزت والی کتاب ہے جس کے آس پاس بھی
الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا	باطل نہیں آسکتا، یہ حکمت اور تعریف والے
مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ	خدا کی اتاری ہوئی ہے، اے پیغمبر تجھ سے وہی
مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ	کہا جاتا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا،
مِنْ قَبْلِكَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ	تیرا پروردگار بخشش والا بھی ہے، اور عذاب والا
وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ	بھی ہے، اگر ہم اس قرآن کی زبان عجمی کرتے تو
قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ	وہ لوگ یہ کہتے کہ اسکے احکام کیوں نہیں کھول
اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ	کے بیان کیے گئے، ہم عرب ہیں، اور کتاب عجمی،
اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ (فصلت)	کہہ دے کہ یہ کتاب مومنوں کیلیے ہدایت اور شفا ہے
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ	لوگو تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ	نصیحت آچکی، اور دلوں کے امراض کا علاج
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یونس)	ہے، اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے
وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یسین ۱)	حکمت والا قرآن
وَالْقُرْاٰنِ ذِى الذِّكْرِ (ص ۱)	نصیحت والا قرآن
قرآن کا جواب لانے کی قدرت نہیں — لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (بنی اسرائیل)	جن وانس اس کا جواب نہیں لاسکتے،
وَلَنْ تَفْعَلُوْا (بقرہ)	یہ کفار ہرگز اس کا جواب نہیں لاسکتے،

ایک امی کی زبان سے ادا ہونا	وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا	قرآن سے پہلے اے پیغمبر نہ تو تو کچھ پڑھ کر سناتا تھا
	مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ	اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو البتہ
	بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ	یہ باطل پرست شک کر سکتے، بلکہ یہ کھلی آیتیں ہیں
	بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ	جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جنکو علم بخشا گیا
	الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ	ہے، اور ہماری آیتوں سے صرف گنہگار ہی انکار
	بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا	کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیوں اس (پیغمبر)
	لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	پر اسکے خدا کیطرف سے نشانیاں نہیں اتریں،
	قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ	کہدے کہ نشانیاں خدا کے قبضہ میں ہیں،
	وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ	میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کے لیے
	اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى	یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب
	عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً	اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے،
	وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ،	اس میں ایمان والوں کے لیے رحمت
	(عنکبوت ۵)	اور نصیحت ہے،
حفظ وبقا کا وعدہ	وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (نحل ۱)	اور یقیناً ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں
	اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (قیامہ ۱)	ہم پر ہے اس قرآن کا جمع کرنا،
	لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ	اس قرآن کے پاس آگے اور نہ پیچھے سے
	وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (فصلت)	باطل آسکتا ہے،

قوتِ دلائل | فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ (انعام) یقیناً تمھارے پاس تمھارے خدا کی دلیل آچکی

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کہہ دے کہ خدا ہی کے لیے وہ دلیل ہے جو

(انعام) دلوں تک اتر جاتی ہے،

هٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى یہ قرآن تمھارے رب کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں

وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ (اعراف ۲۴) ہیں اور ہدایت و رحمت ہے مومنوں کے لیے،

قرآن مجید کی یہ آیتیں صرف چند حیثیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں، اگر کوئی استقصا کرے تو متعدد وجوہ اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں، الغرض مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزۂ کامل ہے، اس کے معجزۂ کامل ہونے پر مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گذرے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک اُمّی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گذر گیا، مگر ایک آواز بھی اس تحدی کو قبول کرنے کے لیے بلند نہ ہوئی، اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیار اعجاز قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اُس وقت جب ایک اُمّی کی طرف سے، جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا[1]، یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا، اُس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان آور شعراء اور آتش بیان خطباء موجود تھے، مگر اس "صوت سرمدی" کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں، کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں،

[1] بخاری شریف

انھوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین وکیش کو برباد کیا، اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں، ان کے سپاہیوں نے میدانِ جنگ میں پرے جمائے، ان کے دولتمندوں نے اپنے خزانے کھول دیے، اُن کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستانِ عرب کو تنور بنا دیا، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ نہ ہوسکا کہ قرآن مجید کی ایک سورہ کا جواب پیش کریں جو اسلام کے دعوائے حق وصداقت کے کنگرہ کو چشم زدن میں پست کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اسکی مثال لانے سے عاجز تھے، اور جب وہ جو زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے اس کے مقابلہ سے عاجز تھے تو اس زمانہ کے بعد کے لوگوں کے لیے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے،

حسان بن ثابت، عامرؓ بن اکوع، طفیلؓ بن عمر، زید الجلیل، زبرقان، شماس، اسود بن سریع، کعب بن زہیر، عبد اللہ بن رواحہ وغیرہ عرب کے مشہور زبان آور اور شاعر تھے مگر قرآن مجید کے سامنے ان سب نے سر نیاز خم کیا، لبید عرب کے مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی بزم مشاعرہ کے ایک رکن تھے، اسلام کے بعد جب حضرت عمرؓ نے ان سے چند اشعار کی فرمایش کی تو انھوں نے جواب دیا،

"جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آل عمران سکھائی، تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں"[1]

انیس قبیلۂ غفار کے شاعر تھے، انھوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنا، تو چھپ کر مکہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آیتیں سنکر واپس گئے، ان کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے کیسا پایا، انھوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں کہ

---

[1] استیعاب ابن عبد البر ترجمہ لبید

وہ شاعر ہیں، ساحر ہیں، اور کاہن ہیں، ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے، یہ اُن کی بولی نہیں، ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھ لیا ہے، وہ شعر بھی نہیں ہے، خدا کی قسم محمد سچے اور قریش جھوٹے ہیں[1]۔

ضماد ازدی ایک صاحب تھے، جو جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، وہ یہ سن کر کہ محمدؐ (نعوذ باللہ) دیوانے ہو گئے ہیں، آپ کے علاج کے لیے آئے، آپ نے مختصر سی حمد اور کلمۂ شہادت پڑھا، وہ سنکر متحیر رہ گئے، تین دفعہ پڑھوا کر سنا، پھر کہا کہ خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی، اور جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں، لیکن تمھارا کلام کچھ اور ہی ہے، یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا[2]، جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ابو جہل اور قریش کے دیگر اکابر جمع ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ محمدؐ کی تحریک روز بروز بڑھتی جاتی ہے، کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا چاہیے جو جادو، کہانت اور شعر کہنا جانتا ہو، تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ کیا ہے، قریش کے مشہور سردار عتبہ بن ربیعہ نے کہا میں یہ سب کچھ جانتا ہوں، کہو تو میں جا کر دیکھوں، چنانچہ آستانۂ نبویؐ میں آکر اس نے صلح کے کچھ شرائط پیش کیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سورۂ فصّلت پڑھنی شروع کی، کچھ ہی آیتیں پڑھی تھیں کہ اس نے آپ کے منہ پر ہاتھ رکھدیا کہ قرابت کا واسطہ بس کرو، واپس پھرا تو چند روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا، ابو جہل نے جا کر کہا، کیوں عتبہ! محمدؐ کے یہاں کھانا کھا کر پھسل گئے، عتبہ نے کہا تم جانتے ہو کہ میں سب سے زیادہ دولتمند ہوں، مجھ کو دولت کی طمع دامنگیر نہیں ہو سکتی، لیکن محمدؐ نے میرے جواب میں جو کلام پیش کیا

---

[1] صحیح مسلم اسلام ابی ذر [2] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ۔

وہ نہ شعر تھا، نہ کہانت تھی، نہ جادو، میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا، انھوں نے جو کلام پڑھا، اس میں عذاب الٰہی کی دھمکی تھی، میں نے ان کو قرابت کا واسطہ دیا کہ چپ ہو جائیں، میں ڈرا کہ تم پر عذاب نہ آجائے، لوگوں نے کہا محمدؐ نے اپنی زبان سے عتبہ پر جادو کر دیا،[1]

ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولتمند اور صاحبِ اثر تھا، وہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں آیا، اور فرمایش کی کہ کچھ پڑھ کر سنایئے، آپ نے چند آیتیں پڑھیں، اُس نے مکرر پڑھوا کر سنیں آخر بیخود ہو کر بولا "خدا کی قسم اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے، اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنہ بھاری ہے، یہ کسی انسان کا کلام نہیں"[2]

بنو ذہل بن شیبان کے سردار مفروق کے سامنے آپ نے چند آیتیں پڑھیں تو گو وہ مسلمان نہ ہوا، مگر کلام الٰہی سے متاثر ہوا[3] نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے جب سورۂ مریم کی تلاوت کی، تو اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، پھر کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"[4]

اس قسم کے اور بعض واقعات ابن اسحٰق نے سیرت میں نقل کیے ہیں، پہلی جلدوں میں پڑھ چکے ہیں، کہ لوگ کیونکر قرآن مجید کی آیتیں سنکر متاثر ہو جاتے تھے، حضرت عمرؓ کا دل ایک سورہ کی چند آیتیں پڑھکر[5] اور سن کر[6] پتھر سے موم ہو گیا، حضرت جبیر بن مطعمؓ اُسیران بدر کو

---

[1] کتاب التفسیر ابن مردویہ، مسند ابو یعلی و سیرۃ ابن اسحاق، اخیر فقرہ صرف سیرۃ ابن اسحاق میں ہے [2] مصنف عبد الرزاق مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۵۰۶ میں یہ اور اوپر کا واقعہ دونوں مل جل گئے ہیں [3] روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام جلد اوّل ص ۲۶۴، مطبوعہ مصر [4] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲ و مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۳۱۰ [5] ابن سعد جلد ۳ حصہ اول ص ۱۹۱ و ابو یعلی و حاکم و بیہقی [6] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۱۷

چھڑانے آئے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ طور کی ایک دو آیتیں سن لیں تو ان کا دل دھڑکنے لگا[1]، حضرت عثمانؓ بن مظعون نے چند آیتیں سن لیں تو فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے[2]، حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن مجید کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو مسلمان ہو گئے[3]، طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانیؓ نے آپ کو وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ پڑھتے سنا تو گو وہ اُس وقت مسلمان نہ ہوئے، مگر پوری سورہ ان کے دل میں گھر کر گئی یعنی یاد ہو گئی[4]، حبش سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت حاضر خدمت ہوئی، آپ نے ان کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے[5]، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت ابو سلمہؓ، حضرت ارقم بن ارقمؓ، یہ تینوں اصحاب اسی کی کشش مقناطیسی سے کھنچکر حلقۂ اسلام میں آئے[6]، اور، تو اور خود مہبط وحیؐ اور حامل کلام ربانی کا کیا حال تھا؟ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے ایک دفعہ قرأت شروع کی تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے[7]، ایک اور موقع پر قرآن مجید کی چند آیتیں زبانِ مبارک سے ادا ہوئیں، اور اس کے بعد آنسوؤں کا تار بندھ گیا[8]۔

کلام کی یہ شیرینی، یہ نمکینی، یہ تاثیر، یہ تسخیر جو دوست و دشمن، موافق و مخالف، شاہ و گدا، عالم و جاہل، پیغمبر و امت سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہے، اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ حکما

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ طور [2] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸ [3] استیعاب تذکرہ طفیلؓ بن دوسی [4] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵ [5] سیرۃ ابن ہشام [6] اسد الغابہ تذکرہ ابو سلمہؓ بن عبد الاسد [7] صحیح بخاری تفسیر فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید [8] صحیح مسلم باب بکاء صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ

فلاسفہ، ادبا، اہلِ لغت، مفسرین، محدثین، فقہا، صوفیا، شعرا، متکلمین، غرض نوعِ انسانی
کی وہ کونسی صنف ہے جس نے ایک اُمّی کی زبان سے ادا ہونے والے پیغام کے عشق و
محبت میں اپنا سرمایۂ حیات قربان نہیں کر دیا، اور جن کو اس کلام کی تشریح و تفصیل اور تحقیق
و توضیح کے خدمات کی لذت میں دنیا کی تمام نعمتیں ہیچ نظر آئیں، کیا یہ اعجاز نہیں؟

غور کیجئے کہ ایک اُمّیِ محض، جو امیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہوا، اس نے
ہوش سنبھالا تو گرد و پیش تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اس کو کچھ نظر نہیں آیا، علوم و فنون اور
تمدن و تہذیب سے ایک عاری ملک، عاری شہر، اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پائی،
جہاں اہلِ حکم اور اربابِ علم کا وجود نہ تھا، وہ خود، اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت
و خواند کے نقوش و حروف سے آشنا نہ تھا، گذشتہ صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کا ایک حرف
اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا، علماء اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اٹھائی، اصولِ
قانون، مبادیِ اخلاق، محاسنِ علم و عمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی، بلکہ مدرسۂ علم و حکمت
کے سایۂ دیوار تک کبھی اس کا گذر نہیں ہوا، اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دورے
پورے کرتا ہے کہ دفعۃً غارِ حرا کے ایک ہادیٔ اجالا ہوتا ہے، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا
سرچشمہ ابلتا ہے، ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، صحفِ انبیاء
اور افکارِ عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، اسکے پرتوِ صحبت سے اُمّی
اور جاہل، علماءِ دہر اور دانشورانِ روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں، اصولِ قانون، مبادیِ اخلاق
اور محاسنِ علم و عمل کی تعلیم کا غلغلہ اس کی بزمِ فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے، کلامِ ربانی

کے پردہ میں علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں، اس سے زیادہ قرآن مجید
کے معجز ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے!

توراۃ قانون و شریعت ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں، انجیل اخلاق و موعظت ہے، لیکن قانون و شریعت نہیں، زبور مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے، لیکن دیگر صفات سے خالی، مسیحؑ کے صحیفہ میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں، مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں، صحفِ بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائقِ حکمت اور اسرار ایمان و عمل سے خالی ہیں، دنیا میں ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق و موعظت بھی، مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی، اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے، اور دقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی، اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف و تغییر، اور تراجم و تعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں، اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک لفظ ایک حرف، ایک نقطہ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی، وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانہ کے صندوق ہیں، اور وہ اسی زبان اور ان ہی الفاظ اور ان ہی حروف کے قالب میں ابتک جلوہ گر ہے جس میں دستِ قدرت نے اس کو ڈھالا تھا، اور جبرئیلِ امین نے اس کو اتارا تھا، اور محمدؐ عربی نے اس کو امت کے ہاتھوں میں سونپا تھا، کیا یہ اعجاز نہیں؟

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ کلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے، اور اس کی فصاحت وبلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں، حریف نہیں بن سکتیں، کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے وحی ہیں، چنانچہ نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے، اور نہ کبھی انھوں نے اپنی کتابوں کو کلام وعبارت کے لحاظ سے معجز کہا ہے، چنانچہ اسی لیے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحیِ موسوی (تورات) اور عیسوی (انجیل) نے ظہور کیا، مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہوگئی، تورات کی اصل عبرانی زبان جو حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نکلی تھی، وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہوگئی، اور اس نے آرامی اور سریانی زبان کا قالب اختیار کرلیا، اور بآخر صدہا سال کے بعد حضرت عزیرؑ نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا، انجیل کے متعلق ابھی تک یہی طے نہیں ہوا کہ اسکی اصل زبان کیا تھی؟ اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں جو حضرت عیسیٰؑ فلسطین کے ملک میں بولتے تھے، ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت وبلاغت کے اعجاز اور ان کے الفاظ کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کیونکر کیا جاسکتا ہے، برخلاف اس کے دنیا میں "وحی محمدیؐ" سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے جس نے اس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا، چنانچہ قرآن مجید کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے، اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا اور وہ ہر قسم کی تحریف وتغییر سے پاک ہے، اس لیے اس کے الفاظ، کلمات اور عبارات تک معجزہ ہیں، اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔[۱]

[۱] یہاں مسئلۂ اعجاز القرآن پر بحث مقصود نہیں، یہ مباحث مفصل آیندہ کسی جلد میں آئیں گے، یہاں صرف سلسلۂ معجزات میں اس کا محض تذکرہ مقصود تھا۔

اُمیّت

یعنی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند کے داغ سے پاک ہونا

اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (اعراف)

یہ واقعہ محتاج بیان نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند کے داغ سے پاک تھے، قرآن مجید نے متعدد موقعوں پر اس واقعہ کا اظہار کیا ہے، چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ	یہ مسلمان وہ ہیں جو ان پڑھ پیغمبر اور فرستادۂ الٰہی کی پیروی کرتے ہیں۔

اسی سورہ میں پھر اس کے بعد ہی ہے،

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ	تو لوگو! خدا پر اور اسکے ان پڑھ پیغمبر اور فرستادہ پر ایمان لاؤ،

سورۂ جمعہ میں نہ صرف آپ کے امی، بلکہ اغلب آبادی کی حالت کے لحاظ سے تمام قریش اور عرب کے امی ہونے کا اظہار ہے،

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ (جمعہ)	اسی خدا نے امیوں کے درمیان ان ہی میں سے ایک پیغمبر بنا کر بھیجا،

دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت ۵)	اور قرآن کے نزول سے پہلے پیغمبر نہ تو تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اسکو لکھ سکتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست شک

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا انسانی تعلیم سے پاک ہونا بھی مصلحتِ الٰہی کا ایک خاص منشا تھا۔ اسی لیے اس کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ، اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (عنکبوت - ۵)	اور معترضین کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اسکے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری، کہدے کہ نشانیاں خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اور میں تو صرف خدا سے ڈرانے والا ہوں، کیا ان معترضین کو یہ نشانی کافی نہیں ہو کہ ہم نے تجھ پر (جو امی ہو) کتاب اتاری جو ان کو پڑھکر سنائی

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں اس کا اظہار ہو کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری زبان سے آج گذشتہ پیغمبروں، اگلی امتوں اور عہد ماضی کے واقعات ادا ہوتے ہیں"۔ ان واقعات اور حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے انسان کے ہاتھ میں ہیں، ایک یہ کہ وہ اس واقعہ کے وقت موجود ہو، دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے، تیسرا یہ کہ اوروں سے سنے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اطلاع کے ان تینوں ذرائع سے ناآشنا تھے، اول ذریعہ تو ظاہر ہے کہ

مفقود تھا، قرآن مجید میں آدمؑ سے مولدِ محمدیؐ تک کے تمام واقعات بیان کیے گئے ہیں، یہ واقعات آپ کی پیدایش سے پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے، اور آپ کے پاس ان کے علم کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا، اسی لیے قرآن مجید نے متعدد مواقع مثلاً حضرت مریمؑ اور زکریاؑ کے قصہ میں کہا ہے،

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ	یہ گذشتہ زمانہ کی خبروں میں سے ہے جس کو ہم
اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ	تیری طرف وحی کر رہے ہیں، تو ان کے پاس
يُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَيُّھُمْ يَكْفُلُ	اس وقت موجود نہ تھا جب وہ اپنا اپنا پانسہ
مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ	ڈال رہے تھے، کہ کون مریم کی کفالت کریگا اور
يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (آل عمران ۵)	نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے،

حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ	جب ہم نے موسیٰ کو اپنا فیصلہ دیا تو تو اس وقت
قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ	مغربی گوشہ میں موجود نہ تھا، بلکہ ہم نے صدیاں
مِنَ الشّٰهِدِيْنَ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا	اس پر گذار دیں، قومیں پیدا کیں جنکی بڑی بڑی
قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ	عمریں ہوئیں، اور نہ تو اہل مدین میں قیام پذیر
وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ	ہو کر آیات الٰہی انکو پڑھکر سناتا تھا، بلکہ ہم
تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ	آیندہ تم کو بھیجنے والے تھے، اور نہ تو اس وقت
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا	گوشۂ طور میں تھا جب ہم نے موسیٰ کو آواز دی تھی
وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (قصص ۵)	بلکہ (اس قصہ کا علم تجھکو جو حاصل ہو رہا ہے) یہ محض تیرے پروردگار کی مہربانی ہے

حضرت یوسفؑ کے قصہ میں فرمایا،

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ	یہ اس گذشتہ زمانہ کے قصہ کا علم ہم تم کو اپنی
اِلَيۡكَۚ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ	وحی سے عطا کر رہے ہیں، تو اس وقت انکے
اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ (یوسف ۱۱)	پاس موجود نہ تھا جب وہ باہم مشورت با

علم کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتابوں کو پڑھ کر اطلاع حاصل ہو، قرآن مجید نے اسکی بھی نفی کی

وَمَا كُنۡتَ تَتۡلُوۡا مِنۡ قَبۡلِهٖ مِنۡ	نہ تو تو اس سے پہلے کوئی کتاب پڑھ کرسناتا تھا
كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيۡنِكَ (عنکبوت)	اور نہ اپنے ہاتھ سے تو اسکو لکھ سکتا تھا
مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا	تجھ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہو
الۡاِيۡمَانُ (شوریٰ ۵)	اور ایمان کس کو کہتے ہیں،

تیسری صورت یہ تھی کہ دوسروں سے سن کر یہ علم حاصل کیا جائے، سب کو معلوم ہے کہ نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمام تر مکہ معظمہ میں گذری، بجز اس کے کہ چند مہینے بصریٰ وغیرہ کے سفر تجارت میں گذرے ہوں، اور خود مکہ معظمہ میں نہ ان واقعات کا کوئی واقف کار تھا، اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی، اس لیے یہ ذریعۂ علم بھی ثابت نہیں، چنانچہ قرآن مجید نے علی الاعلان کہا

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ	یہ گذشتہ زمانہ کی باتیں ہیں جن کی بذریعۂ وحی
اِلَيۡكَۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَ	ہم تجھ کو تعلیم کرتے ہیں تو خود اور تیری قوم
لَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا (ھود)	اس سے پہلے ان سے آگاہ نہ تھی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو زندگی مکہ معظمہ میں گذری اور سفر تجارت میں قریش کے شامی قافلوں کے ساتھ جو زمانہ بسر ہوا، اس کا ایک ایک واقعہ قریش کے سامنے تھا، جب آپ مکہ میں تھے تب بھی آپ قریش کے مجمع میں تھے، اور جب کبھی مکہ سے باہر گئے تو بھی قریش ہی کے جھرمٹ میں رہے، اس لیے آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ان سے مخفی نہ تھا، اگر آپ نے کوئی ظاہری تعلیم پائی ہوتی، تو شاعر و مجنون و ساحر کی طرح وہ اس الزام کا اظہار بھی کر سکتے تھے، مگر انھوں نے نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ محمد کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے داغدار نہیں، چنانچہ قرآن مجید نے بآواز بلند کہا،

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ	اگر خدا کو منظور ہوتا تو میں تم کو نہ یہ قرآن پڑھکر سناتا
وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ	اور نہ خدا تم کو اس قرآن سے آگاہ کرتا، اس سے
عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ۲)	پہلے میں مدتوں تم میں رہ چکا ہوں کیا تم یہ نہیں سمجھتے

قرآن مجید نے ان تمام شکوک اور الزامات کو دہرایا ہے، ان کو یہ شک تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی دوسرے سے سن کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید نے ان کے اس اعتراض کو نقل کیا اور اس کا جواب دیا،

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا	اور ہم کو بتحقیق معلوم ہے کہ یہ کفار کہتے ہیں کہ محمد
يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ	کو کوئی آدمی سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان جس
اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ	کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں، عجمی ہے، اور
مُّبِيْنٌ (نحل ۱۴)	یہ فصیح عربی زبان ہے،

سورہ فرقان میں چند آدمیوں کی شرکت کا شبہہ مذکور ہے،

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا	اور کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن من گھڑت چیز ہے
اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ	جس کو محمدؐ نے گھڑ لیا ہے اور اس افترا پردازی
قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ . فَقَدْ جَآءُوْا	میں چند آدمی بھی شریک ہیں، وہ یقیناً غلط
ظُلْمًا وَّزُوْرًا (فرقان ۱)	اور جھوٹ کہتے ہیں،

یہ سب شبہات کیے گئے، مگر کفار نے کبھی یہ شبہہ نہیں ظاہر کیا کہ محمدؐ نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے، اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنا لیتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی امیت پر ان کو یقین تھا، مدینہ آکر یہودیوں سے معاملہ پڑا، روایات میں بکثرت اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ یہود آپ کے پاس آتے تھے، اور آپ سے وہ سوالات کرتے تھے جو انکی کتابوں میں مذکور تھے، اور کہتے تھے کہ ان کے جواب پیغمبر ہی دیسکتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے صحیح جوابات دیتے تھے، اور وہ متحیر رہ جاتے تھے، اس واقعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ یہود کو بھی یقین تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی محض ہیں اور ہماری کتابوں کو نہ انھوں نے پڑھا ہے اور نہ پڑھ سکتے ہیں، اور نہ اس جرأت کے ساتھ وہ اپنی کتابوں کے سوالات اس شخص کے سامنے جس کی نسبت ان کو معلوم ہوتا کہ وہ ان کو پڑھ چکا ہے، یا پڑھ سکتا ہے، نہ پیش کرتے، اور نہ اس کو حق و باطل کا معیار قرار دیتے۔

قریش کو جس شخص کی نسبت یہ شبہہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے، اس کے متعلق امام طبری نے تفسیر میں مختلف روایتیں نقل کی ہیں، جن سے اس کی شخصیت اور نام

کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں کوئی نصرانی غلام تھا، جو اپنی زبان میں کتب مقدسہ کبھی کبھی پڑھا کرتا تھا، اور آپ راستہ چلتے اس کے پاس کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے، اسی پر کفار نے کہا کہ محمد کو یہی قرآن کی آیتیں سکھاتا ہے، اللہ تعالےٰ نے جواب دیا کہ اس غلام کی، اور جو کتابیں وہ پڑھا کرتا ہے، ان کی زبان عربی نہیں، اور نہ وہ عربی جانتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے، اور خود قرآن کی زبان فصیح عربی ہے، یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیر زبان کو سمجھ لیں اور وہ عجمی غلام قرآن جیسی فصیح زبان میں کلام کرے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو آپ کے چچا ابوطالب اپنے ساتھ شام لیے جا رہے تھے، راستہ میں بحیرا نام ایک راہب نے آپ کو دیکھا، اور آثار سے پہچان لیا کہ آپ ہی پیغمبر آخر الزماں ہیں، چنانچہ اس نے ابوطالب کو مشورہ دیا کہ ان کو مکہ واپس بھیجدو، ورنہ یہود اگر دیکھ لیں گے تو قتل کر ڈالیں گے، اگرچہ یہ واقعہ جیسا کہ سیرۃ نبوی جلد اول (شام کا سفر) میں بتفصیل لکھا جا چکا ہے، صحیح نہیں ہے، تاہم ہمارے عیسائی احباب اس ضعیف روایت پر اپنے شکوک و شبہات کی عظیم الشان عمارت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا، اگر یہ صحیح ہے تو دنیا کے لیے اس سے بڑا معجزہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کیا چاہیے کہ ایک ابجد ناشناس طفل دوازدہ سالہ نے چند گھنٹوں میں حقائق و اسرار دین، اصول عقائد، نکات اخلاق، مہمات قانون اور ایک شریعت عظمیٰ کی تکمیل و تاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لیے، کیا ہمارے عیسائی دوست اس

معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں،

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ زندگی پورے ۲۳ برس تک قائم رہی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی معلم سے فیض پاتے رہتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانہ تک یا بڑی حد تک خلوت و جلوت میں آپ کے ساتھ رہتا کہ وقتِ ضرورت (نعوذ باللہ) آپ اس سے قرآن بنواتے. احکام و مواعظ سیکھتے، اسرار و نکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا، کیونکہ جو شخص خود مدعیِ نبوت کو تعلیم دے رہا ہو، وہ کیونکر اس کی نبوت کو تسلیم کرسکتا تھا، اور پھر اس شہرت عام ذکر جمیل، رفعتِ مقام کو دیکھکر جو مدعی نبوت کو حاصل ہو رہی تھی، وہ خود پردہ کے پیچھے گمنامی پسند نہ کرتا، اور صحابہ کرام کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہہ تھا، اگر حقیقت میں آپ اس سے تعلیم حاصل کیا کرتے تو قریش جو آپ کی تکذیب، تذلیل اور آپ کو خاموش کرنے کی ہر تدبیر پر عمل پیرا ہو رہے تھے، ان کے لیے آسان تھا کہ اس غلام عجمی کو الگ کر دیتے کہ محمد رسول اللہ کی وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعۃً درہم برہم ہو جاتا، علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ اس کا وجود مکہ میں تھا، پھر مدینہ میں ۱۳ برس تک سینۂ نبوت سے فیضان الٰہی کا سرچشمہ کیونکر ابلتا رہا، قرآن شریعت اسلام اور احکام کا بڑا حصہ یہیں وحی ہوا ہے، مکہ میں تو نسبتہً بہت کم سورتیں نازل ہوئی ہیں

جب مدینہ منورہ میں اسلام کا چرچا پھیلا تو یہود و نصاریٰ نے اسلام کو بدنام اور رسوا کرنے کی ایک تدبیر یہ سوچی کہ لوگ جھوٹ موٹ آکر پہلے مسلمان اور پھر چند روز کے بعد مرتد ہو جائیں تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بدنامی ہو، اور لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہی
اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ	کہ مسلمانوں پر جو اترا ہی، اس پر صبح کو ایمان
اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا	لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید کہ
اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران)	وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں،

چنانچہ اسی سازش کے مطابق ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا، اور سورہ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کی خدمت اسکے سپرد کی، چند روز کے بعد وہ مرتد ہو گیا، اور کہنے لگا کہ میں نے محمد کو جو کچھ لکھدیا ہی، وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، خدا نے اپنی نشانی ظاہر کی، اور موت نے بہت جلد اسکی افترا پردازی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا[1] اور دنیا نے دیکھ لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان نبوت کا چشمہ اب بھی اسی طرح جوش زن ہے

صلح حدیبیہ کا ایک واقعہ یہ ہی کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان عہدنامہ مرتب ہو رہا تھا، حضرت علیؓ عہدنامہ لکھ رہے تھے، عہدنامہ کی عبارت یہ تھی کہ "یہ وہ شرائط ہیں جن کو خدا کے رسول محمدؐ نے منظور کیا"، قریش نے کہا اگر ہم آپ کو خدا کا رسول مانتے تو اس لڑائی کی نوبت ہی کیوں آتی، اس لفظ کو مٹا کر اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیے، آپنے حضرت علیؓ کو ایما فرمایا کہ انکی حسب خواہش ترمیم کر دو، حضرت علیؓ نے کہا مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی، آپنے پوچھا وہ الفاظ کہاں ہیں حضرت علیؓ نے انگلی رکھکر بتایا، تو آپنے خود اپنے دست مبارک سے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا، اور محمد بن عبداللہ لکھدیا، یہ واقعہ بخاری، مسلم، نسائی، مسند ابن حنبل اور تمام کتب سیر میں مذکور ہے

[1] صحیح بخاری علامات النبوۃ فی الاسلام

اسی کے ساتھ بخاری میں یہ تصریح ہے[1] کہ ولیس یحسن یکتب، اور مسند احمد میں بروایت اسرائیل یہ الفاظ ہیں ولیس یحسن ان یکتب یعنی آپ لکھنا نہیں جانتے تھے،" لیکن باوجود اسکے تمام احادیث وسیر میں یہ ہے کہ "آپنے محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھدیے" روایت کے ظاہری معنی سے بعضوں کو یہ شبہہ ہوا کہ آپنے خود اپنے دستِ مبارک سے یہ الفاظ لکھے، اور آپنے شاید اخیر زمانہ میں لکھنا سیکھ لیا تھا، ابن ابی شیبہ نے مجاہد کے واسطہ سے یہ روایت کی ہے کہ آپنے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک آپ کو لکھنا پڑھنا آگیا، اور ایک اور روایت (بواسطہ یونس بن میسرہ عن ابی کبشۃ السلولی عن سہل بن الحنظلیہ) نقل کی ہے کہ آپنے حضرت امیر معاویہؓ سے ایک فرمان لکھوا کر اقرع اور عیینہ کو عنایت فرمایا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا کہ معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہے، آپنے اس پر ایک نظر ڈال کر فرمایا، وہی لکھا ہے جو میں نے حکم دیا ہے،

اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور معجزہ ہوگا کہ انسانی تعلیم کے بغیر اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ فن بھی اپنی بارگاہ سے عنایت کیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایتیں تمامتر موضوع یا نہایت ضعیف ہیں، اس لیے آپ کی امیت کے متعلق جو متواتر روایتیں ہیں ان سے ان کی تنسیخ نہیں ہوسکتی، یہ ممکن ہے کہ امی سے امی آدمی کے ہاں جب شب و روز لکھنے پڑھنے کا کام لگا رہے، تو وہ کسی قدر حرف شناس ہوجائے، خصوصاً اپنے نام اور دستخط کو پہچان لینا اور ان کو لکیر کھینچ کر لکھ دینا تو معمولی بات ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ فاعل مجازی و حقیقی کی تفصیل میں راویوں سے مسامحت ہوئی ہے، عموماً سلاطین، امراء، اور اکابر جو

---

[1] صحیح بخاری باب عمرۃ القضاء،

فرامین اور مراسلات لکھاتے ہیں، محاورۂ عام میں ان کو لکھنا ہی کہتے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے یہ فرمان لکھ کر دیا، شاہجہاں نے جامع مسجد بنائی۔ فلاں بادشاہ نے قلعہ تعمیر کیا، حالانکہ لکھنے والے، بنانے والے، اور تعمیر کرنے والے کاتب اور معمار تھے، مگر چونکہ ان سلاطین کے حکم سے اور ان ہی کی طرف سے وہ لکھا یا بنایا گیا، اس لیے بولنے والے خود سلاطین اور امراء کی طرف فعل کی نسبت کر دیتے ہیں، چنانچہ اسی محاورہ کے مطابق اس موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطینِ عالم کے نام دعوت نامے بھیجے ہیں، تو وہاں عام طور پر یہ الفاظ ہیں، وکتب الی قیصر، وکتب الی کسریٰ، آپ نے قیصر کو یہ خط لکھا، کسریٰ کو یہ لکھا، مگر سب کو معلوم ہے کہ آپ نے دست خاص سے یہ خطوط لکھ کر نہیں بھیجے، مگر چونکہ آپ ہی نے لکھوائے تھے، اس لیے ان کی نسبت آپ ہی کی طرف کی گئی، روزمرہ کی بات ہے کہ ہندوستان کے ادنیٰ طبقے جو نوشت و خواند سے عاری ہیں، وہ اپنے اعزہ اور احباب کو خط لکھاتے ہیں، مگر کہنے والے اس کو یوں ہی کہتے ہیں کہ اس نے خط میں لکھا ہے کہ میں آنے والا ہوں، حالانکہ وہ خود لکھنے والا نہیں، اس نے دوسروں سے لکھایا ہے، مگر چونکہ لکھنے والے نے اپنا مدعا نہیں لکھا، بلکہ لکھانے والے کی زبان سے اس کا مدعا ظاہر کیا ہے، اس لیے اسی کی طرف فعل کی نسبت کر دی گئی قرآن پاک نے آپ کو بار بار اور برملا امی کہا ہے، اس سے زیادہ ثبوت اس کا اور کیا چاہیے؟ لیکن آپ امی ہو کر، امیوں میں پل کر، کتب سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہو کر بھی سب کچھ جانتے تھے، اور یہ آپ کا معجزہ تھا، کفار کو خطاب کرکے قرآن کہتا ہے کہ محمدؐ

کی صداقت کی یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ ناآشنائے تعلیم ہو کر بھی وہ کچھ جانتا ہے، جس کی علماے بنی اسرائیل کے سوا اور کسی کو خبر نہیں،

اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ اَوَلَمْ	یہ باتیں گذشتہ پیغمبروں کی کتابوں میں
یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ	ہیں. کیا ان کافروں کے لیے یہ نشانی نہیں
عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ	کہ ان باتوں کو (جو ایک امی کی زبان سے
(شعراء - ۱۱)	ادا ہو رہی ہیں) بنی اسرائیل کے عالم جانتے ہیں،

ذاتِ نبویؐ کی حفاظت

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ

انبیاے کرام جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ دنیا کی جہالت و ظلمت، جور و ستم، گناہ و معصیت کے خلاف اپنا جہاد شروع کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں انسان ان کے دشمن بلکہ ان کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں، اس تنہائی و بیکسی کے عالم میں جس سے ہر مصلح کو آغاز دعوت میں دوچار ہونا پڑتا ہے، صرف اسی قادر و توانا کا ہاتھ ہوتا ہے، جو ان کی تسکین و نصرت کا سہارا ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نمرود کے دربار میں اور حضرت موسیٰؑ فرعون کی بارگاہ میں، حضرت عیسیٰؑ رومیوں اور یہودیوں کی عدالت میں ایک ہی گناہ کے مجرم تھے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس پیغام کی بقا و قیام کا جس کے لیے وہ پیغمبر کو مبعوث کرتا ہے، خود ذمہ دار ہوتا ہے، اس لیے اس بیکسی و بیچارگی کے عالم میں اس کی زندگی کا وہی محافظ اور نگہبان بن جاتا ہے، کہ وہ بے خوف و خطر اپنے فرائض کو انجام دے سکیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع ہی میں تسکین دیدی گئی تھی،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ	اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کیے بیٹھا رہ
بِأَعْيُنِنَا (طور-۲)	کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے،

سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کا بچہ بچہ آپ کا

دشمن ہوگیا، آپ کو طرح طرح کے آزار پہنچانے گئے، آپ کے خلاف سیکڑوں منصوبے باندھے گئے، آپ کے قتل کی سازشیں ہوئیں، تلواریں زہر میں بجھا کر رکھی گئیں، سوتے میں آپ کے قتل کا ارادہ کیا گیا، میدان جنگ میں آپ پر نرغہ کیا گیا، کمینگاہوں سے آپ پر حملے کیے گئے، غفلت میں آپ کے سر پر پتھر گرانے کی تدبیر سوچی گئی، کھانے میں زہر دیا گیا، مگر ہر موقع پر یہ ظاہر ہوا کہ ع

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تراست

اور قرآن مجید کا یہ اعلان صحیح ثابت ہوا:

اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ (۱۷-۶۱) تیرے پروردگار نے لوگوں کو گھیر رکھا ہے کہ تجھ پر دسترس پائیں۔

یہ خود ایک مستقل معجزہ ہے کہ ان ہنگاموں، فتنوں اور سازشوں کے عالم میں خصوصاً عرب کے ملک میں جہاں اقتدارِ حکومت یا نظامِ امن کا نام و نشان تک نہ تھا، کیونکر آپ نے بحفاظت تمام اپنے فرض کو انجام تک پہنچایا،

قریش کی مجلسیں اکثر خانۂ کعبہ میں منعقد ہوا کرتی تھیں، اور اکثر وہیں انکی نشست و برخاست رہا کرتی تھی، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز اور طواف کے لیے بیخوف و خطر وہیں تشریف لیجایا کرتے اور برملا ان کے دیوتاؤں اور بتوں کی برائیاں بیان کیا کرتے تھے، آخر قریش نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ نعوذ باللہ آپ کا خاتمہ کر دیں، یہ خبر آپ تک پہنچتی ہے، مگر اس سے آپ کے ارادہ میں کسی قسم کا وہن یا ضعف نہیں پیدا ہوتا، ایک دن قریش نے یہ طے کیا کہ آج

محمدؐ کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے، اتفاق سے کفار کی یہ تقریر حضرت فاطمہؓ سن لیتی ہیں، وہ روتی ہوئی باپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں، آپ تسلّی دیتے ہیں، اور وضو کر کے حرم کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں، دشمنوں کی نگاہیں آپ پر پڑتی ہیں، تو وہی نگاہیں جو ابتک خون آشامی کے لیے تیار تھیں، دفعۃً سرنگو ہو جاتی ہیں[1]. حاکم میں ہے کہ اس کے بعد آپؐ نے چند کنکریاں اٹھا کر ماریں، جن جن کو یہ کنکریاں جا کر لگیں وہ بدر میں مارے گئے۔

ایک دفعہ ابوجہل نے ارادہ کیا کہ اگر اب وہ آپ کو سجدہ میں دیکھے گا تو آپ کی پیشانی کو رگڑ دے گا، جب وہ اس ارادہ سے آگے بڑھا تو جھجھک کر پیچھے لوٹ گیا. لوگوں نے دریافت کیا تو اس نے کہا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی خندق حائل ہے، اور چند پردار ہستیاں کھڑی ہیں، آپؐ نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اسکے ٹکڑے اڑا دیتے[2]

معلوم ہے کہ جس شب کو آپؐ نے ہجرت کا ارادہ کیا ہے، قریش کے تمام خاندانوں نے ملکر آپؐ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا. قریش کے بہادر رات بھر خانہ اقدس کا پہرہ دے رہے تھے، تاہم آپ ان کے سامنے سے نکلے، زبانِ مبارک پر یہ آیت پاک تھی،

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ سَدًّا	اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دیواریں
وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ	کھڑی کر دیں، انکی آنکھوں پر پردہ ڈالدیا
فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (یٰسین)	کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں،

---

[1] مستدرک حاکم جلد اول ص ۱۶۳ حیدر آباد، مسند ابن حنبل جلد اول ص ۳۶۸

[2] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ

پہرہ داروں کی آنکھوں پر قدرت نے مہر لگادی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے درمیان سے نکل کر چلے گئے، صبح ہوئی تو دشمن آپ کے تعاقب میں اُس غار تک پہنچ گئے، جہاں آپ اور حضرت ابو بکرؓ جاکر چھپے تھے، وہ اس غار کے دہانہ تک پہنچ گئے، اور اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو ان مقدس پناہ گزینوں پر ان کی نظر پڑ جاتی، مگر خدا نے ان کی عقل اور دور اندیشی کے نور کو بجھا دیا کہ نیچے جھک کر دیکھنے کا خیال تک ان کے دل میں نہیں آیا،

کفار نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو محمدؐ کو گرفتار کر لائیگا، یا ان کا سر کاٹ کر لائیگا، اس کو سو اونٹ انعام میں ملیں گے، یہ سن کر سراقہ بن جعشم اپنے اسپ راہوار پر سوار ہو کر آپ کے تعاقب میں روانہ ہوا، اور دمبدم اس مختصر قافلہ کے قریب ہو رہا تھا، حضرت ابو بکرؓ پر بتقاضائے بشری اضطراب طاری تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکینتِ خاطر میں کوئی فرق نہ آیا، آپ نے دعا کی، تین دفعہ اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس دھنس گئے، اس نے فال کے تیر نکال کر دیکھے تو ہر دفعہ نفی میں جواب آیا، بالآخر اس کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اور ہی راز ہے، اور ذات محمدیؐ ہماری گرفت سے باہر ہے، اس نے اپنے ارادۂ فاسد سے توبہ کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خطِ امان لیکر واپس گیا،[1] اور بعد کو مسلمان ہو گیا،

شروع شروع میں جب آپ مدینہ تشریف لائے، تو صحابہ جان نثاری کی بنا پر راتوں کو آپ کے گرد پہرہ دیا کرتے تھے، ایک رات صحابہ آپ کے خیمہ کے گرد پہرہ دے رہے تھے کہ آیت

---

[1] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

نازل ہوئی:

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ) اور اللہ ان لوگوں سے تیری حفاظت کریگا۔

آپنے اسی وقت خیمہ سے باہر سر نکالا اور پہرہ والوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ "لوگو! واپس جاؤ، خدانے میری حفاظت کا فرض خود اپنے ذمہ لے لیا ہے[1]" یہ وعدۂ حفاظت ہزارہا مشکلات اور خطرات کے باوجود بھی پورا ہوتا رہا، غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ چلے تھے، اور ذاتِ مبارک دشمنوں کے نرغہ میں تھی، اور آپ پر تیغ وتبر وسنگ کی بارش ہورہی تھی لیکن دو سپید پوش فرشتے آپکے پاس کھڑے ہوئے آپ کی حفاظت کا فرض انجام دے رہے تھے[2]،

ایک دفعہ ایک شخص کو لوگ گرفتار کرلائے، اور عرض کی کہ یہ حضور کے قتل کی گھات میں تھا، فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو کہ اگر یہ مجھ کو قتل کرنا چاہتا بھی تو نہیں کرسکتا اسی طرح سے خیبر میں جب ایک یہودیہ نے گوشت میں زہر ملاکر پیش کیا، تو آپنے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ فرمایا یہ گوشت نہ کھاؤ، کیونکہ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اس میں زہر ملا ہے، یہودیہ کو بلاکر جب واقعہ کی تحقیق کی اور اس نے اپنی نیتِ فاسد کا اقرار کیا تو آپنے فرمایا کہ "خدا تجھکو اس پر قابو نہ دیتا[3]"

[1] جامع ترمذی تفسیر سورہ مائدہ [2] صحیح بخاری غزوۂ احد وصحیح مسلم کتاب الفضائل [3] صحیح مسلم باب السم،

لیلۃ الجنّ

جنّوں کی انقلابِ آسمانی کی تلاش اور ان کا مشرف باسلام ہونا

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (سورۂ جن)

مخلوقاتِ الٰہی کی تعداد اور اصناف کا کون اندازہ لگا سکتا ہے،

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ (مدثر) اور تیرے رب کی فوجوں کا علم اسکے سوا کسی کو نہیں،

مخلوقاتِ الٰہی کی ایک صنف کا نام جنّ ہے، اہلِ لغت کہتے ہیں کہ عربی میں جن کا لفظ جَنٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی "چھپنے" اور چھپانے" کے ہیں، چونکہ یہ مخلوق انسانوں کی آنکھوں سے عموماً مستور رہتی ہے، اس لیے اس کو جن کہتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ یہ لفظ اسی معنی میں یا اسی کے قریب قریب مختلف قوموں کی زبانوں میں پایا جاتا ہے، فرنچ میں "جنی" (Genee) اور انگریزی میں Genee اسی مفہوم میں ہے جس میں عربی میں جنی (دیو، بھوت، پلیت) ہے، لاطینی میں جینیوس (GENIUS) اور "جینی" (GENII) وہ مفہوم رکھتا ہے جو ہمارے ہاں ہمزاد کا ہے، اور روح نوعی کے معنی میں بھی یہ لفظ رومی اساطیر (میتھالوجی) میں مستعمل ہوا ہے، فارسی میں "جان" کے معنی مطلق "روح" کے ہیں، بہرحال دنیا کی قوموں میں یہ اعتقاد کسی نہ کسی حیثیت سے موجود رہا ہے کہ انسانوں کے سوا اس سطحِ ارضی پر ایک اور غیر مرئی مخلوق بھی موجود ہے، یورپ کے موجودہ دورِ الحاد میں ارواح سے نامہ و پیام اور

ان کے عمل و تسخیر کے کارنامے بڑے بڑے فلسفیوں اور مادہ پرستوں کو آئینۂ حیرت بنائے ہوئے ہیں، اور روز بروز ان کے انکار اور شک کی جرأت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسلام کے علاوہ دوسری مسلّم مذہبی کتابوں میں بھی جن اور شیطان کے تذکرے موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات جو موجودہ انجیل میں مذکور ہیں، انکی بڑی تعداد انسانوں اور حیوانوں کو انکے پنجۂ ظلم سے رہائی ہے۔

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ان کی پیدائش انسانوں سے پہلے ہوئی ہے۔ اور آگ سے بنائے گئے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ	اور ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے
مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ، وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ	سے پیدا کیا، اور جنوں کو اس سے پہلے لو کی
مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (حجر-۳)	آگ سے پیدا کیا،
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (رحمٰن-۱)	اور اس نے جنوں کو آگ کی لو سے پیدا کیا ہے،

اسلام سے پہلے عرب میں جنات کا بڑا تسلط تھا، ان کی پوجا کی جاتی تھی[1]، ان کی دہائی مانگی جاتی تھی، بتخانوں میں جو عامل اور کاہن ہوتے تھے، ان سے اُن کی دوستی ہوتی تھی، اور وہ اُن کو غیب کی خبریں بتایا کرتے تھے، بچوں کے سرہانے استرے رکھے جاتے تھے کہ ان سے جنات بھاگ جاتے ہیں، یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے، یہ بھی خیال تھا کہ وہ صورتیں بدل بدل کر لوگوں میں پھرتے ہیں، اور ان کو ستاتے ہیں، خدا کے کارخانۂ قدرت میں بھی ان کے استیلاء اور تصرف کو دخل تھا۔ وہ جنگلوں میں انسانوں کو مار ڈالتے تھے۔ راستوں سے اٹھا لیجاتے تھے۔ لوگوں کو بیمار ڈال دیتے تھے، انکے ہوش و حواس کے

---

[1] صحیح مسلم، باب التفسیر

خزانہ پر قبضہ کر لیتے تھے۔ غرض جس طرح خدائی الوہیت میں عرب کے بہت سے دیوتا اور دیبیاں شریک تھیں، اسی طرح یہ جنات بھی شریک تھے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ (انعام-۱۲)	اور ان مشرکوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا ہے
وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا	اور ان مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان
(صافات-۵)	رشتے قائم کر رکھے ہیں،
بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ	(خدا قیامت میں ان سے کہے گا) بلکہ یہ لوگ جنوں کی
بِهِمْ مُؤْمِنُونَ (سبا-۵)	پرستش کرتے تھے اور ان میں اکثر لوگ ان ہی کے

اسلام آیا تو اس نے ان اعتقادات باطلہ کے تار و پود کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اس نے دنیا میں صرف ایک ہی قوت کی تعلیم دی، اور وہ خدا کی تھی۔ اس نے بتایا کہ جنات بھی اس کے حضور میں ویسے ہی عاجز اور درماندہ ہیں جیسے انسان، وہ بھی اسی طرح اس کی مخلوق ہیں جیسی اس کی دوسری مخلوقات، ان میں لوگ اسی طرح اچھے اور برے، کافر و مومن، سعید اور شقی ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں، وہ بھی توحید و رسالت اور احکام الٰہی کے ماننے کے ویسے ہی مکلف ہیں، جیسے عام انسان

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا	اور میں نے جن اور انس کو اسی لیے پیدا
لِيَعْبُدُونِ (ذاریات ۳)	کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں،

قیامت میں دونوں سے سوال ہوگا،

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ	اے جن اور انس کی جماعت! کیا تمہارے پاس

رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ	تمھیں میں سے پیغمبر تمھارے پاس نہیں آئے
اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ	اور وہ تم کو ہماری آیتیں پڑھکر نہیں سناتے
هٰذَا (انعام-۱۶)	تھے اور اس دن کے آنے سے نہیں ڈراتے تھے،

قرآن کے تحدی کے جواب سے دونوں عاجز ہیں،

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	کہدو کہ اگر انس وجن دونوں مل کر چاہیں
عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	کہ ایسا قرآن بنا لائیں توان کے لیے
لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (اسرائیل-۱۰)	یہ ناممکن ہے۔

خدا کی قدرت اور طاقت کے سامنے دونوں لاچار اور درماندہ ہیں،

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ	اے جن وانس! اگر آسمان وزمین کے حدود
اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ	سے نکل کر باہر جا سکتے ہو تو نکل جاؤ
وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ	لیکن خدا کی قدرت قاہرہ کے بغیر
اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (رحمٰن ۲)	تم نکل نہیں سکتے۔

کاہنوں اور عاملوں کو جو غیب کی بعض بعض باتیں معلوم ہوجاتی ہیں تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اپنے اپنے ملاء اعلیٰ میں اسکا ذکر کرتا ہے، ملاء اعلیٰ والے اپنے نیچے کے فرشتوں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں، اور اس طرح درجہ بدرجہ ہر آسمان کے فرشتوں کو علم ہوتا جاتا ہے، یہانتک کہ آخری آسمان تک بات پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سے نیچے دنیا کی حد شروع ہوتی ہے، یہانتک کہ جنات وشیاطین سُن گن لینے کے لیے ادھر اُدھر

چھپے رہتے ہیں، ایک دو لفظ انھوں نے سن لیے، اور ان میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملاکر کاہنوں اور عاملوں سے کہدیتے ہیں، وہ اس کو انسانوں میں مشتہر کرتے ہیں[۱]۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان میں بیشمار ستاروں کے شعلے بھڑکا رکھے ہیں، کہ ایک تو اُن سے آسمان کی زیبایش وآرایش ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یہ جنات، اور شیاطین اپنی سرحد سے آگے بڑھ کر فرشتوں کی باتیں سننا چاہتے ہیں تو فوراً ایک چمکتا ہوا تارا (شہاب ثاقب) ٹوٹ کر اُن پر گرتا ہے۔ مختلف سورتوں میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا	اور ہم نے آسمان میں بُرج بنایا ہے،
وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ	اور ان ستاروں کو دیکھنے والوں کیلیے زینت
كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ	وآرایش بنایا ہے اور ہر راندۂ درگاہ شیطان سے
السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ	اسکو محفوظ رکھا ہے، لیکن اتنا ہے کہ وہ چوری
(حجر-۲)	چھپے کچھ سن لے تو ایک چمکتا ستارہ اس کا
إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ	ہم نے آسمانِ زیریں کو ستاروں کی آرایش سے
الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ	مزین کیا ہے، اور ان کو ہر سرکش شیطان کا نگہبان
مَارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ	بنایا ہے، وہ ملاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے
الْأَعْلَىٰ وَيُقْذَفُونَ مِنْ كُلِّ	وہ ہر طرف سے پھینک کر مارے جاتے
جَانِبٍ ۝ دُحُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ	ہیں، اور یہ ان کے لیے لازمی سزا ہے،

[۱] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حجر و تفسیر سورۂ نساء و بدء الخلق وغیرہ۔

وَاصِبٌ ○ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ	(اس طرح وہ فرشتوں کی باتیں نہیں سن سکتے)
فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ○	لیکن یہ کہ کوئی اچک کر سن لے تو ایک دہکتا ہوا
(صافات ۱)	ستارا اس کے پیچھے لگا رہتا ہے،
وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ	ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کے چراغوں سے
وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ ○	مزین کیا ہے، اور ان کو شیطانوں کیلیے پھینک کے
(ملک ۱)	مارنے کی ایک چیز بنایا ہے،
وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ	اور ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کے چراغوں
وَحِفْظًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ	سے مزین کیا ہے، اور ان کو نگہبان بنایا ہے
الْعَلِيمِ (فصلت ۲)	یہ غالب و دانا خدا کی تقدیر ہے،

دنیا میں اُس سلسلۂ نبوت کا جو آغاز آفرینش سے جاری تھا، اور دین الٰہی کا ہزاروں منزلوں کے طے ہونے کے بعد تکمیل کی منزل میں پہنچ جانا، اور نوع انسان کو خدا کی وہ آخری شریعت سپرد ہونا جس کے بعد خاکدانِ عالم کو وحی و نبوت کے کسی اور حال کی ضرورت نہ ہوگی، ایک ایسا واقعہ تھا جس نے آب و خاک کے عالم میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، اُس نے سطحِ زمین کے ہزاروں پیغمبروں کے دین و ملت کو منسوخ کر دیا، ان کی آسمانی کتابوں کے احکام و رسوم کو بدل دیا، ملکوں کی شہنشاہیاں ہل گئیں، قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ گئے، صومعہ و کلیسا ویران ہو گئے، اسی طرح مملکتِ فلکی اور آسمانی بادشاہی میں بھی انقلاب کا ظاہر ہونا ضرور تھا، آسمانی مخلوقات میں بھی ایک انقلاب پیدا ہوا، مگر اس کو وہی دیکھ سکے جو دیکھ سکتے تھے، انجیل میں

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے موقع پر بھی ایک نئے نورانی ستارہ کے ظہور کی خبر ہے جس کو دیکھ کر دوسرے ملک کے لوگ ان کی تلاش میں بیت لحم پہنچے، اور ان کے دیدار سے مشرف ہوئے، مگر بنی اسرائیل کو آخر تک اس بینائی سے محرومی رہی،

صحیحین میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز ہوئے تو ستاروں کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہوا جن اور شیاطین اب اوپر چڑھنے سے روک دیے گئے، ٹوٹنے والے ستاروں کی بھرمار ہوگئی، کاہنوں اور عاملوں کی خبر رسانی کے ذرائع مسدود ہوگئے، اور ان باطل پرستیوں کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس آسمانی انقلاب نے جنوں اور شیطانوں کی محفلوں میں حیرت پیدا کر دی، سب نے کہا یقیناً روے زمین پر کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہے، دنیا کی ہر سمت کو انھوں نے چھان ڈالا۔ اس پر چند سال گذر گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی تبلیغ کے لیے قبائل میں دورے کر رہے تھے، اور اسی تقریب سے عکاظ کے میلہ میں تشریف لیجا رہے تھے، راستہ میں رات کے وقت مقام نخلہ میں قیام ہوا، صبح کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقا کیساتھ نماز میں مصروف تھے، اور قرآن مجید کی آیتیں جہر کے ساتھ تلاوت فرما رہے تھے، کہ اتفاق سے جنوں کی ایک جماعت کا جو تفتیش حال کے لیے تہامہ کی طرف آئی تھی، اس مقام پر گذر ہوا، اس نے جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں، تو یکبار پکار اٹھی کہ یہی وہ نور حق ہے جو درخشاں ستاروں میں ہمیں نظر آتا ہے، وہ لوٹ کر اپنی قوم میں گئی، اور اُن کو جا کر خاتم نبوت کے ظہور کی بشارت سنائی[۱]

[۱] یہ پوری تفصیل صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الجہر فی الصبح میں ہے اور امام بخاری نے مختلف ابواب میں اس واقعہ کو درج کیا ہے مثلاً تفسیر سورۂ جن و باب الجہر بقراءۃ صلوٰۃ الفجر و مسند ابن حنبل روایت ابن عباس جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ و صحیح ترمذی تفسیر سورۂ جن

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ
الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا
يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَ
لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا وَّاَنَّهُ
تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً
وَّلَا وَلَدًا وَّاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ
سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا وَّاَنَّا
ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ
الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّاَنَّهُ كَانَ
رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ
بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ
رَهَقًا وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ
اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا وَّ
اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا
مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا
وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ
فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا

اے پیغمبر! لوگوں سے کہدو کہ مجکو بذریعہ وحی
خبر دی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن
کو سنا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے عجیب غریب
کتاب الٰہی سنی، جو ہدایت کی طرف رہنمائی
کرتی ہے، تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب
ہم ہرگز خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے،
خداوند تعالیٰ کی نہ تو کوئی بیوی ہے اور نہ کوئی
لڑکا ہے، ہم میں سے کچھ بیوقوف خدا پر بہت دور
از عقل الزام قائم کرتے تھے، ہم سمجھتے تھے
کہ کوئی انسان یا جن خدا پر جھوٹا الزام نہیں
قائم کرسکتا، انسانوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو
بعض جنوں کی پناہ مانگا کرتے تھے، تو ان ہی نے
ان کو اور زیادہ گمراہ کردیا، انسان بھی ہماری
ہی طرح یہ سمجھتے تھے کہ اب خدا کوئی پیغمبر نہ بھیجے گا،
ہم نے آسمان کو خوب ٹٹولا، تو ہم نے پایا کہ
وہ نگہبانوں سے اور ٹوٹنے والے تاروں سے بھرا ہوا ہے
ہم پہلے اس آسمان کی بعض نشستگاہوں

رَصَدًا ۝ وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ
بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ
رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝ وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ
وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ ۖ كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا ۝
وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّن نُّعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ
وَلَن نُّعْجِزَهُ هَرَبًا ۝ وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا
الْهُدَىٰ آمَنَّا بِهِ ۖ فَمَن يُؤْمِن بِرَبِّهِ
فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا ۝
وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۖ
فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا
رَشَدًا ۝ وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ
فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝

(جن ۱۰)

میں سننے کو بیٹھ جاتے تھے، اب جو کوئی سننے جاتا ہے
تو اپنی تاک میں ٹوٹنے والے ستارہ کو پاتا ہے اور
ہمیں نہیں معلوم کہ اس انقلاب سے زمین والوں کے
ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا جا رہا ہے یا انکا پروردگار
ان کیساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، ہم میں اچھے بھی
ہیں اور انکے علاوہ اور لوگ بھی ہیں، ہم جدا جدا
راستوں پر تھے اور ہم سمجھتے تھے کہ ہم خدا کو اس زمین
میں عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اسکے قبضہ سے
نکل سکتے اور اب جب ہم نے اس ہدایت کی بات
سن لیا تو اب ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، تو جو شخص
اپنے پروردگار پر ایمان لے آتا ہے، تو پھر گھاٹے سے
کا اسکو ڈر نہیں رہتا، ہم میں کچھ اطاعت گذار ہیں،
کچھ گنہگار ہیں، تو جو اطاعت گذار ہیں ان ہی نے

پھر سورہ احقاف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ
يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ
قَالُوا أَنصِتُوا ۖ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا

ہم نے جب جنوں کی ایک جماعت کا رخ اے پیغمبر
تیری طرف پھیر دیا کہ وہ قرآن کو سنیں تو
جب وہ آئے تو انھوں نے ایک دوسرے سے کہا

اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ قَالُوْا یٰقَوْمَنَا	چپ رہو، جب قرآن ختم ہوگیا، تو وہ اپنی قوم
اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ	کے پاس گئے کہ انھیں خبردار کریں، انھوں نے جاکر
مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ	کہا، بھائیو! ہم نے ایک شریعت کی کتاب کو سنا
یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ	جو موسٰی کے بعد اتاری گئی ہے، اور اس کے پہلے جو
مُّسْتَقِیْمٍ یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ	کتاب الٰہی آئی ہے، اسکی تصدیق کرتی ہے اور سچائی
وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ	اور سیدھی راہ دکھاتی ہے اے بھائیو! خدا کے
ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ	پکارنے والے کو قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ
اَلِیْمٍ	تاکہ وہ تمھارے گناہوں کو معاف کرے اور دردناک
(احقاف - ۴)	عذاب سے تم کو پناہ دے۔

صحیح مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں نے دو دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام مجید پڑھتے سنا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ دونوں سورتیں الگ الگ واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہوں۔ پہلے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ شریک نہ تھے[1]، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ کسی صحابی نے ان جنوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا[2]، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکی اطلاع ایک درخت[3] نے کی، اور تفصیلی کیفیت وحی آسمانی سے معلوم ہوئی، اسی واقعہ کو واقعۂ لیلۃ الجن (جن کی رات) کہتے ہیں لیکن یہ دونوں واقعے مکہ معظمہ ہی میں گذرے ہیں۔ صحیح مسلم[4]

[1] صحیح مسلم باب الجہر بالقراءۃ الصبح [2] صحیح بخاری و مسلم باب مذکور و مسند احمد جلد اول ص ۲۵۲۔
[3] صحیح مسلم باب مذکور [4] صحیح مسلم باب مذکور

ترمذی[1] اور مسند طیالسی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کے شاگرد خاص علقمہ نے پوچھا کہ آپ صاحبوں میں سے کوئی لیلۃ الجن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ انھوں نے کہا نہیں، لیکن ایک اور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ شب کو ہم لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا، میدانوں اور گھاٹیوں میں ہر جگہ ڈھونڈا، مگر آپ نہیں ملے ہم لوگوں کو طرح طرح کے خیال آنے لگے کہ آپ کو کوئی اٹھالے گیا، یا دھوکے سے کسی نے قتل کر دیا، سخت اضطراب اور قلق میں ہم نے یہ رات بسر کی، صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپ غار حرا کی طرف سے چلے آرہے ہیں، ہم سب نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم نے شب کو ہر جگہ آپ کو ڈھونڈا، مگر آپ کہیں نہیں ملے ہم نے سخت اضطراب اور قلق میں رات بسر کی، فرمایا کہ "رات کو جنوں کا قاصد آیا تھا، میں اس کے ساتھ گیا تھا، میں نے ان کو قرآن پڑھکر سنایا، اس کے بعد آپ ہم سب کو لیکر اس مقام پر تشریف لے گئے، اور وہاں ان کے قیام اور آگ جلانے کے نشانات دکھائے اور فرمایا، کہ انھوں نے مجھ سے زاد راہ کی خواہش کی، میں نے ان کے لیے دعا کی کہ وہ جس ہڈی اور گوبر پر گذریں ان کے لیے وہ کھانا ہو جائے۔[2]

مسند ابن حنبل کے زیادات میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی جنوں کی آمد کا ایک اور واقعہ مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رات کے وقت ہم لوگوں کے پاس بیٹھے تھے، کہ یکایک آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلے لیکن وہ نہ چلے جس کے دل میں ذرا سا بھی کھوٹ ہو، ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں پانی کا لوٹا لیکر آپ کے ساتھ ہولیا، آپ مجھے

[1] ترمذی سورۂ احقاف [2] صحیح مسلم باب الجہر بقراۃ الصبح و صحیح بخاری باب ذکر الجن فی المبعث صحیح بخاری و مسلم و ترمذی باب الاستنجاء

ساتھ لیے ہوئے مکہ کے آگے پہنچے، وہاں مجھکو کچھ پرچھائیاں ایک جگہ اکھٹی نظر آئیں، آپ نے ایک خط پھینچ دیا، اور فرمایا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں کھڑے رہو، یہ کہکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ گئے میں نے دیکھا کہ وہ پرچھائیاں آپ کی طرف چلیں، آپ اُن کیساتھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، جب فجر کا اجالا ہوا، تو آپ میرے پاس آئے اور وضو کا پانی مانگا، میں نے دیکھا تو وہ پانی کے بجائے کھجور کا شربت (نبیذ) تھا، آپنے فرمایا، اس میں کیا حرج ہے، کھجور بھی پاک ہے اور پانی بھی پاک ہے، یہ کہکر آپنے اسی سے وضو کیا، اس کے بعد نماز کو کھڑے ہوئے، تو ان میں سے دو آدمی پاس آکر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہم بھی آپکے پیچھے نماز پڑھیں گے! چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ آپکے پیچھے کھڑے ہوئے، نماز سے فارغ ہوکر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا، یہ شہر نصیبین کے جن تھے، اپنے کچھ معاملات میرے پاس فیصلہ کے لیے لائے تھے انھوں نے مجھ سے توشہ مانگا تھا میں نے دیدیا، عرض کی، یا رسول اللہ! کیا آپکے ساتھ کوئی توشہ کا سامان تھا؟ فرمایا میں نے انھیں گوبر اور ہڈی کا توشہ دیدیا ہے، گوبر ان کے لیے جو اور ہڈی پُر گوشت ہوجائے گی، اسی موقع پر آپنے گوبر اور ہڈی سے استنجا، منع فرمایا۔[1]

زیادات مسند اور صحیح مسلم کی دونوں روایتیں کیا ایک ہی واقعہ کی دو تفصیلیں ہیں؟ مگر ان دونوں روایتوں کے جزئیات میں اسی قدر فرق ہے کہ وہ یقیناً ایک نہیں ہوسکتیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیاداتِ مسند کی روایت بالکل لغو اور بے سروپا ہے، اس روایت کا سلسلۂ سند یہ ہے عن ابی فزارۃ عن ابی زید مولیٰ عمرو بن الحریث المخزومی عن عبد اللہ بن مسعود

---

[1] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۴۵۸

اس میں ابوزید مولیٰ عمرو بن حریث ایک مجہول راوی ہے، جس سے محدثین میں کوئی واقف نہیں، حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

ابوزید مولیٰ عمرو بن حریث	ابوزید غلام عمرو بن حریث اس کو کوئی جانتا
لا یعرف عن ابن مسعود وعنه	نہیں، اس نے ابن مسعود سے روایت کی ہے اور
ابو فزارة لا یصح حدیثه ذکره	اس سے ابو فزارہ نے، اسکی حدیث صحیح نہیں بخاری
البخاری فی الضعفاء ومتن حدیثه	نے ضعفا میں اسکو درج کیا ہے، اس کی حدیث
ان نبی الله توضأ بالنبیذ وقال	کا متن یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیذ سے
ابو محمد الحاکم رجل مجهول قلت	وضو کیا، ابو احمد حاکم کہتے ہیں کہ یہ مجہول الحال
ماله سوای حدیث واحد	آدمی ہے، میں کہتا ہوں کہ اسکی یہی ایک حدیث ہے

البتہ جامع ترمذی میں اسی قسم کا ایک واقعہ عبداللہ بن مسعودؓ سے فرشتوں کی آمد اور دیدار کے متعلق بروایت صحیح مروی ہے،

شقِ قمر

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (قمر ۱)

پیغمبر کی صداقت کی گواہی کائنات کا ذرہ ذرہ دیتا ہے، آسمان اور زمین، چاند اور سورج ہر چیز اس کی صداقت کا ثبوت بنجاتی ہے، انجیل (متی ۲-۲) میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے وقت ایک نیا ستارہ طلوع ہوا، اور جب انھوں نے وفات پائی، تو تین گھنٹہ کے لیے تمام دنیا میں اندھیرا چھا گیا (متی ۲۷-۴۵) قربِ قیامت کی ایک نشانی یہ بھی تھی کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے، یہ نشانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر پوری اتری۔ اور قرآن نے کہا،

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ	قیامت نزدیک آگئی، اور چاند شق ہوگیا،
وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا	اگر کافر کوئی سا بھی نشان دیکھیں تو اس سے
سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ	اعراض ہی کریں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے
(قمر ۱)	جو سدا سے ہوتا آیا ہے،

بعض عقل پرست مسلمانوں نے قربِ قیامت کی مناسبت سے یہ تاویل کی ہے کہ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں شقِ قمر کا ثبوت نہیں ہوتا، بلکہ یہ قیامت کے

واقعہ کا ذکر ہے، لیکن اس حالت میں اول تو بے قرینہ ماضی (چاند پھٹ گیا) کو مستقبل (چاند پھٹ جائے گا) کے معنی میں لینا پڑے گا، دوسرے یہ کہ اگر قیامت کا واقعہ ہوتا تو اسکے بعد یہ کیوں ہوتا کہ "یہ کافر اگر کوئی سی نشانی بھی دیکھیں تو منہ پھیرلیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے" قیامت سامنے آجانے کے بعد اس کے انکار کے کیا معنی اور اس کو مستمر جادو کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ مستند اور صحیح روایات کی کیونکر تردید کیجا سکتی ہے

اس شق قمر کا واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند ابن حنبل، مسند طیالسی، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی اور دلائل ابونعیم میں بہ تصریح تمام مذکور ہے، صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جبیرؓ بن مطعم، علیؓ بن ابی طالب اور حذیفہ بنؓ یمان وغیرہ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے۔[1] ان میں سب سے صحیح اور مستند تر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے، جو صحیح بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں مروی ہے، وہ اس واقعہ کے وقت موقع پر موجود تھے، اور اس معجزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

انشق القمر ونحن مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ منیٰ میں تھے کہ
بمنیٰ فقال اشھدوا وذھبت فرقۃ	چاند پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی
نحو الجبل (بخاری و ترمذی تفسیر سورۂ قمر و صحیح مسلم)	طرف چلا گیا، آپ نے فرمایا گواہ رہو،

صحیحین میں ان کی دوسری روایت یہ ہے:

انشق القمر علی عھد رسول اللہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے

[1] زرقانی بر مواہب جلد ۵ ص ۱۲۴

صلی اللہ علیہ وسلم فرقتین فرقۃ فوق الجبل وفرقۃ دونہ فقال رسول اللہ صلعم اشھدوا (صحیح بخاری وصحیح مسلم) | ہو گئے، ایک ٹکڑا تو پہاڑ کے اوپر رہا، اور دوسرا اس کے نیچے، آپ نے فرمایا گواہ رہو،

حضرت انس بنؓ مالک کی یہ روایت بخاری ومسلم دونوں میں ہے،

ان اھل مکۃ سألوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یریھم آیۃ فاراھم القمر شقتین حتی راؤا حراء بینھما | اہل مکہ نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ ان کو کوئی معجزہ دکھائیں، آپ نے ان کو چاند کے ٹکڑے دکھائے، ایک ٹکڑا حرا کے اس طرف تھا، دوسرا اس طرف

صحیح مسلم میں ہے،

ان اھل مکۃ سألوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یریھم اٰیۃ فاراھم انشقاق القمر فرقتین، | اہل مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی طلب کی تو آپ نے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کو دکھایا،

جامع ترمذی میں ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

سأل اھل مکۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اٰیۃ فانشق القمر بمکۃ فرقتین فنزلت | اہل مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی طلب کی، تو چاند مکہ میں دو ٹکڑے ہو گیا اس پر یہ آیت اتری،

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ | قیامت آگئی اور چاند پھٹ گیا،

جامع ترمذی اور مسند ابن حنبل میں جبیرؓ بن مطعم کی جو روایت ہے، اس میں ہے کہ اس معجزہ

کو دیکھ کر کفار نے کہا کہ محمدؐ نے ہم پر جادو کر دیا ہے، دوسروں نے کہا کہ اگر ہم پر جادو کر دیا ہے تو تمام آدمیوں پر تو وہ جادو نہیں کر سکتے، مسند ابوداؤد وطیالسیؒ اور بیہقی میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ محمدؐ تمام دنیا پر تو جادو نہیں کر سکتے، مسافروں کو اور مقامات سے آنے دو، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں، چنانچہ جب ادھر ادھر سے مسافر آئے، اور ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے بھی اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا،

بہرحال یہ معجزہ رات کے وقت مکہ میں بمقام منیٰ واقع ہوا،

عقلی حیثیت سے یہ معجزہ زمانہ قدیم سے معرکۃ الآرا رہا ہے، علمائے متکلمین نے فلسفۂ قدیم کے اصول پر اس میں خوب خوب موشگافیاں کی ہیں، مثلاً فلاسفۂ قدیم کا یہ اعتقاد تھا کہ اجرام فلکی میں خرق والتیام اور شکست و ریخت محال ہے، اس لیے شق قمر بھی ناممکن ہے، متکلمین نے ثابت کیا کہ اجرام فلکی میں خرق والتیام اور شکست و ریخت ممکن ہے، مگر اب کہ جدید طبعیات و ہیئت نے ہمارے معلومات کے آسمان و زمین کو بدل دیا ہے، یہ مباحث بے سود اور بیکار ہیں، اب تو ہر روز نئے نئے ستاروں کے شکست و ریخت اور تصادم کے حادثے پیش آرہے ہیں، اور ہیئت جدید اور علم تکوین میں تو زمین، سورج، اور ستاروں کے آغاز آفرینش کی داستان ہی اس باب سے شروع ہوتی ہے،

اس سے دوسرے درجہ پر ایک اور قدیم اعتراض وجواب کتابوں میں لکھا چلا آتا ہے، اور ہمارے مسیحی مناظرین نے اس کو نئے آب و رنگ سے شہرت دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر

---

[1] مسند عبد اللہ بن مسعودؓ صفحہ ۳۸، حیدر آباد دکن،

یہ معجزہ درحقیقت واقع ہوتا تو یہ صرف اہل مکہ ہی کو نظر نہ آتا، بلکہ اس کو تمام دنیا دیکھتی، اور اسکی روایتیں مشرق سے لیکر مغرب تک پھیل جاتیں لیکن بجز مکہ کے اور ملکوں میں اس واقعہ کا چرچا نہیں ہوا، اور تمام قدیم اہل نجوم وہیئت وتاریخ اس کی روایت سے خاموش ہیں،

لوگوں نے اس شبہہ کے یہ جوابات دیے ہیں کہ اولاً ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ واقعہ دوسرے ملک کے لوگوں کو نظر نہیں آیا تم اس کے ثبوت میں کہوگے کہ اگر نظر آتا تو اس ملک کے اہل تاریخ اس کا ذکر کرتے، حالانکہ کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ملک کا مشہور واقعہ جو دوسرے ملک کی معاصر تاریخوں میں مذکور نہ ہو، صرف اس کا یہ عدم ذکر کیا اس کے انکار کی سند ہوسکتا ہے، اور اگر ایسا ہی تو ہندوؤں کی مہابھارت کا تم انکار کرسکتے ہو، حضرت مسیحؑ کے تمام معجزات بلکہ واقعات زندگی تک کا انکار کرسکتے ہو کہ شام ومصر کے معاصر رومی مورخوں نے ایسے عجیب وغریب واقعات کا ایک حرف بھی قلمبند نہیں کیا، اسکے برخلاف ابھی اوپر کی روایتوں میں بیان کیا جاچکا ہے کہ عرب شام سے آنے والے مسافروں نے یہ بیان کیا کہ انھوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا،

فلکی حیثیت سے جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اہل ہیئت جو اجرام فلکی کے ایک ایک واقعہ کو قلمبند کرتے آئے ہیں، انھوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزات رات کے وقت ظاہر ہوا تھا، اور اس وقت دنیا کا بڑا حصہ خواب راحت میں مصروف تھا، جو لوگ بیدار بھی ہوں گے، وہ اپنے دوسرے مشاغل میں مصروف ہوں گے اور جنھوں نے دیکھا بھی ہوگا، ان میں کتنا بڑا حصہ ان کا ہوگا جو اپنے مشاہدات کو تحریری صورت

میں لانے پر قادر نہ تھے یعنی ناخواندہ تھے۔ اور اگر ان میں چند لکھے پڑھے اربابِ ہیئت اور اصحابِ تاریخ تھے تو ضروری نہیں کہ انھوں نے اپنے اس مشاہدہ کا تذکرہ بھی کیا ہو یا تذکرہ کیا تو ان کی یادداشت مثل دوسری سیکڑوں علمی یادداشتوں کے ضائع ہوگئی ہو، آغاز آفرینش سے اب تک اجرام فلکی میں لاکھوں انقلابات پیش آئے ہوں گے لیکن کیا وہ سب کے سب دنیا کے اوراقِ ہیئت میں درج ہیں؟ اور ان کا درج نہ ہونا ان کے عدمِ وقوع کی دلیل ہے؟ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اس قسم کے حوادث فلکی کا ذکر ہے، لیکن علم ہیئت و فلک اس کے ذکر سے خاموش ہے لیکن یہ خاموشی اس کے عدم وقوع پر شہادت ہے؟ خود تمھاری انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش کے وقت ایک ستارۂ نبوت طلوع ہوا جس کو یورپ کے لوگوں نے دیکھا، اور پھر انجیل میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی تو تمام دنیا دفعۃً تاریک ہوگئی لیکن کیا ہیئت و افلاک کی کتابوں میں ان انقلاباتِ سماوی کا تذکرہ موجود ہے؟

حوادثِ فلکی کے حدوث اور وقوع میں بڑی چیز یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ مطالع اور مغارب پر موقوف ہے، اور ہر جگہ کے مطالع و مغارب دوسری جگہ سے نہایت مختلف ہیں، بالخصوص قمر کے مطالع میں، تو اور بھی سخت اختلاف ہے، ایک جگہ چاند ڈوبتا ہے، دوسری جگہ نکلتا ہے، ایک جگہ چاندنی ہے، دوسری جگہ اندھیری ہوتی ہے، ایک جگہ چاند کو گہن لگتا ہے، اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو وہ نظر تک نہیں آتا۔ اس لیے اگر تمام دنیا نے اس معجزہ کو نہیں دیکھا تو یہ شقِ قمر کی نفی کی دلیل نہیں، چنانچہ دنیا کی مختلف باخبر قوموں نے اپنی اپنی کتابوں

ہیں مختلف حوادثِ فلکی کا ذکر ہے لیکن جس واقعہ کو ایک نے بڑے شدومد سے بیان کیا ہے، اس کی معاصر قوموں کی کتابیں اسکی شہادت سے قطعاً خالی ہیں، لیکن کیا یہ خاموشی اس کے عدمِ وقوع کی سند ہوسکتی ہے؟ علاوہ اور وجوہ کے اس خاموشی اور اختلاف کی ایک وجہ یہی ہوتی ہے کہ تمام دنیا کا ایک مطلع نہیں ہے، اس لیے ایک چیز ایک جگہ نظر آتی ہے، دوسری جگہ نہیں آتی۔

بعض متکلمین نے جن میں ایک شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی ہیں، لکھا ہے، اور امام غزالی کا بھی ادھر ہی رجحان معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت چاند میں شگاف نہیں ہوا تھا، بلکہ لوگوں کو ایسا نظر آیا، چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

ان اھل مکۃ سالوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یریھم اٰیۃ فاراھم انشقاق القمر فرقتین (صحیح مسلم)	اہلِ مکہ نے آپ سے نشانی طلب کی تو آپ نے چاند دو ٹکڑے دکھایا۔

ہم ان تمام پرپیچ راستوں سے گذر کر صرف ایک سیدھی سی بات کہہ دینا چاہتے ہیں، شق القمر اہلِ مکہ کی طلب پر ایک آیتِ الٰہی تھی یعنی ان منکروں کو انکی خواہش کے مطابق ثبوت کی ایک نشانی دکھائی گئی تھی، احادیث میں یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، خواہ در اصل چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے ہوں، یا خدا نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا ہو کہ ان کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، جو خدا انسانوں کی آنکھوں میں خلافِ عادت تصرف کرسکتا ہے، وہ خود چاند میں بھی خلافِ عادت تصرف کرسکتا ہے، پھر چونکہ اللہ نے

یہ نشانی اہل مکہ کے لیے ظاہر کی تھی، اور ان ہی کے لیے یہ آیہ ثبوت تھی، اس لیے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور روایت کی حاجت نہ تھی، اس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شق قمر مشاہدہ نہ ہوا تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں، بلکہ اہل مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاع عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ آسمان کے طبعی انقلابات میں سے کوئی انقلاب تھا، جیسا کہ اور سیکڑوں قسم کے تغیرات اس سے پہلے ہو چکے ہیں، جیسا کہ فلکیات اور علم بدء خلق (کسموگریفی اور نیچرہسٹری) میں مذکور ہیں لیکن جب اہل مکہ کے علاوہ جو شہر مکہ میں تھے، یا باہر قافلہ میں تھے، صرف ان ہی کو نظر آیا، تو اس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا، وللہ الحمد،

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ (روم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی الہامی زبان سے جن واقعات کی پیشین گوئی کی ہے، ان سب میں سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ صاف وصریح، سب سے زیادہ معرکۃ الآرا غلبۂ روم کی پیشین گوئی ہے۔

عرب کے چپ و راست دونوں پہلوؤں میں روم وفارس کی پرزور حکومتیں قائم تھیں، اس وقت ایران کا تاجدار خسرو اور روم کا فرمانروا ہرقل تھا، ان دونوں سلطنتوں میں ایک مدت سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا، بعثت نبوی کے پانچویں سال یعنی ۶۱۳ء میں ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ شروع ہوگئی، اگرچہ ان دونوں قوموں میں کسی قوم نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا تھا، تاہم رومی حضرت عیسیٰ کے پیرو اور اہل کتاب تھے، اور ایرانیوں کے عقائد مشرکین مکہ کے عقائد کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے، اس لیے لازمی طور سے مسلمانوں کو رومی عیسائیوں کے ساتھ اور مشرکین مکہ کو ایرانیوں کے ساتھ ہمدردی تھی، اس لیے مسلمانوں اور کفار قریش دونوں کو جنگ کے نتیجہ کا شدت کے ساتھ انتظار تھا۔

ان دونوں سلطنتوں کے حدود دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر آکر ملتے تھے، رومی سلطنت مشرق میں ایشیائے کوچک، حدود عراق، شام، فلسطین اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی، ایرانیوں نے دوطرفہ حملہ کیا، ایک طرف تو وہ دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھے، اور دوسری طرف ایشیائے کوچک کی جانب آذربائجان سے آرمینیا ہوکر، موجودہ اناطولیہ میں داخل ہوگئے، اور دونوں طرف سے رومیوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے سمندر میں ان کو ڈھکیل دیا، شام کی سمت میں انھوں نے یکے بعد دیگرے اس ارض مقدس کا ایک ایک شہر رومیوں سے چھین لیا، ۶۱۴ء میں فلسطین اور اس کا مقدس شہر یروشلم صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی کے زیر سایہ آگیا، کنیسے مسمار کیے گئے، مذہبی شعائر کی توہین کی گئی، ۲۶ ہزار یہودیوں نے ایرانی فوج میں شامل ہوکر ۶۰ ہزار بے گناہ عیسائیوں کا قتل عام کیا، شہنشاہ ایران کے قصر اقامت کی تیس ہزار مقتول سروں سے آرایش کی گئی، ایرانی فتوحات کا سیلاب اس سے آگے بڑھکر ۶۱۶ء میں پوری وادی نیل یعنی مملکتِ مصر پر محیط ہوگیا، اور آخر اسکندریہ کے ساحل پر جاکر تھما، اور دوسری طرف تمام ایشیائے کوچک کو زیر و زبر کرتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جاکر رکا، اور قسطنطنیہ کی دیواروں سے جاکر ٹکرایا، شہنشاہِ روم کے دارالسلطنت کے سامنے ایران کے فاتح لشکر نے جاکر اپنے خیمے کھڑے کر دیے، اور اب رومیوں کے بجائے عراق و شام و فلسطین و مصر و ایشیائے کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہوگئی، ہر جگہ آتشکدے تعمیر ہوئے، اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا، رومی سلطنت کی اس تباہی کو دیکھکر رومی شہنشاہی کی وسیع مملکت میں بغاوتیں کھڑی ہوگئیں

افریقہ میں بھی شورش ہوئی، خود قسطنطنیہ کے قریب یورپ میں مختلف قومیں قتل و غارتگری میں مصروف ہوگئیں، غرض اس وقت سلطنت رومہ کے پرزے پرزے اڑ گئے تھے،

جنگ کا نتیجہ جب ایسا خلاف امید ظاہر ہوا تو مسلمانوں کو یقیناً رنج اور کفار کو مسرت حاصل ہوئی، اور انھوں نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ "جس طرح ہمارے بھائی غالب ہوئے ہیں، اسی طرح اگر تم ہم سے لڑتے تو ہم غالب ہوتے، اس وقت رومیوں کی جو افسوسناک حالت تھی وہ آپ سن چکے کہ وہ اپنے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ کھو چکے تھے، خزانہ خالی تھا فوج منتشر تھی، ملک میں بغاوتیں پیدا تھیں، شہنشاہ روم ہرقل ہمہ تن عیاش، بے پروا، سست اور مبتلائے اوہام تھا، ایرانیوں کا فاتح سپہ سالار قسطنطنیہ کے دروازہ پر پہنچکر رومیوں کے سامنے حسب ذیل شرائط پیش کرتا ہے، رومی باج ادا کریں، ایک ہزار ٹالنٹ سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار حریر کے تھان، ایک ہزار گھوڑے، اور ایک ہزار باکرہ لڑکیاں ایرانیوں کے حوالہ کریں، رومیوں کی کمزوری کی یہ حالت ہے کہ وہ ان شرمناک شرائط کو قبول کرتے ہیں، اس پر بھی جب رومی قاصد شہنشاہ ایران کے دربار میں مصالحت کا پیام لیکر جاتا ہے تو مغرور خسرو جواب دیتا ہے، "مجکو یہ نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے، اور اس وقت تک صلح نہیں کرونگا جب تک شہنشاہ روم اپنے مصلوب خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کے آگے سر نہ جھکائے گا"؛

کارزار عالم کا نقشہ یہ تھا کہ معرکۂ جنگ سے بہت دور ایک خشک اور بنجر زمین کی سنسان پہاڑی سے ایک شہزادۂ امن نمودار ہوا، اور واقعات عالم کے بالکل خلاف سروش غیب سے نغمۂ قدس میں گویا ہوا

الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ	رومی قریب تر زمین میں مغلوب ہوگئے، لیکن
وَھُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ	وہ چند سال میں مغلوب ہوجانے کے بعد پھر
فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ	غالب ہوں گے، خدا ہی کے ہاتھ میں پہلے اور
وَمِنْ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ	پیچھے سب اختیار ہے، اور اس دن مسلمان خدا
بِنَصْرِ اللّٰہِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ	کی مدد سے خوش ہوں گے، وہ جس کی چاہے
الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ وَعْدَ اللّٰہِ لَا	مدد کرے، وہ غالب رحم والا ہے، خدا کا وعدہ
یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (روم)	ہے، خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

یہ پیشین گوئی واقعات کے لحاظ سے اس قدر مستبعد اور ناقابلِ یقین تھی کہ کفار نے اس کے صحیح ہونے کی صورت میں کئی اونٹوں کے ہارنے کی مسلمانوں سے شرط لگائی، اب مسلمانوں اور کافروں کو بڑی شدت سے واقعات کے پہلو کا انتظار تھا، آخر چند سال کے بعد دنیا نے خلاف امید پلٹا کھایا، مورخ گبن کے الفاظ میں "شہنشاہ جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں سستی، عیاشی اور اوہام کا غلام، اور رعایا کے مصائب کا نامرد تماشائی تھا جس طرح صبح و شام کا کہرا آفتاب نصف النہار کی روشنی سے پھٹ جاتا ہے، دفعۃً (۶۲۱ء میں) محلوں کا ارکاڈیوس، میدان جنگ کا سیزر بن گیا، اور روم اور ہرقل کی عزت نہایت شاندار طریقہ سے بچائی گئی[1]"، جس وقت ہرقل اپنی بقیہ فوج لیکر قسطنطنیہ سے چلا ہے، لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ رومۃ العظمیٰ کے آخری لشکر کا منظر دنیا کے سامنے ہے[2] لیکن عرب کے نبی امی کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، اور عین اس وقت جب مسلمانوں

[1] تاریخ زوال روم مصنفہ گبن ج ۳ ص ۴۰۴ مطبوعہ ۱۸۹۰ء [2] ایضاً

نے بدر کے میدان میں قریش کو شکست دی، رومیوں نے ایرانیوں پر غلبہ حاصل کیا، مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا، اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے سواحل کی طرف ڈھکیل دیا،

اس عظیم الشان پیشین گوئی کی صداقت کے اثر نے دنیا کو محو حیرت کر دیا، قریش کے بہت سے لوگ اس صداقت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے[1]، واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوالِ روم کا مشہور مصنف گبن اس حیرتناک پیشین گوئی کی سچائی سے متحیر ہو کر کہتا ہے:

"مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دونوں کی ایک دوسرے کو تباہ کر دینے والی روز افزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا، اور عین اس وقت جب کہ ایرانیوں کو پیہم کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں، اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ چند سال میں فتح وظفر رومی علم پر سایہ فگن ہوگی۔" جس وقت یہ پیشینگوئی کی گئی تھی، کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دور از قیاس نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کی بارہ سال کی (۶۱۰ء سے ۶۲۲ء تک) حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ جلد بکھر جائے گا۔"[2]

ہرقل کی طبیعت میں اس فوری انقلاب اور واقعات کی رو سے اس حیرتناک تغیر اور اس کے اسباب کی تفصیل میں تاریخ روم کے مصنفین نے عجیب عجیب باتیں پیدا کی ہیں، لیکن انھیں کیا معلوم کہ اس خونی معرکہ سے دور ایک پیغمبرانہ ہاتھ رومیوں کی مدد کے لیے دراز تھا

[1] ترمذی تفسیر سورۂ روم [2] تاریخ زوال روم جلد ۳ ص ۳۰۲ و ۳۰۳ طبع مذکور،

اور وہی اس انقلاب اور تغیر کا سب سے بڑا روحانی سبب تھا۔

مستدرک[1] (علی شرط الصحیحین) اور جامع ترمذی[2] میں ہے کہ "روم وفارس کی جب جنگ شروع ہوئی تو مشرکین، ایرانیوں کے طرفدار تھے، کیونکہ وہ بھی بت پرست تھے، اور مسلمان رومیوں کے طرفدار تھے کہ وہ اہل کتاب تھے، اس وقت ایرانی روم کو دباتے جارہے تھے، اس پر سورۂ روم کی پیشین گوئی نازل ہوئی، حضرت ابو بکرؓ نے چلا چلا کر تمام مشرکین کو یہ پیشینگوئی سنائی، مشرکین نے کہا کہ اس پیشینگوئی کے لیے کوئی سال مقرر کرو، حضرت ابو بکرؓ نے پانچ سال کی شرط کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ بضع کا لفظ ۳ سے ۹ تک بولا جاتا ہے، اس لیے دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیے تھی، چنانچہ اس تشریح کے مطابق نویں سال غزوۂ بدر کے موقع پر پیشین گوئی پوری ہوئی، اور رومی غالب آئے"

غزوۂ بدر ہجرت کے پہلے سال اور بعثت کے چودہویں سال پیش آیا، اس سے ۹ برس پہلے بعثت کا پانچواں سال ہوگا، اس بنا پر پیشین گوئی کا زمانہ ۵ھ بعثت اور اس کے پورے ہونے کا زمانہ ۱۴ بعثت یا ۱ھ ہے، بعض لوگوں نے اس پیشینگوئی کے پورے ہونے کا زمانہ صلح حدیبیہ کا سال یعنی ۶ھ بیان کیا ہے، یہ صحیح نہیں، شاید لوگوں کو اس سے دھوکا ہوا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ قاصد نبوی جب اسلام کا دعوت نامہ لیکر قیصر کے پاس گیا، تو وہ اس وقت فتح کا شکریہ ادا کرنے کے لیے شام آیا ہوا تھا، اور معلوم ہے کہ قاصد صلح حدیبیہ کے زمانہ میں روانہ ہوئے تھے، اس لیے لوگوں نے یہ سمجھا کہ حصول فتح کی بھی یہی تاریخ ہے، مگر یہ مغالطہ

---

[1] جلد ۲ تفسیر سورۂ روم [2] تفسیر سورۂ روم

بالکل ظاہر ہے کہ یہ فتح مکہ کی تاریخ نہیں، بلکہ فتح کے جشن کی تاریخ ہے، رومی تاریخ مطابقت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۶۰۹ء میں آپ کی بعثت ہوئی، ۶۱۰ء سے روم و فارس کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی، ۶۱۳ء میں اعلان جنگ ہوا، ۶۱۴ء سے رومیوں کی شکست کا آغاز ہوا، ۶۱۶ء میں رومی شکست تکمیل کو پہنچ گئی، ۶۲۲ء سے پھر رومیوں نے حملہ شروع کیا، ۶۲۳ء سے ان کی کامیابی کا آغاز ہوا، اور ۶۲۵ء میں ان کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی، اس ترتیب سے دیکھئے تو ظاہر ہوگا کہ اس پیشین گوئی کی خوبی یہ ہے کہ آغاز شکست سے آغاز فتح تک جوڑیئے تو بھی وہی نو برس ہو گئے ہیں، اور اگر انجام شکست سے آغاز فتح تک جوڑیئے تو بھی وہی نو برس ہوں گے،

اس فتح کی تکمیل کے بعد ہرقل پھر وہی سست و عیاش قیصر بن گیا جو پہلے تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دست قدرت نے صرف اس پیشینگوئی کے پورا کرنے کے لیے چند سال کے واسطے اس کے دل و دماغ کو بیدار اور دست و بازو کو ہشیار کر دیا تھا، پیشینگوئی کی تکمیل کے بعد پھر پہلے کی طرح تعیش اور کاہلی نے اس کو عیش و غفلت کے بستر پر تھپک تھپک کر سلا دیا،

— • • • —

دیگر آیات و دلائل نبوی

قرآن مجید میں

طیر ابابیل کی نشانی | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت عام الفیل میں ہوئی جس میں ابرہتہ الاشرم نے ہاتھیوں کی قطار کے ساتھ خانۂ کعبہ پر حملہ کرنا چاہا تھا، لیکن فضلِ آسمانی کے ایک حقیر حقیر پرندہ نے کنکریوں کے ذریعہ سے اُن کو ہلاک کر دیا، یہ ایک عظیم الشان نشان تھا جس کا ظہور مسلمان اور عیسائی دونوں تسلیم کریں گے کہ مشرکین عرب کی تائید کے لیے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ابرہتہ الاشرم ایک عیسائی بادشاہ تھا جس کا مذہب بہرحال مشرکین سے بہتر تھا، بلکہ یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا نشان تھا، جن کی ذاتِ پاک حقیقی طور پر خانۂ کعبہ کی حفاظت کی کفیل تھی، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس معجزہ کے ذکر میں خاص طور پر آپ کی طرف روئے خطاب کیا ہے،

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے
الْفِيْلِ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ	ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا، انکی چالوں کو
تَضْلِيْلٍ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا	کو بے راہ نہیں کر دیا؟ اور ان پر جھنڈ کے

اَبَابِيْلَ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ	جھنڈ پرندے بھیجے، جو اُن کو پتھریلی کنکریوں
سِجِّيْلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ	سے مارتے تھے، تو خدا نے ان کو کھائی ہوئی
مَّاْكُوْلٍ، (فیل)	بھس کے مانند کردیا،

یہ سورہ واقعہ کے تقریباً ۴۵ برس بعد اتری تھی، اور غالباً اس وقت متعدد اشخاص اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں گے، اور ایسے تو ہزاروں ہوگے جنھوں نے دیکھنے والوں سے براہ راست اور بلا واسطہ اس واقعہ کو سنا ہوگا، کفار جو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے درپے رہتے تھے، اگر اس صورتِ واقعہ کے بیان میں کچھ بھی غلطی یا جھوٹ شامل ہوتا، تو وہ اس کی علانیہ تردید کردیتے، مگر ایسا نہیں ہوا، اس لیے اس کی سچائی میں کوئی شک شبہ نہیں کیا جاسکتا،

شہب ثاقب کی کثرت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت عطا ہوئی تو نظم آسمانی میں ایک خاص انقلاب پیدا ہوا، جنات جو پہلے آسمان کے قریب تک جاسکتے تھے، ان کی آمد و رفت مسدود کردی گئی، اور ان پر ٹوٹنے والے تاروں کی بارش ہونے لگی، چنانچہ قرآن مجید میں خود جنات کی زبانی بیان ہے،

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا	ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو پایا کہ وہ سخت
مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا	پہرہ داروں اور ٹوٹنے والے تاروں سے
وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ	بھر دیا گیا ہے، اور ہم پہلے سننے کو وہاں ٹھکانوں
لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ	پر بیٹھتے تھے، لیکن اب جو کوئی سنے

لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (جن ۱) تو تارے کو اپنی تاک میں پا دے،

شرحِ صدر | شرحِ صدر یعنی سینہ کا کھول دینا، یا اس غرض سے چاک کرنا کہ وہ انوارِ الٰہی سے معمور کیا جائے، ایک دولتِ ربّانی تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی، ارشاد ہوا

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (شرح) اے محمد کیا ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا (یا چاک نہیں کر دیا)

احادیث میں گو اس شرحِ صدر کی پوری تفصیل مذکور ہے، مگر بہر حال قرآن پاک سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ خواہ یہ ظاہری طور سے یا باطنی رنگ میں علم و حکمت اور نورِ معرفت کی غیر معمولی اور مافوق بشری بخشش ہو، ہر صورت میں وہ ایک فہم سے بالاتر کیفیت تھی،

مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزانہ طریق پر ایک شب میں مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک جو پراسرار سفر کیا، قرآن نے ان الفاظ میں ان کی تصدیق کی ہے،

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (اسرٰی ۱-۶۱) پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو خانۂ کعبہ سے بیت المقدس تک رات کے وقت ایک شب میں لے گیا،

حالانکہ ان دونوں مقامات کے بیچ میں اُس زمانہ میں مہینوں کا سفر تھا،

قریش پر قحط سالی کا عذاب | حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے پہلے بھی یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب قریش نے آپ کی مخالفت کی تو آپ نے ان کو بددعا کی کہ "خداوندا اُن کو سات سال

تک قحط میں مبتلا رکھ جس طرح تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں سات سال تک مستقل قحط کو قائم رکھا تھا، چنانچہ ان پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے بھوک کے مارے مردار اور چمڑے کھائے، یہاں تک کہ جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو وہ انکو دھوئیں کی طرح نظر آتا تھا، یہ حالت دیکھکر ابوسفیان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ "اے محمد! تم خدا کی اطاعت اور صلۂ رحم کا حکم دیتے ہو، حالانکہ خود تمہاری قوم تباہ ہو رہی ہے، اس کے لیے خدا سے دعا کرو" آپ نے دعا فرمائی، اور بارش ہوئی جس نے قحط کی مصیبت کو دور کر دیا، اسکے بعد پھر قریش نے حسب دستور آپ کی مخالفت شروع کی، تو قیام مکہ ہی کے زمانہ میں خدا نے آپ کی زبان سے یہ پیشینگوئی قریش کو سنائی کہ آیندہ اس کا انتقام ایک بڑی سخت گرفت سے لیا جائیگا، وہ گرفت بدر کی لڑائی تھی، چنانچہ سورۂ دخان کی ان آیتوں میں اسی واقعہ کا ذکر ہے،[۱]

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۗءُ بِدُخَانٍ	اس دن کا انتظار کرو، جب آسمان دھواں
مُّبِيْنٍ يَّغْشَى النَّاسَ ھٰذَا عَذَابٌ	نمایاں کریگا جو لوگوں پر چھا جائیگا، یہ نہایت
اَلِيْمٌ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا	تکلیف دہ عذاب ہے، خداوندا یہ عذاب ہمارے
مُؤْمِنُوْنَ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ	اوپر سے ہٹالے، ہم مسلمان ہیں اور کہاں ان
جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ثُمَّ تَوَلَّوْا	کو یہ نصیحت پکڑنا، حالانکہ ان کے پاس ایک
عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ اِنَّا كَاشِفُوا	رسول کھلم کھلا آیا، پھر ان لوگوں نے اس سے
الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَاۗىِٕدُوْنَ	اعراض کیا، اور کہا یہ سکھایا ہوا پاگل ہے، ہم

[۱] صحیح مسلم تفسیر سورۂ دخان

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (دخان ۱) | تھوڑی دیر کیلئے اس عذاب کو ہٹالینے والے ہیں تم لوگ اسی قدیم حالت کیطرف عود کر جاؤ گے ہم اس روز انتقام لیں گے جو سب

موقع ہجرت کی معجزانہ نشانیاں | کفار نے دار الندوہ میں چھپ کر آپ کے قتل وغیرہ کے مشورے کیے، کوئی مسلمان نہ اُن میں شریک تھا، اور نہ کسی طرح ہو سکتا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز کی خبر اللہ نے دیدی، دن، تاریخ، وقت، سب سے آگاہی ہوگئی، اور پھر یہ کہ جس شب کو آپ نے ہجرت کی سب کو معلوم ہے کہ اس رات کو آپ کے گھر کے چاروں طرف دشمنوں کا پہرہ تھا، تاہم آپ اُن کی آنکھوں میں خاک جھونک کر ان ہی کے درمیان سے گذر کر حضرت صدیق رض کے ساتھ شہر سے نکل گئے، آپ مکہ کے قریب ہی غار ثور میں جا کر چھپے، عرب آثار قدم سے اشخاص کے مقام و گذرگاہ کا پتہ لگانے میں نہایت مشاق تھے، صبح کو وہ آپ کا پتہ لگاتے ہوئے غار مذکور کے دہانہ تک پہنچ گئے، یہانتک کہ اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو آپ ان کے سامنے تھے، حضرت ابوبکر رض اقتضاے بشری سے گھبرا اٹھے، مگر آپ نے تسلی دی کہ خدا ہمارے ساتھ ہے، چنانچہ ساتھ والے خدا نے یہ تدبیر کی کہ کافروں سے ان کی یہ سوجھ چھین لی کہ وہ جھک کر دیکھیں، اور ان کے دل میں ایسی بات ڈال دی کہ وہ بے دیکھے واپس چلے گئے،

سیر کی اکثر ضعیف روایتوں میں اور مسند ابن حنبل کی ایک روایت میں جو زیادہ کمزور نہیں ہے، مذکور ہے کہ مکڑی نے غار کے منہ پر جالے تن دیے تھے، کفار نے کہا اگر کوئی اس غار میں جا کر چھپتا تو ظاہر ہے کہ یہ جالے ٹوٹ جاتے، اور یہ کہکر وہ واپس چلے گئے، اس غار سے نکل کر جب آپ مدینہ کی راہ چلے تو قریش کے سوار آپ کے تعاقب میں نظر آئے، چنانچہ سراقہ اپنا گھوڑا دوڑاتا

آپکے قریب پہنچ گیا، دفعۃً گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، تین دفعہ یہی واقعہ پیش آیا، سراقہ اس اعجاز کو دیکھکر مرعوب ہوگیا، اور خط امان لیکر واپس چلا گیا،

واقعۂ ہجرت کے ان معجزانہ واقعات کا تفصیلی بیان احادیث میں ہے، مگر قرآن مجید کا یہ اجمالی اعتراف ان کی تائید کی شہادت ہے،

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ

(انفال ۴)

اور یاد کرو (اے پیغمبر) جب کفار تمھارے ساتھ داؤ کر رہے تھے، تاکہ تم کو قید کریں یا قتل کریں یا گھر سے نکال دیں، وہ بھی داؤ کر رہے تھے اور خدا بھی داؤ کر رہا تھا، اور خدا سب داؤ کرنے والوں میں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے،

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ط وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ

اے لڑائی سے پیچھے رہنے والے لوگو! اگر تم اس پیغمبر کی مدد نہ کرو تو وہ تمھاری مدد سے بے نیاز ہے، کہ خدا نے اس وقت اسکی مدد کی جب اس کو کافروں نے گھر سے نکالدیا تھا، دو رفیقوں میں سے ایک نے جب وہ دونوں غار میں تھے، اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے، پھر خدا نے اس پر اپنی تسکین نازل کی اور ان فوجوں سے اسکی مدد کی جن کو تم نے

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٥ (توبه - ٦)

نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کیا، اور خدا ہی کی بات اونچی رہتی ہے اور خدا غالب اور تدبیر والا ہے،

خواب میں کفار کا کم دیکھنا ہجرت کے بعد سب سے بڑا معرکہ غزوۂ بدر کا پیش آیا جس میں ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان تھے، جو ہتھیاروں سے بھی پورے آراستہ نہ تھے، دوسری طرف ایک ہزار قریش کی لوہے میں غرق فوج تھی، دنیا قیاس کر سکتی ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ کس کے حق میں ہوتا لیکن چونکہ یہ اسلام کی ہمیشہ کے لیے موت و حیات کی ساعت تھی، اسلیے کارساز قدرت نے اپنی عجیب و غریب نشانیوں سے حق کو فتح اور باطل کو شکست دی، چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معرکہ کا نقشہ عالم رویا میں دکھایا گیا تھا، اور اس میں کفار کی تعداد بہت کم دکھائی گئی تھی، جو ان کی ذلت اور شکست کی طرف اشارہ تھا، مسلمانوں نے جب یہ خواب سنا تو انکی ہمت ہوئی، اگر عالم رویا میں کفار کی کثرت دکھائی جاتی، تو مسلمانوں کے حوصلے پہلے ہی سے پست ہوجاتے، چنانچہ خود قرآن نے اسکی تصریح کردی،

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (انفال - ٥)

خدا کے احسان کو یاد کرو جب وہ تجھکو تیرے خواب میں ان کافروں کو تھوڑا دکھا رہا تھا اگر تم کو زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور لڑائی کے بارہ میں آپس میں اختلاف کرنے لگتے لیکن خدا نے بچا لیا، بیشک خدا سینوں کے راز جانتا ہے،

مسلمانوں کا کافروں کی نظر میں اور کافروں کا مسلمانوں کی نظر میں کم کرکے دکھانا

اس معرکہ میں سن چکے کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی، ایسی حالت میں مسلمانوں کا بزدل ہونا لازمی تھا، خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ کا یہ تماشہ دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کردیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے معلوم ہونے لگے، اُدھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے، مقصود یہ تھا کہ رؤسائے کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ لے جانے پائیں، اس کی یہ تدبیر کی کہ مسلمان اپنی اصلی تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے، اس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر حصول نتیجہ کے لیے نہ تو سرفروشانہ کوشش کی، اور نہ بھاگنے کی کوئی ضرورت سمجھی، اور یہی بات مسلمانوں کے حق میں مفید ہوگئی،

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ	خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم دشمنوں
فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ	سے صف آرا ہوئے، تو وہ تمہاری نگاہوں
فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا	میں ان کو تھوڑا کرکے دکھاتا تھا، اور تم کو ان
كَانَ مَفْعُوْلًا	کی آنکھوں میں کم کرکے دکھا رہا تھا، تاکہ اس
(انفال۔ ۵)	کام کو جس کا ہونا مقرر ہے، طے کردے،

پھر کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کا دونا نظر آنا

پہلے تو خدا نے کافروں کی نگاہ میں مسلمانوں کو کم کرکے دکھایا تاکہ کفار بے پروا ہوکر لڑ پڑیں، پھر جب دونوں صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دونی نظر آنے لگی، اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش نے ڈر کر ہمت ہار دی،

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ	اے یہودیو! تمھارے لیے ان دونوں فوجوں
الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ	میں جو صف آرا ہوئیں، جن میں ایک خدا کی راہ
اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ	میں لڑ رہی تھی اور دوسری خدا کی منکر تھی یقینا
مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ وَاللّٰهُ	ایک نشانی تھی، کافروں کا لشکر آنکھوں دیکھے
يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اِنَّ	اپنی مقابل فوج کو اپنے سے دونا دیکھ رہا تھا
فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ	اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا
(آل عمران ۲)	ہے، اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے جو چشم بینا
	رکھتے ہیں، بڑی عبرت ہے،

فرشتوں کی آمد | یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیونکر گئی؟ کیا آسمان سے فرشتے اترآئے؟ خدا فرماتا ہے

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ	یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے
لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ	تو اس نے تمھاری سن لی کہ میں لگاتار ہزاروں
الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ وَمَا جَعَلَهُ	فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا، اور خدا
اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ	نے یہ نہیں کیا، لیکن خوش کرنے کے لیے اور
قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ	تاکہ تمھارے دل مطمئن ہوں، ورنہ فتح تو
عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ	اللہ ہی کی طرف سے ہے، اللہ غالب
(انفال ۔ ۱)	حکمت والا ہے،
اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ	یاد کرو جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی

اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم مسلمانوں
سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا	کے دل مضبوط کیے رہو، کافروں کے دلوں میں
الرُّعْبَ (انفال - ۲)	میں عنقریب رعب ڈال دوں گا.

میدان جنگ میں پانی برسانا بدر کے میدان میں جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں، وہ جگہ بلند تھی، اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی، وہ جگہ نشیب تھی، اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سامان یہ پیدا کر دیا کہ عین اُس وقت میدان جنگ میں موسلادھار پانی برسایا، جس نے اُدھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر ان کے پاؤں جما دیے، اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا ہوا کر ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا، خدا خود فرماتا ہے،

وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً	اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب وہ
لِیُطَهِّرَکُمْ بِهٖ وَیُذْهِبَ عَنْکُمْ	آسمان سے پانی برسا رہا تھا، تاکہ تم کو اس
رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ	پانی سے پاک کرے، اور ناپاکی تم سے دور
وَیُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ	کرے، اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے
(انفال - ۲)	اور اس سے قدموں کو جما دے،

لڑائیوں میں نیند کا طاری ہونا معرکۂ جنگ وہ مقام ہے، جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اڑ جاتی ہے، مگر مایۂ تسکینِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز یہ تھا کہ بدر و اُحد کے کارزار میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری اور بے خوفی کے لیے انکی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا،

تاکہ کسی خوف وخطر کا خیال کیے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں، چنانچہ خدا احسان جتاتا ہے،

وَاِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنْہُ (انفال - ۲)	یاد کرو جب خدا اپنی طرف سے تمہاری بچاؤ کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا،
ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَۃً مِّنْکُمْ وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ (آل عمران - ۱۶)	پھر خدا نے غم کے بعد بے خوفی کے لیے تم پر نیند اتاری، جو ایک گروہ پر چھا رہی تھی، اور دوسرا گروہ تھا جس کو اپنی جان کی فکر غم میں ڈالے تھی،

آپ کا کنکری پھینکنا یہ سب کچھ تھا، لیکن عین اس دار و گیر کے معرکہ میں، ایک مقدس وجود پر سکونِ دل اور سربسجود پیشانی کے ساتھ ظاہری ہتھیاروں سے منزہ ہو کر دعاؤں میں مصروف تھا، اس نے سر اٹھایا، اس حیرتناک منظر پر نگاہ ڈالی، اور زمین سے ایک مٹھی کنکری اور خاک اٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی، دفعۃً باطل کا طلسم چور چور تھا، قرآن گواہی دیتا ہے،

فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْہُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (انفال - ۲)	تو تم نے (مسلمانو) ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ خود خدا نے ان کو قتل کیا، اور اے پیغمبر! تو نے نہیں پھینکا جب تو نے پھینکا، بلکہ خدا نے پھینکا تاکہ مسلمانوں کو اس سے (فتح کی) اچھی نعمت عطا کرے، خدا دعاؤں کا سننے والا اور بھیدوں کا جاننے والا ہے،

کوئی رمی کے معنی تیر پھینکنے کے نہ لے کہ آپ نے اس موقع پر کیا تمام عمر میں سخت سے سخت خطرہ میں بھی کبھی تیغ و تبر اور تیر و خنجر سے دستِ مبارک کو آلودہ نہیں کیا،

غزوۂ بدر میں دو میں سے ایک کا وعدہ

پڑھ چکے ہیں کہ بدر کے معرکہ سے پہلے قریش کا ایک تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا، شام سے مکہ جا رہا تھا، اور اُدھر سے قریش کی فوج بڑے سر و سامان کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کو نکلی تھی، مدینہ سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اس صورت واقعہ سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک چیز تم کو ملے گی، یا تو یہ قافلہ، اور یا یہ قریش کی فوج شکست کھائیگی اور تم کو غنیمت کا مال ملے گا، چنانچہ یہ صورتِ واقعہ بھی درست نکلی اور وعدہ بھی پورا ہوا،

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ (انفال) — اور یاد کرو جب تم سے اللہ وعدہ کر رہا تھا کہ ان دو گروہوں میں ایک تمہارا ہے،

غزوۂ احزاب کی خبر

غزوۂ احزاب جس میں دفعۃً متحدہ عرب قبائل کا سیلاب مدینہ کے چاروں طرف امنڈ آیا تھا، واقعہ سے بہت پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم رویا میں اس کی اطلاع دیجا چکی تھی، اور آپ نے تمام مسلمانوں کو اس مصیبت کے آنے سے پیشتر با خبر کر دیا تھا، چنانچہ جب یہ صورتِ حال نظروں کے سامنے آگئی تو اس نشان کے ظاہر ہونے سے مسلمانوں کے ایمان میں اور زیادہ پختگی آگئی، اور ان کے دلوں میں آپ کی صداقت کا مزید یقین پیدا ہو گیا،

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ — اور جب مسلمانوں نے ان متحدہ حملہ آور قبائل

قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ	کو دیکھا تو کہا یہی وہ ہے جس کا وعدہ ہم سے
رَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ	خدا اور اس کے رسول نے کیا تھا، اور خدا
رَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ	اور اسکے رسول نے سچ کہا تھا، اور اس واقعہ
اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (احزاب ۳)	نے ان کو ایمان اور اقرار میں اور زیادہ پختہ کر دیا،

غزوۂ احزاب میں آندھی اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل نے ملکر مسلمانوں پر متحدہ حملہ کیا تھا، اور چاروں طرف سے مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا، اور ڈیرے خیمے ڈالکر اس بات پر جم گئے تھے کہ ہم اسی محاصرہ کی حالت میں مسلمانوں کو مدینہ میں گھیر کر ان کا خاتمہ کر دینگے، چنانچہ ۲۰ دن تک وہ محاصرہ کیے پڑے رہے، آس پاس کے یہودی جو پہلے مسلمانوں سے عہد کر چکے تھے، دشمنوں سے جا کر مل گئے، اور اس قدر زور کا حملہ کیا کہ مسلمان فریضۂ نماز بھی وقت پر ادا نہیں کر سکتے تھے، مدینہ میں فاقہ ہونے لگا، منافقین اور کچے دل کے لوگ گھبرا کر ساتھ چھوڑنے لگے کہ عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے باہر اس زور کی آندھی چلائی کہ دشمنوں کے خیمے اکھڑ گئے طنابیں ٹوٹ گئیں، ہانڈیاں الٹ گئیں، اور ایسی سخت سردی پڑی کہ دشمن ٹھٹھر رہ گئے، اور ہمت ہار کر خود محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے، خدا نے مسلمانوں کو اپنا یہ احسان جتایا،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ	مسلمانو! اپنے اوپر خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا	فوجوں نے تم پر حملہ کیا تو ہم نے ان پر ہوا اور ایسی
عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ	فوجیں بھیجیں جن کو تم نے نہیں دیکھا، اور جو تم
اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (احزاب ۲)	کر رہے تھے، خدا اس کو دیکھ رہا تھا،

غزوۂ حنین میں نصرت فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین پیش آیا، گو اس میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی بھیڑ شامل تھی، لیکن اس میں کچھ نوجوان تھے، جو لڑائی کا تجربہ نہیں رکھتے تھے، کچھ مکہ کے نومسلم تھے جو ابھی صبر و ضبط کے خوگر نہیں ہوئے تھے، فوج میں زرہ پوش بھی کم تھے، اور مقابلہ قبیلۂ ہوازن سے پڑا، جو قدر اندازی میں کمال رکھتے تھے، مسلمان جونہی آگے بڑھے، حریف نے ان کو تیروں پر رکھ لیا، پہلے ہی حملہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، لیکن مرکز نبوت اپنی جگہ پر تھا، آپ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا، انھوں نے مہاجرین و انصار کو آوازیں دیں، وہ پلٹے تو آپ سواری سے نیچے اترے، اور زمین سے ایک مشت خاک اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینکی، دفعتہً جنگ کا نقشہ بدل گیا، ہوازن شکست کھا کر بھاگ نکلے، یہ واقعہ صحیح مسلم اور دیگر معتبر روایتوں میں مذکور ہے، اور قرآن کی اس صداقت کی گواہی دیتا ہے،

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ	خدا نے تمھاری نصرت بہت سے مقامات میں کی اور
وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ	نیز حنین کے دن جب تمھاری کثرت تعداد نے
فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ	تم کو مغرور بنا دیا تھا، تو یہ کثرت تمھارے کچھ کام
عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ	نہ آئی، اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی
وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ	پھر پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے، پھر اللہ نے اپنی تسکین اپنے
سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ	رسول پر اور مومنوں پر نازل کی، اور وہ فوجیں
وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ	اتاریں جن کو تم نے نہیں دیکھا، اور کفر کرنے
الَّذِينَ كَفَرُوا (توبہ ۴)	والوں کو پوری سزا دی،

نظر نہ آنے والی فوجوں" کے الفاظ سے قرآن مجید نے ہمیشہ فوق الفہم اور غیر مادی ذرائع و وسائل کی تعبیر کی ہے،

غیب پر اطلاع غیب پر ذاتی علم تو خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، مگر وہ جس کو چاہے اپنی اس بخشش سے سرفراز بھی کر سکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کے سامنے کبھی دور دراز مقامات کی خبریں، کبھی لوگوں کے دلوں کے حالات، کبھی مخفی واقعات آئینہ کر دیے جاتے تھے، مسلمان تو مسلمان، وہ بھی جو سچے دل سے آپ کی صداقت کے قائل نہ تھے، اس سے ڈرتے تھے کہ وحی الٰہی جس کے متعلق انھیں تجربہ ہو چکا تھا کہ وہ واقعات غیبی کے پردہ در ہے کہیں ان کے مخفی جرائم اور دل کے کھوٹوں کو برملا ظاہر نہ کر دے۔

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ	منافقین اس سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں پر
عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي	کوئی ایسی سورہ اترے جو ان کو ان باتوں سے
قُلُوبِهِمْ (توبہ ۸)	آگاہ کر دے جو منافقوں کے دلوں میں ہیں

بنو نضیر کی سازش کی اطلاع ایک دفعہ ایک ضروری کام کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چند رفقائے خاص کے ساتھ بنو نضیر کے قلعہ میں تشریف لے گئے، یہود بنی نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اکابر اسلام کے خفیہ قتل کا اس کو بہترین موقع سمجھا، چنانچہ جب دیوار کے نیچے آپ کھڑے تھے، اس کی چھت پر ایک شخص چڑھ گیا کہ اوپر سے ایک بھاری پتھر آپ پر گرا دے کہ دب کر مر جائیں، اللہ تعالیٰ نے جو اپنے پیغمبر کی حفاظت کا کفیل تھا، اس نے بروقت اطلاع دی، اور آپ فوراً ان کے دام سے باہر نکل آئے، اور ان کو ان کے اس ارادۂ فاسد کی اطلاع بھیج دی،

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ	اے مسلمانو! خدا کے اس احسان کو جو اس نے
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ	تم پر کیا یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے تم پر دست
يَّبْسُطُوْا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ	درازی کا قصد کیا تو خدا نے تم سے انکے ہاتھوں
اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى	کو روک دیا، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور مسلمانوں
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (مائدہ ۲)	کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں،

مہاجرین حبش کو بشارت قریش کے گوناگوں مظالم سے تنگ آکر مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اپنے ملک وطن کو خیرباد کہکر حبش چلی گئی، اول تو غیر ملک اور بدیس میں ان مسلمانوں کا جانا ہی فکر وتردد کا باعث تھا، اور معلوم نہ تھا کہ حبش کے عیسائی بادشاہ اور امراء نئے مذہب کے ان پیرووں کے ساتھ کیونکر پیش آئیں گے، اس سے زیادہ فکر کی چیز یہ تھی کہ رؤسائے قریش کے تجارتی تعلقات کے باعث حبش کے امراء ان سے شناسا تھے، اور باہم ان کے درمیان دیرینہ روابط تھے، اس کے بعد اس سے بھی زیادہ تردد انگیز یہ واقعہ ہوا کہ رؤسائے قریش نے اپنے گذشتہ تعلقات کی بناپر نجاشی کے دربار میں تحفہ تحائف دیکر اپنے سفراء اس غرض سے بھیجے تاکہ ان بے وطن مسلمانوں کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت نہ دے، یہ تمام اسباب ایسے تھے جن کی بناپر مسلمانوں کو عموماً اور مہاجرین کو خصوصاً اپنے مستقبل کی نسبت سخت تشویش کا پیدا ہونا ضرور تھا، اس بناپر سکینتِ الٰہی نے ان کو امن وامان کا پیام سنانا ضروری سمجھا، چنانچہ اسی تشویشناک اور تردد انگیز عہد میں یہ آیت نازل ہوئی،

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ	اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر مظلومی کی
بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ	حالت میں ہجرت کی، ہم ان کو بالیقین دنیا
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ	میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور آخرت کا ثواب
الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل - ۶)	سب سے بڑا ہے،

اگرچہ ہجرت کا لفظ عام ہے، مگر اس دلیل سے کہ یہ سورہ قیام مکہ کے زمانہ کی ہے، اور جن لوگوں نے اس عہد میں ہجرت کی تھی، ان کا ذکر ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص مہاجرین حبش کے لیے بشارت ہے، سب کو معلوم ہے کہ خدا کا یہ وعدہ کتنا سچا ہوا، نجاشی نے نہ صرف یہ کہ قریش کے سفرا، کو خلافِ توقع ناکام واپس کر دیا، بلکہ مسلمانوں کو اس نے بڑی عزت سے جگہ دی، اور خود اسلام کی طرف میلان ظاہر کیا، بعض مسلمان چودہ چودہ برس وہاں رہے، اور اس اثنا میں کئی نجاشی سریر آرا ہوئے، مگر کسی نے ان سے تعرض نہیں کیا،

ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بے سروسامانی کیساتھ ہجرت فرمائی تھی، اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اس حالت کو دیکھکر کسی شخص کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ بے خانماں قافلہ ایک دن مدینہ سے اسقدر طاقتور ہو کر نکلے گا کہ جن لوگوں نے ابتداے نبوت سے آغاز ہجرت تک اسکی جان لینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، وہ اس کے ہاتھوں خود ہلاک و برباد ہو جائینگے، لیکن قرآن مجید دوسری پیشگوئی کر رہا تھا، چنانچہ ہجرت سے ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں یہ آیت اتری،

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	اگر وہ تم کو سرزمین مکہ سے گھبرا چکے تا کہ تم کو

الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل)

اس سے نکال دیں تو وہ تمہارے بعد بہت کم مدت باقی رہیں گے۔

چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی، اور ایک ہی سال کے بعد غزوۂ بدر نے صنادید قریش کا خاتمہ کر دیا، اور اہل عرب کی مخالفت کی جڑ کٹ گئی،

مدینہ میں بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہوگا

عجب نہیں کہ مدینہ آکر مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو گیا ہو کہ ان کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ ہو گیا، اور اس وقت کوئی ایسا قرینہ بھی نہ تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ قریش انتقام کے جوش میں نیام سے تلواریں کھینچ لیں گے، اور تمام عرب اس مہم میں ان کا ہم آہنگ ہو جائیگا، اور متصل آٹھ برس تک لڑائیوں کا سلسلہ قائم رہیگا جس میں مسلمانوں کو تنگدستی، فاقہ، قتل و خونریزی ہر نوع کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا، مگر عالم غیب کا پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی پہنچ چکا تھا،

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ (بقرہ۔۱۹)

اور ہم یقیناً تم کو کسی قدر خوف، فاقہ، اور جانوں کی اور مال اور پھلوں کی کمی کی مصیبتوں سے آزمائیں گے۔

دینی اور دنیاوی شہنشاہی کا وعدہ

لیکن اس بے سروسامانی کے عالم میں اس بے خانماں گروہ کیساتھ خداوند تعالیٰ نے ایک وعدہ اور بھی کیا، اور ان کو خلافتِ ارض یعنی دینی و دنیاوی شہنشاہی کی بشارت دی، یہ بشارت واقعات موجودہ کے کسقدر خلاف تھی مگر چند ہی سال میں محال نے وقوع کی صورت اختیار کر لی،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	کیا خدا نے اُن سے وعدہ کیا ہے کہ اُن کو زمین
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	کا خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اُس نے تم سے پہلے
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	کے لوگون کو خلیفہ بنایا، اور جو دین اُن کیلئے
الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ	پسند کیا ہے، اُس کو مستحکم کر دیگا، اور انکے
بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا، (سورۂ نور)	خوف کو امن سے بدل دے گا،

مسلمانون کی حالت کے لحاظ سے یہ بشارت کس قدر عجیب و غریب تھی، مسلمانون کا گروہ ایک مظلوم بیکس اور ضعیف گروہ تھا جس کو کفار نے طرح طرح کی اذیتین دیکر خانمان برباد کر دیا تھا، اور اس نے مدینہ مین آکر خدا کے چند نیک بندون کے سایے میں پناہ لی تھی، یہان آکر بھی اُس کو اطمینان و راحت کی نیند نصیب نہ ہوئی، کفار مکہ پہلے ہی سے جان کے دشمن تھے، یہان آکر دشمنون کی تعداد میں منافقین اور یہود کا اور بھی اضافہ ہوگیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہؓ کو ہمیشہ کفار کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا، اور ذرا سے شور و غل پر مدینہ میں بدحواسی پھیل جاتی تھی، یہان تک کہ صحابہ ہمیشہ سوتے جاگتے مسلح رہتے تھے، چنانچہ اس مظلوم گروہ نے اس حالت سے تنگ آکر ایک دن کہا کہ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا، جب ہم کو اطمینان حاصل ہوگا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہ ہوگا، اس پر اُن کو قرآن مجید نے خلافت ارض کی بشارت دی[1] اور وہ پوری ہوئی، اور اس گروہ نے دنیا پر اس طرح کامیاب حکومت کی کہ اُس کے سامنے

---

[1] مستدرک جلد ۲ صفحہ ۴۱۰۔

تمام متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر گیا، اس سے بڑھکر اس پیشینگوئی کی صداقت کیا ہو سکتی ہے،

قبائل عرب کی شکست ہوگی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو غزوات پیش آئے، اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا، کفار کو جو شکستیں ہوئیں، قرآن مجید نے ان کے متعلق پیشین گوئیاں کیں اور اس حالت میں کیں، جب ظاہری اسباب کے لحاظ سے کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ جب ہر طرف سے کفار کا ہجوم تھا، اور اس ہجوم کو دیکھکر ان کو یقین تھا کہ تمام عرب مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کر دے گا، خدا نے یہ اعلانِ عام دیا کہ عنقریب خود مسلمان تمام عرب قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے۔

أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُنْتَصِرٌ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (قمر-۳)

کیا وہ کفار کہتے ہیں کہ ہم سب ایک دوسرے کے مددگار ہیں، یہ جتھا عنقریب توڑ دیا جائیگا، اور وہ پشت پھیریں گے،

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (فتح-۳)

اور اگر کفار تم سے لڑیں گے تو ان کو بھاگنا پڑے گا، پھر وہ کوئی حامی اور مددگار نہ پائیں گے،

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ (توبہ-۲)

تم اُن سے لڑو، خدا ان کو تمہارے ہاتھ سے عذاب دیگا اور اُنکو رسوا کریگا اور تمکو اُن پر فتح دیگا اور مسلمانوں کے دل ٹھنڈے کریگا اور اُنکے دلوں کا غصہ دور کریگا،

اور یہ تمام پیشگوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں پوری ہوئیں، اسلام نے عرب کے تمام قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیا اور انھوں نے ہر موقع پر شکستیں کھائیں،

قریش کی شکست اور بربادی کے وعدے

مصیبت زدہ اور بے سروسامان مسلمانوں کی تسکین کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قریش کی تباہی و بربادی اور مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے متعدد وعدے کیے گئے تھے جن میں سے بعض آپ کی زندگی میں اور بعض آپ کی وفات کے بعد پورے ہونے والے تھے،

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ (زخرف - ۴)	پس اگر ہم تجھ کو اٹھا لیں تو بھی ان کافروں سے انتقام لیں گے، اور اگر ہم تیری زندگی میں تجھکو وہ دکھا دیں جس کی دھمکی ان کافروں کو ہم نے دی ہے تو ہم ان پر یہ قدرت رکھتے ہیں،
فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ (مومن - ۸)	تو صبر کر خدا کا وعدہ یقیناً سچا ہے تو جس بات کی دھمکی ہم ان کافروں کو دیتے ہیں اس کو یا تیری زندگی میں دکھا دینگے یا تجھکو موت دینگے، تو وہ ہمارے پاس ہی لوٹ کے جائیں گے،
وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ	اور اگر تیری ہی زندگی میں بعض وہ وعدے جو ہم نے ان سے کیے ہیں دکھا دیں یا تجھکو موت دیدیں تو تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے اور

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ، (رعد - ۶)	ہمارا کام حساب لینا ہو گیا یہ کافر نہیں دیکھتے کہ (ہم اسلامی فتوحات کے ذریعہ سے) سرزمین (عرب) کے حدود میں (کافروں کے قبضہ کو) کم کرتے جاتے ہیں خدا ہی اپنا حکم چلاتا ہے کوئی اس کے

فتح کی پیشینگوئیاں

جو چیز مسلمانوں کے دل سے لگی ہوئی تھی، وہ فتح مکہ تھی، یعنی اس شہر پر قبضہ، جہاں سے وہ نہایت بے بسی اور بے کسی کے عالم میں نکلے تھے، اور جس کے حدود میں اُن کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی، وہ گو اب مدینہ کے دارالسلطنت میں تھے تاہم وطن کی یاد دِل سے کم نہیں ہوتی تھی، اُن کو فتح پر فتح ہوتی جاتی تھی لیکن اُن کے دل کی کلی اپنی شگفتگی کے لیے جس موسمِ بہار کا انتظار کر رہی تھی، وہ ہنوز نگاہوں سے دور تھا، مگر بشارتِ الٰہی ہر قدم پر اُن کیلئے تسکین کا نیا پیام لا رہی تھی، اور مژدہ فتح سے اُن کو دل شاد کرتی جاتی تھی، سورہ قصص میں یہ آیت اُتری،

اِنَّ الَّذِىْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ، (قصص - ۹)	جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے تجھ کو ٹھکانے کی طرف پھر لوٹا کر لیجانے والا ہے،

یعنی مکہ[1] پھر سورہ صف میں خدا نے مسلمانوں کو آخرت میں جنت کی بشارت دینے کے ساتھ اس دنیا میں بھی ایک بشارت دی،

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ	اور دوسری نعمت جس کو تم دل سے چاہتے ہو،

[1] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور،

وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	خدا کی طرف سے نصرت اور عنقریب فتح ہے
(صف - ۲)	اور مسلمانون کو بشارت سُنا دے،

صلح حدیبیہ سے پہلے خواب مین آپ کو خانۂ کعبہ کا داخلہ دکھایا گیا،

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا	خدا نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دیا،
بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ	تم لوگ یقیناً مسجد حرام مین اگر خدا نے چاہا،
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ	تو بے خوف وخطر داخل ہوگے، بال مُنڈوا کر،
وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ، (فتح - ۴)	یا ترشوا کر کسی سے نہ ڈرو گے،

حدیبیہ سے آپ واپس آرہے تھے کہ سورۂ فتح نازل ہوئی،

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (فتح - ۱)	ہم نے کھلی فتح تم کو دی،

آپ نے اُسی وقت حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ خوشخبری سُنائی، اُس کے دو برس کے بعد مکہ کی دولت مسلمانون کو مل گئی،

خیبر اور حنین کی فتح کی پیشینگوئی ۶ھ ہجری کی صلح حدیبیہ مین فتح مکہ کی پیشینگوئی کی جا چکی تھی جو ۸ھ مین پوری ہوئی لیکن حدیبیہ کی صلح مین مسلمانون نے رسولؐ کی اطاعت اور متابعت کا جو بہترین نمونہ پیش کیا تھا، اور جس صبر اور تحمل سے صلح حدیبیہ کے شرائط کو مسلمانون نے تسلیم کر لیا تھا، اس کے معاوضہ مین اللہ تعالیٰ نے دوسری فتوحات عظیمہ کا وعدہ مسلمانون سے کیا جن مین بے شمار مال غنیمت اُن کو ہاتھ آنے والا تھا،

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ	تو خدا نے وہ جانا جو تم نے نہیں جانا اس

دُوْنَ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا هُوَ الَّذِيْٓ	(فتح مکہ) سے پہلے ایک عنقریب فتح تمہارے
اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ	لیے بنائی، اور اسی نے اپنے پیغمبر کو ہدایت
الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ	اور دین حق دیکر بھیجا، تاکہ اس کو تمام دینوں
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (فتح-۴)	پر غالب کرے، اور خدا گواہ کافی ہے

یہ خیبر کی فتح تھی، جو صلح حدیبیہ کے ایک سال کے بعد، اور فتح مکہ سے ایک سال پہلے حاصل ہوئی، اور جس پر عرب میں یہودیوں کی قوت کا خاتمہ ہو گیا، اور اسلام کو عرب کے تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہو گیا،

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	خدا مسلمانوں سے خوش ہو گیا، جب وہ
اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے، تو ان کے
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ	دلوں میں جو تھا (یعنی فتح کے لیے بیچینی)
السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ	اسکو جان لیا، تو اس نے ان پر تسکین نازل
فَتْحًا قَرِيْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً	کی، اور مکہ کے بدلہ میں سردست ایک فتح
يَّاْخُذُوْنَهَا (فتح-۳)	ان کو دی اور بہت سا مال غنیمت جس پر (وہ قبضہ کرینگے)
وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً	خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے
تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ	جس کو تم لوگے، تو یہ ایک غنیمت تم کو جلد عطا
وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ	کر دی اور لوگوں کی دست درازی کو تم سے
وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (فتح-۳)	روک دیا، تاکہ مسلمانوں کے لیے ایک نشانی ہو،

چنانچہ خیبر کی فتح میں مسلمانوں کو خیبر کی تمام سرسبز و شاداب زمینیں اور ہرے بھرے نخلستان مل گئے، اور اس کے ایک سال بعد حنین کی فتح میں مالِ غنیمت کا بیشمار ذخیرہ (چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی) مسلمانوں کے ہاتھ آیا،

یہود کو اعلان | عرب کے یہود اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں جان و مال سے دریغ نہیں کرتے تھے، تاہم یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق بعض پیشنگوئیاں ایسی کیں کہ اگر وہ ہمت سے کام لیتے تو اس کا ابطال خود اُن کے امکان میں تھا، مثلاً یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ "وہ خدا کے چہیتے ہیں، اور جنت ان کے لیے مخصوص ہے" لیکن چونکہ جنت صرف مرنے کے بعد نصیب ہو سکتی ہے، اور جن لوگوں کو اس کے ملنے کا یقین کامل ہو، وہ اس کے لیے جان دینے سے دریغ نہیں کر سکتے؛ اس لیے قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق کہا،

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ	کہہ اگر آخرت کا گھر صرف تمھارے لیے
عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ	مخصوص ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	آرزو کرو، لیکن وہ لوگ اپنے گناہوں کی
وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ	وجہ سے ہرگز یہ آرزو نہ کریں گے۔ خدا
اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (بقرہ ۱۱)	ظالموں کو خوب جانتا ہے،
قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ	کہہ اے یہود! اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ
زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ	صرف تمھیں خدا کے دوست ہو تو اگر تم

اِلنَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ	اس میں سچے ہو تو موت کی آرزو کرو ؛
صٰدِقِيْنَ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا	لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہرگز اس
قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ	کی آرزو نہ کرینگے، خدا ظالموں کو خوب
بِالظّٰلِمِيْنَ، (جمعہ-۱)	جانتا ہے،

لیکن باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے ہرممکن کوشش کرتے تھے اور آرزوے موت اُن کے لئے ممکن تھی، تاہم قرآن مجید کی پیشینگوئی پوری ہوئی، اور آج تک کسی یہودی نے لقاے الٰہی کی آرزو میں جان نہیں دی،

یہود کی دائمی ناکامی،

یہود سے دمبدم مقابلہ درپیش تھا، اور پورے سات برس تک یہ مقابلہ درپیش رہا، یہود عرب میں بڑی طاقت رکھتے تھے، تمام مالی کاروبار اُن کے قبضہ میں تھا، اُن کے پاس کثرت دولت تھی، عربوں سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں علانیہ فائق تھے، ہرطرح کے سامانِ جنگ رکھتے تھے، اور فنِ جنگ سے بھی کماحقہٗ واقف تھے، مدینہ سے لیکر حدودِ شام تک اُن کے تجارتی قلعوں کی مسلسل قطاریں تھیں، اور ادھر مسلمانوں کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہ تھی، بااینہمہ قرآن مجید نے اپنے پیغمبر کی زبانی یہ اعلان عام کر دیا،

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ	اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو اُن کیلئے
خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ	یہ بہتر ہوتا، ان میں بعض ایماندار اور اکثر
اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ	فاسق ہیں، وہ تم کو سوا تھوڑی سی تکلیف دینے کے
اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ	کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اگر وہ

یہودیون کی ذلت و ادبار

اَلْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝ ضُرِبَتْ	تم سے لڑین تو پشت پھیر دین، پھر اُن کی
عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْا اِلَّا	مدد نہ کی جائے گی، اُن پر ذلت جہان کہین
بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ	وہ ہون پھینک ماری گئی ہے لیکن خدا کے کسی
وَبَآؤُ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَضُرِبَتْ	وسیلہ سے یا لوگون کی سفارش سے کبھی کبھی اِس ذلت
عَلَیْھِمُ الْمَسْکَنَۃُ (آل عمران - ۱۲)	سے بچ جائین، خدا کا غضب لے کر وہ ٹین گئے،

اُس وقت سے آج تک اُن کی ایشیا، افریقہ، اور یورپ ہر جگہ کی تاریخ اس صداقت سے معمور پیشینگوئی کی صرف حرف حرف تصدیق ہے،

روم کی قوت ٹوٹ جائیگی

سنہ کے بعد مسلمانون کا مقابلہ عرب کے مشرکین اور یہود سے زیادہ سخت اور طاقت ور دشمن رومی عیسائیوں سے آپڑا، رومن امپائر کی وسعت، قوت، سامان، نظام، فوج، خزانہ کو پیش نظر رکھ کر مسلمانون کی حالت پر غور کرو، تو معلوم ہوگا کہ ایک پر کاہ کا کوہ سے مقابلہ ہے تاہم اسلام کے پیغمبر کی زبان سے اُسی وقت یقین و تسلی کے کلمات دنیا نے سُن لئے،

ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ	وہی خدا ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت
بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ	اور سچا دین دیکر بھیجا ہے تا کہ اس دین کو
عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ، (صف ۱)	تمام دینوں پر غلبہ عطا کرے،

دنیا کو اس پیشینگوئی کی تصدیق کے لئے صرف چند سال کا انتظار کرنا پڑا،

خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں

لیکن قرآن مجید کی پیشینگوئیان صرف انہی غزوات کے

ساتھ مخصوص نہ تھیں جو عہد نبوت میں پیش آئے، بلکہ اس کے بعد بھی خلفاء کے زمانہ میں جو عظیم الشان لڑائیاں واقع ہوئیں، ان کے متعلق قرآن مجید نے پہلے سے پیشینگوئی کردی تھی، اور وہ آیندہ زمانہ میں پوری ہوئیں، مسلمانوں کو ایرانیوں اور رومیوں سے جو جنگ کرنا پڑی، وہ تاریخ اسلام کا ایک نمایاں واقعہ ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے نتائج کا پہلے ہی سے اعلان کردیا تھا،

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ	جہاد میں جان چرانے والے بدوؤں سے
سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ	کہدو کہ تم کو ایک سخت طاقتور قوم سے
شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ	جنگ کرنے کے لیے بلایا جائیگا، تم لوگ
(فتح - ۲)	ان سے لڑوگے، یا وہ مسلمان ہوں گے،

چنانچہ یہ جنگ ہوئی، اور وہی نتیجہ ہوا جس کو قرآن مجید نے دو صورتوں یعنی قتل اور اسلام میں محدود کردیا تھا،

وفاتِ نبوی کی پیشینگوئی مکہ کی فتح کے بعد آپ کی زندگی کا مقصد پورا ہوگیا، اور اس عام اصول کی بنا پر کہ انبیاؑ اپنی زندگی کا مقصد پورا کرنے کے بعد نہیں رہتے، وہ وقت آیا کہ آپ اپنے اصلی مرکز یعنی ملاء اعلیٰ سے جاملیں، اس لیے خداوند تعالیٰ نے اس راز کو ایک مستقل پیشینگوئی کی صورت میں ظاہر کردیا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَ	جب خدا کی مدد اور فتح آگئی اور تم نے دیکھ
رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ	لیا کہ لوگ خدا کے دین میں جھنڈ کے جھنڈ
دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ	داخل ہو رہے ہیں، تو خدا کی تسبیح اور استغفار کر

رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (النصر) وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اس سورہ میں آپ کے وصال کی پیشین گوئی اگرچہ نہایت مبہم الفاظ میں کی گئی ہے، لیکن اشارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مژدۂ فتح نہیں، بلکہ مژدۂ وصال ہے، کیونکہ مژدۂ فتح کے ساتھ تسبیح و استغفار کو کوئی مناسبت نہیں، بلکہ اس کے لیے شکر موزوں ہے، تسبیح و استغفار کا اصلی وقت وہ ہے جب انسان دنیا سے رخصت ہوتا ہے، چنانچہ صحابہ میں جو لوگ نکتہ دان شریعت تھے، وہ اس راز کو سمجھ گئے تھے۔[1]

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مذکور۔

آیات و دلائلِ نبویہ

بروایاتِ صحیحہ

گذشتہ صفحات میں صرف وہی آیات و دلائل بیان کئے گئے ہیں، جو صراحتہً قرآن مجید میں مذکور ہیں، یاکم ازکم اُن کے اشارات قرآن مجید مین پائے جاتے ہیں لیکن ذیل میں ان آیات و دلائل کا استقصا مقصود ہے، جو صحیح اور مستند روایتون سے حدیث کی کتابون میں مذکور ہین، اس قسم کے آیات و دلائل کا بڑا حصہ گو فرداً فرداً خبر احاد سے ثابت ہے، مگر مجموعی حیثیت سے اُن کا درجہ خبر مشہور تک پہنچ جاتا ہے، مثلاً تھوڑی سی مقدار کا بڑھ کر زیادہ ہوجانا، ہاتھ سے پانی کے چشمہ کا اُبل پڑنا، امراض سے غیر معمولی طور پر شفایابی حاصل کرنا، دعاؤن کا غیر معمولی طریق سے قبول ہوجانا، ان میں سے ہر قسم کے معجزات کے جزئی جزئی واقعے گو صرف ایک ایک دو دو راویون کی زبانی بیان ہوئے ہین، مگر ان میں سے ہر قسم کے معجزہ کے متعلق تو بر تو شہادتین موجود ہیں، جن کی بنا پر اُن میں سے ہر قسم کے معجزات خبرِ متواتر نہین، تو خبرِ مشہور تک ضرور پہنچ جاتے ہین،

البتہ بعثت سے پہلے جو عجائبات آپ سے صادر ہوئے یا جو غیر معمولی سوانح آپ کو پیش آئے، اُن کی صحت محدثانہ اصول سے بہت کم ثابت ہے لیکن اس کی وجہ اس عہد میں اس قسم کے واقعات کا کم ہونا یا غلط ہونا نہین ہے، بلکہ اس عہد کے واقعات کے راوی چونکہ عموماً

ماں باپ اور خاندان کے بڑے بزرگ ہوا کرتے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بعثت کے بعد، بلکہ مدینہ کی پُرامن زندگی شروع ہونے کے بعد جب اسلام کے سلسلۂ روایات کا صحیح طریقہ سے آغاز ہوا، تو آپ کے خاندان کے بزرگوں میں سے جنہوں نے آپ کے بچپن اور نوجوانی کا عہد دیکھا تھا، کوئی موجود نہ تھا، والدین پہلے ہی وفات پا چکے تھے، دادا کا بھی انتقال ہو چکا تھا، چچاؤں میں ابولہب آپ کا دشمن ہی تھا، ابوطالب آغاز اسلام ہی میں مر چکے تھے، حضرت حمزہؓ جو ہمسن تھے اور ۳ھ ہی میں شہادت پا چکے تھے، حضرت عباسؓ صرف برس دو برس بڑے تھے، اس بنا پر محدثانہ اصولِ تنقید کے معیار پر اس زمانہ کے واقعات کا سلسلۂ روایت بہت کم صحیح اترتا ہے، اور اس لئے وہ غیر مستند ٹھہرتے ہیں،

بہرحال تمام صحیح معجزات کے استقصاء سے کچھ واقعات بعثت سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں، کچھ مکہ کی زندگی کے، اور زیادہ تر مدینہ کے عہد کے، جب اسلامی روایتوں کا سلسلہ راویوں کی کثرت کے باعث مستحکم ہو چکا تھا، ملتے ہیں، بعثت کے بعد جو معجزات ظاہر ہوئے ہیں وہ نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں، مثلاً بعض واقعات اجسام کائنات میں تصرف اور تاثیر کے ہیں بعض تکثیر اشیاء کے ہیں بعض استجابتِ دعا، اور شفاءِ امراض وغیرہ کے ہیں، اس لئے ذیل میں ہر نوع کے معجزات کو ہم علٰحدہ علٰحدہ لکھتے ہیں،

علاماتِ نبوت
قبل بعثت

ہر شخص اس کو تسلیم کرے گا کہ ممتاز افراد کے سوانحِ زندگی میں شروع ہی سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جو اُن کے روشن مستقبل کی پیشینگوئی کرتے ہیں، جب یہ ان عام ممتاز افرادِ انسانی کا یہ حال ہے، جو خاندانوں، قوموں اور ملکوں کے صرف ظاہری رہنما اور رہبر ہوتے ہیں، تو اس حیثیت سے اُن برتر ہستیوں کی نسبت کیا شبہ ہو سکتا ہے جو قوموں کے روحانی پیشوا اور انسانیت کے حقیقی رہبر اور رہنما ہوتے ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی سوانحِ زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں، کتب سیر و دلائل کے مصنفین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لیکر بعثت تک کے ان تمام واقعات کو بڑی شرح وبسط سے بیان کیا ہے، مگر جیسا کہ پہلے گذر چکا، محدثانہ اصول کی سخت گیری نے ہمارے لیے ان کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے، صحیح روایتوں سے اس عہد کے جو واقعات علاماتِ نبوت کے تحت میں آسکتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

حضرت آمنہ کا خواب | متعدد صحابیوں سے روایت ہے کہ صحابہ نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اپنا حال بیان فرمائیے، فرمایا، میں اپنے باپ ابراہیمؑ

کی دعا، اور عیسیٰ کی بشارت، اور اپنی ماں کا خواب ہوں میری ماں نے جب میں پیٹ میں تھا، خواب دیکھا کہ ان کے بدن سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل روشن ہوگئے، یہ خالد ابن معدان تابعی کی روایت ہے[1] جو گو ابن سعد میں مرسل ہے، مگر مستدرک میں ہے کہ انھوں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، حضرت عرباض بن ساریہ صحابی کی روایت میں کچھ الفاظ زیادہ ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا کہ میں خدا کا بندہ اور خاتم انبیاء اس وقت سے ہوں کہ میرا باپ (آدم) آب و گل میں تھا، میں اس کی تفصیل بتاتا ہوں، میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا، عیسیٰ کی بشارت اور اپنی ماں آمنہ کا خواب ہوں، اور اسی طرح پیغمبر کی مائیں خواب دیکھا کرتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے آپ کی ولادت کے وقت خواب دیکھا کہ ایک نور ہے جس سے شام کے محل روشن ہوگئے[2]۔ پھر یہ آیت پڑھی[3]

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا وَّدَاعِيًا إِلَى	سنانے والا، اور ڈرانے والا، اور خدا کے
اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا	حکم سے خدا کی طرف پکارنے والا اور
(احزاب - ۶)	روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

ولادت نبوی کی پیشینگوئیاں یہود و نصاریٰ میں | احادیث، سیر اور دلائل کی کتابوں میں تو بر تو ایسی

[1] ابن سعد جلد اول ص ۹۶ مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۶۰۰ [2] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۱۲۷، بیہقی، مستدرک (علی شرط الصحیح) جلد ۲ ص ۶۰۰ و ابن سعد جلد ۱ ص ۹۶ [3] مستدرک حاکم (صحیح) جلد ۲ صفحہ ۴۱۸

روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے، کہ ظہور نبویؐ کے عہد میں یہود و نصاریٰ خاص طور سے آنے والے پیغمبر کے منتظر تھے، اور اُس کے جلد ظہور اور بعثت کی مختلف پیشینگوئیاں کر رہے تھے، ان روایتوں مین سے گو ہر روایت بجائے خود ضعیف ہے، مگر ان کی مجموعی حیثیت سے یہ قدر مشترک ضرور نکلتا ہے کہ یہ عہد ان لوگون کے نزدیک آنے والے پیغمبر کے خاص انتظار کا تھا اور مدینہ کے لوگون مین اور مکہ کے جویانِ حق اشخاص مین اس پیغمبر کے ظہور کا خاص ذکر اور چرچا تھا،

تبخانون سے غیبی آوازین | اسی طرح ان کتابون میں بکثرت روایتیں ایسی ہیں جن مین بیان ہے کہ آپ کی پیدایش کے بعد لوگون نے تبخانون کے اندر غیبی آوازین سنیں، کہ "اب صنم خانون کی بربادی کا زمانہ آگیا، پیغمبر صادقؐ کی ولادت ظہور مین آچکی ہے" ان روایتون کا اکثر حصہ سخت کمزور اور ناقابلِ اعتبار ہے، تاہم مجموعی شہادت سے اس قدر اخذ کیا جا سکتا ہے، کہ اس عہد میں اس قسم کا کوئی واقعہ ضرور ہوا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کے حوالہ سے اس قسم کی ایک روایت آگے آتی ہے،

مسند ابو یعلی و ابو نعیم و ابن عساکر و احمد عن عتبہ ابن عبد ان

شق صدر | تمام ارباب سیر اور بعض محدثین کی روایت کی بنا پر بچپن کے زمانہ مین جب آپ حضرت حلیمہؓ کے ہان پرورش پا رہے تھے، شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا، ایک روایت مین ہے، کہ بعض صحابہ نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو سب سے پہلا غیبی واقعہ کیا پیش آیا؟ اس کے جواب میں آپ نے دو فرشتون کی آمد اور شقِ صدر کا واقعہ بیان کیا،[1]

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ باب معجزات ابن سعد جلد ۱ ص ۹۰ مسند دارمی باب کیف کان اول شان النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اس واقعہ کی سب سے مستند روایت وہ ہے جو حماد بن سلمۃ اور ثابت البُنانی کے واسطہ سے صحیح مسلم،
مسند احمد اور ابن سعدؐ وغیرہ میں ہے کہ آپ ایک روز بچّوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ ایک
ایک آنے والا آیا اور اُس نے آپ کو پکڑ کر سینۂ مبارک کو چاک کیا، اور قلب اقدس سے
خون کا ایک لوتھڑا نکال کر پھینک دیا، اور کہا کہ یہی حصّہ تجھ میں شیطان کا تھا، پھر سونے
کے طشت میں زمزم کے پانی سے دھو کر برابر کر دیا، لڑکے بھاگے ہوئے حلیمہ کے پاس آئے
کہ محمّدؐ کو کسی نے مار ڈالا۔ حلیمہ آئیں تو دیکھا کہ آپ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہے، حضرت انسؓ
کہتے ہیں کہ آپ کے سینہ میں اس زخم کے ٹانکے کے نشان ہم کو نظر آتے تھے، مستدرک میں بھی
اسی قسم کی ایک اور روایت خالد بن معدان سے عتبہ بن عبد السلمی کے واسطہ سے مذکور ہے'
(جلد۲ ص ۶۱۶ باب دلائل النبوّۃ)

ارباب سیر اور بعض محدثین کی روایت کے مطابق میں نے اس واقعہ کو یہاں لکھدیا ہے
مگر اس باب میں میری جو ذاتی تحقیق ہے، وہ اس سے پہلے (شرح صدر) حوالۂ قلم کرچکا ہوں۔

مبارک قدم ہونا

روایتوں میں آپ کے مبارک قدم ہونے کے بہت سے واقعات مذکور ہیں
مگر اُن میں سے کوئی بطریق صحیح مروی نہیں، صرف ایک روایت صحیح طریقہ سے مذکور ہے اور
وہ یہ ہے کہ ایک صحابی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اسلام سے پہلے جاہلیت میں حج
کرنے گئے تھے، تو انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص طواف میں مصروف ہے، اور اس کی زبان
پر شعر میں یہ دعا ہے،

لہ صحیح مسلم باب الاسرا، ابن سعد جلد اول ص، و مسند ابن حنبل روایات حضرت انسؓ جلد ۳ صفحہ ۱۲۱،

رُدّ الی راکبی محمداً　　　　یارب رُدّ واصطنع عندی یدا

اے میرے پروردگار! میرے سوار محمدؐ کو واپس بھیج اور مجھ پر یہ ایک احسان کر

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ عبدالمطلب ہیں، ان کا ایک اونٹ گم ہوگیا تھا، انھوں نے اپنے پوتے کو اس کے ڈھونڈنے کے لئے بھیجا ہے، اور وہ اب تک لوٹ کر نہیں آیا ہے، اُن کا یہ پوتا ایسا ہے کہ انھوں نے جب کسی کام کے لئے اس کو بھیجا ہی اُن کو کامیابی ہی ہوئی ہے، کچھ دیر کے بعد آپ اونٹ لے کر واپس آتے نظر آئے، عبدالمطلب نے سینہ سے لگا لیا[۱]

بے ستری میں آپ کا غش کھا کر گرنا

آپ بچہ تھے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر در پیش ہوئی، تمام شرفائے مکہ اس مقدس گھر کے معمار اور مزدور بنے، نیچے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، انہی بچوں کی صف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے، حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تہبند کھول کر گردن پر رکھ لو کہ پتھر کی رگڑ سے گردن پر خراش نہ آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا کے حکم کی تعمیل کی، دفعۃً آپ غش کھا کر گر پڑے، اور آنکھیں پھٹ کر آسمان سے لگ گئیں، جب ہوش آیا تو آپؐ کی زبان پر یہ لفظ تھے، "میرا تہبند، میرا تہبند"، لوگوں نے تہبند کمر سے باندھ دیا، یہ صحیحین[۲] کی روایت ہے، حاکم اور ابونعیم میں ہے کہ ابوطالب نے اسکے

---

[۱] مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۶۰۳، ذہبی نے حاکم کی اس روایت کو علی شرط مسلم تسلیم کیا ہے، علاوہ ازیں تاریخ بخاری، ابن سعد، ابویعلی، طبرانی، بیہقی، ابونعیم اور ابن مندہ میں یہ واقعہ مذکور ہے [۲] صحیح بخاری جلد اول، کتاب المناقب باب بنیان الکعبہ، صحیح مسلم۔

بعد واقعہ دریافت کیا تو فرمایا کہ مجھے ایک سپید پوش مرد نظر آیا جس نے کہا کہ ستر پوشی کر"
بیہقی و ابن سعد میں اور حاکم کی دوسری روایت میں ہے کہ ندا آئی کہ محمد اپنے ستر کو چھپا" ان
روایتوں میں ہے کہ غیب کی یہ پہلی آواز تھی جو آپ کو سُنائی دی،

نیند طاری ہونا

حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر بیان کرتے ہیں کہ آپ نے
فرمایا کہ بعثت سے پہلے صرف دو دفعہ میرے دل میں بُرا خیال آیا، اور دونوں دفعہ خدا نے
مجھے بچا لیا، ایک دفعہ رات کو میں نوجوان چرواہوں کے ساتھ مکہ کے باہر تھا، میرے دل
میں آیا کہ شہر کے اندر جا کر لطف احباب اٹھاؤں. چلا تو سر راہ شادی کا ایک جلسہ نظر آیا،
میں دیکھنے کھڑا ہو گیا تو خدا نے مجھ پر نیند طاری کر دی تو اُس وقت تک میں نہ جاگا،
جب تک سورج کی کرنوں نے آ کر میرے شانے نہ ہلائے، دوسری دفعہ جب خیال آیا تو پھر
یہی واقعہ گذرا، اس کے بعد میں نے جاہلیت کا کوئی ارادہ نہ کیا یہاں تک کہ خدا نے مجھ کو
نبوت سے مشرف کیا[1]

صدائے غیب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ
بیٹھے تھے، سامنے سے ایک خوبصورت سا آدمی گذرا حضرت عمرؓ نے بلوا کر حال پوچھا اُس نے
کہا میں جاہلیت میں کاہن تھا، دریافت کیا کہ اس زمانہ میں عجیب ترین واقعہ تم نے کیا دیکھا
اس نے کہا میں بازار میں تھا کہ میرا موکل جن میرے پاس گھبرایا ہوا آیا اور یہ شعر پڑھا،

---

[1] مسند ابن راہویہ، ابن اسحاق، بزاز، بیہقی، ابونعیم، ابن عساکر قال ابن حجر اسنادہ حسن متصل ورجالہ ثقاۃ
(خصائص کبریٰ سیوطی جلد اول صفحہ ۸۸، حیدر آباد، مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۲۴۵، علی شرط مسلم)

الم تر الجن وابلاسها   ویاسہا من بعد انکاسہا

ولحوقہا بالقلاص احلاسہا

حضرت عمرؓ نے فرمایا اُس نے سچ کہا خود مجھ پر اسی قسم کا ایک واقعہ گذرا، ایک دفعہ میں جاہلیت کے بتوں کے پاس سویا تھا کہ ایک آدمی بچھڑا لے کر آیا، اور اُس کی قربانی کی ناگاہ اس کے اندر سے بڑے زور سے چیخنے والے کی آواز آئی جس سے زیادہ چیخ کی آواز میں نے کبھی نہیں سُنی، آواز یہ تھی،

یا جلیح، امر جنیح رجل فصیح	اے جلیح! کامیاب بات ایک فصیح
یقول لا الہ الا اللہ،	آدمی کہتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ آواز سُن کر سب لوگ کود کود بھاگ نکلے لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ٹلا اور دل میں کہا کہ اصل حقیقت دریافت کرکے ٹلوں گا، ناگاہ دوسری دفعہ اور پھر تیسری دفعہ وہی آواز آئی، اس واقعہ کو کچھ ہی دن گذرے تھے کہ مکہ میں یہ شہرہ ہوا کہ آپ نے نبوت کا دعوی کیا ہے،[۱]

پتھروں سے سلام کی آواز

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو مجھ کو نبوت سے پہلے سلام کیا کرتا تھا، میں اب بھی اُس کو پہچانتا ہوں،[۲] یہ صحیح مسلم، مسند احمد، اور مسند دارمی کی روایت ہے،[۳] دوسری روایتوں میں[۴] ہے کہ میں مکہ کے اس

[۱] صحیح بخاری، باب اسلام عمر [۲] صحیح مسلم کتاب الفضائل مسند احمد جلد ۵ ص ۹۰ [۳] مسند دارمی صفحہ باب ما اکرم اللہ به نبیه من ایمان الشجر بروایت جابر بن سمرہ [۴] جامع ترمذی ذکر معجزات و ابونعیم ص ۱۴۱

پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت کے زمانہ میں مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔

خواب میں فرشتوں کی آمد نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ خواب میں فرشتے نظر آیا کرتے تھے، صحیح بخاری میں ہے کہ آغاز وحی سے پہلے رویا میں تین فرشتے آپ کے پاس آئے آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ کعبہ کے احاطہ میں آرام فرما تھے ایک فرشتے نے پوچھا اُن میں وہ کون ہے؟ بیچ والے نے جواب دیا اُن میں جو سب سے بہتر ہے، پچھلے نے کہا تو ان میں سے بہتر کو لے لو، اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔[۱]

[۱] صحیح بخاری کتاب التوحید باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الانبیاء۔

اشیا میں اثر سے مقصود یہ ہے کہ بحکمِ الٰہی کبھی کبھی آپ کے فیض و برکت کی قوت اثر سے جمادات نباتات، حیوانات اور انسانوں میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہو گیا جس کی بنا پر اشیا سے اُن کی فطرت کے مافوق یا اُن کے معمول کے برخلاف افعال، حرکات اور اثرات رونما ہوئے، اس قسم کے معجزات حضرت موسیٰؑ کی سیرت میں زیادہ نمایاں ہیں، مثلاً پانی کا خون ہو جانا، عصا کا سانپ بن جانا، ہتھیلی کا چمکنے لگنا، عصا کی ضرب سے دریا کا خشک ہو جانا، چٹان سے پانی بہنے لگنا، اوس کے اٹھانے سے دشمن کا شکست کھانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ نشانیاں ملی تھیں، جن میں سب سے مستند معجزہ **شق القمر** ہے، جس کی تفصیل دلائلِ قرآنی کے ضمن میں پہلے گذر چکی ہے، اس کے بعد ستونِ حنانہ، یعنی مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ستونِ خرما سے گریہ و بکا کی آواز پیدا ہونے کا واقعہ ہے،

ستون کا رونا مسجد نبویؐ میں پہلے منبر نہ تھا، مسجد میں خرمے کے تنہ کا ایک ستون تھا، آپ اس سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے، منبر تیار ہوا تو آپؐ نے اس پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ دینا شروع کیا تو دفعۃً اُس ستون سے بچوں کی طرح رونے کی آواز آنے لگی، بعض روایتوں میں ہے کہ اونٹنیوں کی طرح بلبلانے کی آواز آئی، یہ حاضرین کے اختلافِ مذاق کی بنا پر دو نے

کی مختلف تشبیہیں ہیں، راویون کا مشترک مقصود یہ ہے کہ درد فراق سے اس سے جزع و فزع کی آواز سنائی دینے لگی، یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اُتر کر آئے، اور ستون پر تسکین کے لئے ہاتھ رکھا، اور اس کو سینہ سے لگایا تو آواز بند ہوگئی، آپ نے فرمایا کہ اس کا یہ رونا اس بنا پر تھا کہ یہ پہلے خدا کا ذکر سنا کرتا تھا[1] یہ واقعہ حدیث وسیر کی کتابون میں گیارہ مختلف صحابیون[2] سے منقول ہے،

منبر کا ہلنے لگنا ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ دے رہے تھے، جلال وکبریائے الٰہی کا بیان تھا، آپ خود بہت متاثر تھے، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ میں نے دیکھا تو آپ داہنے بائین ہل رہے تھے، اور نیچے سے منبر اس زور سے ہل رہا ہے کہ مجھے ڈر ہوا کہ آپ کو لیکر گر نہ پڑے[3]

چٹان کا پارہ پارہ ہوجانا غزوۂ خندق میں تمام صحابہ مل کر مدینہ کے چارون طرف دشمنون سے بچنے کے لئے خندق کھود رہے تھے، اتفاق سے ایک جگہ ایک بہت سخت چٹان نکل آئی، لوگون نے ہر چند اس کو توڑنا چاہا، مگر وہ نہ ٹوٹی، کدالیاں اس پر پڑ پڑ کر اچٹ جاتی تھین، آخر لوگون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر صورت حال عرض کی، آپ اٹھ کر خود تشریف لائے، آکر

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ ومسند احمد وترمذی وابویعلی وابن ماجہ ودارمی (معجزات) ونسائی (باب خطبۃ الجمعہ)

[2] (۱) جابر بن عبداللہؓ (بخاری نسائی امام احمد بزاز ابونعیم (۲) سہیل بن سعدؓ (ابن ابی شیبہ . . . . . ابن سعد علی شرط الصحیحین عبداللہ بن عمرؓ (بخاری امام احمد ترمذی (۴) انس بن مالکؓ (ترمذی امام احمد ابویعلی ابن ماجہ بزار، ابونعیم (۵) ابی بن کعبؓ (امام احمد، امام شافعی، ابن ماجہ دارمی ابویعلی (ابن سعد (۶) عبداللہ بن عباسؓ (امام احمد ابن ماجہ علی شرط مسلم ابن سعد بیہقی دارمی (۷) ابوسعید خدریؓ (ابن ابی شیبہ ابویعلی دارمی عبد بن حمید، ابونعیم علی شرط مسلم (۸) بریدہؓ (دارمی) (۹) مطلب بن وداعہ (زبیر بن بکار فی اخبار المدینہ (۱۰) ام سلمہؓ (طبرانی بیہقی) (۱۱) عائشہؓ (بیہقی وابونعیم)

[3] صحیح مسلم باب ابتداء الخلق، ابن ماجہ، ذکر المبعث، مسند احمد عن ابن عمر وغیرہ

کدالی ہاتھ میں لے کر ایک ضرب لگائی تو وہ چٹان ریگ ہو کر چور چور ہو گئی،[1]

درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں ایک طرف کو نکلا، تو میں نے دیکھا کہ جو پہاڑ اور درخت بھی سامنے آتا ہے، اُس سے السلام علیک یا رسول اللہ کی آواز آتی ہے، اور میں اُس کو سُن رہا تھا،[2]

پہاڑ کا ہلنا

صحیح بخاری میں ہے ایک دن آپ اور آپ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ[3]، اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ[4] بھی تھے، ایک پہاڑ پر چڑھے، پہاڑ جنبش کرنے لگا، آپ نے پہاڑ کو پائے مبارک سے ٹھوکر مار کر فرمایا: "ٹھہر جا! کہ تیری پشت پر اس وقت پیغمبر ہے یا صدیق ہے یا شہید ہے[5]"

صحیح بخاری میں راوی کو شک ہے، یہ پہاڑ کوہ احد تھا، یا کوہ حرا، مگر صحیح مسلم اور مسند احمد میں صرف کوہ حرا کا اور مسند ابو یعلی اور بیہقی میں صرف کوہ احد کا نام ہے، بہر حال اگر یہ کوہ احد تھا، تو مدینہ کا یہ واقعہ ہے، اور اگر کوہ حرا تھا تو مکہ کا ہے،

آپ کے اشارہ سے بتوں کا گر جانا

فتح سے پہلے خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بتوں کا معبد تھا، جب مکہ فتح ہوا تو آپ کعبہ میں تشریف لے گئے، دستِ مبارک میں ایک چھڑی تھی اور زبانِ اقدس پر یہ آیتِ کریمہ جاری تھی،

---

[1] صحیح بخاری (غزوۂ خندق)، و نسائی (کتاب الجہاد)، و بیہقی و ابو نعیم و ابن سعد و ابن اسحاق و ابن جریر۔ [2] جامع ترمذی ذکر معجزات بروایت حسن۔ [3] صحیح بخاری مناقب ابی بکرؓ۔ [4] صحیح مسلم فضائل حضرت طلحہ و زبیرؓ۔ [5] صحیحین کے علاوہ یہ واقعہ مسند احمد حنبل بروایت بریدہؓ اور ترمذی نسائی اور دار قطنی بروایت حضرت عثمانؓ اور ابو یعلی اور بیہقی میں بروایت سہل بن سعدؓ کور ہی

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل)	حق آیا، اور باطل مٹ گیا، باطل مٹنے ہی کے لئے آیا تھا،

آپ چھڑی سے جس بت کی طرف اشارہ کرتے تھے، وہ بے چھوئے دھم سے گر پڑتا تھا (فاکہی بتصحیح ابن حبان وبیہقی وطبرانی وابونعیم)

یہ واقعہ کہ کعبہ کے چاروں طرف تین سو ساٹھ بت تھے اور آپ دستِ مبارک میں چھڑی لے کر اُن بتوں کی طرف اشارہ کرتے جاتے، اور آیتِ مذکور تلاوت کرتے جاتے تھے صحیح بخاری ومسلم باب فتحِ مکہ میں موجود ہے، مگر اس اشارہ سے بے چھوئے بتوں کا خود بخود گرتے جانا صحیحین میں مذکور نہیں، البتہ فاکہی میں بروایت عمر اور طبرانی، ابنِ اسحاق اور ابونعیم میں بروایت ابن عباسؓ موجود ہے، فاکہی کی روایت کو ابن حبان نے صحیح کہا ہے، صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الفتح میں جو روایت ہے، اُس سے ضمناً اس کے خلاف یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ آپ نے اُن لوگوں سے اکھڑوا کر پھنکوا دیا، اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

عن ابن عباس لما قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم ابى ان يدخل البيت وفيه الالهة فامر بها فاخرجت،	ابنِ عباسؓ سے روایت ہو کہ جب آپ (مکہ) آئے تو اس حالت میں کہ خانہ کعبہ کے اندر بُت تھے آپ نے اس کے اندر جانے سے انکار کیا تو آپ نے اُن کے باہر نکال دینے کا حکم دیا تو وہ باہر

اگر فاکہی، طبرانی، ابن اسحاق اور ابونعیم کی روایتِ بالا صحیح ہو تو اس میں اور بخاری کی اس روایت میں یہ تطبیق ممکن ہے کہ پہلے جن بتوں کا ذکر ہے، وہ حول البیت یعنی خانۂ کعبہ کے باہر چاروں

طرف تھے، آپ اُن کی طرف اشارہ کرکے آیتِ مذکور کو پڑھتے تھے، اور وہ گر جاتے تھے، اور خانۂ کعبہ کے اندر جو بُت تھے، اپنے اندر جانے سے پہلے آپ نے اُن کو نکلوا کر پھکوا دینے کا حکم دیا تھا، اسی طرح بخاری و مسلم کی فتحِ مکہ والی روایت میں جن بتوں کو چھڑی سے کونچے دینے کا ذکر ہے وہ وہ ہیں، جو باہر تھے، یعنی حول البیت اور جن کے نکلوانے کا ذکر بخاری کی دوسری روایت میں ہے وہ خانۂ کعبہ کے اندر تھے،

کھانوں سے تسبیح کی آواز حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ تم لوگ معجزوں کو خوف کی چیز سمجھتے ہو، اور ہم لوگ اُن کو برکت سمجھتے تھے، ہم کھانوں سے جب وہ کھائے جاتے تھے، تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے،

زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا، اور سورۂ بقرہ وآلِ عمران پڑھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کتابتِ وحی کی خدمت کی، چند دنوں کے بعد وہ مرتد ہوکر بھاگ گیا، اور عیسائی ہوگیا، اور مشہور کیا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محمد اُس کے سوا کچھ نہیں جانتے اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی دکھائی یعنی اس کو موت دیدی، اس کے دوستوں نے اس کو دفن کیا، تو صبح کے وقت لاش قبر کے باہر تھی، اُس کے دوستوں کو معلوم ہوا تو کہنے لگے کہ یہ محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ کا کام ہے، چونکہ وہ اُن سے علیحدہ ہوگیا، اس لئے قبر کھود کر اس کو باہر پھینک دیا، اس خیال سے اُن لوگوں نے اب کی خوب گہری قبر کھود کر اس میں اُس کو دفن کیا، صبح کے وقت پھر مردہ قبر سے باہر تھا، اب اُن کا یہ خیال پختہ ہوگیا، اور کہنے لگے کہ یہ مسلمانوں ہی کی حرکت ہے، پھر جس قدر وہ گہری قبر کھود سکتے تھے، کھود کر اس میں اس کو دفن کیا صبح کو دیکھا تو پھر وہی منظر سامنے تھا، اب اُن کو یقین ہوا کہ یہ آدمی کا کام نہیں، چنانچہ اس کو اسی طرح

لہ صحیح بخاری باب علامات النبوۃ،

زمین پر چھوڑ دیا[۱]،

درختوں کا چلنا ایک بار آپ سفر میں قضاے حاجت کے لئے نکلے، حضرت جابرؓ پانی لئے ہوئے ساتھ تھے، آپنے میدان میں ادھر ادھر دیکھا تو کوئی چیز آڑ کرنے کے لئے نہ ملی، میدان کے کنارے صرف دو درخت تھے، آپ ایک درخت کے پاس گئے، اور اس کی ایک ڈالی کو پکڑ کر کہا کہ خدا کے حکم سے میری اطاعت کر، وہ فرمانبردار اونٹ کی طرح آپکے ساتھ ہولیا، پھر دوسرے درخت کے نزدیک تشریف لے گئے، اور وہ بھی اسی طرح آپ کے ساتھ چل پڑا، پھر آپنے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا، اور فرمایا کہ خدا کے حکم سے باہم جڑ جاؤ، دونوں باہم مل گئے جب اُن کے آڑ میں فراغت کر چکے تو پھر دونوں درخت الگ الگ اپنی اپنی جگہ پر آگئے[۲]،

اسی قسم کا واقعہ دوسرے سفروں میں بھی پیش آیا ہے، چنانچہ صحابہؓ نے اپنی عینی شہادت کی بناپر اس کو بیان کیا ہے، حضرت اُسامہ بن زیدؓ حجۃ الوداع میں[۳] اور حضرت یعلی بن مرہؓ نے کسی سفر میں[۴] اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے،

ایک اور واقعہ ہے کہ آپ ایک روز اہلِ مکہ کی ایذا رسانی سے نہایت غمگین بیٹھے ہوئے تھے اسی حالت میں حضرت جبرئیلؑ آئے، اور انھوں نے دریافت کیا تو حضرت جبرئیلؑ نے کہا یا خود آپنے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی (روایتیں مختلف ہیں) کہ مجھے ایک ایسی نشانی دکھا

---

[۱] بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام [۲] مسلم حدیث جابر الطویل و احمد و دارمی و بیہقی باختلاف یسیر [۳] بسند ابو یعلی وبیہقی و ابونعیم، حافظ ابن حجر نے مطالب عالیہ میں اس روایت کی تحسین کی ہے [۴] امام احمد بروایت یعلی بن مرہ و ابن شیبہ برجال ثقات وحاکم بروائت صحیح،

جو اس غم کو مجھ سے دور کر دے، حکم ہوا کہ میدان کے کنارے جو ایک درخت ہے، آپ اُس کو بلائیے، آپ نے بلایا، تو وہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا، پھر اُس سے واپس جانے کو کہا تو وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا، آپ نے فرمایا، اب مجھے کوئی غم نہیں ہے[۱]

خوشۂ خرما کا چلنا

آپ کی خدمت میں ایک بدو آیا، اور کہا کہ مجھے یہ کیونکر یقین ہو کہ آپ پیغمبر ہیں، آپ نے فرمایا اگر میں اس خوشۂ خرما کو بلا لوں تو تم میری نبوت کی شہادت دو گے؟ اس نے کہا "ہاں" آپ نے خوشۂ خرما کو بُلایا، اور وہ درخت سے اُتر کر آپ کے پاس آیا، اور پھر آپ کے حکم سے واپس گیا، بدو فوراً اس معجزہ کو دیکھ کر ایمان لایا[۲]

درخت کا چلنا اور اس کا آواز آنا

آپ ایک سفر میں تھے کہ ایک بدو آتا ہوا نظر آیا، جب وہ آپ کے قریب آگیا تو آپ نے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ اُس نے جواب دیا امکان کا ارادہ ہے، پھر آپ نے فرمایا "تمھیں نیکی کی حاجت ہے"؟ اُس نے کہا وہ نیکی کیا ہے؟ آپ نے کلمۂ توحید کی تلقین کی اُس نے کہا "اس کی شہادت کون دیتا ہے"؟ آپ نے فرمایا "سامنے کا یہ درخت" چنانچہ یہ کہکر آپ نے وادی کے کنارے سے اُس درخت کو بُلایا، وہ دوڑتا ہوا آیا، اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا، آپ نے تین بار اُس سے کلمۂ توحید پڑھوایا، اور اُس نے پڑھایا، پھر وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا، اور بدو یہ کہہ کر اپنے مکان کو روانہ ہوا کہ اگر میرے اہل و عیال نے بھی اسلام

---

[۱] سنن ابن ماجہ باب الصبر علی البلاء و مسند احمد عن انس بن مالک و ابن سعد و بزار و بیہقی عن عمر بن الخطاب

[۲] ترمذی (معجزات نبوی) نے اس کو صحیح کہا ہے امام بخاری نے تاریخ میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے، اور ابو یعلی نے ابن عباس رضؓ سے اس کی روایت کی ہے

قبول کر لیا تو اُن سب کو لے کر آؤں گا ورنہ تنہا آپ کے ساتھ قیام کروں گا۔"

بے دودھ کی بکری نے دودھ دیا | عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نوخیز چھوکرا تھا، عقبہ بن معیط ایک قریشی کافر رئیس کی بکریاں مکہ میں چرایا کرتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا ادھر سے گذر ہوا، آپ نے مجھ سے کہا لڑکے! تمہارے پاس دودھ ہے؟ ہم کو پلاؤ گے"؟ میں نے کہا میں امین ہوں تم کو نہیں پلا سکتا، آپ نے پوچھا "اچھا کوئی بکری کا

ے مسند دارمی ص، بسند صحیح و بزار و ابونعیم باختلافِ یسیر، وابن سعد جلد اول ص ۱۲۱، ۵۲ یہ روایت مسند ابوداؤد طیالسی، مسند ابن حنبل، ابن سعد، اور دلائل ابی نعیم میں ہے، طیالسی اور ابونعیم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ جب مشرکین سے بھاگے تھے، تب یہ واقعہ پیش آیا، یعنی ہجرت کے ایام میں طیالسی کی اس روایت کا سلسلہ سند ہر طرح سے محفوظ ہے، ابوداؤد، حماد بن سلمہ سے اور وہ عاصم ابن بہدلہ سے اور عاصم زر بن حبیش سے اور وہ خود عبداللہ بن مسعودؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں یہ تمام اصحاب ثقہ اور معتبر ہیں، بایں ہمہ اس واقعہ کو زمانہ ہجرت میں قرار دینے سے متعدد خرابیاں نظر آتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت میں کسی صاحب سے بھول ہوئی ہے، اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہجرت کے وقت نوخیز لڑکے تھے، اور ابھی تک قرآن مجید سے ناواقف تھے، بلکہ مسلمان بھی نہ تھے، حالانکہ وہ ہجرت سے بہت پہلے اسلام لا چکے تھے وہ چھٹے مسلمان تھے، اور ہجرت کے وقت وہ حبش میں تھے، اور وہاں سے اس وقت لوٹے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ جا چکے تھے، جیسا کہ نماز میں سلام کرنے والی روایت سے جو حدیث کی تمام کتابوں میں ہے ثابت ہوتا ہے، اس لئے وہ اس وقت مکہ میں سرے سے موجود ہی نہ تھے، اس روایت کے ان الفاظ کے متعلق میں اپنے یہ شکوک لکھ چکا تھا کہ رجال اور سیر کی مختلف کتابوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا حال الٹ پلٹ کر پڑھا، سب نے اُن کے حال میں اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر ان شبہات پر کسی کی نظر نہیں پڑی، اسی اثناء میں فتح الباری جلد ہجرت اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعینہٖ یہی اعتراضات حافظ ابن حجر کے ذہن

بچہ ہے ؟ میں نے کہا ہاں فرمایا "لے آؤ" میں لے آیا، حضرت ابو بکرؓ نے بچہ پکڑا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھن میں ہاتھ لگایا اور دعا کی، ابو بکر ایک گہرا پتھر لے آئے اس میں دودھ دوہا گیا، پہلے آپ نے خود پیا، پھر حضرت ابو بکرؓ نے پیا اُس کے بعد حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ پھر مجھے پلایا، دودھ پی کر آپ نے فرمایا "اے تھن! سمٹ جا، وہ سمٹ کر خشک ہو گیا، اس کے

(بقیہ حاشیہ ص ۶۲۱) میں بھی گذرے ہیں لیکن انھوں نے حسب دستور مختلف روایات کی تطبیق کے متعلق جو اُن کا عام اصول ہے، اس سے کام لے کر آگے بڑھ گئے ہیں، یعنی یہ کہدیا ہو کہ ممکن ہو کہ یہ ہجرت کے، علاوہ کسی اور زمانہ کا واقعہ ہو، مگر مشکل یہ ہے کہ ہجرت کے علاوہ کوئی اور زمانہ ایسا نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ مشرکین سے بھاگے ہوں لیکن الحمدللہ کہ اثنائے تحقیق میں مجھے مسند احمد بن حنبل (جلد اص ۴۰۹) میں یہی روایت اسی قسم کی سند سے مل گئی ہے جس میں ان قابل اعتراض الفاظ کے بجائے متعلق یہ الفاظ ہیں کہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا گذر ہوا اس میں فرار اور ہجرت کا متعلق ذکر نہیں ہو اس سے ثابت ہوتا ہو کہ یہ ہجرت سے بہت پہلے کا کوئی واقعہ ہے، پہلے الفاظ کے راوی عاصم سے ان کے شاگرد حماد بن سلمہ ہیں، اور دوسرے الفاظ کے راوی ان ہی کے شاگرد ابو بکر عیاش ہیں، گو حافظہ کی خرابی اور اغلاط کی کثرت میں یہ دونوں برابر ہیں تاہم ناقدانہ وجوہ ابو بکر بن عیاش کی تائید میں ہیں، پہلی روایت میں فرّ (بھاگے) کا لفظ ہے اور دوسری میں مرّ، یعنی گذرے کا لفظ ہے معلوم ہوتا ہو کہ راویوں میں فرّ اور مرّ کے الفاظ میں باہم تشابہ ہو گیا ہو، اور بعد کو پھر فرّ کی مناسبت سے عن المشرکین بڑھ گیا ہو ابن سعد نے بسند حسن (جلد اول ص ۱۲۲) اس واقعہ کو ان الفاظ میں روایت کیا ہو جس سے تمام مسئلہ صاف ہو جاتا ہو حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں، میں اپنے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں جانتا، میں گھر کی بکریاں چرا رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور دریافت فرمایا کہ تمہاری کسی بکری میں دودھ ہے، میں نے عرض کیا نہیں آپ نے ایک بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا، فوراً دودھ اُتر آیا تو میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں مانتا،

بعد میں آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ اس عمدہ کلام یعنی قرآن مجید میں سے مجھے کچھ سکھائیے، فرمایا تم سیکھنے والے لڑکے ہو تو میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ستر سورتیں سیکھیں جن میں کوئی دوسرا میرا مقابلہ نہیں کرسکتا" ابن سعد میں ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہا کرتے تھے کہ میرے اسلام لانے میں اسی معجزہ کو دخل ہی[1]

سست گھوڑے کا تیز رفتار ہو جانا ابوطلحہ صحابیؓ کا گھوڑا نہایت سست رفتار اور مٹھا تھا، ایک دفعہ مدینہ میں شور و غل ہوا، آپ نے اسی گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگایا، وہ آپ کی سواری کی برکت سے اس قدر تیز رو ہو گیا کہ جب آپ واپس تشریف لائے تو فرمایا کہ "یہ تو دریا ہے، اس کے بعد کوئی گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا"[2]

اندھیرے میں روشنی ہونا حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ دو صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رات کو دیر تک حاضر رہے، جب واپس آ ہوئے، تو رات بہت اندھیری تھی، مگر خدا کی قدرت کہ اُن کے سامنے دو چراغوں کی طرح آگے آگے کوئی چیز روشن ہو گئی، جب دونوں الگ ہو کر اپنے اپنے گھر چلے تو ایک چراغ ایک کے ساتھ، اور دوسرا دوسرے کے ساتھ ہو گیا، یہاں تک کہ دونوں گھر چلے گئے، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے[3] اس میں ان دونوں صحابیوں کے ناموں کی تصریح نہیں، لیکن حاکم، ابن سعد، بیہقی، اور ابونعیم میں حضرت انسؓ نے اُن کے نام عبادؓ بن بشر، اور اُسید بن حضیرؓ بتائے ہیں، اور ان میں یہ اضافہ ہے کہ یہ روشنی اُن کی لکڑیوں کے سروں میں پیدا ہو گئی تھی، ابونعیم کی ایک دوسری روایت میں جو حضرت انسؓ ہی سے مروی ہے، عباد

---

[1] ابن سعد جلد اول ص ۱۲۲ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الرکوب علی الدابۃ الصعبۃ جلد اول ص ۴۰۰ [3] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ

بن بشیرؓ اور اسید بن حضیرؓ کے بجائے حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کے نام ہیں، روایت کی صحت کی صورت میں ممکن ہے کہ یہ دوسرا واقعہ ہو، نیز حاکم، بیہقی، اور ابو نعیم میں اسی قسم کا واقعہ ابو عبس ابن جبر صحابیؓ جو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشار کی نماز پڑھا کرتے تھے، اُن کو بھی ایک دفعہ پیش آنا بیان کیا گیا ہے، تاریخ بخاری اور بیہقی میں ایک سفر میں اندھیری رات حمزۃ الاسلمیؓ کی انگلیوں کا روشن ہو جانا بھی مذکور ہے،

جانور کا سجدہ کرنا حدیث کی اکثر کتابوں میں چند الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ روایت مذکور ہے کہ ایک دفعہ ایک انصاری کا اونٹ باؤلا ہو گیا تھا، یا بگڑ گیا تھا، لوگوں نے جا کر آپ کو خبر کی آپ نے اس کے پاس جانا چاہا۔ تو سب نے روکا کہ یا رسول اللہ! یہ آدمی کو کتے کی طرح کاٹ کھاتا ہے، آپنے فرمایا کہ "مجھے اس کا خوف نہیں" یہ کہکر آپ آگے بڑھے تو اونٹ نے آپ کے سامنے آکر اپنی گردن ڈال دی، آپنے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کو پکڑ کر اس کے مالک کے حوالہ کر دیا، پھر فرمایا ہر مخلوق جانتی ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں لیکن گنہگار انسان اور نافرمان جن" صحابہ نے یہ منظر دیکھ کر کہا یا رسول اللہ! جب جانور آپ کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو سب سے پہلے کرنا چاہئے آپنے فرمایا "اگر کسی انسان کا دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے"[2]

جانور کا آپکے مرتبہ کو پہچاننا ایک دفعہ آپ ایک انصاری کے باغ میں گئے، ایک اونٹ کھڑا

---

[1] دارمی ص۔ [2] امام احمد بن حنبل نے مسند میں متعدد صحابیوں کی سند سے یہ واقعہ نقل کیا ہے چنانچہ کتاب مذکور میں حضرت جابرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ، حضرت عائشہؓ کی مسند دیکھو نیز سنن نسائی و ابن ابی شیبہ و طبرانی و بیہقی اور دلائل نے اس ایک واقعہ کو ذرا ذرا سے لفظی اختلاف کے باعث متعدد واقعات بنا دیا ہے، البدایۃ والنہایۃ جلد ۶ ص ۱۳۹،

چلا رہا تھا، آپ کو دیکھ کر وہ بلبلانے لگا، اور اس کی دونوں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، آپ نے قریب جاکر اوس کے سر اور کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہوگیا، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کا اونٹ ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام بتایا، وہ بلوائے گئے تو آپ نے فرمایا "تم ان جانوروں پر جن کو خدا نے تمہارا محکوم بنایا ہے، رحم کیا کرو، اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے، کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو، اور اُس کو تکلیف دیتے ہو"[1]

حافظہ بڑھ جانا تمام صحابہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایتیں سب سے زیادہ ہیں، حالانکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صرف تین چار برس رہے تھے، لوگوں کو آج بھی اس پر تعجب ہوا اور خود اُن کے زمانہ میں بھی تھا، لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہمارے مہاجر بھائی تو بیوپار میں لگے رہتے تھے، اور انصاری بھائی اپنے کھیتوں میں اور میرا آپ کی خدمت میں حاضری کے سوا اور کوئی کام نہ تھا، ایک دن خدمت میں حاضر تھا کہ زبانِ مبارک سے نکلا کہ "جو دامن پھیلائے گا اس وقت میری باتیں سینہ میں سمیٹ لیگا وہ پھر کبھی نہ بھولے گا، میں نے دامن پھیلایا، جب کلامِ مبارک ختم ہوا، سینہ میں سمیٹ لیا، اس وقت سے کوئی بات نہ بھولا"[2]

صحیح بخاری میں یہی واقعہ ایک اور طرح سے بھی مذکور ہے، چنانچہ وہ آگے آئے گا،

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجہاد باب الشفقۃ علی البہائم ص ۳۴۹ و مسند احمد بن حنبل عبداللہ بن جعفر و مسلم بن مہدی بن میمون (صفحہ ۲۰۴) البدایہ ابونعیم وغیرہ میں اسی واقعہ میں اور بہت سی نامستند باتیں شامل ہیں، [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم مناقب ابو ہریرہؓ،

شفاے امراض

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ،

پیغمبر دنیا مین درحقیقت بیماردلون کے روحانی طبیب بن کرآتے ہیں مگر کبھی کبھی ارواح وقلوب کے معالجہ میں اُن کو جسمانی امراض وعوارض کا علاج بھی کرنا پڑتا ہے، تمام انبیاءؑ میں حضرت عیسی علیہ السلام کی زندگی اس وصف میں سب سے ممتاز ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس قسم کے معجزات کا وافر حصہ ملا تھا،

حضرت علیؓ کی آنکھوں کا اچھا ہوجانا

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضرت سلمہ بن اکوعؓ اور حضرت سہیل بن سعدؓ تین چشم دید گواہوں سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر مین جب آپ نے علم عطا فرمانے کے لئے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو طلب فرمایا، تو معلوم ہوا کہ اُن کی آنکھون مین آشوب چشم ہے، اور یہ آشوب جیسا کہ مسند ابن حنبل میں ہے، ایسا سخت تھا کہ ایک صاحب (سلمہ بن اکوعؓ) اُن کا ہاتھ پکڑ کر لائے تھے، آپؐ نے اُن کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن مل دیا، اور دم کر دیا، وہ اُسی وقت اچھی ہوگئیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکی آنکھون مین کبھی درد تھا ہی نہین،[۱]

ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہوجانا

حضرت عبداللہ بن عتیکؓ قلعہ میں داخل ہوکر جب ابو رافع یہودی کو

---

[۱] صحیح بخاری، باب غزوۂ خیبر ومناقب علیؓ کتاب الجہاد وصحیح مسلم باب فضائل علی ومسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۵۲، سہیل بن سعد اور سلمہ بن اکوعؓ کی روایت بخاری ومسلم دونوں میں ہے، اور حضرت سعدؓ کی روایت صرف مسلم میں ہے،

قتل کرکے واپس آنے لگے تو کوٹھے کے زینہ سے گر پڑے جس سے اُن کی ایک ٹانگ میں سخت چوٹ آئی پہلے پہل تو یہ چوٹ معلوم نہیں ہوئی لیکن بعد کو یہ حالت ہوئی جیسا کہ ابن اسحاق ہے کہ اُن کے ہمراہی اُٹھا کر اُن کو لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا آپ نے اس ٹانگ پر دستِ مبارک سے مسح کر دیا، اور وہ فوراً بالکل اچھی ہوگئی، اور یہ معلوم ہونے لگا کہ کبھی چوٹ لگی، ہی نہ تھی،[1]

تلوار کے زخم کا اچھا ہونا | غزوۂ خیبر میں حضرت سلمہ بن اکوع کی ٹانگ میں تلوار کا زخم لگ گیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے اس پر تین مرتبہ دم کر دیا، پھر انھیں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی، صرف نشان رہ گیا تھا،[2]

غزوۂ حنین میں حضرت خالد بن ولید کے پاؤں میں زخم لگا جب لڑائی ختم ہو چکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا آپ حضرت خالدؓ کی فرودگاہ پوچھتے ہوئے اُن کے پاس آئے، دیکھا کہ کجاوہ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں، آپ نے اُن کے زخم پر ایک نگاہ ڈالی اور اس پر لعاب دہن ڈال دیا، زخم اچھا ہو گیا،[3]

اندھے کا اچھا ہونا | آپ کی خدمت میں ایک اندھا حاضر ہوا، اور اپنی تکلیفیں بیان کیں، آپ نے فرمایا "اگر چاہو تو دعا کر دوں، اور اگر چاہو تو صبر کرو، اور یہ تمھارے لئے اچھا ہے" عرض کی دعا کیجئے

---

[1] بخاری باب قتل ابی رافع میں یہ واقعہ دو طرح بیان ہوا ہے یہاں ان دونوں میں تطبیق کر دی گئی ہے [2] صحیح بخاری باب غزوۂ خیبر و مسند ابن حنبل جلد ۴ حدیث سلمہ بن اکوع [3] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۸۸ و عبدالرزاق و عبد بن حمید و ابن عساکر،

فرمایا اچھی طرح وضو کر کے یہ دعا مانگو کہ خداوندا! اپنی رحمت والے پیغمبر کے وسیلہ سے میری حاجت پوری کر دے"، ترمذی[1] اور حاکم کی ایک روایت[2] میں اسی قدر ہے، مگر ابن حنبل[3] اور حاکم کی دوسری روایت میں اس کے بعد ہے کہ اُس نے ایسا کیا تو فوراً اچھا ہو گیا، حاکم کی ایک اور روایت[4] میں جو علی شرط البخاری ہے، یہ واقعہ ان الفاظ میں منقول ہے، حضرت عثمان رضؓ بن حنیف صحابی کہتے ہیں کہ ایک نابینا صحابی آپ کے پاس حاضر ہوئے، اور درخواست کی کہ یا رسول اللہ! میری خدمت کے لئے کوئی آدمی نہیں، مجھے سخت تکلیف ہے، فرمایا، وضو خانہ میں جاکر وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو، اس کے بعد یہ دعا مانگو، عثمانؓ بن حنیف کہتے ہیں کہ ابھی ہم مجلس سے الگ بھی نہیں ہوئے تھے، اور نہ کچھ زیادہ بات کرنے پائے تھے کہ وہ نابینا واپس آیا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کو نابینائی کی بیماری کبھی تھی ہی نہیں،

حبیبؓ بن فدیک ایک اور نابینا صحابی کے اچھے ہونے کا واقعہ ابن ابی شیبہ، طبرانی، بیہقی، اور ابو نعیم میں مذکور ہے،[6] مگر چونکہ اُس کے سلسلۂ سند میں مجہول الاسم اشخاص ہیں اس لئے اس کو قلم انداز کر دیا ہے،

بلا دور ہونا آپ ایک سفر میں جا رہے تھے، راستہ میں ایک عورت بچہ کو لئے ہوئے سامنے آئی، اور کہا کہ یا رسول اللہ! اس کو دن میں کئی دفعہ کسی بلا کا دورہ ہوتا ہے، آپ نے بچہ کو اٹھا کر کجاوہ کے سامنے رکھا، اور تین بار کہا کہ "اے خدا کے دشمن نکل میں خدا کا رسول ہوں"

---

[1] ترمذی کتاب الدعوات [2] مستدرک جلد ۱ صفحہ ۵۱۹ [3] مسند جلد ۴ صفحہ ۱۳۸ [4] مستدرک جلد ۱ ص ۵۲۶
[5] مستدرک جلد ۱ ص ۵۲۶ ، [6] دلائل ابی نعیم صفحہ ۱۷۰ و اصابہ ترجمہ حبیبؓ بن فدیک ،

پھر لڑکے کو اس عورت کے حوالے کر دیا، سفر سے پلٹے تو وہ عورت دو دُنبے لے کر حاضر ہوئی، اور عرض کی یا رسول اللہ! میرا ہدیہ قبول فرمائیے، خدا کی قسم پھر بچے کے پاس وہ بلا نہ آئی، آپ نے ایک دُنبہ قبول فرمالیا، اور دوسرے کو واپس کر دیا[1]،

گونگے کا بولنا حجۃ الوداع میں آپؐ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچّہ کو لے کر حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یہ بولتا نہیں، آپ نے پانی منگایا، ہاتھ دھویا، اور کلّی کی، اور فرمایا کہ یہ پانی اُس کو پلا دو، اور کچھ اُس کے اوپر چھڑک دو، دوسرے سال وہ عورت آئی تو بیان کیا کہ لڑکا بالکل اچھا ہوگیا، اور بولنے لگا[2]،

مرضِ نسیان کا دور ہونا ایک دفعہ حضرت علیؓ نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! قرآن یاد کرتا ہوں تو بھول جاتا ہوں، آپؐ نے فرمایا "اس طرح نماز پڑھ کر یہ دعا مانگو" حضرت علیؓ فرماتے ہیں، کہ میں نے اسی طرح کیا، اور فائدہ ہوا، اور جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ پہلے چار چار آیتیں یاد کرتا تھا، اور اب چالیس چالیس آیتیں یاد کرلیتا ہوں، پہلے بات بھول جاتا تھا، اور اب حرف حرف یاد رہتا ہے[3]،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۷۰، ۱۷۱، میں دو حسن روایتوں سے حضرت یعلیٰؓ بن مرّہ سے یہ واقعہ مذکور ہے علاوہ ازیں ابن ابی شیبہ اور حاکم میں بھی یہ منقول ہے دارمی صفحہ ۹ میں یہ واقعہ حضرت جابرؓ سے جس سلسلۂ سند سے مذکور ہے وہ مستند نہیں، نیز دارمی اور ابو نعیم میں اسی قسم کا ایک اور واقعہ (یعنی ایک جن کا ایک بچہ پر مسلط ہونا اور آپ کے اثر سے ایک کتّے کا پلّہ کی شکل میں نکل کر بھاگ گنا) حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ بھی صحیح نہیں،

[2] سنن ابن ماجہ باب النشرہ و ابو نعیم صفحہ ۱۶۱، ابن ابی شیبہ [3] جامع ترمذی ابواب الدعوات و مستدرک حاکم جلد اوّل صفحہ ۳۱۶، ذہبی نے جودتِ سند کے باوجود اس روایت میں کلام کیا ہے،

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کو آپ نے طائف کا عامل مقرر فرمایا، انھوں نے وہاں سے آکر بیان کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ نماز میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا پڑھتا ہوں، آپ نے پاس بلا کر ان کے سینہ پر ہاتھ مارا، اور منہ میں دم کیا، پھر یہ حالت بالکل زائل ہو گئی،[۱]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی ایک دفعہ حافظہ کی شکایت کی، تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ دامن پھیلاؤ، انھوں نے پھیلایا، آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا، پھر فرمایا کہ اب اس کو سمیٹ لو، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا، تب سے پھر میں کوئی بات نہ بھولا،[۲]

بیمار کا تندرست ہونا | حضرت عثمان بن ابی العاص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دفعہ سخت بیمار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی عیادت کو تشریف لے گئے، تو فرمایا کہ "یہ دعا سات دفعہ پڑھ کر اپنا ہاتھ بدن پر پھیرو" حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو خدا نے میری بیماری دور کر دی اور اب میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی یہ دعا بتایا کرتا ہوں،[۳]

ایک بار حضرت علیؓ اس قدر بیمار ہوئے کہ موت کی دعا کرنے لگے، آپ کا گذر ہوا تو ان کو اس پر تنبیہ کی، اور دعا فرمائی، پھر اُن کو اس مرض کی تکلیف محسوس نہ ہوئی،[۴]

ایک جلے ہوئے بچے کا اچھا ہونا | محمد بن حاطبؓ ایک صحابی ہیں وہ جب بچہ تھے تو اپنی ماں کی گود سے گر کر آگ میں گر پڑے، اور کچھ جل گئے، اُن کی ماں اُن کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] سنن ابن ماجہ باب الفزع والارق [۲] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [۳] جامع ترمذی کتاب الطب، [۴] جامع ترمذی ابواب الدعوات، بروایت حسن وصحیح حاکم فی المستدرک،

کی خدمت میں آئین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن اُن پر ملا، اور دعا پڑھ کر دم کیا،
طیالسی اور ابن حنبل میں اسی قدر ہے، مگر امام بخاری نے تاریخ میں بہ سند بیان کیا ہے کہ محمد
بن حاطب کی ماں کہتی تھیں کہ بچہ کو لے کر مین وہان سے اٹھنے بھی نہیں پائی تھی کہ بچہ کا زخم
چنگا ہو گیا[1]،

جنون دور ہونا | ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یارسول اللہ! میرا بھائی بیمار ہے، دعا کیجئے،
پوچھا کیا بیمار ہے؟ عرض کی اس پر جنون کا اثر ہے، فرمایا اس کو لے آؤ، وہ آیا تو آپ نے قرآن
مجید کی متعدد سورتین پڑھ کر جھاڑ دیا، وہ کھڑا ہوا تو اس پر جنون کا کوئی اثر نہ تھا[2]،

---

[1] مسند ابو داؤد طیالسی صفحہ ۱۷۵، مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۲۵۹، تاریخ بخاری کی روایت ابن عبدالبر نے
بہ سند استیعاب (ترجمۂ محمدؓ بن حاطب میں) اور سیوطی نے خصائص کبری جلد ۲ صفحہ ۶۹ مین نقل کی ہے [2] سنن
ابن ماجہ باب الفزع والارق، اس روایت کے سلسلۂ سند مین ابو جناب ایک راوی ہیں جن پر تدلیس کا
الزام ہے، مگر اس روایت میں تو تدلیس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، واللہ اعلم،

استجابتِ دعا

منجملہ دیگر علامتوں کے اللہ کی بارگاہ میں دعاؤن کا قبول ہونا بھی ایک بڑی علامت ہے جس سے نیک اور مقبول بندون کی پہچان اور شناخت ہوتی ہے، انبیائے الٰہی سے بڑھکر خدا کے نیک ور مقبول بندے اور کون ہوسکتے ہین،؟ اسی لئے اللہ تعالیٰ اُن کی دعاؤن کو شرفِ اجابت بخشا ہی، اور اُن کی نداؤن کو جو دل کے اندر سے نکلتی ہیں، سمعِ قبول سے سنتا ہے، حضرت آدمؑ نے ندامت کے ساتھ خدا کو پکارا تو اُس نے اُن کو معاف کردیا، حضرت نوحؑ نے طوفانی عذاب کی درخواست کی تو پوری ہوئی، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے نبوت اور برکت کی دعا کی تو قبول ہوئی، حضرت یونسؑ نے سمندر کی تہ میں سے خدا کو پکارا تو اُس نے سُنا، حضرت زکریاؑ نے خانوادۂ نبوت کے لئے ایک وارث مانگا تو دیا گیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بارگاہِ الٰہی مین دعائین مانگیں، حاجت مندیون میں اس کے آگے ہاتھ پھیلائے، تنہائیون میں اس کی رفاقت چاہی، بیکسیون میں اس کی نصرت مانگی، فقرو فاقہ مین اُس کے خزانۂ غیب سے مدد طلب کی، حق کی اشاعت میں اس کی اعانت کی درخواست کی، نیک بندوں کے حق میں اپنے آپ کو اس کے سامنے شفیع بنایا، شریرون کے دفعِ شر کیلئے اس کی غیبی امداد کا سہارا ڈھونڈھا، اور اُن میں سے ہر موقع پر آپکے لئے قبول و اجابت کا دروازہ کھولا گیا،

مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ آپ جب بھی کسی کے حق میں دعا فرماتے تھے، تو وہ نہ صرف اُسی کے بلکہ اُس کی اولاد دراولاد کے حق میں مستجاب ہوتی تھی[1] صحیح مسلم میں ہے کہ جب کسی کے متعلق آپ رحمہ اللہ یعنی خدا اس پر رحمت کرے، فرماتے تھے، تو صحابہؓ سمجھ جاتے تھے کہ اس کو شہادت نصیب ہوگی[2] چنانچہ ایسا ہی ہوتا تھا، یہاں تک کہ وہ بھی جو آپ کی دعوتِ حق کے سخت منکر تھے، اس امر کا دل سے یقین رکھتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا دُن میں خیر بناک تاثیر ہے، مکہ میں جب قحط پڑا تو ابوسفیان نے بھی بحالتِ کفر اسی آستانہ پر حاضر ہو کر دعائے رحمت کی درخواست کی[3] ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش کے حق میں جو آپ کی نماز میں خلل انداز ہوئے تھے، جب آپنے بددعا کی تو وہ خوف سے کانپ اُٹھے[4] یہ واقعات بتفصیل پہلے گذر چکے ہیں، اس لئے یہاں موضوعِ سخن کی تقریب سے اختصار پر اکتفا کی جاتی ہے،

قریش پر عذاب آنا اور اس کا دور ہونا

قریش نے جب اسلام کی سخت مخالفت کی، تو خدا نے اُن پر قحط کا عذاب بھیجا، اہل مکہ سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے، بالآخر سوا اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ اسی رحمتِ عالم کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں، قریش کے بعض رئیسون نے خدمتِ نبوی میں جا کر عرض کی کہ "اے محمدؐ! تمھاری قوم برباد ہوگئی، خدا سے دعا کرو کہ وہ اس مصیبت سے اس کو نجات دے، رحمتِ عالمؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، دعا قبول ہوئی خوب پانی برسا اور اہل مکہ کو قحط کے عذاب سے نجات ملی[5]

---

[1] مسند احمد بروایت حضرت حذیفہؓ [2] صحیح مسلم باب غزوۂ خیبر [3] صحیح بخاری و صحیح مسلم تفسیر سورۂ دخان وغیرہ [4] صحیح بخاری آخر کتاب الوضو، ومسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین [5] صحیح بخاری تفسیر

رؤسائے قریش کے حق میں بددعا

آپ ایک دفعہ صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے کہ بعض رؤسائے قریش نے عین حالتِ نماز میں آپ کی گردنِ مبارک پر نجاست ڈال دی، حضرت فاطمہؓ نے آکر جب یہ نجاست ہٹائی، اور آپؐ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو نام بنام دعا مانگی کہ "خداوندا! اُن کو تو پکڑ"۔ چنانچہ سب کے سب بدر کی لڑائی میں مارے گئے۔[۲]

حضرت عمرؓ کا اسلام

ایک طرف قریش کے سربرآوردہ اصحاب، اسلام اور داعی اسلامؐ کی عداوت اور دشمنی کی کوششوں میں مصروف تھے، اور دوسری طرف داعیِ اسلامؐ اُن کی ہدایت و رہنمائی کے پُرمحبت ولولوں سے معمور تھا، ابوجہل و عمر کہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت اور مستقل تھے، اُن ہی کی ہدایت کا پُرشوق ارمان آپ کے قلبِ مبارک میں سب سے زیادہ تھا جب تبلیغ و دعوت کے دوسرے حربے اُن پر کامیاب نہ ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سب سے کارگر حربہ کو اُن کے مقابلہ میں استعمال کیا جس کے وار کی کوئی روک نہیں ہو سکتی تھی، آپ نے دعا فرمائی کہ "خداوندا! ابوجہل و عمر میں جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو، اُس سے اسلام کو معزز کر"۔ ابن ماجہ اور حاکم میں حضرت عائشہؓ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۳) سورۂ دخان و صلوٰۃ الاستسقاء [۲] صحیح بخاری غزوۂ بدر [۳] جامع ترمذی مناقب عمر بہ روایت ابن عمر حدیث حسن غریب ترمذی کے اسی باب میں اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے اس میں اسقدر اضافہ ہے کہ اس دعا کے دوسرے ہی دن حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے مگر اس روایت میں ایک راوی قابلِ اعتراض ہے، ترمذی کے علاوہ یہ روایت ابن سعد میں تین مختلف سلسلوں سے بہ سند حسن مذکور ہے (جلد ۳ حصہ اول ص ۱۹۱) حافظ ابن حجر نے اصابہ (ترجمہ عمر) میں لکھا ہے کہ یہ روایت مسند ابو یعلی اور عبد بن حمید وغیرہ میں بھی ہے، خصائص سیوطی میں ہے کہ یہ روایت حاکم، طبرانی، ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں بھی ہے،

روایت ہے کہ آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا تھا، اس دعا کو ابھی چند روز بھی نہین گذرے تھے کہ حضرت عمرؓ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، کارسازِ قدرت نے اس دعا کے قبول و تاثیر کا سامان کیونکر پیدا کیا؟ روایتوں میں اس کی تفصیل میں کچھ اختلاف ہے، استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد میں حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ جس طرح لکھا ہے، وہ حرف الفاروق کی نقل ہے، اس مین مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے لے کر جو سورہ پڑھی، اور جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے، وہ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ" یعنی سورۂ حدید تھی، اس میں شک نہیں کہ بزار، طبرانی، بیہقی، اور ابو نعیم میں یہ روایت بھی ہے لیکن حد درجہ کمزور ہے علاوہ ازین حضرت عمرؓ کا اسلام مکہ کا واقعہ ہے، اور سورۂ حدید مدنی ہے، اس کو حضرت عمرؓ اُس وقت کیونکر پڑھ سکتے تھے، استاذ مرحوم نے الفاروق مین یہ واقعہ کتب رجال و تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن حدیث و سیر کی صحیح روایتوں میں یہ واقعہ دو صورتون سے مذکور ہوا ہے، ایک تو وہی مشہور صورت ہے، کہ حضرت عمرؓ تلوار کمر سے لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادہ سے نکلے تھے کہ راہ مین ایک مسلمان سے ملاقات ہو گئی، اس نے حضرت عمرؓ کے ارادہ کا حال سُن کر کہا کہ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو، تمھاری بہن اور بہنوئی اس نئے دین مین داخل ہو چکے ہین، حضرت عمرؓ غصہ مین اپنی بہن کے گھر گئے، اور مار پیٹ کی، بالآخر انھون نے قرآن کی ایک سورہ بہن سے لے کر پڑھی، اور وہ سورۂ طٰہٰ تھی، اور جب اس آیت پر پہونچے،

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ — مین ہون خدا، کوئی خدا نہین لیکن مین تو مجھ کو

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ) یوجہ، اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کرو،

تو یہ اثر ہوا کہ دل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پکار اٹھے اور درِ اقدس پر حاضری کی درخواست کی، یہ واقعہ

یہ روایت بہ سند[1] ابن سعد، ابو یعلی، دار قطنی، حاکم اور بیہقی میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے،

لیکن یہ حد درجہ کمزور ہے، یہ دو طریقوں سے مروی ہے، اور ان دونوں میں ایسے رواۃ ہیں، جو

قبول کے لائق نہیں، اور محدثین نے اس کی تصریح کی ہے،

دوسری روایت مسند ابن حنبل میں[2] خود حضرت عمرؓ سے ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک شب میں

---

[1] طبع اول میں ہم نے اس واقعہ کو لکھا تھا کہ وہ "بہ سند صحیح" مذکور ہے مگر تحقیق سے یہ واقعہ اس "سند صحیح" کا نہیں ثابت ہوا"
دار قطنی نے اس روایت کو مختصراً لکھ کر کہا ہے کہ اس کا ایک راوی قاسم بن عثمان بصری قوی نہیں،
باب لطہارۃ للقرآن) ذہبی نے مستدرک حاکم (جلد ۴ صفحہ ۵۹) کے استدراک میں لکھا ہے کہ یہ روایت واہی اور منقطع
ہے، اور میزان الاعتدال میں قاسم بن عثمان بصری کے حال میں جو اس روایت کا ایک راوی ہے لکھا ہے اس نے حضرت عمرؓ
کے اسلام کا پورا قصہ بیان کیا ہے وہی منکر ہے جلد ۱، اور وہ نہایت ہی منکر ہے، کنز العمال (فضائل عمرؓ بن الخطاب) میں
بھی اس روایت کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے، ان روایتوں کے مشترک راوی اسحاق بن یوسف، قاسم بن عثمان اور
اسحاق بن ابراہیم الحسینی اور اسامہ بن زید بن اسلم ہیں، اور یہ سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں لیکن باایں ہمہ کہ یہ روایت
اپنی سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے تاہم اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، اُن میں سے متعدد ٹکڑوں کی صحیح
روایتوں سے تائید ملتی ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کا اپنی بہن اور بہنوئی کو اُن کے مسلمان ہو جانے پر آزار دینا۔
(بخاری اسلام سعیدؓ بن زید) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمرؓ کے اسلام کے لئے دعائے خیر کرنا (ترمذی
و حاکم) اور متعدد طریقوں سے ایک واقعہ کا ذکر ہونا گو وہ سب ضعیف ہی کیوں نہ ہوں کچھ نہ کچھ اصلیت کا
پتہ دیتا ہے، اس لئے ہم نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے،

[2] جلد اول ص ۱۷، اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن ابتدائی راوی کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں
اس لئے اس میں انقطاع ہے لیکن حضرت عمرؓ کے اسلام کے بارہ میں سب سے محفوظ روایت یہی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھیڑنے کو نکلا آپ بڑھ کر مسجد حرام میں داخل ہو گئے اور نماز شروع کر دی اس وقت آپ نے سورۂ الحاقہ قرأت فرمائی، میں کھڑا سنتا رہا۔ اور قرآن کے نظم اور اسلوب سے حیرت میں تھا، دل میں کہا، خدا کی قسم یہ شاعر ہے، جیسا قریش کہا کرتے ہیں، ابھی یہ خیال تھا ہی کہ آپ نے یہ آیت پڑھی،

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ وَّمَا	یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے، اور یہ
ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلًا مَّا	کسی شاعر کا کلام نہیں، تم بہت کم ایمان
تُؤْمِنُوْنَ، (الحاقہ - ۲)	رکھتے ہو،

میں نے کہا یہ تو کاہن ہے، میرے دل کی بات جان گیا کہ اس کے بعد ہی یہ آیت پڑھی،

وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ قَلِیْلًا	یہ کاہن کا کلام بھی نہیں، تم بہت کم
مَّا تَذَکَّرُوْنَ ہ تَنْزِیْلٌ مِّنْ	نصیحت پکڑتے ہو، یہ تو جہانوں کے
رَّبِّ الْعَالَمِیْنَ، (الحاقہ - ۲)	پروردگار کی طرف سے اترا ہے،

آپ نے یہ سورہ آخر تک پڑھی، اور اس کو سن کر اسلام میرے دل میں پوری طرح گھر کر گیا،

ابن اسحاق نے ان دونوں روایتوں کو بہت کچھ گھٹا بڑھا کر بغیر کسی سند کے اپنی سیرت میں لکھا ہے، اس لئے وہ اس باب میں سند کے قابل نہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں یہ دونوں روایتیں لکھ کر چھوڑ دی ہیں، اور یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ان دونوں واقعوں میں سے مرجح کون ہے؟ اور اگر دونوں قابل قبول ہیں، تو ان کی ترتیب کیا ہے؟ میرا خیال

یہ ہے کہ اگر یہ دونوں واقعے صحیح ہیں، تو اُن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ نے آپ کو نماز میں سورۃ الحاقہ پڑھتے سُنا، اور اس سے اُن کو اسلام کی طرف میلان ہوا، جیسا کہ اُن کے اُس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوقع الاسلام فی قلبی کل موقع یعنی اسلام میرے دل میں پوری طرح بیٹھ گیا" تاہم چونکہ وہ طبعاً مستقل اور پختہ کار تھے، اس لئے اپنے اسلام کا انھوں نے اعلان نہیں کیا بلکہ اس اثر کو وہ شاید روکتے رہے، لیکن اس کے بعد جب اُن کی بہن کا واقعہ پیش آیا، اور سورۂ طٰہٰ پر نظر پڑی تو پھر دل پر قابو نہ رہا، اور جوشِ حق کا چشمہ اُن کی زبان و دل سے بے اختیار اُبل پڑا، اور فوراً درِ اقدس پر حاضری کی درخواست پیش کی، حضرت انسؓ کی اسی روایت میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنا یہ شوق ظاہر کیا، حضرت خبابؓ جو حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو سورۂ مذکور کی تعلیم دے رہے تھے، اور حضرت عمرؓ کی آواز سُن کر گھر میں چھپ گئے تھے، بے تامل نکل کر سامنے آگئے، اور بشارت دی کہ "اے عمر! نوید مژدہ! کہ جمعرات کی رات کو تمھارے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا کی تھی، شاید اُس کے پورے ہونے کا دن آگیا، حضور نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا! عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام (ابوجہل) سے اسلام کو عزت دے"[1]

غور کرو کہ یہ دعاے نبویؐ کس طرح حرف بہ حرف پوری ہوئی، نہ صرف یہ کہ حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا، بلکہ اُن کی ذات سے اسلام کو وہ عزت نصیب ہوئی جس کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی دنیا کو اعتراف ہے، عبداللہ بن مسعودؓ گواہی دیتے ہیں کہ "ما زلنا اعزۃ منذ اسلم عمر، حضرت عمرؓ جب اسلام لائے، ہم مسلمانوں کو عزت اور قوت حاصل ہوگئی"[2]

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اسلام عمر

کی اس عزت کو اگر سوانحِ فاروقی کے کارناموں میں تلاش کرو، تو دعاے نبوی کے قبول و اجابت کا پُرحیرت سمان نگاہوں کے سامنے گذر جائے گا.

سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں کا دھنس جانا

جب آپ ہجرت کی غرض سے مدینہ کو روانہ ہوئے تو کفار کے جاسوسوں میں سراقہ نے آپ کا پیچھا کیا، اور آپ سے اس قدر قریب آگیا کہ حضرت ابوبکرؓ گھبرا کے بول اٹھے کہ "ہم آئے گئے" آپ نے اُن کی دل دہی کی، اور دعا فرمائی جس کے اثر سے اُس کے گھوڑے کے پانون زمین میں دھنس گئے، سراقہ نے یہ حالت دیکھ کر کہا کہ تم دونون نے مجھے بددعا دی، اب دعا کرو تو میں تمام لوگون کو تمہارے تعاقب سے واپس لیجاؤں، آپنے اُس کے لئے دعا فرمائی، اور اُس نے اس مصیبت سے نجات پائی، وہان سے واپس آیا تو تمام تعاقب کرنے والون کو واپس لے گیا"[۲]

مدینہ کی آب و ہوا کے لیے دعا

مدینہ کی آب و ہوا اچھی نہ تھی، وبا کا بھی اثر تھا، اکثر مہاجرین یہان آکر بیمار پڑ گئے، اس حالت میں لوگون کو بار بار اپنا وطن مکہ یاد آنے لگا، یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ "الٰہی! مدینہ کو بھی ہمارے لئے ویسا ہی محبوب کردے، جیسا کہ ہم کو مکہ محبوب ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب بنادے، الٰہی! ہمارے صاع اور مد میں برکت دے، اور اس کو ہمارے لئے صحت بخش بنادے، اور یہاں کا بخار جحفہ میں منتقل کردے[۳]" یہ دعا حرف بحرف قبول ہوئی، مہاجرین کو اس شہر سے جو محبت ہوگئی،

---

[۱] بخاری باب علامات النبوۃ [۲] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح مسلم باب الترغیب فی سکنی المدینۃ و باب صیانۃ المدینۃ، [۳] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح مسلم باب الترغیب فی سکنی المدینۃ،

وہ اُن کی زندگی کے واقعات سے ظاہر ہے، وہی ابوبکرؓ و بلالؓ جو چند روز میں یہان سے گھبرا اُٹھے تھے، اُس کے ایسے والہ و شیدا ہوئے کہ پھر مکہ کا نام بھی نہین لیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہان سے وبا کا دُور ہونا خواب میں دکھایا گیا[1]،

قحط کا دور ہونا اور پانی کا برسنا

ہجرت سے پہلے مکہ مین جب قحط پڑا تھا تو مسلمانوں نے نہین، کافرون نے جا کر آپؐ سے درخواست کی کہ دعا کیجئے، آپ نے دعا فرمائی تو پانی برسا[2]۔

حضرت ابوطالب عمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید اسی منظر کو دیکھ کر آپ کی مدح میں یہ شعر کہا تھا،

وَاَبیَضُ یُستسقی الغمام بوجهه ثمال الیتامیٰ عصمة للارامل

محمد گورے رنگ والا ہو اُس کے چہرہ کے وسیلہ سے ابر باران کی سیرابی مانگی جاتی ہو، یتیموں کی جا پناہ اور بیواؤں کا بچاؤ ہو،

حضرت ابنِ عمرؓ کہتے ہین کہ آپ جب پانی برسنے کی دعا مانگتے، تو میں آپ کے چہرہ مبارک کو تکتا رہتا، اور ابوطالب کا یہ شعر یاد آتا، آپ دعا مانگ کر منبر سے اُترنے بھی نہیں پاتے تھے کہ مدینہ کا ہر پانالہ زور شور سے بہنے لگتا[3]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے متعدد واقعے حضرت ابنِ عمرؓ کے سامنے گذرے تھے، حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت مین جب قحط پڑا تو حضرت عمرؓ نے دعا مانگی، کہ خداوندا! ہم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مین اس کو وسیلہ بنا کر تیرے سامنے پیش کرتے تھے، تو تو ہم کو سیراب کرتا تھا[4]"

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرویا، والتعبیر [2] صحیح بخاری ابواب الاستسقاء [3] صحیح بخاری وابن ماجہ ابواب الاستسقاء

[4] صحیح بخاری ابواب الاستسقاء

ایک دفعہ مدینہ میں خشک سالی ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لیکر نکلے اور کھڑے ہو کر بارگاہِ الٰہی میں دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر دعا مانگی، پھر قبلہ رخ ہو کر چادر الٹی، اور دو رکعت نماز پڑھی، ابر آیا، پانی برسا اور لوگ سیراب ہوئے[1]۔

دعاے نبویؐ سے پانی برسنے کا سب سے حیرت انگیز لیکن مستند تر واقعہ حسبِ ذیل ہے، جو متعدد طریقوں اور سلسلوں سے احادیث میں مذکور ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک بار مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں قحط پڑا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اسی حالت میں ایک شخص نے کہا "یا رسول اللہ مویشی ہلاک ہو گئے، لوگ بھوکوں مر گئے، خدا سے دعا فرمائیے کہ ہم کو سیراب کرے" آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، یہ اثر ہوا کہ پہلے تو آسمان آئینہ کی طرح صاف تھا، اور اب ایک آندھی چلی، بادل امنڈ آئے، اور آسمان کا دہانہ کھل گیا، لوگ مسجد سے نکلے تو پانی میں بھیگتے ہوئے مکان تک پہنچے، ایک ہفتہ تک متصل پانی برستا رہا، یہانتک کہ لوگ گھبرا اٹھے اور دوسرے جمعہ کو اسی آدمی نے یا کسی اور نے کہا "یا رسول اللہ مکانات گر گئے، دعا کیجئے کہ خدا پانی کو روک لے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر دعا فرمائی، بادل پھٹ گئے، اور مدینہ تاج کی طرح چمک اٹھا[2]،

ابن ماجہ باب الاستسقاء میں اس قسم کے دو واقعے اور لکھے ہیں، اگر وہ اس واقعہ سے الگ ہیں تو اس قسم کے دو واقعوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ ابواب الاستسقاء [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ وابواب الاستسقاء صحیح مسلم باب صلوٰۃ الاستسقاء بطرق متعددۃ،

حضرت انسؓ کے حق میں دعاے برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ ان کو چادر میں لپیٹ کر لائیں اور آپؐ کی خدمت میں بطور خادم کے پیش کیا، اور ان کے لیے دعا کی درخواست کی، آپنے ترقی مال و اولاد کی دعا دی، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ "آج اس دعا کی برکت سے میرے پاس بکثرت دولت ہے، اور میرے لڑکوں اور پوتوں کی تعداد سنو کے قریب پہنچ گئی ہے"[1] اس دعا کا یہ اثر تھا کہ حضرت انسؓ ابن مالک کا ایک باغ تھا، جو سال میں دو بار پھل لاتا تھا، اور اس میں ایک پھول کا درخت تھا جس سے مشک کی بو آتی تھی،[2]

حضرت ابن عباسؓ کے حق میں دعائے علم

ایک بار آپ قضاے حاجت کے لیے گئے، حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ نے پہلے ہی سے وضو کا پانی بھر کے رکھدیا، آپنے ان کو تفقہ فی الدین کی دعا دی[3] چنانچہ ان کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ انھوں نے حبرالامۃ کا خطاب پایا،

حضرت ام حرامؓ کے حق میں دعائے شہادت

ایک روز آپ اُمّ حرامؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، انھوں نے آپ کو کھانا کھلایا، اور سر سے جوئیں نکالنے لگیں، اسی حالت میں آپ کو نیند آگئی، پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، تو ام احرامؓ نے ہنسی کی وجہ پوچھی، آپنے فرمایا "میری امت میں سے مجاہدین کا ایک گروہ میرے سامنے پیش کیا گیا، جو بغرض جہاد دریا میں اس طرح سوار ہوکر چلے گا جس طرح تخت پر بادشاہ" ام حرامؓ نے درخواست کی کہ خدا سے دعا فرمائیے کہ میں بھی انہی میں سے ہوں، چنانچہ آپنے دعا فرمائی اور امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ان کو بحری جنگ کا شرف حاصل ہوا،

---

[1] مسلم فضائل انس بن مالک [2] ترمذی مناقب انس [3] مسلم فضائل عبداللہ بن عباسؓ،

اور دریا سے نکل کر خشکی میں آئیں تو سواری سے گر کر درجۂ شہادت حاصل کیا،[1]

ایک نوجوان کی ہدایت کے لیے دعا

حضرت ابو امامہ باہلیؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اصحاب کے حلقہ میں تشریف فرما تھے، ایک نوجوان نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ مجھے زنا کی اجازت دیجئے، یہ سن کر چاروں طرف سے اس پر لوگوں نے ملامت شروع کی، آپ نے روکا، پھر اس نوجوان کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور دلدہی سے پوچھا کہ "تم اس فعل کو اپنی ماں کے لیے پسند کروگے"؟ عرض کی "آپ پر قربان، نہیں یا رسول اللہ! فرمایا "تو اور لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے نہیں پسند کریں گے" "تو کیا تم اپنی بیٹی کے لیے یہ پسند کروگے"؟ عرض کی نہیں یا رسول اللہ! فرمایا "تو اور لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے اسکو پسند نہ کریں گے" "تو کیا اپنی بہن کے لیے یہ پسند کروگے" گذارش کی "نہیں یا رسول اللہ" فرمایا "تو اور لوگ بھی اپنی بہنوں کے لیے یہ پسند نہ کریں گے" پھر اسی طرح خالہ اور پھوپھی کے متعلق آپ نے پوچھا، اس نے وہی جواب دیا، اور آپ بھی اسی طرح فرماتے گئے، اس کے بعد اس پر ہاتھ رکھکر دعا کی کہ "خداوندا اس کے گناہوں کو بخش، اور اس کے دل کو پاک اور اس کو عصمت عطا کر" ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نوجوان کا یہ حال تھا کہ وہ کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا تھا،[2]

حضرت سعد بن وقاص کی شفایابی کے لیے دعا

حضرت سعد بن وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں مکہ گیا، اور وہاں جا کر ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے کے

[1] بخاری کتاب الجہاد [2] مسند احمد جلد ۵ ص ۲۵۶ بہ سند صحیح و شعب الایمان بیہقی،

قریب ہو گیا، یہاں تک کہ وصیت کی تیاری کی، آپ عیادت کو تشریف لائے تو عرض کی یا رسول اللہ! میں اس سرزمین میں مرتا ہوں جس سے ہجرت کی تھی، آپ نے فرمایا "نہیں انشاء اللہ۔"[1] پھر تین دفعہ دعا کی کہ "الٰہی سعد کو شفا دے، سعد کو شفا دے، سعد کو شفا دے"۔[2] چنانچہ ان کو شفا ہوئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چودہ پندرہ برس تک زندہ رہے، اور لشکر عراق کے امیر مقرر ہوئے،

حضرت سعد بن ابی وقاص کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا

ان ہی حضرت سعد بن وقاص کے حق میں آپ نے دعا فرمائی تھی کہ "خداوندا! ان کو مستجاب الدعوات بنا۔"[3] چنانچہ اس کا یہ اثر تھا کہ وہ جس کو دعا دیتے تھے وہ یقیناً قبول ہو جاتی تھی، کوفہ کی امارت کے زمانہ میں بعض شریروں نے بارگاہ فاروقی میں ان کی غلط شکایت کی، حضرت عمرؓ نے تحقیق حال کے لیے آدمی بھیجا، وہ ایک ایک مسجد میں جا کر لوگوں سے حضرت سعدؓ کے متعلق حالات دریافت کرتا پھرتا تھا، ایک محلہ کی مسجد میں ایک شخص نے جھوٹی گواہی دی کہ وہ نماز بھی ٹھیک نہیں پڑھاتے، یہ سن کر حضرت سعدؓ بے اختیار ہو گئے، فرمایا "خداوندا! اگر یہ جھوٹا ہو تو اسکو آزمایش میں ڈال"۔ اس شخص کا یہ حال ہو گیا تھا کہ بوڑھے ہو کر اس کی پلکیں لٹک آئی تھیں، تاہم بازاروں میں چھوکریوں کو چھیڑتا پھرتا تھا، اور کہتا تھا کہ سعدؓ کی بد دعا مجھے لگ گئی"۔[4] احادیث و سیر میں ان کی قبولیتِ دعا کے اور بھی واقعات مذکور ہیں۔

حضرت عروہؓ کے حق میں دعاے برکت

ایک بار آپ نے حضرت عروہؓ کو ایک دینار دیا کہ

---

[1] نسائی کتاب الوصیۃ [2] صحیح مسلم کتاب الوصیۃ [3] ترمذی مناقب سعد بن ابی وقاص [4] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ

اس کی ایک بکری خرید لائیں، انھوں نے اس سے دو بکریاں خریدیں، ایک کو ایک دینار پر فروخت کر ڈالا، اور آپؐ کی خدمت میں دوسری بکری اور دینار کو پیش کیا، آپ نے ان کو خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا کی، اور اس کا یہ اثر ہوا کہ اگر وہ مٹی بھی خریدتے تھے تو اس میں نفع ہوتا تھا،[1]

ابو امامہ باہلیؓ کے حق میں دعاے سلامتی

حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں فوج بھیج رہے تھے، میں نے حاضر ہو کر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! میرے لیے دعا کیجئے کہ شہادت نصیب ہو" فرمایا "خداوندا! ان کو سالم و غانم واپس لا"، چنانچہ ہم صحیح و سلامت مالِ غنیمت لیکر واپس آئے، پھر کہیں فوج جانے لگی، میں نے پھر وہی درخواست کی، آپ نے پھر وہی دعا دی اور پھر وہی ہوا، تیسری مرتبہ پھر یہی موقع پیش آیا، میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! میں نے دو دفعہ دعاے شہادت کی درخواست پیش کی قبول نہ ہوئی اب یہ تیسرا موقع ہے" آپ نے پھر وہی دعا دی اور وہی نتیجہ تھا،[2]

حضرت ابو طلحہؓ کے حق میں برکت اولاد کی دعا

حضرت ابو طلحہؓ کی بیوی نہایت ہوشمند اور اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر دل سے فدا تھیں، ایک دفعہ ان کا بچہ بیمار ہوا، حضرت ابو طلحہؓ گھر سے باہر ہی تھے کہ بچہ نے دم توڑ دیا، بیوی نے بچہ کو ایک گوشہ میں لٹا دیا، ابو طلحہؓ جب گھر واپس آئے تو بیوی سے دریافت کیا کہ بچہ کیسا ہے؟ نیک بخت نے جواب دیا کہ "وہ آرام پا گیا" ابو طلحہؓ سمجھے کہ وہ اچھا ہے، دونوں میاں بیوی ایک ہی بستر پر سوئے، ابو طلحہؓ صبح کو اٹھے

---

[1] بخاری باب علامات النبوۃ [2] مسند احمد جلد ۵ ص ۲۴۸ و ابو یعلیٰ و بیہقی۔

غسل کر کے مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کو جانے لگے، تو بیوی نے اصل حقیقت ظاہر کی، ابو طلحہؓ نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب کا ماجرا سنایا تو فرمایا شاید کہ خدا نے آج شب کو برکت عطا کی ہو، چنانچہ اس شب کی برکت مقررہ مہینوں کے بعد پوری ہوئی[1]، ایک انصاریؓ کہتے ہیں کہ برکت کا یہ اثر ہوا کہ میں نے ابو طلحہؓ کی نو اولادیں دیکھیں اور سب کی سب قرآن خواں تھیں[2]،

حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ کے حق میں دعاے ہدایت

حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ کافرہ تھیں، ابو ہریرہؓ ان کو دعوتِ اسلام دیتے تھے، لیکن وہ نہیں مانتی تھیں، ایک دن انھوں نے حسب دستور دعوتِ اسلام دی، تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا، حضرت ابو ہریرہؓ کو سخت تکلیف ہوئی، وہ روتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس ناگوار واقعہ کا ذکر کیا اور درخواست کی کہ میری والدہ کے لیے ہدایت کی دعا فرمایئے، آپؐ نے دعا کی کہ "خداوندا! ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت نصیب کر" حضرت ابو ہریرہؓ کو اس دعا کے قبول ہونے کا اس درجہ یقین تھا کہ وہ خوش خوش گھر واپس آئے دیکھا کہ دروازہ بند ہے، ماں نے پانوں کی آہٹ سنی تو کہا کہ دروازے پر ٹھہرے رہو، حضرت ابو ہریرہؓ کو پانی گرنے کی آواز بھی محسوس ہوئی، جب وہ غسل کر کے کپڑے بدل چکیں تو دروازہ کھولا اور کلمۂ شہادت پڑھا، حضرت ابو ہریرہؓ خوشی کے مارے الٹے پانوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے اور آپ کو مژدہ سنایا، آپؐ نے خدا کا

---

[1] صحیح مسلم فضائل ابی طلحہؓ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من لم یظہر الحزن عند المصیبة

شکر کیا اور دونوں کو دعا دی[1]،

اونٹ کا تیز ہو جانا | ایک غزوہ میں حضرت جابرؓ کی سواری کا اونٹ اس قدر تھک گیا، یا بیمار ہو گیا تھا کہ تقریباً چل نہیں سکتا تھا، آپ نے دیکھا تو دعا دی، اور اب وہ اس قدر تیز ہو گیا کہ تمام اونٹوں کے آگے آگے رہتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر پھر دریافت کیا کہ "اے جابر! اب کیا حال ہے" ؟ عرض کی، آپ کی دعا، کی برکت قبول ہوئی[2]،

بیمار کا اچھا ہونا | آپ ایک صحابی کی عیادت کو تشریف لے گئے، جو ضعف سے چور ہو گئے تھے، آپ نے فرمایا کیا تم صحت کی حالت میں خدا سے کوئی دعا کرتے تھے، انھوں نے کہا "ہاں میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ مجھے آخرت میں جو عذاب دینا ہے وہ دنیا ہی میں دیدے" آپ نے فرمایا "سبحان اللہ! تم دنیا کے عذاب کے متحمل نہیں ہو سکتے تو تم نے یہ دعا کیوں نہیں کی،

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً	خداوندا ہم کو دنیا و آخرت دونوں
وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا	میں بھلائی دے، اور دوزخ کے عذاب
عَذَابَ النَّارِ (بقرہ-۲۵)	سے محفوظ رکھ

اس کے بعد آپ نے درگاہ خداوندی میں دعا کی اور خدا نے ان کو شفا عطا فرمائی[3]،

سواری کی قوت آجانا | حضرت جریرؓ ایک صحابی تھے، جو گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر نہیں بیٹھ سکتے تھے

[1] صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہؓ [2] بخاری کتاب الجہاد [3] صحیح مسلم کتاب الدعوات باب کراہۃ الدعا بتعجیل العقوبۃ فی الدنیا،

ایک بار آپ نے ان کو ذی الخلیفہ کے بتخانے کے ڈھانے کے لیے بھیجنا چاہا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گھوڑے پر جم کر نہ بیٹھنے کی شکایت کی، آپ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا، اور دعا دی کہ "خداوندا! اس کو گھوڑے پر بیٹھنے کی قوت دے اور اس کو ہادی و مہدی بنا۔" چنانچہ وہ گئے اور اس میں آگ لگا کر آئے۔[1]

ایک مغرور کا ہاتھ شل ہو جانا آپ کے سامنے ایک شخص نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا، آپ نے فرمایا "دائیں ہاتھ سے کھاؤ"، اس نے غرور سے کہا "میں اس سے کھا نہیں سکتا۔" چونکہ اس نے غرور سے ایسا کہا تھا، آپ نے فرمایا "خدا کرے ایسا ہی ہو" چنانچہ اسکے بعد ایسا ہوا کہ وہ دائیں ہاتھ کو اٹھا کر واقعی اپنے منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا۔[2]

قبیلۂ دوس کا مسلمان ہونا ایک بار حضرت طفیل دوسیؓ اپنے رفقاء کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا "یا رسول اللہ دوس کے قبیلہ نے دعوتِ اسلام کے قبول کرنے سے انکار کیا، آپ اُس پر بد دعا فرمائیے لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی،

اللھم اھد دوسا وائت بھم[3] — خداوندا دوس کو ہدایت دے اور ان کو لا،

بالآخر یہ دعا قبول ہوئی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو کر حاضرِ خدمت ہوا،

رفع بے پردگی کے لیے دعا ایک حبشیہ عورت نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ "مجھے صرع کا دورہ ہوتا ہے جس سے میں بے پردہ ہو جاتی ہوں، میرے لیے دعا فرمائیے" ارشاد ہوا "اگر صبر کرنا چاہو تو تمھیں جنت نصیب ہو گی اور اگر کہو تو میں دعا کروں کہ

---

[1] صحیح مسلم فضائل جریر بن عبداللہ بجلیؓ [2] صحیح مسلم باب آداب الطعام والشراب واحکامہا [3] صحیح بخاری قصۂ دوس (کتاب الجہاد) و مسلم فضائل غفار و اسلم و دوس وغیرہا۔

خدا تم کو صحت دے اس نے کہا "میں صبر کرتی ہوں لیکن سر برہنہ عورت کے لیے دعا فرمایئے"۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے لیے دعا کی[۱]،

سلطنتِ کسریٰ کی تباہی

پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کے لیے جب کسریٰ کے پاس خط بھیجا تو اس نے خط کو چاک کر کے پھینک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے اس کو بد دعا دی کہ اس کے بھی پرزے پرزے اڑ جائیں[۲]، چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی سلطنت کے پرخچے اڑ گئے،

دعائے برکت کا اثر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فوج کو صبح تڑکے روانہ فرماتے تھے اور تمام امت کے لیے دعا کی تھی کہ "خداوندا! میری امت کو صبح کے سویرے میں برکت دے"، ایک تجارت پیشہ صحابیؓ نے اس پر عمل کیا اور اپنا سامان تجارت عموماً صبح سویرے روانہ کرنا شروع کیا، چنانچہ اس دعا کی برکت ظاہر ہوئی اور وہ اتنے دولتمند ہو گئے کہ ان کو اپنی دولت کے رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی[۳]،

طول عمر کی دعا

ام قیسؓ ایک صحابیہ تھیں، ان کا لڑکا مر گیا، تو وہ اس قدر بد حواس ہو گئیں کہ غسل جنازہ دینے والے سے کہا کہ میرے بچے کو ٹھنڈے پانی سے غسل نہ دو ورنہ مر جائیگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو مسکرائے اور ان کو طولِ عمر کی دعا دی، چنانچہ انھوں نے تمام عورتوں سے زیادہ عمر پائی[۴]،

۱؎ صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ من المرض و کتاب البر والصلۃ ۲؎ صحیح بخاری کتاب الجہاد ۳؎ ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ ص ۱۶۳ باب ما یرجی من البرکۃ فی البکور و مسند احمد جلد ۳ ص ۴۳۲ عن صخر الغامدی ۴؎ نسائی کتاب الجنائز ص ۳۰۶ و ادب المفرد امام بخاری

ایک بچہ کی ہدایت کے لیے دعا، رافع بن سنان نے اسلام قبول کرلیا، لیکن بی بی نے جس کی گود میں ایک لڑکی تھی، اس سعادتِ ابدی سے انکار کیا، اب اختلافِ مذہب کی بنا پر لڑکی کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی، بارگاہ نبوت میں مقدمہ پیش ہوا، آپ نے دونوں کو الگ الگ بٹھایا، اور کہا کہ لڑکی کو بلاتے جاؤ، دونوں نے بلایا تو لڑکی ماں کی طرف بڑھی، آپ نے اس حالت کو دیکھ کر دعا فرمائی کہ "خداوندا! اس کو ہدایت دے" اس کا یہ اثر ہوا کہ لڑکی کا رخ فوراً باپ کی طرف پھر گیا، یہ ابوداؤد کی روایت ہے،[1]

ابن سعد نے اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابوسلمہ صحابیؓ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بچہ تھے، ان کے دادا اور نانا میں سے ایک کافر اور ایک مسلمان تھا، دونوں نے بچہ کی تولیت کا دعویٰ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ خود بچہ کے اختیار پر رکھ دیا، پہلے تو بچہ اپنے کافر رشتہ دار کی طرف چلا، آپ نے فرمایا "خدایا اس کو ہدایت دے" فوراً بچہ مسلمان عزیز کی طرف چلا گیا، اور فیصلہ اسی کے حق میں رہا،[2]

---

[1] ابوداؤد ص ۲۲۲ کتاب الطلاق باب اذا اسلم احد الابوین مع من یکون الولد [2] ابن ماجہ باب تخییر الصبی بین ابویہ میں بھی یہ روایت ہے۔

اشیاء میں اضافہ

مسلمانوں کی ابتدائی زندگی جس فقر و فاقہ میں گذری تھی اس کا حال کتاب کے مختلف حصوں میں پڑھ چکے ہو، کئی کئی دن گذر جاتے تھے کہ ان کو کھانے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی، ایسی حالت میں اگر برکتِ الٰہی ان کو اپنا خاص مہمان نہ بنا لیتی تو ان کا کیا حشر ہوتا؟ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے تھوڑی سی روٹی اور مچھلی سے کئی سو آدمیوں کو شکم سیر کر دیا، اور یہ ان کا بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک اور فیضِ روحانی سے ایک دفعہ نہیں متعدد دفعہ اس قسم کے برکات ظاہر ہوئے،

تھوڑے سے کھانے میں ستر اسی آدمیوں کا سیر ہونا

ایک دن حضرت ابو طلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے محسوس کیا کہ آپ بھوک کی شدت سے ضعیف ہو رہے ہیں، گھر میں آئے، اور بی بی (ام سلیم) سے کہا کہ مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضعیف آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھوکے ہیں، تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انھوں نے جو کی چند روٹیاں دوپٹے میں لپیٹ کر حضرت انسؓ کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجیں، وہ روٹیاں لے کر آئے تو آپ صحابہؓ کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے، حضرت انسؓ سامنے کھڑے ہوئے تو آپ نے پوچھا "کیا ابو طلحہؓ نے تمھارے ہاتھ کھانا بھیجا ہے؟" انھوں نے کہا ہاں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام صحابہؓ کے ساتھ اٹھے، اور حضرت ابو طلحہؓ کے مکان پر تشریف لائے

حضرت انسؓ نے ان کو خبر کی تو انھوں نے بی بی سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت کے ساتھ تشریف لائے ہیں، اور ہمارے پاس کھلانے کا کوئی سامان نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوطلحہؓ کے ساتھ آئے اور ام سلمہؓ سے کہا کہ جو کچھ تمھارے پاس ہو لاؤ، انھوں نے وہی روٹیاں پیش کیں جو حضرت انسؓ کے ہاتھ بھیجی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انکو چورا کیا گیا، اور ام سلمہؓ نے گھی کا برتن اونڈیل دیا جس نے سالن کا کام دیا، لیکن ان ہی روٹیوں میں برکت ہوئی کہ آپؐ دس دس آدمیوں کو بلا بلا کے کھلاتے تھے اور وہ شکم سیر ہو ہو کے جاتے تھے، یہانتک کہ ستر اسی آدمی آسودہ ہو گئے[۱]

چھوہارے کے ڈھیر کا بڑھ جانا | حضرت جابرؓ کے والد نے اپنے اوپر یہودیوں کا قرض چھوڑ کر وفات کی، قرضداروں نے تقاضا کیا تو حضرت جابرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ والد نے اپنے اوپر قرض چھوڑ کر انتقال کیا ہے، اور بجز کھجوروں کے میرے پاس ادا کرنے کا کوئی سامان نہیں، صرف کھجوروں کی پیداوار سے کئی برس تک یہ قرض ادا نہیں ہو سکتا، آپؐ میرے ساتھ نخلستان میں تشریف لے چلیے، تا کہ آپکے ادب سے قرضدار مجھ پر سختی نہ کریں، آپ ان کے ساتھ تشریف لائے اور کھجوروں کا جو ڈھیر لگا ہوا تھا، اس کے گرد چکر لگا کر دعا کی، اور اسی پر بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ اپنے اپنے قرض میں لیتے جاؤ، آپؐ کی دعا کی تاثیر سے ان ہی کھجوروں میں یہ برکت ہوئی کہ تمام قرض ادا ہو گیا، اور جس قدر کھجوریں قرضداروں کو دی گئی تھیں، اتنی ہی بچ رہیں،[۲]

---

[۱] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [۲] ایضاً

کھانے میں حیرت انگیز برکت

چونکہ اصحاب صفہ بالکل محتاج تھے اور ان کی معاش کا کوئی سامان نہ تھا، اس لیے آپ نے ایک بار حکم دیا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کے کھانے کا سامان ہو وہ اصحابِ صفہ میں سے ایک کو، اور جن کے پاس چار آدمیوں کی غذا ہو وہ دو کو اپنے ساتھ لیجائے اور کھانا کھلائے، چنانچہ اس اصول کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں دس اور حضرت ابوبکرؓ کے حصے میں تین آدمی آئے، یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے گھر میں آئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے یہاں کھانا کھایا، اور آپ کے ساتھ عشا کی نماز پڑھی، اس لیے کسی قدر رات گذر گئی، وہ گھر میں دیر کر کے آئے تو ان کی بیوی ام رومان نے کہا کہ مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں رہ گئے؟ انھوں نے کہا کیا تم نے ان کو کھانا نہیں کھلایا؟ وہ بولیں بغیر تمھارے ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا، حضرت ابوبکرؓ نہایت برہم ہوئے اور ان لوگوں کو کھلانا شروع کیا، وہ لوگ جو لقمہ اٹھاتے تھے اس میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوجاتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ لوگ شکم سیر ہو کر کھا چکے تو بچا ہوا کھانا پہلے سے بھی زیادہ نکلا، حضرت ابوبکرؓ نے اس برکت کو دیکھ کر ام رومان کی طرف مسرت سے دیکھا، اور غصہ میں اگرچہ کھانے کی قسم کھا چکے تھے لیکن قسم توڑنے کے لیے ایک لقمہ اس میں سے کھایا اور تمام کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھیجدیا، وہ کھانا آپ کے گھر میں صبح تک رہا، دوسرے روز آپ کی خدمت میں ۱۲ آدمی آئے، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ کئی کئی آدمی خدا جانے کتنے تھے، آپ نے وہ کھانا ان کے پاس بھیجدیا اور وہ لوگ بھی سیر ہو گئے،[1]

---

[1] بخاری باب علامات النبوۃ،

گھی کی مقدار میں برکت ام مالکؓ کا دستور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمیشہ ایک برتن میں گھی ہدیۃً بھیجا کرتی تھیں، جب ان کے بچے سالن مانگتے اور گھر میں نہ ہوتا تو وہ اس برتن کو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھی بھیجتی تھیں، اٹھا لاتیں اور اس میں سے بقدر ضرورت گھی نکل آتا، ایک دن انھوں نے اس برتن کو نچوڑ لیا، پھر آپؐ کی خدمت میں آئیں تو آپؐ نے فرمایا "اگر تم نے اس کو نچوڑ نہ لیا ہوتا تو ہمیشہ اس میں سے گھی نکلا کرتا"۔[1]

جو کی مقدار میں برکت ایک بار ایک شخص نے آپؐ سے غلہ مانگا، آپؐ نے تھوڑے سے جو دیدیے، اس میں اس قدر برکت ہوئی کہ وہ روز اپنے لیے، اپنی بی بی کے لیے، اپنے مہمان کے لیے اس میں سے صرف کرتا تھا، اور اس میں کمی نہ ہوتی تھی، ایک دن اس نے اس کو تولا لیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ نے فرمایا، اگر تم اس کو نہ تولتے تو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا۔[2]

کھانے میں حیرت انگیز اضافہ غزوۂ احزاب میں تمام مہاجرین اور انصار خندق کھود رہے تھے، حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت بھوکے ہیں، وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور پوچھا کہ تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انھوں نے ایک صاع جو نکالا، اور گھر میں ایک بکری تھی، حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کیا، اور بی بی نے آٹا گوندھا، گوشت دیگچی میں چڑھایا گیا تو حضرت جابرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لینے کے لیے چلے، بی بی نے کہا کہ دیکھو آپؐ کے ساتھ لوگوں کو لاکر مجھے رسوا نہ کرنا، حضرت جابرؓ آئے اور چپکے سے آپؐ کے کان میں

---

[1] صحیح مسلم باب معجزات النبیؐ و مسند احمد عن جابرؓ [2] ایضاً

کہا کہ ہم نے کھانے کا انتظام کیا ہے. آپ چند اصحاب کے ساتھ تشریف لے چلئے. لیکن آپ نے تمام اہل خندق کو پکارا کہ "آؤ جابرؓ نے دعوت عام کی ہے" اور حضرت جابرؓ سے کہا کہ جب تک میں نہ آلوں چولھے سے دیگچی نہ اتاری جائے، اور روٹی نہ پکے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کو لیکر روانہ ہوئے، حضرت جابرؓ گھر میں آئے تو بی بی نے برا بھلا کہنا شروع کیا، انھوں نے کہا میں کیا کروں، تم نے جو کہا تھا میں نے اس کی تعمیل کر دی، آپؐ آئے، تو بی بی نے آپ کے سامنے آٹا پیش کیا. آپ نے اس میں اپنا لعاب دہن ملا دیا، اور برکت کی دعا دی، پھر اسی طرح دیگچی میں بھی لعاب دہن ڈالا اور دعاے برکت کی، اس کے بعد آپ نے روٹی پکانے اور سالن نکالنے کا حکم دیا، کم وبیش ایک ہزار آدمی تھے، سب کھا کر واپس گئے، لیکن گوشت اور آٹے میں کوئی کمی نہیں ہوئی،[1]

تھوڑی سی زاد راہ میں غیر معمولی برکت

غزوۂ تبوک میں صحابہؓ کو بھوک کی اتنی تکلیف ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواریوں تک کے ذبح کرنے کی اجازت دیدی حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی، آپ بچا ہوا زاد راہ سب سے طلب فرمائیں اور اس پر دعاے برکت کریں، ممکن ہے کہ خدا اس میں ان کا بھلا کر دے، آپ نے ایک چادر بچھوائی اور تمام فوج کا زاد راہ جمع کرا دیا، اور اس پر برکت کی دعا کی، پھر تمام لوگوں سے فرمایا کہ اپنے اپنے برتن بھر لیں، لوگوں نے تمام برتن بھر لیے اور خوب سیر ہو کر کھایا، یہاں تک کہ کھانے سے بچ گیا۔[2]

---

[1] بخاری جلد ۲ ص ۵۸۹ ذکر غزوۂ خندق [2] صحیح مسلم جلد اول ص ۳۲ مصر، کتاب الایمان

تھوڑی سی زاد راہ میں عظیم برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے، صحابہ بھوک سے اسقدر بیتاب ہوئے کہ اونٹنیاں ذبح کرنا چاہیں، لیکن آپنے تمام لوگوں کے زاد راہ کے جمع کرنے کا حکم دیا، ایک چادر بچھائی گئی، اور اس پر تمام زاد راہ ڈھیر کیا گیا، اس تمام سامان کی مجموعی مقدار نے صرف اسقدر زمین کا احاطہ کیا، جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی، اور اشخاص کی تعداد ۱۴سو تھی، لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا، اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے، کھانے کے بعد آپنے پانی طلب فرمایا، ایک صاحب ایک برتن میں تھوڑا سا پانی لائے، آپنے اسکو پیالہ میں انڈیل دیا، اور ۱۴سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا،[1]

آدھ سیر آٹے اور ایک بکری میں برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے، ۱۳۰ آدمیوں کی جماعت ساتھ تھی، آپنے لوگوں سے پوچھا کہ تمھارے ساتھ کچھ کھانے کا سامان ہے؟ ایک شخص ایک صاع آٹا لایا، اور وہ گوندھا ہوا گیا، پھر ایک کافر بکریاں چراتا آیا، آپ نے اس سے ایک بکری خرید فرمائی، اور ذبح کرنے کے بعد کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا، اور ہر شخص کو تقسیم کی، گوشت تیار ہوا تو دو پیالوں میں بھرا گیا، اور سب کے سب کھا کر آسودہ ہوگئے، اور بچ بھی گیا،[2]

تھوڑے سے کھانے میں غیر معمولی برکت

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ نے ایک بار ایک قسم کا کھانا تیار کیا اور حضرت انسؓ کو بھیجا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا لائیں، وہ گئے تو آپنے پوچھا کہ کیا میرے ساتھیوں کو بھی بلایا ہے، حضرت انسؓ نے گھر میں آکر پوچھا

[1] مسلم جلد ۲ ص ۶۱ مصر باب خلط الازواد اذا قلت [2] بخاری جلد ۲ ص ۸۱۱ کتاب الاطعمہ،

تو حضرت ابو طلحہؓ نے آپ سے آکر کہا کہ وہ تو ذرا سی چیز ہے جس کو ام سلیمؓ نے تیار کیا ہے، آپ تشریف لائے اور وہ کھانا سامنے رکھا گیا تو فرمایا کہ دس دس آدمیوں کو لاؤ، اس طرح جا جا آدمی دس دس کر کے آئے اور شکم سیر ہو کر کھایا لیکن کھانے میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی،[1]

قلیل تعداد میں کثیر برکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کیا تو حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ نے تھوڑا سا حیس (ایک قسم کا کھانا ہوتا ہے) تیار کیا اور ایک طشت میں کر کے حضرت انسؓ کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجا، حضرت انسؓ کھانا لے کر آئے، تو آپ نے بہت سے اصحاب کو مدعو کیا، تقریباً تین سو آدمی جمع ہو گئے، آپ نے حکم دیا کہ دس دس آدمی حلقہ باندھ کے بیٹھ جائیں، اور اپنے سامنے سے کھانا شروع کریں، تمام لوگ کھا کر آسودہ ہو گئے، لیکن اس میں اسقدر برکت ہوئی کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جس وقت میں نے طشت کو اٹھا کر رکھا، اس وقت کھانا زیادہ تھا، یا جب لوگوں کے سامنے رکھا گیا تھا،[2]

ایک پیالہ میں حیرت انگیز برکت سمرہ بن جندبؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ دس دس آدمی صبح سے شام تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پیالہ سے متصل کھاتے رہتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ اس میں اس قدر بڑھتی، کیونکر ہوتی جاتی تھی، انھوں نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ "وہاں" سے[3]

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۱۹ کتاب الاطعمہ [2] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۵۵۰ مصر کتاب النکاح [3] ترمذی باب ماجاء فی آیات نبوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

دودھ کے پیالہ میں برکت ایک دن حضرت ابوہریرہؓ بھوک کی شدت سے بیتاب ہوکر راستہ میں بیٹھ گئے، حضرت ابوبکرؓ کا گذر ہوا، تو ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن اس کا مقصد اپنی حالتِ زار کی طرف توجہ دلانا تھا، وہ گذر گئے، اور کچھ توجہ نہ کی، پھر حضرت عمرؓ گذرے، انھوں نے اسی غرض سے ان سے بھی ایک آیت پوچھی، لیکن انھوں نے بھی بے التفاتی کی، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا، اور آپ نے ان کے چہرے کو دیکھ کر اصل حقیقت معلوم کرلی، اور ان کو پکارا، حضرت ابوہریرہؓ نے لبیک کہا، اور ساتھ ہولیے، آپ گھر میں داخل ہوئے تو دودھ کا پیالہ بھرا ہوا نظر آیا، پوچھنے سے معلوم ہوا کہ ہدیۃً آیا ہے، آپ نے حضرت ابوہریرہؓ کو حکم دیا کہ اصحاب صفہ کو بلالائیں، حضرت ابوہریرہؓ کو یہ ناگوار گذرا کہ اس دودھ کا سب سے زیادہ مستحق تو میں تھا لیکن آپ کی تعمیلِ ارشاد سے چارہ نہ تھا، مجبوراً اصحاب صفہ کو بلالے گئے، اور سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ آپ کے حکم سے حضرت ابوہریرہؓ نے سب کو پلانا شروع کیا، جب سب کے سب سیراب ہوگئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ کو ہاتھ پر رکھا اور ابوہریرہؓ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا کہ اب صرف ہم اور تم باقی ہیں، آؤ بیٹھو اور پینا شروع کرو، آپ ان کو متصل پلاتے رہے، یہاں تک کہ وہ خود بول اٹھے کہ اب گنجائش نہیں، اس کے بعد آپ نے خود پیالہ لیا، اور جو کچھ بچ گیا تھا، بسم اللہ کہکر پی گئے، [۱]

بکری کے دست میں برکت ایک صحابی نے آپ کے لیے گوشت پکایا، چونکہ آپ کو بکری کا

[۱] بخاری جلد ۲ ص ۹۵۷ کتاب الرقاق۔

دست نہایت مرغوب تھا، انھوں نے آپؐ کو دونوں دست دیئے، جب آپ ان کو تناول فرما چکے تو پھر دست مانگا، انھوں نے کہا یا رسول اللہ! بکری کے کتنے دست ہوتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا خدا کی قسم اگر تم خاموش رہتے تو میں جس قدر دست مانگتا تم مجھے دیتے رہتے[1]۔

بکری کے تھنوں میں برکت حضرت مقدادؓ سے روایت ہے کہ میں اپنے دو رفیقوں کے ساتھ سخت عسرت اور فاقہ زدگی کی حالت میں آیا، اور تمام صحابہؓ کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کیا لیکن کسی نے ہماری کفالت منظور نہیں کی، بالآخر ہم سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ہم کو گھر لے گئے، وہاں تین بکریاں بندھی ہوئی تھیں، آپؐ نے فرمایا کہ ان کا دودھ دوہ کر پیا کرو، چنانچہ ہم سب دودھ دوہ کے اپنا حصہ پی لیتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ رکھدیتے تھے، آپ رات کو آتے تو پہلے نرم آواز میں سلام کرتے، پھر مسجد میں آکر نماز پڑھتے، اس کے بعد اپنا حصہ دودھ پیتے، ایک دن جبکہ میں اپنے حصہ کا دودھ پی چکا تھا، شیطان نے مجھ کو دھوکا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے یہاں سے آتے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں اور آپ اُن کو تناول فرماتے ہیں، آپ کو اس دودھ کی ضرورت نہیں، میں اس کے دھوکے میں آگیا، اور تمام دودھ اٹھا کر پی گیا، جب میرے پیٹ میں گنجائش نہ رہی تو شیطان یہ کہکر چلتا ہوا کہ کمبخت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ پی گیا، جب آپ

---

[1] شمائل ترمذی، باب صفۃ ادام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

تشریف لائیں گے اور اپنے حصہ کو نہ پائیں گے تو تجھ کو بد دعا دیں گے، اور تیرا دین و دنیا سب برباد ہو جائے گا۔" چنانچہ اس ڈر سے میری آنکھوں کی نیند اڑ گئی، آپ تشریف لائے حسب معمول سلام کیا، اور نماز پڑھی، اس کے بعد دودھ کو کھولا، تو آپؐ کا حصہ غائب تھا، آپؐ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا، اور میں سمجھا کہ آپ اب مجھ پر بد دعا فرمائیں گے اور میں ہلاک ہو جاؤں گا لیکن آپؐ نے یہ دعا فرمائی "خداوندا! جس شخص نے مجھ کو کھلایا، اس کو کھلا، اور جس نے مجھے پلایا، اسے پلا"۔ اب میں چادر لپیٹ کے اٹھا، ہاتھ میں چھری لی کہ ان بکریوں میں جو سب سے زیادہ فربہ ہو اس کو ذبح کروں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا ہے۔ اب میں نے ایک برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال کو یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ کبھی اس قدر دودھ ہوگا کہ اس میں دوہا جائے گا۔ لیکن میں نے اس میں دودھ دوہا تو وہ بھر گیا، اور اوپر پھین نظر آنے لگا، میں نے دودھ کو آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا کیا تم اپنا حصہ پی چکے، میں نے کہا آپ پی لیجئے، آپؐ نے پی کر مجھے دودھ عنایت فرمایا، میں نے عرض کی کہ آپ نوش جان فرمائیے، آپ نے پی لیا، اور مجھے عنایت فرمایا، چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سیر ہو گئے اور آپ کی دعا کی برکت میں میں شامل ہو گیا، تو میں ہنستے ہنستے زمین پر گر پڑا[۱] اور آپ کی خدمت میں اول سے آخر تک تمام واقعہ بیان کیا، آپؐ نے فرمایا،

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۹۰ مصر باب اکرام الضیف۔

"یہ خداوند تعالیٰ کی رحمت ہے، تم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کیوں نہیں جگایا کہ وہ بھی پیتے۔ میں نے کہا کہ جب میں نے آپ کے ساتھ پی لیا تو مجھے اس کی پروا نہیں کہ کسی اور نے پیا یا نہیں،

ایک وسق جو کی برکت | حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو کچھ وسق (ایک پیمانہ) جو کے سوا کچھ گھر میں نہ تھا، تو میں نے اسی کو کھانا شروع کیا، تو وہ ختم ہی ہونے پر نہیں آتا تھا، تو ہم نے اس کو تولا تو پھر وہ ختم ہو گیا یعنی اسکی وہ برکت جاتی رہی[1]،

توشہ دان ہمیشہ بھرا رہتا | حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ مجھ پر اسلام میں تین مصیبتیں سب سے سخت پڑیں، پہلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات، دوسری حضرت عثمانؓ کی شہادت، تیسری میرے توشہ دان کا جاتے رہنا، لوگوں نے پوچھا "کیسا توشہ دان؟" انھوں نے کہا آپ ایک غزوہ میں تھے، رسد ختم ہو گئی تھی، آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ابوہریرہ کچھ کھانے کے لیے پاس ہے؟ میں نے عرض کی کہ کچھ کھجوریں ہیں، ارشاد ہوا، وہ لے آؤ، میں لایا تو آپ نے ان کو دسترخوان پر پھیلا دیا، اکیس کھجوریں تھیں، آپ ایک ایک کھجور لے کر اور اس پر خدا کا نام پڑھ کر رکھتے جاتے تھے، پھر آپ نے سب کو ملا دیا، اور حکم دیا کہ دس دس آدمی آکر شریک ہوں، چنانچہ اس طرح لوگ آتے گئے اور پوری فوج سیر ہو گئی اور کچھ کھجوریں بچ گئیں، میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! ان پر میرے لیے برکت کی دعا فرمائیے، آپ نے دعا کی، میں نے ان کو اپنے توشہ دان میں ڈال لیا، انکی برکت

---

[1] صحیح بخاری و مسلم

یہ تھی کہ جب میں ہاتھ ڈالتا تھا، اس میں سے کھجوریں نکل آتی تھیں، اور ۵۰ وسق تو میں نے اس میں سے راہ خدا میں خیرات کی، حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ تک میں اس میں سے کھاتا رہا، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ہنگامہ میں جہاں اور چیزیں گئیں توشہ دان بھی جاتا رہا، [1]

تھوڑی کھجوروں میں برکت حضرت دکینؓ اور نعمان بن مقرن صحابیؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ چار سو چودہ آدمی خدمت نبویؐ میں ایک ساتھ حاضر ہوئے اور ہم سب نے کھانے کی درخواست کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ ان کو کھانا کھلاؤ، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو اسی قدر ہے جو بال بچوں کو کافی ہو، ارشاد ہوا "جاؤ ان کو کھلادو" عرض کی جیسا حکم ہو تعمیل میں عذر نہیں، یہ کہہ کر حضرت عمرؓ ہم کو لے کر چلے، اور ایک جگہ لاکر بٹھایا، اور جو کچھ کھجوریں تھیں، وہ سامنے لاکر رکھدیں، اور ان میں یہ برکت نظر آئی کہ ہم سب سیر ہو گئے، لیکن کھجوروں میں کمی نہیں آئی۔ [2]

---

[1] مسند احمد، جامع ترمذی، ابن سعد، ابن حبان، بیہقی [2] مسند احمد عن دکین و ابو داؤد و ابن حبان و ابن سعد عن نعمان بن مقرن

پانی جاری ہونا

عرب کے خشک و ریگستانی ملک میں سب سے کمیاب جنس پانی کا ایک چشمہ ہے
دنیا کے فاتحوں اور کشور کشاؤں کے حملوں سے یہ ملک جن اسباب کی بنا پر ہمیشہ محفوظ رہا ہے
اُن میں سے ایک قوی سبب اس میں پانی کے وجود کی کمیابی بھی ہے، چنانچہ یونانیوں، رومیوں
اور ایرانیوں کی ہمتیں اسی لیے اس صحرائے لق و دق میں آباد قبائل کے فتح سے قاصر رہیں
غور کرو کہ اسلام کا فاتحانہ لشکر بھی اگر نبوت کے برکاتِ الٰہی کے یہ چشمے اس کے ساتھ ساتھ
نہ ہوتے تو اس مشکل کو وہ کبھی حل کر سکتا تھا ؟

انبیائے عالم میں صرف ایک حضرت موسیٰؑ کی ذات ہے، جن کے لیے ایک دفعہ
چٹان کی رگیں پانی کی سوتیں بنیں لیکن رسول عربؐ کے لیے مشکیزہ کا چمڑا، گوشت و پوست
کی انگلیاں، خشک چشموں کے دہانے، سوکھے ہوئے کنوؤں کی سوتیں، دہانِ مبارک
کی کلیاں متعدد دفعہ پانی کا خزانہ ثابت ہوئیں۔

مشکیزہ سے پانی ابلنا ایک دفعہ آپ سفر میں تھے، صبح کو آنکھ کھلی، اور آپ نے نماز پڑھانی شروع
کی تو ایک صحابی جماعت سے الگ ہو گئے، آپ نے شریک جماعت نہ ہونے کی وجہ پوچھی
تو انھوں نے جنابت کا عذر کیا، چونکہ پانی نہ تھا، اس لیے ان کو آپ نے تیمم کا حکم دیا، اسکے
بعد آپ نے چند صحابہ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، وہ لوگ چلے تو ایک عورت ملی جو اونٹ پر دو

مشکیزوں میں پانی لاد کر لیے جا رہی تھی، ان لوگوں نے اس چشمہ کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا، اس جگہ پانی نہیں ہے، پھر ان لوگوں نے دریافت کیا کہ تمہارے قبیلہ اور چشمہ کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے؟ اس نے ایک دن اور ایک رات کی مسافت بتائی، وہ لوگ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے مشکیزوں کو چھو دیا، آپ کے دست مبارک کی برکت سے اس پانی کی مقدار میں اسقدر اضافہ ہو گیا کہ چالیس آدمیوں نے اس سے خوب سیراب ہو کر پانی پیا، اور اپنے اپنے تمام مشکیزے اور برتن بھر لیے، اسکے بعد آپ نے کھجور اور روٹی کے ٹکڑے جمع کرا کے اس عورت کو دیے، وہ اپنے گھر آئی تو حیرت و استعجاب سے لبریز تھی، اس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ میں نے سب سے بڑے ساحر کو یا اس کے معتقدین کے خیال میں ایک پیغمبر کو دیکھا، آخر اسی خاتون کے اثر سے یہ پورا قبیلہ اس عورت کے مسلمان ہو گیا،[۱]

انگلیوں سے پانی جاری ہونا ایک دن آپ مقام زوراء میں تھے، عصر کا وقت آگیا، تو صحابہ نے پانی کی جستجو شروع کی، لیکن صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پانی ملا، جب آپ کی خدمت میں پانی کا برتن پیش کیا گیا تو آپ نے اس پر اپنا ہاتھ ڈال دیا اور انگلیوں سے پانی کا فوارہ چھوٹنے لگا، یہانتک کہ تقریباً تین سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا،[۲]

پانی کا بڑھ جانا آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر میں تھے، نماز کا وقت آیا تو صحابہ نے پانی تلاش کیا، لیکن کہیں نہ ملا، ایک صحابی پیالہ میں تھوڑا سا پانی لائے۔ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وضو کیا، پھر پیالے پر آپ نے انگلیاں پھیلا دیں، پانی کی مقدار میں اسقدر برکت ہوئی کہ

---

[۱] صحیح بخاری باب علامات النبوت [۲] صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، باب معجزات۔

تقریباً ستر آدمیوں کے وضو کے لیے کافی ہوا[1]

انگلیوں کی برکت ایک بار نماز کا وقت آیا، تو جن لوگوں کا گھر مسجد کے قریب تھا، وہ گھر کے اندر وضو کرنے کے لیے چلے گئے، لیکن بقیہ لوگ بے وضو رہ گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک برتن میں وضو کا پانی پیش کیا گیا، آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالنا چاہا، تو اس کا دہانہ اس قدر تنگ نکلا کہ آپ کی ہتھیلیاں اس کے اندر نہ پھیل سکیں، اسلیے آپ نے اپنی انگلیاں اس کے اندر ڈالیں اور وہ پانی تقریباً ۸۰ آدمیوں کے وضو کے لیے کافی ہوا[2]

انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہنا صلح حدیبیہ کے دن صحابہ پیاس سے بیتاب ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صرف چمڑے کے ایک برتن میں پانی تھا، آپ نے اس سے وضو کرنا شروع کیا، تو تمام صحابہ آپ کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھے، آپ نے اس بیتابی کی وجہ پوچھی، تو لوگوں نے کہا کہ ہماری ضروریات کے لیے صرف یہی پانی تھا، آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈال دیا، اور آپ کی انگلیوں کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی جاری ہوا، چودہ پندرہ سو آدمی ساتھ تھے سب نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہو کر پانی پیا[3]

کلی سے پانی بڑھ جانا دوسری روایت ہے کہ صحابہ اس دن اس کنوئیں پر ٹھہرے جس کا نام حدیبیہ تھا، اور اس کا تمام پانی اوبچ لیا، یہانتک کہ کنوئیں کے اندر ایک قطرہ پانی نہ رہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو کنوئیں کے کنارے بیٹھ گئے، اور تھوڑا سا پانی منہ میں لیکر اسمیں کلی کر دی، تھوڑی دیر میں اسقدر ابلا کہ تمام صحابہ اور صحابہ کے تمام اونٹ سیراب ہو گئے[4]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم باب معجزات و مسند احمد عن انس بن مالک [2] صحیح بخاری باب معجزات [3] ایضاً [4] ایضاً

ہاتھ منہ دھونے کی برکت

غزوۂ تبوک کے سفر میں دو دو وقت کی نمازیں ایک ساتھ پڑھتے جارہے تھے، ایک دن عشا اور مغرب کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر فرمایا کل تم لوگ دوپہر کے وقت تبوک کے پاس پہنچو گے، لیکن جب تک میں نہ آلوں کوئی شخص اس کے پانی میں ہاتھ نہ لگائے، لوگ پہنچے تو نہر تسمہ کی طرح تنگ اور باریک نظر آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لوگوں نے پانی کو اولیچنا شروع کیا، پانی ایک گڈھے میں جمع ہوگیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں منہ ہاتھ دھوئے، پھر وہ پانی نہر میں ڈال دیا گیا تو وہ پانی سے ابل گئی۔[1]

انگلیوں کی برکت

آپ نے ایک سفر میں حضرت جابرؓ سے وضو کا پانی طلب فرمایا، انھوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈھا، پانی نہیں ملا، انصار میں ایک شخص تھے، جو خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پانی ٹھنڈا کرکے رکھتے تھے، حضرت جابرؓ نے آپ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی، تو آپ نے اُن کو ان انصاری کے پاس بھیجا لیکن ان کے پاس بھی اس قدر کم پانی ملا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصہ میں جذب ہوکر رہ جاتا، حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی، تو آپ نے اس برتن کو منگا بھیجا، اور ہاتھ میں لیکر کچھ پڑھا، اور اس کو طشت کے اندر رکھ کے حضرت جابرؓ کو حکم دیا کہ بسم اللہ کرکے ہاتھ پر پانی گرائیں، حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا تو پہلے آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی امنڈا، پھر طشت بھر گیا، یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہوگئے، اس کے بعد آپ نے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرا رہ گیا۔[2]

---

[1] مسلم باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] مسلم باب حدیث جابر الطویل۔

انگلیوں سے پانی کا جوش مارنا | حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار عصر کا وقت آگیا، صرف تھوڑا سا بچا ہوا پانی رہ گیا تھا، آپ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں اور ان کے اندر سے پانی جوش مارنے لگا، یہاں تک کہ ۱۴۰۰ آدمیوں نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہوئے۔[۱]

تھوڑے پانی میں کثیر برکت | ایک بار آپؐ سفر میں تھے، صبح کے وقت قافلہ سے الگ ہو کر سو گئے اور چند اشخاص سے جو ساتھ تھے کہدیا کہ نماز کا خیال رکھنا، لیکن سب کے سب سو گئے، اور سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے، تو دن نکل چکا تھا، اب سب کے سب گھبرا کے اٹھے تو آپ نے کوچ کرنے کا حکم دیا، دن چڑھا تو آپ نے سواری سے اتر کر وضو کیا، تھوڑا سا پانی جو بچ رہا تھا، اس کی نسبت ابو قتادہؓ سے فرمایا کہ اس کو محفوظ رکھنا، اس سے ایک عظیم الشان نشان ظاہر ہوگا، جب آفتاب خوب بلند ہو چکا تو آپؐ قافلہ سے جا ملے، لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! پیاس نے ہم کو مار ڈالا، آپ نے فرمایا تم لوگ تباہ نہیں ہو سکتے، یہ کہکر اپنے وضو کا بچا ہوا پانی ابو قتادہؓ سے طلب کر کے لوگوں کو پلانا شروع کیا اور تمام لوگ سیراب ہو گئے۔[۲]

انگلیوں سے پانی ابلنا | حبان بن بُحّ الصدائی کا بیان ہے کہ میری قوم حالتِ کفر میں تھی، مجھے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے فوجی تیاریاں فرما رہے ہیں، آیا اور آپ کو اطلاع دی کہ میری قوم مسلمان ہے، پھر میں نے رات بھر آپ کے ساتھ سفر کیا، جب صبح ہوئی تو میں نے اذان دی، آپ نے پانی کا برتن مجھے عطا فرمایا، میں نے اس سے وضو کیا، پھر آپ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں، اور ان کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی ابلنے لگا، آپ نے

---

[۱] بخاری جلد ۲ ص ۸۴۲ کتاب الاشربہ [۲] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب قضاء الصلوٰۃ الفائتۃ۔

حکم دیا کہ جو شخص چاہے اُس سے وضو کرے[1]،

ایک اور واقعہ | حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ معجزات کو برکت سمجھا کرتے تھے، چنانچہ ایک بار ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے، پانی کی کمی کی شکایت ہوئی، تو آپ نے بچے ہوئے پانی کو طلب فرمایا، وہ ایک برتن میں آپکے سامنے پیش کیا گیا، اور آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر فرمایا کہ "وضو کے مبارک پانی کی طرف دوڑو، خدا کی طرف سے برکت ہوگی" میں نے دیکھا تو آپ کی انگلیوں کے درمیان پانی ابل رہا تھا[2]۔

یہ واقعات جو مختلف عنوانوں میں بیان کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ایک ہی واقعہ کی متعدد حکایتیں ہوں، لیکن چونکہ ہر ایک کے ساتھ خصوصیات میں کچھ فرق و امتیاز محسوس ہوا، اس لیے ان کو مستقل واقعات کی صورت دیدی گئی ہے،

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۶۹ [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام

اطلاعِ غیب

فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (جن)

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بار بار بے نقاب کیا ہے کہ "غیب کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں"۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس معنی کی بکثرت آیتیں ہیں، اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب کی صفت سے خدا کے سوا کسی اور کو متصف نہیں کیا جا سکتا،

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ (یونس)	کہدے (اے پیغمبر) کہ غیب تو خدا ہی کیلیے ہے،
قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ	کہدے (اے پیغمبر) کہ خدا کے سوا آسمان و زمین
وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل)	میں کوئی غیب نہیں جانتا،

یعنی خدا کے سوا کسی مخلوق کو غیب کا ذاتی علم نہیں، اور نہ غیب کی باتیں خدا نے آسمان و زمین میں کسی مخلوق کو بتائی ہیں، چنانچہ قیامت کے دن تمام انبیاءؑ کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا،

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ	جس دن خدا تمام پیغمبروں کو جمع کریگا اور کہے گا
مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا	کہ تم کو کیا جواب دیا گیا وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں
اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (مائدہ ۱۵)	غیب کی باتوں کا پورا جاننے والا تو ہی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اعلم الانبیاء تھے، ان کو یہ اقرار کرنے کا حکم ہوتا ہے،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ	کہدے (اے پیغمبر) کہ میں نہیں کہتا کہ خدا کے تمام

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ؕ	خزانے میرے قبضہ میں ہیں، اور یہ بھی کہدیتا ہوں
(انعام - ۵)	کہ میں غیب کی باتیں نہیں جانتا،
قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا	کہدے اے پیغمبر! کہ میں اپنے آپ کے لیے کسی نفع و ضرر
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ	پر قادر نہیں ہوں لیکن یہ کہ خدا جو چاہے، اگر مجھے
الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا	غیب کا علم ہوتا تو بہت سے فائدے اٹھالیتا اور مجھکو
مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ	کبھی مصیبت نہ پیش آتی لیکن میں تو ایماندار
بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف ۲۳)	قوم کو ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں،

ان آیتوں نے صاف کھول دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ غیب کا ذاتی علم تھا اور نہ تمام غیب کی باتیں آپ کو بتائی گئی تھیں، البتہ خدائے تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جو کچھ چاہا اور پسند کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وقتاً فوقتاً اس سے مطلع فرماتا رہا چنانچہ صاف ارشاد ہوا

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ	وہ (یعنی مخلوقاتِ الٰہی) خدا کے علم میں سے
اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ	کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اس کا
(بقرہ ۳۴)	جتنے کا خدا چاہے،

سورۂ جن میں فرمایا

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰی غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا	اللہ تعالیٰ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا
مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (جن ۲)	لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے،

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں فرمایا،

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى	اور خدا غیب کی باتیں تم کو نہیں بتا سکتا،
الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ	لیکن وہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا
رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۱۸)	ہے (اس کے لیے) چن لیتا ہے،

امورِ غیب میں سے قیامت کے متعلق تصریح کر دی گئی ہے کہ اس کا علم کسی کو عطا نہیں ہوا ہے،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ	(اے پیغمبر) لوگ تجھ سے قیامت کی نسبت پوچھتے ہیں،
مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ	کہ وہ کب لنگر انداز ہوگی، کہہ دے کہ اسکا علم تو صرف
رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ	میرے پروردگار ہی کو ہے، وہی اسکے وقت پر اس کو
ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا	ظاہر کریگا، وہ وقت آسمان و زمین میں بڑا بھاری
تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ	ہوگا، وہ دفعۃً آجائیگا، تجھ سے وہ قیامت کا حال اسطرح
حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ	پوچھتے ہیں کہ گویا وہ تجھے معلوم ہے اور تو چھپاتا ہے،
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (اعراف)	کہہ دے کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے

صحاح میں حضرت جبریلؑ کے ایک مسافر کی صورت میں آنے کی جو روایت ہے اور جس میں انھوں نے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات پوچھے ہیں، اور آپ نے اُن کے جوابات دیے ہیں، اسکے آخر میں وہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب ہوگی، اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ما المسئول عنها باعلم من السائل	جس سے پوچھتے ہو وہ پوچھنے والے سے اس باب میں زیادہ

وما جدنا۵ عن اشراطها کتاب لایا سلم و بلیٰ) علم نہیں کھتا۔ ہاں میں اسکی علامتیں بتا دونگا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ وہ کہا کرتی تھیں کہ جو تم سے یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی باتیں جانتے تھے، وہ جھوٹا ہے، قرآن نے صاف کہدیا ہے،

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَاذَا تَکْسِبُ غَدًا — کسی نفس کو یہ علم نہیں کہ کل وہ کیا کرے گا،[۱]

ایک دفعہ چند لڑکیاں آپ کے سامنے بیٹھی کچھ گا رہی تھیں، گاتے گاتے ایک نے ان میں سے کہا

وَفِینَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ — ہم میں ایک نبی ہے جو کل کی ہونے والی بات جانتا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔[۲] حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیب کی کنجی پانچ باتیں ہیں، اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی،[۳]

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ	خدا ہی کے پاس اس آنے والی گھڑی کا علم ہے،
الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ	وہی پانی برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں
نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ	میں کیا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کریگا اور
نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان ۴)	نہ کوئی جانتا ہے کہ کس سرزمین میں وہ مرے گا،

یہی روایت بخاری کے دوسرے باب میں اس طرح ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جنکو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ حاملہ عورت کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی، اور نہ خدا کے سوا کوئی یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا، اور نہ خدا کے علاوہ کسی کو اس کا علم ہے کہ پانی کب برسے گا، اور نہ بجز خدا کے کسی کو اس کی خبر ہے کہ وہ کہاں مرے گا۔[۴]

---

[۱] صحیح بخاری تفسیر نجم [۲] صحیح بخاری کتاب النکاح [۳] صحیح بخاری تفسیر لقمان [۴] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ باب عالم الغیب

بہر حال ان مخصوص باتوں کے علاوہ جن کا علم صرف عالم الغیب کو ہی، اپنے غیب کی باتوں میں جن باتوں کو وہ مناسب سمجھتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وقتاً فوقتاً اسکی اطلاع دیتا تھا، سورہ ہود میں بعض انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ کے بعد خدا فرماتا ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ (ہود - ۴)	یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں، نہ تو ان کو جانتا تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہوا:

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (تکویر - ۱)	یعنی آپ کو امور غیب میں سے جسکی تعلیم دیجاتی ہے آپ اپنی امت کو اس کے بتانے میں بخل نہیں فرماتے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سورج کو گرہن لگا تھا، آپ نے صحابہ کیساتھ نماز کسوف ادا فرمائی تھی، اور نماز کے بعد ایک نہایت بلیغ و مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا،

یا امۃ محمد واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً و لبکیتم کثیراً (صحیح بخاری باب الصدقۃ فی الکسوف و تفسیر سورۂ مائدہ)	اے گروہ محمد! خدا کی قسم اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ،

ایک دفعہ نماز کے بعد آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

هل ترون قبلتی ههنا فواللہ ما یخفی	تم دیکھتے ہو کہ میرا رخ ادھر ہے لیکن خدا کی

علیٰ خشوعکم ولا رکوعکم انی لاراکم من وراء ظہری (بخاری) | قسم مجھ سے (نماز میں) تمہارا خشوع اور نہ تمہارا رکوع پوشیدہ رہتا ہے میں تمکو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا،

انی لاراکم من ورائی کما اراکم (بخاری باب عظۃ امام الناس) | میں جس طرح تم کو دیکھ رہا ہوں اسی طرح میں تم کو پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

احادیث میں متعدد صحابہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے بعض صاحبوں نے کچھ سوالات کیے، جن کو آپ نے پسند نہیں کیا، آپ کو جوش آگیا، آپ نے فرمایا۔ سلونی عما شئتم (جو چاہو مجھ سے دریافت کرلو) ایک شخص نے اٹھ کر کہا، یا رسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ فرمایا "حذافہ"۔ دوسرے نے اٹھ کر کہا اور میرے باپ کا نام کیا ہے؟ فرمایا۔ سالم غلام شیبہ"۔ اور بار بار آپ فرماتے جاتے تھے، "پوچھو مجھ سے، پوچھو مجھ سے" یہ دیکھکر حضرت عمرؓ آگے بڑھے اور عرض کی، یا رسول اللہ! ہم کو اللہ اپنا پروردگار، محمد اپنا رسول اور اسلام اپنا دین پسند ہے۔[1]

صحابہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن آپ نے صبح کی نماز پڑھکر تقریر شروع کی، یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا، ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر عصر تک پھر تقریر کی، اس کے بعد عصر کی نماز پڑھی، اس سے فارغ ہو کر غروب آفتاب تک پھر تقریر کا سلسلہ جاری رہا، اس طویل خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہو گا، یعنی آغاز آفرینش سے لیکر قیامت تک کے واقعات پیدائش عالم، علامات قیامت، فتن، حشر و نشر سب کچھ سمجھایا، صحابہ کہا کرتے تھے کہ ہم میں سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب العلم باب الغضب فی الموعظۃ والتعلیم

بہت سے لوگ بہت کچھ بھول گئے بعضوں کو بہت کچھ یاد ہے ان واقعات میں سے کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے تو ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی شخص کی صورت ذہن سے اتر جاتی ہے. پھر اس کو دیکھ کر یاد آجاتی ہے[1].

نجاشی شاہ حبش جس کے سایۂ حکومت میں جاکر مسلمانوں نے پناہ لی تھی، اور جس نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا تھا جس دن اس نے حبش میں وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس سانحہ کی اطلاع دی، آپ نے فرمایا کہ آج تمھارے بھائی نجاشی نے وفات پائی، اور اس کے بعد اس کے جنازہ کی نماز غائبانہ ادا فرمائی[2]،

شـتـه میں جب غزوۂ موتہ پیش آیا ہے. تو آپ نے فوج کا علم زیدؓ بن حارثہ کو عنایت کیا، اور فرمایا کہ جب زید شہید ہوں تو یہ امانت جعفرؓ کے سپرد کی جائے، جب وہ بھی جاں بحق ہوں تو عبداللہؓ بن رواحہ اس خدمت کو انجام دیں، اور جب وہ بھی کام آجائیں تو مسلمان اپنے مشورہ سے جس کو چاہیں اپنا سردار بنائیں، یہ افسری اور سرداری کے متعلق ترتیبی بیان درحقیقت واقعہ کا اظہار تھا. میدان جنگ میں پہلے زیدؓ نے شہادت پائی، انکی جانشینی جعفرؓ نے کی، وہ بھی جب علم نبوت پر قربان ہو چکے، تو عبداللہ بن رواحہؓ نے پیشقدمی کی، جب وہ بھی نثار ہو گئے. تو مسلمانوں نے خالدؓ بن ولید کو اپنا افسر بنایا، چونکہ اس جنگ میں رومیوں کی عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ تھا، اس لیے مسلمانوں کو بڑا اضطراب تھا عین اس وقت جب مدینہ سے کوسوں دور شام کی سرحد پر یہ خونی مناظر درپیش تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحیح مسلم باب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یکون الی قیام الساعۃ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز وصحیح مسلم

مسجد نبویؐ میں منبر پر تشریف فرما تھے۔ دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور فرما رہے تھے۔ علم کو زیدؓ نے لیا، وہ شہید ہوئے، پھر جعفرؓ نے لیا، وہ بھی جاں بحق ہوئے تو عبد اللہ بنؓ رواحہ نے لیا، انھوں نے بھی شہادت پائی، تو خالد بنؓ ولید نے لیا، اور ان کو فتح دی گئی۔"[1]

ایک غزوہ میں ایک شخص نہایت جانبازانہ حملے کر رہا تھا صحابہ نے دیکھا تو اسکی بڑی تعریف کی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھکر فرمایا کہ "یہ جہنمی ہے" صحابہ کو اس پر تعجب ہوا اور ایک صحابی اس کے پیچھے ہو لیے، ایک موقع پر اس کو سخت زخم لگا، اور اس نے بے صبری کی حالت میں خودکشی کر لی، وہ صحابی خدمت مبارک میں دوڑے ہوئے آئے اور کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے رسول ہیں"، آپنے فرمایا کہ کیا واقعہ ہے"۔ انھوں نے عرض کیا کہ "ابھی حضور نے ایک شخص کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ جہنمی ہے، لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تھا، میں اس کے پیچھے ہو لیا، میں نے دیکھا کہ ایک زخم کے صدمہ سے اس نے خودکشی کر لی۔"[2]

ایک غزوہ میں ایک شخص شریک تھا، وہ قتل ہوا کسی نے آکر خبر دی کہ یا رسول اللہ! فلاں شخص شہید ہو گیا، فرمایا کہ "یہ ناممکن ہے، شہادت اس کے لیے کہاں، میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے، کیونکہ مال غنیمت میں سے اس نے ایک عبا چرائی تھی۔"[3]

مسلمانوں نے ۸ھ میں طائف کا محاصرہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو چکا تھا، کہ طائف کی فتح اس محاصرہ سے مقدر نہیں، اس لیے ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز و باب علامات النبوۃ فی الاسلام و غزوۂ موتہ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۴۰۶ و باب العمل بالخواتیم، ۹۹۰ [3] جامع ترمذی باب ما جاء فی الغلول۔

کل انشاء اللہ ہم محاصرہ چھوڑ کر کوچ کریں گے، لوگوں کو اتنی محنت و زحمت کے بعد حصولِ فتح کے بغیر واپسی شاق ہوئی، اور انھوں نے کہا ہم فتح حاصل کیے بغیر چلے جائیں، آپ نے فرمایا "اچھا کل پھر قسمت آزمائی کر لو"۔ چنانچہ دوسرے دن مسلمان لڑے تو ان کو زیادہ نقصانات پہنچے، شام ہوئی تو آپ نے فرمایا کل انشاء اللہ ہم محاصرہ چھوڑ کر چلے جائینگے، مسلمانوں کو اس سے تعجب ہوا، اور آپ مسکرا دیے[1]، یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ تمھیں میری طرح حقیقتِ حال کا علم نہ تھا،

عمیر بن وہب اسلام کا سخت دشمن تھا، وہ اور صفوان بن امیہ دونوں خانۂ کعبہ میں بیٹھ کر بدر کے مقتولین پر ماتم کر رہے تھے، اور بالآخر ان دونوں میں پوشیدہ طور سے یہ سازش قرار پائی کہ عمیر مدینہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے سے قتل کر آئے، اور اگر وہ مارا گیا تو صفوان اس کے تمام قرض اور گھر کے مصارف اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے گا، عمیر یہاں سے اٹھکر گھر آیا اور تلوار کو زہر میں بجھا کر مدینہ کو چل کھڑا ہوا، مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھ لیا، وہ اس کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ عمیر! یہاں کس ارادہ سے آئے ہو؟ اس نے کہا اپنے بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں، فرمایا، "کیوں نہیں؟ کیا تم نے اور صفوان نے خانۂ کعبہ میں بیٹھکر میرے قتل کی سازش نہیں کی ہے"، عمیر یہ راز کی بات سنکر سناٹے میں آگیا، اور اس کو سخت تعجب ہوا، اور بے اختیار بول اٹھا کہ محمد بیشک تم خدا کے پیغمبر ہو، خدا کی قسم میرے اور صفوان کے سوا کسی تیسرے کو اس معاملہ کی خبر نہ تھی،[2]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم غزوۂ طائف [2] تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر ص ۱۳۵۴ طبع یورپ،

حضرت وابصہ اسدی صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اس غرض سے حاضر خدمت ہوا کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کروں، لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، آپ نے فرمایا وابصہ! میں تمھیں بتاؤں کہ تم کیا پوچھنے آئے ہو؟ عرض کی ارشاد ہو فرمایا "تم نیکی اور گناہ کی حقیقت پوچھنے آئے ہو"۔ عرض کی، قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، آپ نے سچ فرمایا ارشاد ہوا، نیکی وہ ہے جس کے کرنے کے خیال سے تمھارے دل میں انشراح اور خوشی پیدا ہو، اور گناہ وہ ہے، جو تمھارے دل میں کھٹک پیدا کرے، اگرچہ لوگوں نے اس کے کرنے کا فتویٰ ہی کیوں نہ دے دیا ہو، [1]

ایک دفعہ ایک صحابیہ نے آپ کی دعوت کی، بکری ذبح کی، اور آپ کو اور دیگر رفقاء کو کھانا کھانے کے لیے بلایا، آپ تشریف لے گئے، اور گوشت کا ایک لقمہ اٹھا کر ابھی چکھا ہی تھا کہ فرمایا یہ بکری اپنے مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے، داعیہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آل معاذ اور ہمارے خاندان میں پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ ہماری چیز بے تکلف لیتے ہیں اور ہم انکی چیز، [2] دوسری روایت میں ہے کہ اس نے جواب دیا کہ ہاں یا رسول اللہ! میں نے اپنی پڑوسن سے یہ بکری مانگی، اس نے اپنے شوہر سے پوچھے بغیر دیدی،

غزوۂ خیبر میں ایک یہودیہ نے آپ کی دعوت کی، کھانے میں بکری کا گوشت تھا، آپ نے چند رفقا کے ساتھ اس کو کھانا چاہا، ابھی پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ ہاتھ

---

[1] مسند ابن حنبل حدیث وابصۃ الاسدی وابویعلی وبیہقی وابونعیم فی حلیۃ الاولیاء ذکر وابصہ بن معبد الجہنی وبزاز [2] سنن نسائی وحاکم فی المستدرک عن جابر،

روک لو، اس گوشت میں زہر ملایا گیا ہے۔" اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ خیبر کے تمام یہود کو جمع کیا جائے۔ جب وہ جمع ہو چکے تو آپ نے دریافت کیا کہ جو کچھ میں پوچھوں گا، سچ سچ بتاؤ گے۔ انھوں نے ہاں کہا۔ آپ نے فرمایا تمھارے باپ کا کیا نام ہے؟ انھوں نے کچھ بتایا، آپ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، تمھارے باپ کا یہ نام ہے۔ اس امتحان کے بعد آپ نے دریافت فرمایا۔ کیا تم نے بکری کے گوشت میں زہر ملایا تھا۔ انھوں نے کہا ہاں، آپ کو کیونکر معلوم ہوا؟ فرمایا کہ بکری کے اس دست نے مجھ سے کہا۔[1]"

حضرت صہیبؓ بن سنان جو صہیب رومی کر کے مشہور ہیں جس شب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی۔ انھوں نے بھی ہجرت کرنی چاہی، لیکن کفار نے ان کو روک دیا، وہ رات بھر کھڑے رہے، اور بیٹھنے کا نام بھی نہیں لیا، کفار نے ان کی اس حالت کو دیکھکر کہا کہ چلو اس کو تو پیٹ کے عارضہ نے خود ہی مجبور کر دیا ہے، یہ کہکر وہ چلے گئے، انھوں نے نگہبانوں سے اپنے کو آزاد پاکر مدینہ کا راستہ لیا، کافروں نے ان کو پکڑ لیا، آخر کچھ زر و نقد دیکر ان سے رہائی حاصل کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھنے کے ساتھ فرمایا، اے ابویحییٰ! تمھاری خرید و فروخت بڑے نفع کی رہی، حضرت صہیبؓ نے عرض کی، یارسول اللہ مجھ سے پہلے کوئی یہاں آیا نہیں، جو اس راز کی آپ کو خبر کرتا، یہ یقیناً آپ کو بذریعۂ وحی معلوم ہوا۔[2]

حضرت حذیفہؓ کی والدۂ مکرمہ نے ایک دن اپنے بیٹے پر عتاب کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن ابی داؤد و کتاب الدیات و دارمی باب کلام الموتی و بیہقی [2] مستدرک حاکم جلد ثالث ص ۴۰۰ بروایت صحیح ذہبی نے بھی اس کی تصریح کی ہے ذکر ہجرۃ صہیبؓ۔

کی خدمت میں اتنے دن ہو گئے کیوں نہ گئے، انھوں نے معذرت کی، اور کہا کہ آج جا کر اپنی اور آپؐ کی مغفرت کی دعا کراؤں گا، چنانچہ وہ مغرب کی نماز میں جا کر حاضر ہوئے، عشا کی نماز کے بعد جب آپؐ واپس ہوئے تو یہ بھی پیچھے چلے، آپؐ نے آواز پہچان کر فرمایا "کون! حذیفہ!! خدا تمھاری اور تمھاری ماں کی مغفرت کرے[1]" گویا سوال سے پہلے ہی حذیفہ کی درخواست سمعِ اقدس تک پہنچ چکی تھی،

صحابہؓ کو آپ کی اس قوتِ اطلاع کا اس قدر یقین تھا کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے صحابہؓ کو اپنے ایک ایک عمل کا خوف لگا رہتا تھا، کہ ایسا نہ ہو کہ خدا آپ کو اس سے باخبر کردے، یہانتک کہ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہم لوگ اپنی بیویوں سے بھی کھل ملتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری نسبت قرآن میں کچھ نازل ہو جائے، تو رسوائی ہو[2]، علاوہ ازیں منافقین کے تمام اندرونی حالات اور ناموں سے بھی آپ کو ایک ایک کر کے واقفیت تھی[3]،

---

[1] جامع ترمذی مناقب حسنینؓ [2] صحیح بخاری، مسند احمد ج ۲ ص ۶۲ [3] صحیح بخاری

اہل کتاب کے سوالات کا جواب دینا

یہ دوست و دشمن اور موافق و مخالف سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے نہ تھے، یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں سے آپ کو تعلیمی واقفیت نہ تھی. توراۃ و انجیل اور علمائے یہود و نصاریٰ نے انکی شرحوں میں یا اپنی دوسری مذہبی تصنیفات میں جو کچھ لکھا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ایک صفحہ بھی ملاحظہ نہیں فرمایا تھا، اور یہی آخری چیزیں اسوقت یہود و نصاریٰ کے ایمان و عقائد کا جزو ہو گئی تھیں، اور عوام میں ان ہی کتابوں کو مقبولیت حاصل تھی. بااین ہمہ آپ کا ان کے سوالات کا صحیح جواب دینا، آپ کی رُوحانی تعلیم کی کھلی شہادت ہے.

مکہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو کفار عرب کو عموماً آپ کے اس دعویٰ پر یقین نہیں آیا، اس لیے انھوں نے معجزات طلب کئے، اور جب وہ دکھائے گئے تو انکو سحر اور جادو کہنے لگے، پھر ان کو خیال آیا کہ یثرب، خیبر اور شام میں جاکر یہودیوں سے ملیں اور ان سے پوچھکر چند ایسے سوالات دریافت کریں جن کے جوابات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگے جائیں، اور چونکہ وہ لکھے پڑھے نہیں ہیں، اور مکہ میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کو ان کے جوابات بتا سکے گا، اس لیے وہ ان کے جوابات نہ دے سکیں گے، اور اس طرح اس مدعیِ نبوت کی غلطی کھل جائے گی، اور اس کا کذب سب پر واضح ہو جائے گا، اس خیال کی بنا پر وہ

یہودیوں سے جاکر ملے، اُن سے آپ کے حالات بیان کیے، اور آپ سے پوچھنے کے لیے ان سے چند سوالات مانگے، چنانچہ انھوں نے چند سوالات دیے کہ یہ جاکر اس سے پوچھو، اگر وہ پیغمبر نہ ہوگا تو ہرگز اُن کا جواب نہ دے سکے گا۔

یہ تین تاریخی سوالات تھے۔ اصحاب کہف کا حال، حضرت موسیٰؑ اور خضر کی ملاقات کا واقعہ، اور ذوالقرنین کا قصہ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں قصے وحی کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیے، اور آپ نے ان کو پڑھکر کفار کو سنایا، چنانچہ سورۂ کہف میں یہ تینوں قصے مذکور ہیں، اور آخری قصہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ کفار کے سوال کے جواب میں ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَيْنِ	اور کفار تجھ سے (اے پیغمبر) ذوالقرنین کا
قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا	حال دریافت کرتے ہیں، کہدے کہ میں اسکا
(کہف ۱۱)	تھوڑا ذکر تم کو سناتا ہوں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے، جو گویا یہودیوں ہی کا شہر تھا تو انھوں نے بھی مناسب سمجھا کہ اس مدعی نبوت کے دعوائے نبوت کا امتحان ان ہی کتابی سوالات سے لیا جائے، کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ ہماری کتابوں سے واقف نہیں، اسلیے وہ ان کے صحیح جوابات نہ دے سکے۔ اور اگر اس نے یہ کہدیا کہ یہ سوالات یا جن کتابوں میں یہ سوالات مذکور ہیں، وہ غیر معتبر ہیں، تو ان سوالوں اور کتابوں کا اثر یہود میں اسقدر ہے کہ انکی تکذیب سے خود محمد کی جہالت اور کذب دعویٰ (نعوذ باللہ) کا پردہ فاش ہو جائے گا لیکن اتنے بڑے مجمع میں سب لوگ بدنیت ہی نہ تھے بلکہ ان میں بعض لوگ نیک نیت بھی تھے اور وہ نیک نیتی سے

یہ سمجھتے تھے کہ ہماری کتابوں میں جو مخفی اسرار لکھے ہوئے ہیں، ان کو پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا،

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ آئے تو عبداللہ بن سلام مدینہ کے ایک مشہور یہودی عالم آپ سے ملنے آئے، اور کہا کہ میں آپ سے تین سوال کرونگا، جن کا جواب پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں دیسکتا، یہ بتایئے کہ قیامت کی پہلی علامت کیا ہے؟ اور اہل جنت کی پہلی غذا کیا ہوگی؟ اور بچہ کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے مشابہ کیوں ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا، قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ ہے، جو لوگوں کو مشرق سے ہنکا کر مغرب کی طرف لیجائیگی، اور اہل جنت کی پہلی غذا مچھلی کا جگر ہے، اور ماں یا باپ سے بچہ کی مشابہت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب باپ کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو بچہ باپ سے مشابہ ہوتا ہے اور جب ماں کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو ماں سے مشابہ ہوتا ہے، عبداللہؓ بن سلام نے یہ جواب سن کر کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں"،

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک یہودی عالم خدمت والا میں حاضر ہوا، اور کہا کہ "اے محمدؐ میں تم سے چند سوالات کروں گا تم جواب دو" آپ نے فرمایا کہ "میرے جواب سے تم کو فائدہ ہوگا" اس نے کہا، سنو! یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن جس وقت آسمان اور زمین بدلے جائیں گے، لوگ کہاں ہوں گے، فرمایا "پل کے پیچھے تاریکی میں" دوسرا سوال اس نے کیا کہ سب سے پہلے جنت میں جانے کی کس کو اجازت ملے گی؟ جواب دیا، ان غریبوں کو جو راہ حق میں گھر سے بے گھر ہوئے ہیں" اس نے کہا اب میں تم سے وہ بات پوچھتا ہوں جس کا جواب روئے زمین پر صرف پیغمبر یا پیغمبر کے علاوہ ایک ہی دو آدمی دے سکتے ہیں، بتاؤ کہ بچہ کبھی لڑکی

اور کبھی لڑکا کیوں ہوتا ہے؟" آپ نے فرمایا "مرد کا نطفہ سپید اور عورت کا زرد ہوتا ہے، جب یہ دونوں ملتے ہیں تو اگر مرد کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ خدا کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے، اور جب عورت کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ لڑکی ہوتی ہے"۔ یہودی نے یہ جواب سن کر کہا کہ بیشک تم نبی ہو اور یہ کہکر چلا گیا۔ آپ نے فرمایا "یہ جوابات مجھ کو خدا نے القا کیے، مجھے پہلے سے معلوم نہ تھے"۔

مسند ابو داؤد طیالسی میں ہے کہ ایک دفعہ چند یہودی خدمتِ اقدس میں آئے، اور کہا کہ "ہم آپ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں جن کا جواب پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں دیسکتا"۔ آپ نے فرمایا "جو تم چاہو پوچھ سکتے ہو، لیکن وعدہ کرو کہ اگر میں نے ایسے جوابات دیے جن کو تم نے صحیح سمجھا تو کیا اسلام قبول کر لو گے"؟ انھوں نے کہا "ہاں ہم کو یہ شرط منظور ہے" آپ نے فرمایا "اچھا پوچھو کیا پوچھتے ہو"، انھوں نے کہا کہ "چار سوالوں کے جواب دیجئے، پہلا یہ کہ حضرت یعقوبؑ نے توراۃ کے اترنے سے پہلے جو کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، اس کا کیا واقعہ ہے؟ دوسرا یہ کہ ایک ہی نطفہ کبھی نر اور کبھی مادہ کیوں کر ہو جاتا ہے، تیسرا یہ کہ توراۃ میں نبی امی کی کیا پہچان بتائی گئی ہے، اور چوتھا یہ کہ فرشتوں میں سے تمھارا دوست یا نگہبان کون ہے"؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا، تم کو اس خدا کی قسم جس نے موسیٰؑ پر توراۃ نازل کی، تم یہ جانتے ہو کہ ایک دفعہ یعقوبؑ سخت بیمار پڑے، تو انھوں نے نذر مانی کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو کھانے اور پینے کی جو چیز مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے وہ چھوڑ دوں گا، ان کو کھانے میں سب سے زیادہ اونٹ کا گوشت اور پینے میں اونٹ کا دودھ پسند تھا، چنانچہ صحت کے بعد انھوں نے اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑ دیا، یہودیوں نے کہا خدایا سچ ہے"۔ آپ نے فرمایا، خدایا گواہ رہ۔" پھر فرمایا "میں تم اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے

موسیٰؑ پر توراۃ نازل کی، تم کو یہ معلوم ہے کہ مرد کا نطفہ گاڑھا اور سپید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور زرد، ان میں جو جنس غالب ہوتی ہے وہ نطفہ بھی خدا کے حکم سے وہی ہو جاتا ہے اور اسی کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا "خدایا درست ہے" آپ نے فرمایا خدایا گواہ رہ۔ پھر فرمایا میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر توراۃ نازل کی، تم کو یہ معلوم ہے کہ اس نبی کی آنکھیں سوئیں گی اور دل نہیں سوئے گا۔" انھوں نے کہا خدایا ہاں، آپ نے فرمایا "خدایا گواہ رہ"، یہودیوں نے کہا اچھا یہ بتایئے کہ فرشتوں میں آپ کا رفیق کون ہے، اسی جواب کے معلوم کرنے کے بعد ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے، یا آپ سے الگ ہو جائیں گے، آپ نے فرمایا میرا رفیق جبریلؑ ہے، اور دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہوا جس کا وہ رفیق نہ ہو" یہودیوں نے کہا تو ہم پھر آپ کے ساتھ نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ ہمارا دشمن ہے"

صحیح بخاری باب التفسیر (بنی اسرائیل) میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کھیت میں جا رہا تھا کہ راہ میں چند یہودی ملے، انھوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ محمد سے کچھ پوچھنا چاہیے، بعضوں نے کہا کچھ ضرورت نہیں، شاید وہ کوئی ایسا جواب دیں جو تم کو ناگوار ہو، بالآخر انھوں نے طے کیا کہ بہر حال کچھ پوچھنا چاہیے، انھوں نے دریافت کیا کہ "محمد! بتاؤ روح کیا چیز ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے جب وحی نازل ہو چکی، تو آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی،

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ — وہ پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے، اے پیغمبر

مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل ۹)

کہدے کہ روح میرے پروردگار کی ایک بات ہے، اور تم کو علم کا بہت کم حصہ دیا گیا ہے۔

جامع ترمذی (تفسیر بنی اسرائیل) مستدرک حاکم (جلد ا ص ۹) اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت صفوان بن عسال مرادی روایت کرتے ہیں کہ دو یہودی راستہ میں جا رہے تھے ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ پوچھیں، دوسرے نے کہا کہ اس کو پیغمبر نہ کہو تم کو وہ اپنی نسبت پیغمبر کہتے سنے گا تو اس کے چار آنکھیں ہو جائیں گی، اس کے بعد وہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور آکر پوچھا کہ موسیٰ کو جو نو احکام ملے تھے، وہ کیا تھے؟ آپ نے فرمایا وہ یہ تھے کہ شرک نہ کرو، زنا نہ کرو، ناحق قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، بیگناہ کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، پاک دامن عورت پر بہتان نہ باندھو، اور میدان جنگ سے فرار نہ کرو، (راوی کو اس نویں حکم میں شک ہے) پھر فرمایا "اور تمھارے لیے اے یہود خاص حکم یہ ہے کہ سبت مناؤ، ان دونوں نے یہ جواب سن کر آپ کے دست و پائے مبارک کے بوسے دیے، اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک آپ پیغمبر ہیں۔ آپ نے فرمایا تو پھر تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ انھوں نے کہا کہ داؤد نے دعا کی تھی، کہ اس کی نسل میں ہمیشہ پیغمبر ہوا کریگا اور اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہم ڈرتے ہیں کہ یہود ہم کو مار ڈالیں

اخبارِ غیب
یا
پیشین گوئی

فطرتِ بشری کے عجز اور بیچارگی کا سب سے بڑا دردناک نظارہ مستقبل سے ناواقفیت اور جہالت ہے، انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحرِ ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے، اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے، اور اسی لیے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو، اسکی آزمایش اور امتحان کے لیے اسی بحرِ بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دیدے، چنانچہ یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوت اور رسالت بلکہ عام بزرگی اور ولایت کے ثبوت پر نوعِ انسانی کے عام افراد کے نزدیک ایک دلیل ہیں، اور حجتِ قائمہ ہے، بنی اسرائیل کے نزدیک یہ وصف نبوت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ انکی زبان میں پیغمبر کا نام ہی "پیشین گو" ہے، عربی، عبرانی، اور دوسری سامی زبانوں میں "نبی" یا "نابی" جو پیغمبر کے معنی میں مستعمل ہے، اس کے لغوی معنی مخبر اور پیشین گو کے ہیں اور نبوت کے معنی مخبری اور پیشینگوئی کے ہیں، اسی لیے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسیقدر

حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہانِ نادیدہ کا مخبر ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کی یہ کیفیت تھی کہ تمام عرب کاہنوں کے جال میں گرفتار تھا، عرب کے تمام مشرکانہ معابد کاہنوں کے دار السلطنت تھے، جن میں ٹھیکر وہ عرب کے دل و دماغ پر حکومت کر رہے تھے، مشہور کاہنوں کے پاس لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے، اور ان سے مستقبل اور غیب کی باتیں دریافت کرتے تھے، وہ ایک خاص قسم کی مقفی اور مسجع عبارتوں میں اُن کو غیب کی اور مستقبل کی باتیں بتاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پیغمبر بنا کر عربوں کے درمیان بھیجے گئے تو اُن کے لیے ثبوت نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہی اخبار غیب اور پیشنگوئی ہو سکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں پیشنگوئیاں کیں، اور مستقبل کے واقعات اور باتوں کو رائی العین کی طرح پیش فرمایا اور وہ سب کے سب بے کم و کاست پوری اتریں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پیشنگوئیوں کا صدور مختلف حالتوں میں ہوا، اور آپ کو انکی اطلاع مختلف صورتوں میں دی گئی، مثلاً کبھی قرآن مجید کی وحی کی صورت میں، کبھی عالم خواب میں اور کبھی زبانِ صداقت نشان کے عام الفاظ میں جس میں طریقۂ اطلاع کا اظہار نہیں ہے، قرآن مجید کی پیشنگوئیوں کی تفصیل اس سے پہلے گذر چکی ہے، خواب کی پیشنگوئیوں کا تذکرہ کچھ عالم رویا کے بیان میں آچکا ہے، باقی پیشین گوئیاں سطور ذیل میں تحریر ہیں،

فتوحات عظیمہ کی اطلاع اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سر و سامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں یہ قوت پیدا ہو جائیگی کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت کو الٹ دیں گے، لیکن پیغمبر صادق

نے اسی وقت بشارت سنائی کہ "مسلمانو! تم عنقریب قسطنطنیہ فتح کروگے، مداین تمھاری ہاتھوں میں آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمھارے دست تصرف میں ہوں گے، مصر تمھاری حکومت میں داخل ہوگا، تم سے اور ترکوں سے جن کی چھوٹی آنکھیں اور چوڑے چہرے ہوں گے (ترکستانی و منغولی ترک) جنگ ہوگی۔"[1] دنیا ان میں سے کس واقعہ کی تردید کر سکتی ہے؟

یہ پیشینگوئیاں الگ الگ بھی کی گئی ہیں، مگر مجموعی حیثیت سے اس وقت کی گئیں جب مسلمان مدینہ میں محصور ہو رہے تھے، اور تمام عرب مدینہ کو گھیرنے کے لیے امنڈا چلا آرہا تھا، اور مسلمان ہر آن اپنی موت کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے، غزوۂ خندق کے موقع پر جب خندق کھودتے ہوئے ایک سخت پتھر حائل ہو گیا تھا، اور صحابہ اس کے توڑنے سے عاجز ہو چکے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معجز نما ضرب خارا شگاف سے پتھر کے ٹکڑے کر دیے تھے، تو آپ نے تین ضربیں ماری تھیں، اور ہر ضرب کے بعد ایک چنگاری سی اڑتی تھی، اور آپ ہر بار نعرہ لگاتے تھے،

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ	اور تیرے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف
عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَ	سے پوری ہوئیں، اسکی باتوں کو کوئی بدل نہیں
هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (انعام - ۱۲)	سکتا، اور وہی سننے والا اور جاننے والا ہے،

بعض صحابہؓ نے حقیقت دریافت کی، فرمایا "جب میں نے پہلی ضرب ماری تو کسریٰ کے شہر اور ان کے اردگرد میرے سامنے کر دیے گئے، یہاں تک کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے ان کو

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام میں یہ حدیثیں ہیں،

دیکھا" حاضرین نے عرض کی، یارسول اللہ! دعا کیجئے کہ وہ فتح ہوں، آپ نے دعا فرمائی، پھر فرمایا۔ دوسری ضرب میں قیصر کے شہر اور اس کے آس پاس کے مقامات دیکھے، حاضرین نے پھر عرض کی یارسول اللہ! انکی فتح کی بھی دعا فرمایئے۔ آپ نے دعا کی، پھر ارشاد ہوا کہ تیسری ضرب میں حبشہ کے شہر اور گاؤں نگاہوں کے سامنے آئے"۔ پھر فرمایا "حبشہ والے جب تک تم سے تعرض نہ کریں تم بھی تعرض نہ کرو، اور ترکوں کو اُس وقت تک چھوڑ دو جب تک وہ تمہیں چھوڑیں[1]"۔

یہ پیشینگوئی تو تمثیلی شکل میں تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے اور صریح الفاظ میں بھی بشارت سنادی تھی، فرمایا تم لوگ جزیرۂ عرب میں لڑو گے اور خدا فتح دے گا، پھر فارس سے لڑو گے اور فتح ہوگی، پھر روم سے لڑو گے اور فتح ہوگی[2]۔

قیصر و کسریٰ کی بربادی کی خبر عین اُس وقت جب کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں پورے جاہ وجلال سے دنیا پر حکمراں تھیں، اور بظاہر ان کی بربادی کا کوئی سامان نہ تھا کہ مکہ کے منادی حق نے یہ پیشین گوئی کی، اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ "جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا، اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو پھر دوسرا قیصر نہ ہوگا[3]"۔ نہ صرف تاریخ بلکہ آج بھی دنیا کا مشاہدہ اس آواز کی صداقت سے معمور ہے، ایرانی مجوسیوں کی شہنشاہی کی شکست کے بعد کیا پھر کسی ایرانی مجوسی شہنشاہ کا تاجِ خسروی کسی نے دیکھا، اور رومی شہنشاہی کی بربادی کے بعد رومی قوم کا وجود بھی اس سطح زمین پر کہیں نظر آیا؟

---

[1] سنن نسائی کتاب الجہاد [2] صحیح مسلم کتاب الفتن [3] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ و صحیح مسلم وغیرہ

سازو سامان کی بشارت

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ میرے گھر تشریف لائے اور دریافت کیا کہ کیا قالین ہے؟ عرض کی ہمارے پاس قالین کہاں؟ ارشاد فرمایا کہ "ہاں عنقریب تم قالینوں اور عمدہ فرشوں پر بیٹھو گے۔" حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ وہ دن آیا جب ہم قالینوں پر بیٹھے، اب میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ قالین ہٹا لیجاؤ تو وہ کہتی ہے کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے۔[1]

امن وامان کی بشارت

عدی بن حاتمؓ کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ دو شخص آئے، ایک نے بھوک کی، اور دوسرے نے رہزنی کی شکایت کی، آپ نے عدیؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "کیوں عدی! تم نے حیرہ کو دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا، دیکھا تو نہیں ہے، لیکن اس کو جانتا ہوں"۔ آپ نے فرمایا، اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک ہودج نشین عورت چل کر خانۂ کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا، اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ کسریٰ کا خزانہ فتح کر لیا گیا! اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا چاندی لیکر نکلے گا کہ کسی کو خیرات دے لیکن دولت کی کثرت کا یہ عالم ہوگا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ملے گا، عدیؓ کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ آخر قبیلۂ طے کے وہ ڈاکو کیا ہو جائیں گے، جنھوں نے تمام ملک میں آگ لگا رکھی ہے، لیکن خود عدی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھ لیا کہ حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت تنہا چل کر آتی ہے اور خانۂ کعبہ کا طواف کرکے واپس جاتی ہے۔ اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوتا، ان کا بیان ہے کہ جن

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ،

لوگوں نے کسریٰ کا خزانہ فتح کیا، ان میں میں بھی تھا، صرف تیسری پیشینگوئی میرے سامنے پوری ہونے سے رہ گئی ہے، جو لوگ زندہ رہیں گے وہ اس کو بھی پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیں گے۔[1] چنانچہ راویوں کا بیان ہے کہ بنی اُمیّہ کی سلطنت کے زمانہ میں یہ واقعہ بھی بعینہٖ گذرا۔

ابوصفوان کے قتل کی خبر ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو مدینہ منورہ کا دارالامان مل گیا، اور اسلام روز بروز ترقی کرنے لگا تو یہ دیکھ کر قریش کے سردار مدینہ پر حملہ کی تدبیریں سوچنے لگے، اسی اثنا میں انصار کے ایک رئیس سعدؓ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے، اور ابوصفوان (امیہ) کے گھر جاکر مہمان ہوئے، ابوصفوان ایک دفعہ موقع پاکر ان کو طواف کرانے لایا، وہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوجہل نکل آیا، اس نے کہا "تم مکہ آکر بے خوف وخطر کعبہ کا طواف کرتے ہو، حالانکہ تم نے بے دینوں (مسلمانوں) کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے، اور سمجھتے ہو کہ خدا ورسول کی تم نصرت کر رہے ہو، خدا کی قسم اگر ابوصفوان کے ساتھ تم نہ ہوتے تو یہاں سے سلامت گھر نہ جاسکتے۔" حضرت سعدؓ نے ڈانٹ کر جواب دیا کہ "اگر تم ہم کو طواف نہ کرنے دوگے تو ہم تمھارا قافلۂ تجارت مدینہ کے راستہ سے گذرنے نہ دیں گے۔" صفوان نے کہا کہ "اے سعد ان سے سخت لہجہ میں گفتگو نہ کرو، یہ اس وادی کے سردار ہیں۔"

حضرت سعدؓ نے کہا "اے صفوان اپنی طرفداری رہنے دو، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تم عنقریب مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے جاؤگے۔" ابوصفوان نے کہا کیا وہ یہاں آکر مجھے ماریں گے۔" انھوں نے جواب دیا، یہ مجھے نہیں معلوم، یہ سن کر ابوصفوان کے بدن پر

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ۔

رعشہ پڑ گیا، وہ گو کافر تھا لیکن اس کو معلوم تھا کہ دہنِ رسالتؐ سے آجتک کوئی غلط بات نہیں نکلی، چنانچہ اس کے بعد بدر کی لڑائی کا موقع پیش آیا، تو اس کی بیوی نے جانے سے روکا، اور سعدؓ کی پیشینگوئی یاد دلائی، ابوصفوان نے بھی ڈر کر اس فوج میں شرکت سے انکار کر دیا، لیکن ابوجہل اس کو سمجھا بجھا کر لے گیا، بالآخر اسی کارزار میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی[1]،

نام بنام مقتولینِ بدر کی خبر | بدر کا معرکہ جب پیش آنے والا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لیکر میدان میں گئے، اور بتایا کہ یہ فلاں کافر کی قتل گاہ ہے، یہ ابوجہل کا مقتل ہے، یہاں قریش کا وہ بڑا سردار مارا جائے گا. یہ عجیب و غریب پیشینگوئی تھی. تین سو ساڑھے تین سو نیم مسلح بے سر و سامان سپاہیوں کا افسر، ایک ہزار سے زیادہ سپاہیوں کی غرق آہن، باساز و سامان فوج کی شکست اور افسروں کے قتل و موت کا اعلان کر رہا تھا صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہر سردار قریش کے لیے آپ نے جو جگہ مقرر فرما دی تھی، وہیں اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پائی گئی[2]،

فاتح خیبر کی تعیین | خیبر میں یہودیوں کے متعدد مستحکم اور مضبوط قلعے تھے، ہر روز مسلمان افسر علم دخو لے کر جاتے تھے، اور زور آزمائی کرتے تھے، اور شام کو ناکام واپس آتے تھے، ایک دن آپ نے فرمایا کہ کل علم میں اس کے ہاتھوں میں دونگا جس کو خدا اور اس کا رسول پیار کرتا ہے، اور اسی کے ہاتھ پر کل فتح ہوگی، اسلام کی صف میں ہر حوصلہ مند شمشیر زن نے کل کی توقع پر بیقراری میں رات بسر کی، کوکبۂ صبح جب طلوع ہوا تو حضرت علیؓ پردۂ غبار سے نمودار ہوئے، حضرت ممدوح کو آشوب چشم تھا، اس لیے وہ ساتھ نہ آسکے تھے، آپ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ میں علم دیا اور خیبر کا

---

[1] صحیح بخاری، آغاز کتاب المغازی [2] صحیح مسلم غزوۂ بدر،

میدان اُسی دن ان کے ہاتھوں سے سر ہوا[1]،

حضرت فاطمہ زہراؓ کی وفات کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں ایک دفعہ حضرت فاطمہ زہراؓ کو اپنے پاس بلایا، اور اُن کے کان میں کوئی بات کہی کہ وہ رونے لگیں، تھوڑی دیر کے بعد اُن سے ایک اور بات کہی تو وہ ہنسنے لگیں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو یہ دیکھکر تعجب ہوا، اور اُنؓ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں رسول اللہ کا راز ظاہر نہیں کر سکتی، جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت عائشہؓ نے دوبارہ ان سے دریافت کیا، حضرت فاطمہؓ نے کہا ہاں اب میں بتا سکتی ہوں، حضورؐ نے پہلے مجھ سے یہ فرمایا کہ میں اسی بیماری میں انتقال کروں گا، اور پھر فرمایا اے فاطمہ میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم آکر مجھ سے ملوگی[2] یہ دونوں باتیں صحیح ہوئیں، آپنے اسی مرض میں وفات پائی، اور آپ کی وفات کے تقریباً چھ ہی مہینوں کے بعد حضرت فاطمہ زہراؓ بھی اس دنیا سے چل بسیں۔

خود اپنی وفات کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سال وفات پائی ہے، آپنے اسی سال اس دنیا سے اپنی تشریف بری کا عام اعلان کر دیا تھا، حجۃ الوداع سے پہلے معاذؓ کو داعی اسلام بنا کر یمن بھیجا تھا، ان کو رخصت کرتے ہوئے آپنے فرمایا، معاذ! اب اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکوگے، واپس آؤگے تو میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے گذروگے، یہ سن کر وہ رونے لگے،[3] حجۃ الوداع کے خطبہ میں ہزاروں مسلمانوں کے روبرو آپنے فرمایا "شاید کہ آیندہ سال تم مجھے نہ پاسکو گے۔" مرض الموت سے کچھ دن بیشتر فرمایا کہ خدا نے اپنے بندہ کو دنیا اور

۱ صحیح بخاری فتح خیبر ۲ صحیح مسلم باب الفضائل وصحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام ۳ مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۳۵

آخرت کی زندگی کا اختیار دیا، تو اس نے آخرت کی زندگی پسند کی"[1]

فتح یمن کی خبر یمن سنہ ۸ھ میں فتح ہوا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فتح اور وہاں کے مسلمانوں کی دور دراز ملکوں میں ہجرت کی خبر پہلے ہی دیدی تھی، آپ نے فرمایا تھا "یمن فتح کیا جائے گا، تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اور اہل و عیال اور جو ان کا کہا مانیں گے انکو لے کر آئیں گے، حالانکہ مدینہ ہی کا قیام ان کے لیے بہتر ہوتا، اگر وہ جانتے۔"[2] آخر یمن خود آپ کی زندگی ہی میں فتح ہوا، اور آپ کے بعد جب وہاں بغاوت ہوئی، تو عہد صدیقی میں دوبارہ فتح ہوا، اور وہاں سے لوگ نکل نکل کر ایک طرف مشرق میں خراسان اور ترکستان تک اور دوسری طرف مغرب میں افریقہ اور اسپین تک پھیل گئے، اور پھر ان تمام ملکوں میں یمنی اور حجازی قبائل کی باہمی خانہ جنگی کے باعث تباہی، تاریخ کے مشہور و معروف واقعات ہیں،

فتح شام کی خبر پھر فرمایا "اور شام مفتوح ہوگا، تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے، اور اپنے اہل و عیال اور ہمراہیوں کو لے کر آئیں گے، اور مدینہ ان کے لیے بہتر ہوتا، اگر وہ جانتے۔"[3] امام احمد نے مسند میں روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا "عنقریب تم لوگ شام کی طرف ہجرت کروگے تو وہ تمھارے لیے فتح کر دیا جائے گا"[4] معلوم ہے کہ شام فتح ہونے کے ساتھ وہ عربوں کا مسکن بن گیا، اور آج بھی ان کی آبادی وہاں سب سے زیادہ ہے،

فتح عراق کی خبر پھر ارشاد ہوا کہ عراق مفتوح ہوگا، اور لوگ وہاں بھی اپنی سواریوں کو

---

[1] صحیحین مناقب ابی بکرؓ [2] صحیح مسلم کتاب الحج و موطا مالک و عبدالرزاق و ابن خزیمہ و ابن حبان،

[3] بحوالۂ سابق [4] مسند ابن حنبل، روایت معاذؓ

ہنکاتے ہوئے اہل وعیال کو لے کر آئیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر تھا اگر وہ سمجھتے۔[1]
فتحِ عراق کی بشارت کی بعض اور روایتیں بھی ہیں۔

خوزستان اور کرمان کی فتوحات اور ترکوں سے جنگ

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "قیامت سے پہلے تم لوگ ایسے لوگوں سے لڑو گے جن کے جوتے بال کے ہوں گے"۔[2] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "اس وقت تک قیامت نہیں آئیگی، جب تک تم خوز و کرمان کے عجمیوں سے نہ لڑو گے، جن کے چہرے سرخ، ناکیں چپٹی، آنکھیں چھوٹی ہوں گی، ان کے چہرے ہتوڑوں سے پیٹی ہوئی ڈھالوں کے مانند ہوں گے (یعنی چوڑے چپٹے) اور ان کے جوتے بال کے ہوں گے"۔[3] اور روایتوں میں یہ الفاظ ہیں، "اس وقت تک قیامت نہ آئے گی جبتک مسلمان ترکوں سے نہ لڑلیں، جن کے چہرے چپٹے ہوں گے، جن کے لباس بال کے ہوں گے اور بال ہی کے (موزے یا جوتے) پہن کر وہ چلتے ہوں گے"۔[4] یہ تمام پیشین گوئیاں پہلی ہی صدی کے آخر تک پوری ہوگئیں،

فتح مصر کی بشارت اور ایک واقعہ کا حوالہ

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "تم عنقریب مصر فتح کرو گے۔ جہاں قیراط مشہور ہے، جب اس کو فتح کرو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا، کیونکہ تمھارے ان کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے، (حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ماں ہاجرہ مصر کی تھیں) اور جب تم دیکھنا کہ وہاں ایک اینٹ بھر جگہ کے لیے دو آدمی لڑتے ہوں تو وہاں سے نکل جانا، خود حضرت ابوذرؓ نے بعینہٖ ایسا ہی دیکھا،

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحج و موطا امام مالک [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام [3] ایضاً [4] ایضاً،

اور وہ وہاں سے واپس چلے آئے۔[۱]

غزوۂ ہند کی خبر ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان یہ سن کر خوش ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان قدسی بیان سے ہندوستان میں اسلام کے داخل اور غالب ہونے کی خوشخبری سنائی تھی، آپ نے فرمایا "میری امت کے دو گروہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ آتش دوزخ سے بچائے گا، ایک وہ جو ہندوستان کے غزوہ میں شریک ہوگا" دوسری روایت میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے (مسلمانوں سے) ہندوستان کے غزوہ کا وعدہ فرمایا تھا، تو اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو اس کی راہ میں اپنی جان و مال قربان کردوں گا، تو اگر میں اس میں شہید ہوا تو بہترین شہید ٹھہروں گا، اور اگر زندہ لوٹا تو میں آتشِ دوزخ سے آزاد ابوہریرہ ہوں گا۔"[۲] یہ پیشینگوئیاں امام نسائی المتوفی ۳۰۲ھ کی سنن میں ہیں جو سلطان محمود کے حملۂ ہندوستان (۳۹۲ھ) سے تقریباً سو برس پہلے لکھی گئی ہے۔

بحرِ روم کی لڑائیاں بحرِ روم جس کو بحرِ اخضر اور بحرِ متوسط (میڈیٹرین سی) بھی کہتے ہیں یورپ اور ایشیا کی، اور اب گویا اسلام اور عیسائیت کی حد فاصل ہے، اور اُس زمانہ میں یہ رومیوں کی بحری قوت کا جولانگاہ تھا، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوابِ راحت سے مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے، اور فرمایا اس وقت خواب میں میری امت کے کچھ لوگ تخت شاہی پر بادشاہوں کی طرح بیٹھے ہوئے دکھائے گئے، یہ بحرِ اخضر میں (جہاد کے لیے) اپنے جہاز ڈالیں گے۔[۳] یہ بشارت سب سے

---

[۱] صحیح مسلم باب الوصیۃ باہل مصر کتاب فضائل الصحابۃ و مسند احمد جلد ۵ ص ۱۴۴ (عن ابی ذر) و مسند ابی عوانہ و ابن حبان [۲] یہ دونوں روایتیں سنن نسائی کتاب الجہاد میں ہیں [۳] صحیح بخاری باب الرؤیا فی النہار مسلم باب غزوۃ البحر کتاب الامارۃ و ابوداؤد کتاب الجہاد

پہلے امیر معاویہؓ کے عہد میں پوری ہوئی، اور دیکھا گیا کہ دمشق کی سرزمین پر اسلام میں سب سے پہلے تخت شاہی بچھایا جاتا ہے، اور دمشق کا شہزادہ یزید اپنی سپہ سالاری میں مسلمانوں کا پہلا لشکر لے کر بحر اخضر میں جہازوں کے بیڑے ڈالتا ہے، اور دریا کو عبور کر کے قسطنطنیہ کی چہار دیواری پر تلوار مارتا ہے،

بیت المقدس کی فتح بیت المقدس اسلام کا دوسرا قبلہ ہے، اور اس کی تولیت امت محمدیہ کا حق تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس تولیت کی بشارت دیدی تھی، اور فرمادیا تھا کہ میری موت کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا، عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے چند واقعے گن رکھو (اول) میری موت، پھر بیت المقدس کی فتح"[1] اس کے بعد آپ نے چار اور باتیں بیان فرمائیں، یہ بشارت حضرت عمرؓ کے عہد میں ۱۵ھ میں پوری ہوئی

فتح قسطنطنیہ کی بشارت فتح قسطنطنیہ کی متعدد بشارتیں ہیں، ایک دفعہ فرمایا کہ تم لوگ یقیناً آیندہ قیصر کے خزانوں پر متصرف ہوگے"[2] اور فرمایا "میری امت کی ایک جماعت بحر اخضر (بحر روم جس کے ساحل پر قسطنطنیہ ہے) میں سوار ہوگی"[3] مسلمانوں کی پہلی جماعت اسی قسطنطنیہ کی فتح کے لیے اس دریا میں سوار ہوئی، آثار قیامت کے سلسلہ میں فرمایا "یہ ہوگا، یہ ہوگا، پھر تم قسطنطنیہ فتح کروگے"[4] ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "تم لوگ بے شبہ قسطنطنیہ فتح کروگے تو اس کا حاکم (مسلمان) کتنا اچھا حاکم ہوگا، اور وہ (فتح کرنے والی) فوج کیسی اچھی فوج

---

[1] صحیح بخاری باب الجزیہ [2] صحیح بخاری وصحیح مسلم [3] صحیح بخاری رکوب البحر وعلامات النبوۃ وباب الرؤیا فی النہار [4] صحیح مسلم وترمذی کتاب الفتن.

ہو گی"۔[1] مسلمان خلفا، اور سلاطین میں سے ہر باہمت نے اس کو پورا کرنے کیلیے قسمت آزمائی کی، مگر ازل سے یہ سعادت سلطان محمد فاتح کی قسمت میں آچکی تھی،

فتح روم کا اشارہ | جس طرح قسطنطنیہ مشرقی رومی سلطنت کا پایۂ تخت تھا، رومیہ (روم) مغربی رومی سلطنت کا دار الحکومت تھا، اور جو اب اٹلی کا پایۂ تخت ہے، یہ مغربی عیسائیوں کا مقدس شہر ہے، گو صاف اور صریح الفاظ میں نہیں لیکن اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو اس کی فتح کی بشارت دی تھی، چنانچہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ اسپین اور مغرب کے مسلمانوں نے اس کے مناروں کے اوپر بھی اسلام کا علم ایک دفعہ بلند کر دیا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے کسی نے پوچھا کہ پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا، یا رومیہ، انھوں نے اپنی یادداشت کے کاغذوں کو دیکھکر جواب دیا کہ ہم لوگ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد حاضر تھے کسی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا یا رومیہ، فرمایا "نہیں پہلے ہرقل کا شہر فتح ہوگا"۔[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیہ کے متعلق جو زیادہ وضاحت نہیں فرمائی اسکی وجہ غالباً یہ ہو کہ مسلمانوں کی حکومت کا وہاں فتح کے بعد قسمتِ الٰہی میں باقی رہنا منظور نہ تھا،

فاتح عجم کا اشارہ | حضرت سعدؓ بن ابی وقاص حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ گئے تھے، وہاں جاکر وہ اس قدر سخت بیمار پڑے کہ ان کو اپنی زندگی کی امید نہ رہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو ان کا اضطراب دیکھکر ان کو تسلی دی، اور ان کے حق میں دعا کی اور فرمایا کہ "تم اگر خدا نے چاہا تو ابھی نہیں مروگے، تم کو اگر

[1] مسند احمد عن ابی عبد اللہ بن ابی بسر الخثعمی و حاکم و ابن ابی شیبہ [2] ایضاً عن ابی قبیل التابعی عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص جلد ۲ و ابن ابی شیبہ۔

خلوص سے کام کروگے تو درجۂ عظیم ملے گا، بہتیرے لوگوں کو تم سے فائدہ اور بہتوں کو تم سے نقصان پہنچے گا۔"[1] یہ حضرت سعدؓ کے عجمی فتوحات کی بشارت تھی کہ حضرت سعدؓ نے سپہ سالارِ اسلام بن کر بڑا درجہ پایا، اور چند سال میں کسریٰ کا تاج و تخت چھین لیا اور اس طرح مسلمانوں کو ان کی ذات سے فائدۂ عظیم اور مجوسیوں کو نقصان عظیم پہنچا،

مرتدین کی اطلاع | حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں عرب کے متعدد اطراف میں دعویدارانِ کاذب پیدا ہوگئے، اور بہت سے لوگ جو اسلام کا کلمہ پڑھ چکے تھے، ان کے ساتھ ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کی پہلے ہی اطلاع دیدی تھی، فرمایا کہ "حوضِ کوثر پر بہت سے لوگ آئیں گے، میں کہوں گا کہ یہ میرے ساتھی ہیں، لیکن فرشتے ان کو دھکے دیکے نکال دیں گے، اور کہیں گے کہ یا رسول اللہ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ آپ کے بعد بدل گئے تھے"[2]۔

حضرت زینبؓ کی وفات کی اطلاع | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ کو اطلاع دی تھی کہ تم میں سب سے پہلے مجھ سے آکر وہ ملے گی جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہوگا، ازواجِ مطہرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے جو محبت تھی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس پیشین گوئی کے مطابق وہ اپنے اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم میں سے جب سب سے پہلے حضرت زینبؓ نے وفات پائی تو ہم سمجھے کہ ہاتھ کی لمبائی سے حضور کا کیا مقصد تھا (ہاتھ کا لمبا ہونا عربی میں کشادہ دستی اور فیاضی سے کنایہ ہے) زینبؓ ہم سب میں سب سے زیادہ کشادہ دست تھیں[3]۔"

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و نسائی باب الوصایا [2] صحیحین حدیث کوثر [3] صحیح مسلم فضائل حضرت زینبؓ۔

ام ورقہ کو شہادت کی خوشخبری ام ورقہؓ ایک صحابیہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدر کا ارادہ کیا تو انھوں نے درخواست کی کہ "یا رسول اللہ مجھ کو بھی اس میں شرکت کی اجازت دیجئے، شاید کہ خدا مجھے شہادت نصیب کرے"۔ فرمایا "تم اپنے گھر ہی میں رہو تمھیں شہادت نصیب ہوگی، چنانچہ وہ زندگی ہی میں اس پیشینگوئی کے مطابق شہیدہ کہلاتی تھیں، ان کے پاس ایک غلام اور ایک لونڈی تھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان دونوں نے مل کر ایک رات ان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا، اور اس طرح اطلاع نبوی کے مطابق انھوں نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی[1]

خلفاء کی بشارت حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "بنی اسرائیل کی سرداری اور نگہبانی انبیاء کرتے تھے، جب کوئی نبی مرتا تھا تو دوسرا نبی اس کا قائم مقام ہوتا تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہونگے"[2]

بارہ خلفاء آپ کے بعد بارہ خلفاء کے ہونے کی بشارتیں حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہیں، صحیح مسلم[3] میں یہ الفاظ ہیں "اس وقت تک یہ اسلامی حکومت اچھی رہیگی، جب تک اس پر بارہ آدمی حکومت کریں گے"۔ "یہ حکومت اس وقت تک ختم نہ ہوگی، جب تک اس پر بارہ خلیفہ حکمراں نہ ہولیں"۔ "بارہ خلیفوں تک اسلام معزز اور محفوظ رہے گا"۔ "میرے بعد قریش میں سے بارہ خلیفہ ہوں گے، پھر چھوٹے لوگ ہوں گے"۔ ابوداؤد (کتاب المہدی) میں یہ الفاظ ہیں، "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، یہانتک کہ اس میں بارہ

---

[1] سنن ابی داؤد باب الامامۃ وابن راہویہ [2] صحیح مسلم کتاب الامارۃ [3] ایضاً

خلیفہ گذر جائیں، ان سب پر تمام امت مجتمع ہو گی"۔ علماے اہل سنت میں سے قاضی عیاض اس حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفا میں سے بارہ وہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی، اور وہ متقی تھے، حافظ ابن حجرؒ ابوداؤد کے الفاظ کی بنا پر خلفاے راشدین اور بنی امیہ میں سے ان بارہ خلفا کو گنتے ہیں، جن کی خلافت پر تمام امت کا اجتماع رہا، یعنی حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیزؒ، یزید ثانی، ہشام۔[1] شیعہ فرقہ تو اس حدیث کی تشریح میں اپنے بارہ اماموں کو پیش کر دے گا،

خلافت راشدہ کی مدت فرمایا "خلافت (یعنی خلافت راشدہ) میرے بعد تیس برس ہوگی، پھر بادشاہی ہو جائے گی"۔[2] یہ تیس سال کی مدت حضرت علیؓ کی خلافت پر تمام ہوتی ہے۔

خلیفہ کا نام	خلافت کی مدت	خلیفہ کا نام	خلافت کی مدت
حضرت ابوبکرؓ	سنہ ۱۱ھ - سنہ ۱۳ھ	حضرت عثمانؓ	سنہ ۲۳ھ - سنہ ۳۵ھ
حضرت عمرؓ	سنہ ۱۳ھ - سنہ ۲۳ھ	حضرت علیؓ	سنہ ۳۵ھ - سنہ ۴۰ھ

شیخین کی خلافت کی پیشینگوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گو صریح اور صاف الفاظ میں اپنے جانشینوں کی تعیین نہیں فرمادی تھی، مگر آپ کو یہ علم بخشا جا چکا تھا کہ حالات اس طرح رونما ہوں گے ایک دفعہ آپ نے بیان فرمایا کہ "میں سویا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک کنوئیں کی جگت پر دیکھا جس پر ڈول پڑا ہوا تھا، میں نے اس میں سے اتنے ڈول پانی نکالے، جتنے خدا نے چاہے

---

[1] مقدمہ تاریخ الخلفاء سیوطی [2] جامع ترمذی کتاب الفتن سنن ابی داؤد، حاکم، نسائی، بیہقی،

پھر اس ڈول کو ابو قحافہ کے بیٹے ابو بکرؓ نے لیا۔ انھوں نے بھی اس سے ایک ڈول پانی کھینچا، مگر ان کے کھینچنے میں کسی قدر ضعف تھا، خدا ان کو معاف کرے، پھر ڈول ایک بڑا سا ڈول بن گیا، تو خطاب کے بیٹے (عمرؓ) نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اس طرح کھینچا کہ کسی طاقتور آدمی کو میں نے ان کے برابر کھینچتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ حوض لبالب بھر گیا، اور پینے والوں کا چاروں طرف سے ہجوم ہوگیا"[1]

یہ خلافت صدیقی و فاروقی کی تمثیلی پیشنگوئی ہے جس کی آیندہ واقعات نے حرف حرف تصدیق کی

مسلمانوں کو دولت کی کثرت اور فتنوں کے ظہور سے آگاہ کرنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن فتنوں کا آغاز ہوا اور مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں پیش آئیں ان کا پورا پورا علم آپ کو عطا ہوا تھا، اور اسی لیے آپ نے بار بار مسلمانوں کو اس سے متنبہ کر دیا تھا، ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ شہر کے باہر تھے، آپ نے ہمراہیوں سے پوچھا کہ "مجھکو جو نظر آرہا ہے وہ تم دیکھ رہے ہو؟ سب نے عرض کی "نہیں یارسول اللہ" آپ نے فرمایا" میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے گھروں پر بارش کی طرح فتنے برس رہے ہیں"[2] دوسری دفعہ فرمایا "خدا کی قسم مجھ کو تم پر فقر و فاقہ کا خوف نہیں، بلکہ دولت کا خوف ہے کہ جس طرح تم سے پہلوں پر دنیا پھیلا دی گئی تھی، تم پر بھی نہ پھیلا دی جائے، تو تم اس میں آپس میں رشک و حسد کرنے لگو، اور جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو غافل کر دیا تم کو بھی غافل کر دے"[3] ایک اور موقع پر ارشاد ہوا، "دیکھو میرے بعد

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب کتاب الرؤیا، صحیح مسلم مناقب، آخری فقرے حتی ضرب الناس بعطن کا مرادی ترجمہ ہے لفظی نہیں (دیکھو فتح الباری جلد ۱۲ ص ۳۴۶) [2] صحیح بخاری کتاب الفتن وحجۃ الوداع [3] صحیح بخاری و مسلم، کتاب الفتن

ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا"۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا، ایک زمانہ آئیگا کہ تمھارے سامنے دن کو ایک کھانے کا پیالہ اور رات کو دوسرے کھانے کا پیالہ آئیگا، اور کعبہ کے پردوں کی طرح (بیش قیمت اور عمدہ) تمھارے لباس ہوں گے"، حاضرین نے عرض کی "یا رسول اللہ! ہم اِس حالت میں اچھے ہیں یا اُس حالت میں اچھے رہیں گے، فرمایا "نہیں تم اس حالت میں اچھے ہو کہ تم سب باہم ایک دوسرے سے محبت اور پیار کرتے ہو، اور اُس وقت تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹو گے"[1] حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ مجلس میں رونق افروز تھے، فرمایا کہ میرے بعد اختلاف اور فتنہ ہوگا"، لوگوں نے عرض کی کہ "یا رسول اللہ! تو اس وقت ہم کو کیا حکم ہے"؟ فرمایا کہ امیر اور اسکے رفقاء کا ساتھ دینا"[2]۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا "عنقریب میرے بعد کچھ فتنے پیدا ہوں گے جن میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے، اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا"[3]۔

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد فتنوں کا ظہور ہوگا

خلافت راشدہ کے عہد میں جو فتنے برپا ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اُنکی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی دیدی تھی، اور آپ نے ان کو بعض صحابہؓ کو بتادیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے پوچھا کہ حضورؐ نے فتنہ کی نسبت جو فرمایا تھا وہ کس کو زیادہ یاد ہے، حضرت حذیفہؓ نے کہا مجھے یاد ہے، انسان کو اہل و عیال اور دولت و مال

[1] مسند احمد حدیث طلحہ (النضری)، ومستدرک حاکم [2] مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۹۹، ذہبی نے اس کو صحیح کہا ہے [3] صحیح بخاری کتاب الفتن،

ہیں جو فتنہ پیش آتا ہے وہ نماز، صدقہ اچھی باتوں کے کہنے اور بری باتوں سے روکنے سے
دور ہو جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا میں اس کی نسبت نہیں پوچھتا میں اس فتنہ کو
پوچھتا ہوں جو سمندر کی موجوں کی طرح لہریں لے گا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا، "اے
امیرالمومنین! اس فتنہ سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کہ اسکے اور آپکے درمیان
ایک بند دروازہ ہے" دریافت فرمایا کہ کیا یہ دروازہ کھول دیا جائیگا، یا توڑ دیا جائیگا، حضرت
حذیفہؓ نے جواب دیا، توڑ دیا جائیگا، حضرت عمرؓ نے کہا تو یہ دروازہ کبھی بند نہ ہو سکے گا، حضرت
حذیفہؓ نے کہا ہاں ایسا ہی ہے، راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ کیا حضرت
عمرؓ کو معلوم تھا کہ وہ دروازہ کون تھا؟ انھوں نے جواب دیا، ہاں بیشک اُن کو اس کا اسی
طرح علم تھا جس طرح اس بات کا علم ہے کہ آج کے بعد کل آئیگا، راوی کہتا ہے "میں لحاظ سے نہ
پوچھ سکا کہ وہ دروازہ کون تھا"۔ اسلیے مسروق (تابعی) سے کہا کہ وہ حضرت حذیفہؓ سے
اس کو دریافت کریں، مسروق نے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ "وہ دروازہ خود حضرت
عمرؓ کا وجود تھا[1]، یہ دروازہ جب سے ٹوٹا کس کو معلوم نہیں کہ اسلام پر فتنوں کا سیلاب امنڈ آیا۔
فتنے مشرق کی جانب سے اٹھیں گے | مستند اور معتبر حدیثوں میں پوری تصریح کیساتھ بروایات کثیرہ
مذکور ہے[2] کہ اسلام میں فتنوں کا آغاز مشرق کیطرف سے ہوگا، آپ نے انگلی سے اشارہ کر کے بار بار
فرمایا کہ ادھر سے جدھر شیطان کی سینگیں یعنی سورج کی کرنیں نکلتی ہیں، یہ اشارہ عرب سے مشرق
کیجانب تھا یعنی عراق کی طرف۔ دیکھو حضرت عمرؓ کا قاتل عجمی تھا، حضرت عثمانؓ کے عہد کا فتنہ

[1] صحیح بخاری کتاب الفتن [2] صحیح بخاری ومسلم کتاب الفتن وغیرہ،

عراق ہی سے اٹھکر مصر تک پھیلا، جنگ جمل اسی سرزمین پر ہوئی، حضرت علیؓ یہیں شہید ہوئے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ صفین یہیں پیش آئی، خوارج اسلام کا پہلا گمراہ کن فرقہ یہیں سے نکلا، جبریہ اور قدریہ وغیرہ اسلام کے دیگر فرقوں کی یہ بدعتیں جنھوں نے اسلامی عقائد کی سادگی کو پارہ پارہ کر دیا، یہیں پیدا ہوئے، جگر گوشۂ رسول اور خانوادۂ نبوت کا قافلہ یہیں فرات کے کنارہ لٹا، مختار نے ادعاے کاذب کا فتنہ یہیں پیدا کیا، شیعیت جس نے اسلام کو دو حصوں میں منقسم کیا، یہیں کی پیداوار ہے، حجاج کی سفاکیاں اسی سرزمین پر ہوئیں، ترک و تاتار کی غارتگریوں کے نتائج جنھوں نے اسلام کی رہی سہی طاقت، اور عرب خلافت عربی کا تار تار الگ کر دیا، یہیں رونما ہوئے، حتیٰ کہ اس جنگ عظیم میں بھی واحد اسلامی طاقت کے ساتھ غداری کے نتائج بھی اولاً یہیں ظاہر ہوئے اور اس کے اثرات بعد کو اور اطراف میں بھی رونما ہوئے،

حضرت عثمانؓ کو فتنہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ایک باغ میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے، حضرت ابوبکرؓ دروازہ کھلوا کر آئے تو آپ نے ان کو جنت کی بشارت دی، اسی طرح حضرت عمرؓ آئے، اور آپ نے ان کو جنت کا مژدہ سنایا، اس کے بعد حضرت عثمانؓ آئے، تو آپ نے ان کو جنت کی بشارت کے ساتھ فتنہ و امتحان سے دوچار ہونے کی بھی اطلاع دی، چنانچہ ان کو اپنے زمانۂ خلافت میں یہ فتنہ و امتحان پیش آیا اور شہادت نصیب ہوئی،[1] حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بھی روایتیں ہیں،

حضرت عمرؓ اور عثمانؓ شہید ہوں گے ایک دفعہ مکہ معظمہ میں کوہ ثبیر یا کوہ احد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحیح مسلم فضائل عثمانؓ

تشریف فرما تھے، آپؐ کی رفاقت میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی تھے کہ دفعۃً پہاڑ کو جنبش ہوئی، آپؐ نے فرمایا، "اے ثبیر! ٹھہر جا کہ تیری پشت پر ایک پیغمبر، ایک صدیق اور دو شہید ہیں"، پیغمبر اور صدیق کو تو سب جانتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ دو شہید کون تھے[۱]۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کی مشکلات اور شہادت

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "تم سے امت میری بعد بیوفائی کرے گی"۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "اے علی خبردار! کہ تم کو میرے بعد مصیبت پیش آئیگی"۔ حضرت علیؓ نے استفسار کیا "کیا یہ مصیبت میری سلامتی دین کے ساتھ پیش آئے گی؟" فرمایا "ہاں تمہاری سلامتی دین کے ساتھ"۔ حضرت علیؓ اور بعض صحابہؓ ایک سفر میں ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے، آپؐ نے فرمایا "میں بتاؤں کہ دو سب سے بدبخت انسان کون ہیں"؟ لوگوں نے عرض کی "ہاں یا رسول اللہ! بتایئے"۔ "ایک ثمود کا سرخ رنگ بدبخت جس نے ناقۂ ثمود کو قتل کیا، دوسرا وہ جو اے علی! تمھارے یہاں پر (گردن کی طرف اشارہ کیا) تلوار مارے گا"[۲]۔

جنگ جمل کی خبر

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے درمیان جو اتفاقی لڑائی بصرہ میں پیش آگئی تھی، اس کو جنگ جمل کہتے ہیں، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہراتؓ کے درمیان

---

[۱] صحیح بخاری مناقب ابی بکرؓ و صحیح ترمذی مناقب عثمانؓ بروایت حسن و سنن نسائی و دارقطنی،

[۲] یہ تینوں روایتیں مستدرک حاکم میں ہیں، امام ذہبی نے پہلی روایت کو مطلق صحیح، دوسری کو بشرط بخاری و مسلم صحیح، اور تیسری کو بشرط مسلم صحیح کہا ہے، جلد ۳ ص ۱۴۰ و ۱۴۱ حیدرآباد۔

تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا "تم میں سے کسی پر حواب کے کتے بھونکیں گے"۔ (حواب عراق میں ایک تالاب کا نام ہے) حضرت عائشہؓ جب اصحاب جمل کیساتھ روانہ ہوئیں اور حواب کے تالاب پر پہنچیں اور کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی یاد آئی[1]

حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی جنگ ایک بار آپ نے فرمایا کہ "اس وقت تک قیامت نہ آئیگی، جب تک دو ایسے گروہ باہم جنگ آزما نہ ہوں گے جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ ایک ہی ہوگا[2] علماء کا بیان ہے کہ یہ پیشینگوئی حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں پر صادق آتی ہے[3]۔

حضرت عمارؓ شہید ہوں گے آپ نے غزوۂ خندق میں حضرت عمارؓ کے سر پر دست شفقت پھیر کر فرمایا "افسوس تجھ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا[4]" یہ پیشینگوئی متعدد صحابہ سے منقول ہے، حضرت عمارؓ، حضرت علیؓ کی معیت میں امیر معاویہؓ کے ساتھیوں کے ہاتھ سے جنگ صفین میں شہید ہوئے،

امام حسنؓ کی مصالحت ایک دفعہ آپ حضرت امام حسنؓ کو لیکر گھر سے باہر نکلے، اور ان کو گود میں لے کر منبر پر چڑھے۔ پھر فرمایا کہ "میرے اس فرزند کے ذریعہ سے خدا مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان مصالحت کرا دیگا[5]" چنانچہ یہ پیشینگوئی حضرت علیؓ کی شہادت کے چھ مہینے بعد پوری ہوئی اور طرفداران علیؓ اور حامیان معاویہؓ میں بعض شرائط پر صلح ہوگئی،

نوخیز حکمرانان قریش کے ہاتھوں اسلام کی تباہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مخصوص اصحاب کو اسلام

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۵۲ و ۹۷ [2] صحیح مسلم فتن [3] دیکھو شرح مسلم [4] صحیح مسلم کتاب الفتن [5] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام و صحیح مسلم و ترمذی باب المناقب و حاکم ترجمۂ امام حسنؓ جلد ۳

کے مستقبل سے باخبر کر دیا تھا، ان میں ایک حضرت ابوہریرہؓ بھی تھے، وہ کہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری امت کی بربادی قریش کے چند نوخیزوں کے ہاتھ سے ہوگی" حضرت ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ "اگر میں چاہوں تو سب کو نام بنام گنا دوں"[1]، یہ پیشنگوئی حرف بحرف صحیح نکلی، حضرت عثمانؓ کے عہد کا سیاسی طوفان، ان کی شہادت، پھر جمل کی لڑائی یہ سب چند نوخیز قریشی رئیس زادوں کی بیجا امنگوں کے نتائج تھے، جیسا کہ عام تاریخ میں مسطور ہے، اور صحیح بخاری میں ہے کہ راوی کہتا ہے کہ ہم نے شام جا کر بنی مروان کو دیکھا تو اُن کو اسی طرح نوخیز نوجوان پایا[2]،

یزید کی تخت نشینی کی بلا اسلام پر

امیر معاویہؓ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور انکے بجائے یزید تخت نشین ہوا، اور یہی اسلام کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی ادبار و نکبت کی اولین شب ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے متعدد روایتیں ہیں، مسند احمد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ "۶۰ھ کے شروع ہونے سے اور لڑکوں کی حکومت سے پناہ مانگا کرو اور دنیا ختم نہ ہوگی، یہانتک کہ اس پر ایسے ایسے لوگ حکمراں نہ ہو لیں"[3]، حاکم میں ہے کہ آپ نے فرمایا "عربوں پر افسوس اس مصیبت سے جو ۶۰ھ کے آغاز پر قریب آئیگی، امانت، لوٹ کا مال اور صدقہ وخیرات، جرمانہ اور تاوان سمجھا جائیگا، اور گواہی پہچان سے دیجائیگی، اور فیصلے ہوا و ہوس سے ہوا کرینگے"۔ بیہقی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ مدینہ کے بازار میں یہ کہتے جاتے تھے کہ "خداوندا میں ۶۰ھ اور لڑکوں کی حکومت کا زمانہ نہ پاؤں"۔ خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی، اور ۵۹ھ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفتن [2] اوائل کتاب الفتن [3] مسند احمد احادیث ابی ہریرہؓ

میں انھوں نے وفات پائی،[1]

امام حسینؓ کی شہادت حضرت امام حسینؑ کی شہادت کی متعدد پیشنگوئیاں حاکم، بیہقی، ابن راہویہ اور ابونعیم وغیرہ میں مذکور ہیں، مگر اصولاً ان روایات کا درجہ بلند نہیں، تاہم اتنی بات مجملاً ثابت ہوتی ہے کہ آپؐ کو اس واقعہ کا علم ضرور عطا کیا گیا تھا، اور آپ نے اہل بیت کو اسکے متعلق کوئی خاص اطلاع دی تھی، اس باب میں بہترین حدیث حاکم کی یہ روایت ہے جس کو اس نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے، کہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تھی کہ میں نے یحییٰ (پیغمبر) کا بدلہ ستر ہزار سے لیا تھا، اور میں تیرے نواسے کا بدلہ ستر ہزار اور ستر ہزار سے لوں گا۔" حافظ ذہبی نے اس روایت کو علی شرط مسلم تسلیم کیا ہے،[2] لیکن روایت خود اس کا اشارہ کرتی ہے کہ اس سے پہلے حضرت حسینؓ کی شہادت کی اطلاع دیجا چکی تھی، یہ اطلاع الٰہی حرف بحرف صحیح ہوئی، امام موصوف کی شہادت کے بعد مختار کے ہاتھوں قاتلین حسینؑ سے اسی قدر انتقام لیا گیا،

خوارج کی اطلاع حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، قبیلۂ بنو تمیم کا ایک آدمی آیا اور کہا کہ "یا رسول اللہ! انصاف سے مال تقسیم فرمائیے۔" آپ نے فرمایا "میں نہ انصاف کروں گا تو کون کرے گا؟" اس کی گستاخی پر حضرت عمرؓ سخت برہم ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا "جانے دو اس کے ایسے رفقا ہونگے جنکے نماز روزے کے مقابل تم کو اپنے

---

[1] یہ روایتیں خصائص کبریٰ سیوطی جلد ۲ ص ۱۲۵ کے حوالہ سے نقل کیگئی ہیں [2] مستدرک جلد ۳ ص ۱۷۸

نماز روزے حقیر معلوم ہوں گے، وہ لوگ قرآن کی تلاوت کریں گے لیکن گلے کے نیچے نہ اترے گا، مذہب کے دائرہ سے اس طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیر نشانہ کے پار نکل جاتا ہے، اس گروہ کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک سیاہ فام شخص پیدا ہوگا جس کے دونوں بازووں میں عورت کے سینہ کی طرح گوشت لٹکتا ہوگا، حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے اس گروہ سے جنگ کی اور میں ان کے ساتھ موجود تھا، اس سیاہ فام کی تلاش کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علامات بتائی تھیں، وہ اُن کے ساتھ متصف نکلا۔[1]

مختار اور حجاج کی اطلاع | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قبیلۂ ثقیف میں دو شخص پیدا ہونگے، جن میں ایک کذاب، دوسرا مبیر یعنی ہلاک کرنے والا ہوگا، چنانچہ جب حجاج ثقفی نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو پھانسی دی، اور ان کی والدہ حضرت اسمأؓ کو بلایا، تو انھوں نے جانے سے انکار کیا، بار بار کے انکار کے بعد حجاج خود ان کے پاس آیا، بہت سے سوال و جواب کے بعد انھوں نے کہا کہ قبیلۂ ثقیف کے دو شخصوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشنگوئی فرمائی تھی، ان میں کذاب (مختار ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا، اور مبیر کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی ہو" یہ سن کر حجاج چپ چاپ الٹے پاؤں واپس گیا۔[2]

حجاز میں ایک آگ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک حجاز میں ایک ایسی آگ نہ نکلے جس کی روشنی بصریٰ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن نہ کردے" یہ روایت صحیح مسلم اور حاکم میں ہے،[3] امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

---

[1] بخاری ج ۱، ص ۵۱۰ باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] مسلم کتاب الفضائل باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا
[3] کتاب الفتن

یہ آگ ہمارے زمانہ میں ۶۵۴ھ میں مدینہ میں ظاہر ہوئی اور آگ اسقدر بڑی تھی کہ مدینہ کے مشرقی پہلو سے لیکر پہاڑی تک پھیلی تھی، اس کا حال شام اور تمام شہروں میں بتواتر معلوم ہوا، اور ہم سے اُس شخص نے بیان کیا جو اس وقت مدینہ میں موجود تھا، ابوشامہ ایک[1] معاصر مصنف کا بیان ہے کہ "ہمارے پاس مدینہ سے خطوط آئے جن میں لکھا تھا کہ چہارشنبہ کی رات کو جمادی الثانیہ کی تیسری تاریخ کو مدینہ میں ایک سخت دھماکا ہوا، پھر بڑا زلزلہ آیا جو ساعت بساعت بڑھتا رہا، یہانتک کہ پانچویں کو بہت بڑی آگ پہاڑی میں قریظہ کے محلہ کے قریب نمودار ہوئی جس کو ہم مدینہ کے اندر اپنے گھروں سے اس طرح دیکھتے تھے کہ گویا وہ ہمارے قریب ہی ہے، اور ترائیاں بہ نکلیں اور ہم اس کو دیکھنے کو چڑھے تو دیکھا کہ پہاڑ آگ بن کر بہ رہے ہیں، اور ادھر ادھر شعلہ بن کر جا رہے ہیں، آگ کے شعلے پہاڑ معلوم ہوتے تھے، محلوں کے برابر برابر چنگاریاں اڑ رہی ہیں، یہانتک کہ یہ آگ مکہ معظمہ اور صحرا سے بھی نظر آتی تھی، لوگ گھبرا کر روضۂ نبوی میں دعا و استغفار کے لیے جمع ہو گئے تھے، یہ حالت ایک مہینہ سے زیادہ رہی[2]، علامہ ذہبی اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اسی سال (۶۵۴ھ) میں مدینہ میں آگ نکلی، جو ان بڑی نشانیوں میں سے تھی جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی، اس آگ میں اس شدت اور روشنی کے باوجود گرمی نہ تھی، اور چند روز رہی، اہل مدینہ کا خیال تھا کہ قیامت آگئی، تو انھوں نے خدا کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کیا، اس آگ کا حال بتواتر معلوم ہے، حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ متعدد لوگوں سے

---

[1] شرح مسلم نووی جلد ۲ ص ۳۹۳ نولکشور [2] تاریخ الخلفا، بحوالہ ابوشامہ واقعات ۶۵۴ھ۔

[3] مختصر تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۲ ص ۱۲۱ حیدرآباد۔

جو بصریٰ میں اس وقت موجود تھے، یہ شہادت منقول ہے کہ انھوں نے رات کو اس کی روشنی میں بصریٰ کے اونٹوں کی گردنیں دیکھیں[1]،

ایک صدی یا ایک دور کے بعد انقلاب

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اخیر زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عشا کے بعد حاضرین کو مخاطب کرکے فرمایا "آج اس شب میں میں تم کو بتاؤں کہ اس سے سو برس بعد آج کے لوگوں میں سے کوئی بھی روے زمین پر باقی نہ رہے گا"۔ راوی کہتا ہے کہ اس سے آپ کا مقصود ایک دور (قرن) کا ختم ہو جانا تھا حضرت جابرؓ اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے آپ نے فرمایا کہ تم قیامت کی نسبت دریافت کرتے ہو اس کا علم تو خدا کو ہے، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں آج روئے زمین پر کوئی سانس لینے والی جان نہیں جو سو برس بعد زندہ رہے گی[2]" اس سے مقصود صحابہؓ کے خیر و برکت کے دور کا اختتام تھا۔ ابو الطفیل صحابی سب سے اخیر میں مرے ہیں، ان کا بیان تھا کہ اب میرے سوا کوئی باقی نہیں جس نے جمالِ محمدیؐ سے آنکھیں روشن کیں، یہ ابو الطفیلؓ پوری صدی کے اختتام پر رحلت گزیں ہوئے،

چار دوروں کے بعد پورا انقلاب

متعدد راویوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے علی الاعلان فرمایا کہ بہترین دور (قرن) وہ ہے جس میں میں ہوں[3]، پھر اس دور کے لوگ جو میرے بعد ہیں، پھر اُس دور کے لوگ جو اُن کے بعد ہیں، پھر اس دور کے لوگ جو اُن کے بعد ہیں

---

[1] تاریخ الخلفا، واقعات ۶۵۴ھ [2] یہ تمام حدیثیں صحیح مسلم باب فضل صحابہ میں ہیں، اور پہلی روایت ابو داؤد کتاب الملاحم میں بھی مذکور ہے [3] صحیح مسلم فضل صحابہ و مسند احمد حدیث بریدہؓ،

پھر ایسے لوگ ہوں گے جو گواہی کے لیے بلائے نہیں جائیں گے، خود جاکر گواہی دیں گے، خیانت کار ہونگے، امین نہ ہوں گے، نذر مانیں گے لیکن ایفا نہ کریں گے، پہلا دور عہد نبوی ہے، دوسرا دور صحابہؓ کا ہے، تیسرا تابعینؒ کا، چوتھا تبع تابعینؒ کا، یہ چار عہد اسلام کے روحانی، دینی، اخلاقی مناقب و مکارم کا، اور صلحائے امت، ائمۂ دین اور علمائے خیر کے پے در پے ظہور اور وجود کا اور خالص مذہبی علوم کی نشو و نما، ترتیب و تدوین اور نشر و اشاعت کا ہے، اس کے بعد ہی بدعات کا سیلاب امنڈ آتا ہے، علمائے سو اور امرائے جور پیدا ہوتے ہیں، فرق باطلہ کا ظہور ہوتا ہے، فقہا میں جمود آتا ہے، علما میں ہوا و ہوس راہ پاتی ہے، ہند، فارس اور یونان کے فلسفیانہ خیالات مسلمانوں میں رائج ہوتے ہیں، اسلام کے اعتقادی و عملی قویٰ سست ہو جاتے ہیں، اور تمام نظام ابتر ہو جاتا ہے،

مدعیان کاذب | صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "قیامت سے پہلے تیس کاذب و دجال پیدا ہوں گے، جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے"[1]، ایسے مدعیان کاذب کی تعداد اگر مسیلمہ کے وقت سے لیکر آج تک کی تاریخوں سے چن کر الگ کیجائے تو قریب قریب تیس کے پہنچ جائے گی جن میں سے دو جو ہندوستان اور ایران میں ابھی ابھی گذرے ہیں، وہ تمھاری نگاہوں کے سامنے ہیں"۔

منکرین حدیث | ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر

---

[1] صحیح مسلم باب (فتن) و ابوداؤد (ملاحم) کے علاوہ مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ اور ابویعلیٰ بزاز اور طبرانی میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے اسی قسم کی روایت ہے،

تکیہ لگائے (غرور کی شان سے) بیٹھا ہو، اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا، یا جس سے میں نے منع کیا، وہ اس سے بیان کیا جائے تو کہے کہ ہم نہیں جانتے جو ہم نے قرآن میں پایا اسی کو مانتے ہیں[۱]"۔ بیہقی میں اس سے زیادہ صاف الفاظ ہیں، دورِ اول میں اگر یہ پیشنگوئی معتزلہ پر صادق آسکتی تھی تو اب آجکل مصر و ہند کے ان اشخاص پر پوری طرح صادق آتی ہے جو خود کو **اہل القرآن** کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔

تجارت کی کثرت اور اس میں عورتوں کی شرکت۔ قیامت کے آثار اور نشانیوں میں سے ایک واقعہ بھی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قیامت سے پہلے خصوصیت کا سلام ہوگا اور تجارت کی کثرت ہوگی[۲]، یہاں تک کہ عورت بھی اپنے مرد کا ہاتھ اس میں بٹایا کرے گی"، کیا اس موجودہ دورِ تمدن سے بڑھ کر اس پیشگوئی کی صداقت کا کوئی اور زمانہ ہوگا؟ آج سے زیادہ کبھی تجارت کی گرم بازاری تھی، اور عورتیں کبھی اس سے پہلے اس بیباکی سے مردوں کے دوش بدوش ہو کر اس پیشہ میں در آئی تھیں؟

اہل یورپ کی کثرت آپ نے صحابہؓ کے سامنے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ قیامت جب آئے گی تو روم سب سے زیادہ ہوں گے[۳]، عربوں کے محاورہ میں روم سے مقصود اہل فرنگ یعنی اہل یورپ ہیں۔ آج اہل یورپ کی یہ کثرت ہے کہ اس وقت ان کے وجود سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں اور انکی قوت و طاقت کا دنیا کی کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ پیشنگوئی آج سے ساڑھے تیرہ سو برس

---

[۱] سنن ابی داؤد باب لزوم السنۃ [۲] مسند احمد جلد اول ص ۴۱۹ مصر و ادب المفرد امام بخاری باب تسلیم الخاصہ و مستدرک حاکم و بزار و طبرانی [۳] صحیح مسلم کتاب الفتن۔

پہلے کی گئی تھی، اور آج اس کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے،

سود کی کثرت پہلے وہی لوگ سود کھاتے تھے اور کھا سکتے تھے جو براہ راست اس کا کاروبار کرتے تھے لیکن آپ نے پیشینگوئی کی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی ایسا نہ ہوگا، جو سود نہ کھائے گا، اگر وہ براہ راست نہیں کھائے گا تو اس کا غبار یا دھواں بھی اڑ کر اس تک ضرور پہنچے گا[1]، کیا آج وہی زمانہ بعینہٖ نہیں ہے، آج کی تجارت اور سوداگری تمامتر سود پر مبنی ہے، یہاں تک کہ ہمارے ملک کی ہر چیز جو بازار سے خریدی جاتی ہے، وہ بیسیوں سودی معاملوں سے گذر کر ہم تک پہنچتی ہے، تمام وہ لوگ جن کی معیشت سرکاری نوکری ہے، اور اکثر غیر سرکاری نوکر بھی بینک کے جمع شدہ روپیوں سے معاوضہ حاصل کرتے ہیں، اور امراء اور اہل دولت بھی اپنا سرمایہ امانتی منافع سے وصول کرتے ہیں، غرض آج دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں کہی جاسکتی ہے، جو تمامتر سود سے پاک اور مبرا ہو، اور یہ یورپ کے تمدن کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ عالمگیر اثر ہے، یہ عظیم الشان پیشینگوئی کتنی بڑی صداقت پر مبنی ہے، اور جس کو کبھی کوئی انسان صرف قیاس سے اس بلند آہنگی کے ساتھ دنیا کو نہیں سنا سکتا تھا۔

یہودیوں سے جنگ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ مسلمانوں اور یہودیوں میں ایک عظیم الشان جنگ ہوگی، یہودی شکست کھا کر چٹانوں اور درختوں کے پیچھے چھپیں گے تو وہاں بھی ان کو پناہ نہ ملے گی، اور ان میں سے آواز آئے گی کہ اے مسلمان دیکھ! یہ یہودی چھپا ہے[2]۔ اس حدیث کو پڑھتے ہوئے پہلے دل میں خطرہ گذرتا تھا

---

[1] ابوداؤد ونسائی وابن ماجہ باب لربوا، مسند احمد عن ابی ہریرہؓ [2] صحیح مسلم باب الفتن،

کہ اب یہودیوں میں نہ تو قوت ہے نہ کوئی اُن کی سلطنت ہے، نہ مسلمانوں کے درمیان کہیں انکی بڑی آبادی ہے، یہ لڑائی کیونکر پیش آئے گی، مگر پچھلی جنگ نے اپنے نتیجہ کے طور پر فلسطین میں جو صورت حال نمایاں کردی ہے اور عہدنامۂ بالفور نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور صیہونی تحریک نے فلسطین کو خالص یہودی ملک بنانے اور بالآخر وہاں یہودی سلطنت قائم کرنے کا جو تہیہ کیا ہے اس نے مخبر صادق علیہ السلام کی پیشنگوئی کی صداقت کے منظر کو آنکھوں کے سامنے کردیا ہے،

حجاز کا انقطاع مصر شام اور عراق سے

صحیح مسلم میں ہے[1] کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عراق نے اپنا نقرئی سکہ (درہم) اور غلہ کا پیمانہ (قفیز) روک دیا شام نے اپنے غلہ کا پیمانہ (مد) اور اپنا طلائی سکہ (دینار) روک دیا، اور مصر نے اپنے غلہ کا پیمانہ (اردب) اور اپنی اشرفی روک دی، اور تم وہیں لوٹ گئے جہاں سے چلے تھے، وہیں لوٹ گئے جہاں سے چلے تھے، وہیں لوٹ گئے جہاں سے چلے تھے، حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ اس حدیث کے ارشاد نبوی ہونے پر ابوہریرہ کا گوشت اور خون گواہی دیتا ہے۔"

اس حدیث میں درحقیقت دو پیشنگوئیاں ہیں، ایک یہ کہ مسلمان ان ممالک کو فتح کریں گے، اور حجاز کے تعلقات وہاں سے قائم ہوں گے، اور اس خشک اور بنجر خطہ کی پرورش ان ہی ہمسایہ علاقوں سے ہوگی، اور پھر وہ زمانہ آئے گا، جب یہ علاقے الگ ہوجائیں گے اور حجاز پھر ویسا ہی ہوجائے گا، جیسا اسلام سے پہلے یا اسلام کے آغاز میں تھا پہلی پیشنگوئی تو حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں پوری ہوئی، اور اس وقت سے لیکر تیرہ سو برس تک برابر یہ حالت

---

[1] صحیح مسلم کتاب الفتن،

قائم رہی، حجاز کے لیے ہر قسم کا سامان ان ہی ممالک کی پیداوار سے آتا تھا، مصر و شام سے برابر غلہ قانوناً بھیجا جاتا تھا، سالانہ نذرانے تقسیم ہوتے تھے، بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں، لیکن ہمارے خیال میں اس دوسری پیشینگوئی کا محل اس زمانہ سے بہتر نہیں ہوسکتا، تیرہ سو برس کے اندر کبھی ایسا زمانہ پیش نہیں آیا، جب حجاز، عراق و شام اور مصر سے دفعۃً منقطع ہوگیا ہو، آج حجاز کی وہی حالت نہیں جو اسلام سے پہلے یا آغاز اسلام میں تھی؟ جب عراق پر ایرانی اور شام و مصر پر رومی حکمراں تھے، اور خود عرب کے صوبے پراگندہ اور بے نظام تھے، اور ہر قطعہ پر ایک حاکم فرمانروا تھا، آج عراق و مصر و فلسطین و بحرین وغیرہ پر انگریز اور شام پر فرانسیسی حکمراں ہیں، عرب کے تمام صوبے پراگندہ اور بے نظام ہیں، اور ہر خطہ پر ایک مستقل فرمانروا ہے، اور باہمی آتش جنگ و جدل برپا ہے، ایک کو دوسرے کی ماتحتی سے عار ہے، عراق کا غلہ اور نذرانہ بند ہے، شام کی موقوفہ جائدادیں فرانسیسیوں نے ضبط کرلیں، اور آپ نے گذشتہ سال سن لیا کہ مصر نے حجاز کے غلہ اور اشرفیوں کا وہ نذرانہ بند کردیا جو عہد فاروقؓ سے اب تک کبھی بند نہیں ہوا تھا،

اہل یورپ سے شام میں جنگ صحیح مسلم وغیرہ میں فتن اور آثار قیامت کے سلسلہ میں متعدد حدیثیں ایسی ہیں، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے صاف و صریح الفاظ میں اپنی امت کو یہ اطلاع دی ہے کہ آخر زمانہ میں دجال کے ظہور اور نزول مسیحؑ سے پہلے ملک شام میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان عظیم الشان خونی معرکے پیش آئیں گے، گو اس ملک میں ان دونوں کے درمیان صلیبی جنگوں نے اس قسم کے سیکڑوں خونی معرکے پیش کیے ہیں، مگر جنگ عظیم نے شام کی جو صورت حال پیدا کردی ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات

آنے والے خونی معرکوں کی تقریب تمہید ہیں،

مسلمانوں کے خلاف تمام دنیا کی قومیں اٹھ کھڑی ہوں گی

ابوداؤدؒ اور بیہقی میں ہے کہ آپ نے فرمایا "قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی (یعنی تم پر متحدہ حملہ کریں گی) جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالہ پر گرتے ہیں" حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ اس لیے کہ اس زمانہ میں ہم مسلمانوں کی تعداد کم ہوجائے گی" فرمایا نہیں، تمھاری تعداد ان دنوں بہت بڑی ہوگی، لیکن تم ایسے ہوجاؤگے، جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خس وخاشاک ہوتا ہے (کہ سیلاب ان کو بہائے لیے جاتا ہے) اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کے دلوں سے تمھارا رعب دور کردیگا، اور تمھارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا "دنیا (فوائد دنیا) کی محبت اور موت سے کراہت[1] موجودہ دنیائے اسلام کی پیش نظر تاریخ میں کیا حرف حرف اس کی تصدیق نہیں،

---

[1] کتاب الملاحم

معجزاتِ نبویؐ

کے متعلق

غیر مستند روایات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے متعلق جو جھوٹی اور بے سروپا روایتیں مسلمانوں میں مشہور ہوگئی ہیں، ضرورت نہ تھی کہ اس کتاب میں ان کو کسی حیثیت سے جگہ دیجائے، مگر چونکہ عام ناظرین کے دلوں میں اُن کو اس کتاب میں نہ پاکر مختلف قسم کے شبہے پیدا ہوں گے، اس لیے صرف اُن کی تسکین اور کشفِ حقیقت کی خاطر ان روایتوں سے بھی اس کتاب میں تعرض کرنا ضروری پڑا، یہ روایتیں زیادہ تر کتبِ دلائل میں ہیں یعنی ان کتابوں میں ہیں جن کو لوگوں نے عام حدیث کی کتابوں سے الگ کرکے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے ذکر و تفصیل میں لکھا ہے۔

یہی کتابیں ہیں جنھوں نے معجزات کی جھوٹی اور غیر مستند روایتوں کا ایک انبار لگادیا ہے اور ان ہی سے میلاد و فضائل کی تمام کتابوں کا سرمایہ مہیا کیا گیا ہے، خوش اعتقادی اور عجائب پرستی نے ان غلط معجزات کو اس قدر شرفِ قبول بخشا کہ ان کے پردہ میں آپ کے تمام صحیح معجزات چھپ کر رہ گئے، اور حق اور باطل کی تمیز مشکل ہوگئی، حالانکہ اس تمام ذخیرہ سے کتبِ صحاح اور خصوصاً بخاری و مسلم یکسر خالی ہیں لیکن تیسری اور چوتھی صدی میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ اس درجہ

بے احتیاطی کے ساتھ لکھی گئیں کہ محدثین ثقات نے اُن کو بیشتر ناقابلِ اعتبار قرار دیا، کتبِ دلائل کے ان مصنفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں، بلکہ کثرت سے عجیب حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا، تاکہ خاتم المرسلین[ص] کے فضائل و مناقب کے ابواب میں معتد بہ اضافہ ہوسکے، بعد کو جو احتیاط پسند محدثین آئے، مثلاً زرقانی وغیرہ، وہ ان روایات کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تردید اور تضعیف بھی کرتے گئے، لیکن جو چیز اس وسعت کے ساتھ پھیل گئی ہو، جو اسلامی لٹریچر کا ایک جز بن گئی ہو، جو اس کی رگ و پے میں سرایت کرگئی ہو، اس کے لیے صرف اس قدر کافی نہیں، بلکہ وہ مزید تنقید کی محتاج ہے، خصوصاً اس لیے کہ ہمارے ملک میں میلاد کی مجلسوں میں جو بیانات پڑھے جاتے ہیں، وہ تمام تر ان ہی بے بنیاد روایتوں سے بھرے ہوتے ہیں،

اس تنقید کے تین حصے ہوسکتے ہیں، اصولِ[۱] روایت کی بنا پر ان کتابوں کا اور محدثین میں اُن کے مصنفوں کا درجہ کیا ہے؟ ان کتابوں[۲] میں جو غلط، موضوع اور ضعیف معجزات مذکور ہیں، ان کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں، اُن[۳] کتابوں کے خاص خاص مشہور اور زبان زد معجزات کی روایتی حیثیت کیا ہے۔

کتبِ دلائل اور ان کے مصنفین کا درجہ

علمائے اسلام نے روایات کی تنقید اور اُن کے اصول کے منضبط کرنے میں جو کوششیں کی ہیں اور جو خدمات انجام دی ہیں، ان کی پوری تفصیل کتاب کے مقدمہ میں گذر چکی ہے، اسی سلسلہ میں یہ بات بھی ضمناً آگئی ہے کہ ان روایات کی جانچ اور تنقید میں، جن کا تعلق احکامِ فقہی سے ہے، محدثین جو سختی اور شدت اختیار کی ہے

وہ مناقب اور فضائل کے باب میں نہیں کی ہے، چنانچہ علم حدیث کے بڑے بڑے اماموں نے علانیہ اس کا اعتراف کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کے الگ الگ فضائل، نام بنام تمام خلفاء کے مناقب، مقامات اور شہروں کے محامد اعمالِ انسانی کے مبالغہ آمیز ثواب و عقاب کے بیانات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کاہنینِ عرب کی پیشینگوئیاں اور اشعار اور عجیب غریب غیر صحیح فضائل، معجزات اور برکات وغیرہ کا یہ بے پایاں دفتر روایات میں موجود اور کتابوں میں مدون ہے

یہ روایات زیادہ تر تیسرے اور چوتھے درجہ کی کتبِ حدیث میں پائی جاتی ہیں، تیسرے درجہ میں بقول شاہ ولی اللہ صاحب یہ کتابیں ہیں[۱]،

مسند ابویعلیٰ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند طیالسی، بیہقی، طحاوی اور طبرانی کی تصنیفات، ان میں سچی، جھوٹی، اچھی بری، قوی، ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پہلو بہ پہلو درج ہیں، اور چوتھے درجہ میں وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفین صدیوں کے بعد پیدا ہوئے، انھوں نے چاہا کہ اول اور دوم درجوں میں جو روایتیں داخل نہیں کی گئی تھیں ان کو ایک جگہ جمع کر دیں، یہ روایتیں ان لوگوں کی زبانوں پر تھیں، جن کی روایتوں کو حدیث کے اماموں نے قلمبند کرنا پسند نہیں کیا تھا اور قصہ گو واعظین محض اُن سے رونقِ محفل کا کام لیتے تھے، اسرائیلیات، اقوال حکما، اشاراتِ حدیث، قصص و حکایات اور روایاتِ نامعتبر کو انھوں نے حدیث کا درجہ دیکر کتابوں کے اوراق میں مدون کر دیا۔ کتاب الضعفاء لابن حبان، کامل لابن عدی اور خطیب، ابونعیم، جوزقانی، ابن عساکر، ابن نجار اور دیلمی کی تصنیفات کا اسی طبقہ میں شمار ہے

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ باب طبقات کتب الحدیث،

اس تفصیل کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں "صرف اول اور دوم درجہ کی کتابوں پر (یعنی صحاح ستہ پر) محدثین کا اعتماد ہے اور ان ہی پر ان کا مدار ہے، تیسرے طبقہ کی کتابوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو فن کے ناقد اور جوہری ہیں، اور جن کو اسماء الرجال پر عبور اور علل حدیث سے واقفیت ہے، غرض جو صحیح اور غلط اور خطا و صواب میں امتیاز کامل رکھتے ہیں، چوتھے طبقہ کی کتابوں کو جمع اور تدوین کرنا اور اُن کو کام میں لانا متاخرین کی ایک قسم کی بیفائدہ کی کاوشِ فکر ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آیات و معجزات پر جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے کچھ تیسرے طبقہ میں اور بقیہ تمامتر چوتھے طبقہ کی کتابوں میں داخل ہیں، متاخرین نے عام طور سے یہ سرمایہ جن کتابوں سے حاصل کیا ہے وہ طبری، طبرانی، بیہقی، دیلمی، بزار اور ابو نعیم اصفہانی کی تصنیفات ہیں، حافظ قسطلانی نے ان ہی روایات کو تمیز اور نقد کے بغیر مواہب لدنیہ میں داخل کیا، اور معین فراہی نے ان کو معارج النبوۃ میں فارسی زبان میں اس آب و رنگ سے بیان کیا کہ یہ روایتیں گھر گھر پھیل گئیں، اور عوام نے اس شیفتگی اور وارفتگی کے ساتھ ان کو قبول کیا کہ اصلی اور صحیح معجزات اور آیات بھی اس پردہ میں چھپ کر رہ گئے،

مواہب لدنیہ اور معارج النبوۃ وغیرہ کا سرمایہ جن کتابوں سے ماخوذ ہے وہ حسب ذیل ہیں، کتاب الطبقات لابن سعد، سیرۃ ابن اسحاق، دلائل النبوۃ ابن قتیبۃ المتوفی ۲۷۶ھ دلائل النبوۃ ابو اسحٰق حربی المتوفی ۲۵۵ھ، شرف المصطفٰی ابو سعید عبد الرحمٰن بن حسن اصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ، تاریخ و تفسیر ابو جعفر بن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ، مولد یحیٰی بن عائذ، دلائل النبوۃ جعفر

ابن محمد مستغفری المتوفی ۴۳۲ھ، دلائل النبوۃ ابو القاسم اسمٰعیل اصفہانی المتوفی ۵۳۵ھ تاریخ دمشق ابن عساکر المتوفی ۵۷۱ھ لیکن متاخرین میں ان روایات کا سب سے بڑا خزانہ یہ دو کتابیں ہیں، کتاب الدلائل ابو نعیم اصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ اور کتاب الدلائل امام بیہقی المتوفی ۴۳۰ھ

ان بزرگوں کے بذاتِ خود معتبر اور مستند ہونے میں کسی کو کم کلام ہے، جو کچھ کلام ہے وہ اس سے ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے راویوں سے ہر قسم کی روایتیں نقد و تمیز کے بغیر اخذ کیں، اور ان کو کتابوں کے اوراق میں مدون کر دیا، اور عام لوگوں نے ان مصنفین کی عظمت اور جلالت کو دیکھ کر ان روایتوں کو قبول کر لیا، حالانکہ ان میں نہ صرف ضعیف اور کمزور، بلکہ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں، اور ان کے سلسلۂ روایت میں ایسے راوی آتے ہیں، جن کو محدثین کے دربار میں صفِ نعال میں بھی جگہ نہیں مل سکتی، ان مصنفین نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ ہر قسم کا سلسلۂ روایت لکھ دیا گیا ہے، اور لوگ اس سلسلۂ روایت کو دیکھ کر صحیح اور غلط، سچی اور جھوٹی روایت کا خود فیصلہ کر لیں گے، ان روایتوں کی تدوین میں ضروری احتیاطیں مدنظر رکھیں، یا یوں کہو کہ عشقِ نبوی نے فضائل و مناقب کی کثرت کے شوق میں ہر قسم کی روایتوں کے قبول کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا، حالانکہ خود اسی جذبۂ عشق اور اسی ولولۂ شوق نے ثقاتِ محدثین اور علم حدیث کے اکابر کو روایتوں اور راویوں کے نقد اور بحث میں اس قدر سخت گیر بنا دیا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی تحقیق اور کاوش کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا گناہ عظیم سمجھتے تھے، اور من کذب علیّ متعمداً کی دار و گیر سے ہمیشہ ڈرتے اور کانپتے رہتے تھے، محدث ابن مندہ نے کتاب الدلائل کے مصنف حافظ ابو نعیم اصفہانی کی نسبت نہایت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں،

علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں ان دونوں معاصرین کے درمیان محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

لا اعلم لهما ذنبا اكثر من روايتهما الموضوعات ساكتين عنها، (ترجمہ ابونعیم)	مجھے ان دونوں کا اس سے زیادہ کوئی گناہ معلوم نہیں کہ وہ موضوع روایتوں کو خاموشی کے ساتھ روایت کر جاتے ہیں،

لیکن ثقاتِ محدثین کی بارگاہ میں یہ کوئی معمولی گناہ ہے؟ یہی اُن کی خاموشی خدا انھیں معاف کرے، آج ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی گمراہی کی بنیاد بن گئی ہے،

اس سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے علمائے رجال نے زیادہ تر ان راویوں کی بحث و تدقیق کی ہے، جو پہلی تین صدیوں میں تھے، اس لیے چوتھی اور پانچویں صدی کے رواۃ اور رجال کے نام و نشان ہماری موجودہ اسماء الرجال کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں، اگر تراجم و انساب میں اُن کے کچھ حالات مل جاتے ہیں تو محدثانہ حیثیت سے اُن پر نقد و تبصرہ نہیں ملتا، اس لیے ان بزرگوں کے شیوخ اور راویوں میں مجہول الحال اشخاص کی بھی کمی نہیں، اس بنا پر ان کتابوں کی روایتوں کی تنقید کرنا نہایت مشکل ہے،

اسلام میں میلاد کی مجلسوں کا رواج غالباً چھٹی صدی سے ہوا ہے،[1] تتبع سے یہ ثابت ہوا کہ ان روایتوں کا بڑا حصہ ان ہی کتابوں کے ذریعہ سے پھیلا ہے، جو ان مجالس کی غرض سے

---

[1] الملک المظفر شاہ اربل مولود ۵۴۹ھ متوفی ۶۳۰ھ نے جیسا کہ ابن خلکان نے اس کے حال میں لکھا ہے، مولد شریف بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منایا کرتا تھا، یہ جنگ صلیبی کا زمانہ تھا، اس کے لیے ابن دحیہ المتوفی ۶۳۳ھ نے ۶۰۴ھ میں کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر تصنیف کی،

وقتاً فوقتاً لکھی گئیں، اور جن کے بکثرت حوالے مواہب لدنیہ میں جا بجا آتے ہیں،

علامہ سیوطی کی **خصائص کبریٰ** جو حیدرآباد میں چھپ گئی ہے، معجزات کے موضوع پر سب سے زیادہ مبسوط ہے اور جامع تالیف ہے، علامہ ممدوح نے صحاح ستہ کے علاوہ احمد، سعید ابن منصور، طیالسی، ابن ابی شیبہ، حاکم، ابویعلی، بلکہ ان سے بھی فروتر بیہقی، ابونعیم، بزار، ابن سعد، طبرانی، دارمی، بلکہ غیر محتاط مصنفوں مثلاً ابن ابی الدنیا، ابن شاہین، ابن ابی النجاد، ابن مندہ، ابن مردویہ، ابن عساکر، دیلمی، خرائطی، خطیب وغیرہ کی کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا، قوی اور ضعیف اور صحیح وغلط ہر قسم کے واقعات کا انبار لگا دیا، اور مختلف دفتروں میں جو کچھ پھیلا تھا، ان کو خصائص کی دو جلدوں میں یکجا کر دیا، تاہم مصنف کو یہ فخر ہے، جیسا کہ دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ "اس تالیف میں موضوع اور بے سند روایتوں سے اگرچہ احتراز کیا گیا ہے، لیکن ضعیف روایتیں جن کی سندیں ہیں وہ داخل کر لی گئی ہیں"،

غور کے قابل امر یہ ہے کہ بلا امتیاز بھلی بری کسی سند کا موجود ہونا، روایت کی معتبری کی حجت کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ یہ ہے کہ کتاب میں صحیح وغلط، قوی اور ضعیف مشہور ومنکر ہر قسم کی روایتوں کو ان کے درجہ اور مرتبہ کے ذکر کے بغیر پہلو بہ پہلو وہ لکھتے چلے گئے ہیں، اس لیے عام ناظرین کو یہ پتہ نہیں لگتا کہ اس انبار خانہ میں جہاں جواہرات کا خزانہ ہے وہیں خزف ریزوں کا بھی ڈھیر لگا ہے۔ پوری کتاب میں شاید دس بیس مقام سے زیادہ نہیں جہاں مصنف نے اپنی روایتوں کے درجۂ استناد کا پتہ دیا ہو، اس سے زیادہ یہ کہ بعض واقعات کے متعلق باوجود ان کی شدید روایت پرستی کے، ان کو بہ تحقیق معلوم تھا کہ یہ صحیح نہیں

تاہم چونکہ وہ پہلی کتابوں میں مندرج تھے، ان کی نقل سے احتراز نہیں کیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے موقع پر عام کتبِ میلاد میں جو عجیب و غریب واقعات مذکور ہیں، ان کو بتمامہا دلائل ابو نعیم سے نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں،

ھذا الاثر والاثران قبلہ فیھا	اس روایت اور اس سے پہلے دو روایتوں
نکارۃ شدیدۃ ولم اورد فی	میں سخت نامعتبر (منکر) باتیں ہیں اور میں نے
کتابی ھذا اشد نکارۃ منھا	اپنی کتاب میں اس سے زیادہ ناقابلِ اعتبار
ولم تکن نفسی تطیب مایرادھا	روایتیں نہیں لکھیں، میرا دل ان کے
لکن تبعت الحافظ ابا نعیم	لکھنے کو نہیں چاہتا تھا، لیکن حافظ ابو
فی ذالک (خصائص جلد اول ص ۴۹)	نعیم کی پیروی کر کے لکھدیں،

ایک اور جگہ خطیب کی ایک کتاب سے وفد نجران کے متعلق ایک واقعہ نقل کرتے ہیں، حالانکہ وہ خود اس روایت کو بے اعتبار سمجھتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

واخرج الخطیب فی المتفق والمفترق	خطیب نے المتفق والمفترق میں ایسی سند سے
بسند فیہ مجاھیل (جلد ۲ ص ۲۵)	جس میں مجہول الحال راوی ہیں بیان کیا ہے،

ایک اور مقام پر ایک گدھے کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جو گدھے کی صورت میں ایک جن تھا اور آپ کی سواری میں آنے کا مشتاق تھا، یہ لوگوں کے گھروں میں جا کر اشارہ سے ان کو بلا لاتا تھا، یہ عجیب جانور آپ کو خیبر میں ملا تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کے مظالم کی داستان سنائی، اور جب آپ نے وفات پائی تو فرطِ غم سے اپنے کو کنوئیں میں گرا کر جان دیدی،

حافظ سیوطی نے ابنِ عساکر سے یہ واقعہ خصائص میں نقل کیا ہے، اور اس پر بے تعرض کیے گذر گئے ہیں، حالانکہ بعینہ اسی واقعہ کے متعلق ابن حبان کے حوالہ سے اپنی دوسری تصنیف اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ میں لکھتے ہیں کہ "یہ سرتاپا موضوع ہے"۔

محدث صابونیؒ نے معجزہ کی ایک روایت لکھ کر پھر خود ہی اس پر جرح کی ہے کہ اسکی سند اور متن دونوں غریب ہیں، باایں ہمہ وہ اس کے متعلق آخری رائے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ

ھو فی المعجزات حسن	معجزات میں وہ حسن (اچھی) ہے،

(زرقانی جلد ۱ ص ۱۷۲، و خصائص سیوطی جلد ۱ ص ۳۵)

اس پر علامہ زرقانی، شرح مواہب میں لکھتے ہیں،

لان عادة المحدثین التساھل	یہ اس لیے کہ محدثین کی عادت ہے کہ عقائد
فی غیر الاحکام والعقائد	اور احکام کے علاوہ دیگر روایتوں میں
(جلد ۱ ص ۱۷۲)	وہ نرمی برتتے ہیں،

لیکن کیا یہ اصول صحیح ہے؟ اور "من کذب علی متعمدا" کی تہدید سے خالی ہے؟ معجزات ہوں یا فضائل، ضرور ہے کہ آپ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کیجائے وہ شک و شبہہ سے پاک ہو جیسا کہ امام نووی، حافظ عسقلانی، ابن جماعة، طیبی، بلقینی اور علامۂ عراقی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی تصریح کی ہے،[1]

معجزات کے متعلق غلط اور موضوع روایتوں کے پیدا ہونے کے اسباب

۱۔ ان روایتوں کے پیدا ہونے کا بڑا سبب یہ ہے کہ مقبولیتِ عام کی بنا پر یہ کام واعظوں اور میلاد خوانوں کے حصہ میں آیا، چونکہ

[1] دیکھو موضوعات ملا علی قاری ص ۹ مطبوعہ مجتبائی دہلی،

یہ فرقہ علم سے عموماً محروم ہوتا ہے اور صحیح روایات تک اس کی دسترس نہیں ہوتی ، اور ادھر گرمیِ محفل اور شور احسنت کے لیے اس کو دلچسپ اور عوام فریب باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی ، اس لیے لامحالہ اُن کو اپنی قوتِ اختراع پر زور دینا پڑا، ان میں جو کسی قدر محتاط تھے ، انھوں نے اُن کو لطائفِ صوفیانہ اور مضامینِ شاعرانہ میں ادا کیا، سننے والوں نے ان کو روایت کی حیثیت دیدی ، یا بعد کو ان ہی بیانات نے روایت کی حیثیت اختیار کرلی ، اور جو نڈر اور بے احتیاط تھے ، انھوں نے یہ پردہ بھی نہیں رکھا . بلکہ ایک سند جوڑکر انھوں نے براہ راست اس کو حدیث و خبر کا مرتبہ دیدیا ، حافظ سیوطی ، علامہ ابن جوزی کی کتاب الموضوعات کے حوالہ سے لکھتے ہیں :

احدھما القصاص ومعظم	جھوٹی حدیثیں سنانے والوں میں ایک واعظوں کا
البلاء منھم یجری لانھم	گروہ ہے اور سب سے بڑی مصیبت ان ہی سے پیش آئی
یریدون احادیث تنفق وترقق	ہے ، کیونکہ وہ ایسی حدیثیں چاہتے ہیں جو مقبول عام
والصحاح یقل فیھا ھذا ، ثم ان	اور موثر ہو سکیں اور صحیح حدیثوں میں یہ بات نہیں ،
الحفظ یشق علیھم ویتفق عدم	اسکے علاوہ صحیح حدیثوں کا یاد رکھنا ان کو مشکل ہے ،
الدین وھم یحضرھم جھال	اسکے ساتھ ان میں دینداری نہیں ہوتی ، اور انکی
(آخر کتاب للآلی المصنوعہ ص ۲۴۹)	محفلوں میں جاہلوں ہی کا مجمع ہوتا ہے ،

چنانچہ فضائل و مناقب ، عذاب و ثواب ، بہشت و دوزخ ، وقائعِ میلاد اور معجزات و دلائل کا جو جعلی دفتر پیدا ہو گیا ہے ، وہ زیادہ تر ان ہی جاہلوں کا ترتیب دیا ہوا ہے ،

علامہ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ تاویل مختلف الحدیث میں جو مصر میں چھپ گئی ہے،
کہتے ہیں کہ احادیث و روایات میں فساد تین رستوں سے آیا منجملہ ان کے ایک راستہ واعظین ہیں

والقصاص فانهم يميلون وجوه	اور واعظین، کیونکہ وہ عوام کا رخ اپنی
العوام اليهم ويستدرون ما	طرف پھیرنا چاہتے ہیں اور جو کچھ انکے پاس
عندهم بالمناكير والغرائب	ہے اس کو لغو، منکر او عجیب و غریب باتیں
والاكاذيب من الاحاديث	بیان کرکے وہ وصول کرتے ہیں اور عوام
ومن شان العوام القعود عند	کی حالت یہ ہو کہ وہ اسی وقت تک ان
القاص ما كان حديثه	واعظین کے پاس بیٹھتے ہیں جب تک وہ
عجيبا خارجا عن نظر العقول	خارج از عقل باتیں یا ایسی مؤثر باتیں
اوكان رقيقا يحزن القلوب	بیان کیا کرتے ہیں، جو ان کے دلوں پہ
ويستغزر العيون (ص ۳۵۶)	اثر پیدا کریں اور ان کو رلائیں،

آپ کی برتری اور جامعیت کا تخیل

۲- ان روایات کے پیدا ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ مسلمانوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء ہیں، آپ کامل ترین شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں، آپ تمام محاسن کے جامع ہیں، یہ اعتقاد بالکل صحیح ہے، لیکن اس کو لوگوں نے غلط طور پر وسعت دیدی اور انبیائے سابقین کے تمام معجزات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کردیا، اور وہ اس اعتقاد کی بدولت تمام مسلمانوں میں پھیل گئے، بیہقی اور ابونعیم نے دلائل میں اور سیوطی نے خصائص میں علانیہ دوسرے انبیاء کے معجزات کے مقابل میں اُن ہی کے مثل آپ کے معجزات

بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں، اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح آپ کی تعلیم تمام انبیاء کی تعلیمات کا عطر، خلاصہ اور مجموعہ ہے، اسی طرح آپ کے معجزات بھی تمام دیگر انبیاء کے معجزات کا مجموعہ ہے، اور جو کچھ عام انبیاء سے متفرق طور پر صادر ہوا، وہ تمام کا تمام مجموعاً آپ سے صادر ہوا، ظاہر ہے کہ اس مماثلت اور مقابلہ کے لیے تمام تر صحیح روایتیں دستیاب نہیں ہو سکتیں اس لیے لوگوں نے ان ہی ضعیف اور موضوع روایتوں کے دامن میں پناہ لی کہیں شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا، مثلاً حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے تمام اسماء کی تعلیم کی، دیلمی نے مسند الفردوس میں روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی تمام اسماء کی تعلیم دی، حضرت ادریسؑ کے متعلق قرآن میں ہے کہ خدا نے ان کو بلند جگہ میں اٹھایا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندی اس سے بھی آگے قاب قوسین تک ہوئی، حضرت نوحؑ کی طوفان کی دعا اگر قبول ہوئی تو آپؐ کی قحط کی دعا قبول ہوئی، حضرت صالحؑ کے لیے اونٹنی معجزہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ نے باتیں کیں، حضرت ابراہیمؑ آگ میں نہ جلے، آپ سے بھی آتشیں معجزے صادر ہوئے، حضرت اسمٰعیلؑ کے گلے پر اگر چھری رکھی گئی، تو آپ کا بھی سینہ چاک کیا گیا، حضرت یعقوبؑ سے بھیڑیے نے گفتگو کی، روایت کی گئی ہے کہ آپ سے بھی بھیڑیا ہمکلام ہوا، ابو نعیم میں حکایت ہے کہ حضرت یوسفؑ کو حسن کا آدھا حصہ عطا ہوا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا حصہ دیا گیا، حضرت موسیٰؑ کے لیے پتھر سے نہریں جاری ہوئیں، تو آپ کی انگلیوں سے پانی بہا، حضرت موسیٰؑ کی لکڑی معجزہ دکھاتی تھی، تو آپ کے فراق میں چھوہارے کا درخت بھی رویا، اور چھوہارے کی خشک ٹہنی تلوار بن گئی، حضرت موسیٰؑ کے لیے حجر احمر شق ہوا تو آپ کے لیے

معراج میں آسمان و زمین کے درمیان کا دریاے فضا بیچ سے پھٹ گیا، یوشعؑ کے لیے آفتاب ٹھہر گیا، تو آپؐ کے اشارے سے آفتاب ڈوب کر نکلا،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں کلام کیا تھا، یہ روایت وضع کی گئی کہ آپ نے بھی گہوارے میں کلام کیا، اور آپ کی زبان سے پہلے تکبیر و تسبیح کی صدا بلند ہوئی،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معجزہ مردوں کو زندہ کرنا ہے، اور صرف ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی یہ معجزہ منسوب کیا گیا، ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسلام کی دعوت دی، اس نے کہا "جب تک آپ میری لڑکی کو زندہ نہ کر دیں گے میں ایمان نہ لاؤں گا"، چنانچہ آپ نے اس کی قبر پر جا کر آواز دی، اور وہ زندہ نکل کر باہر آئی، اور پھر چلی گئی، اسی طرح یہ روایت بھی گھڑی گئی ہے کہ آپ کی والدہ بھی آپ کی دعا سے زندہ ہوئیں، اور آپ پر ایمان لائیں،

غیبی آوازوں اور پیشگوئیوں سے نبوت کی تصدیق کا شوق

۳۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیاءؑ کے گذشتہ صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشنگوئیاں ہیں، اور اُن کے مطابق یہود و نصاریٰ کو ایک آنے والے پیغمبر کا انتظار تھا، اس واقعہ کو دروغگو راویوں نے یہانتک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن تاریخ، سال، وقت اور مقام سب کچھ معلوم تھا، چنانچہ ولادتِ نبویؐ سے قبل علماے یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے، اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط و خال معلوم تھا، بلکہ پرانے گھرانوں اور دیروں اور کنیسوں میں ایسی مخفی کتابیں موجود تھیں جن میں آپؐ کا تمام حلیہ لکھا تھا، اور اگلے لوگ ان کو بہت چھپا چھپا کر رکھتے تھے، بلکہ بعض دیروں میں

تو آپ کی تصویر تک موجود تھی، توراۃ و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض پیشینگوئیاں حقیقت میں موجود تھیں، اور وہ آج بھی ہیں، لیکن وہ استعارات و کنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں، اُن کو ضعیف و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلایا گیا،

عرب میں بتخانوں کے مجاور اور کاہن تھے، جو فال کھولتے تھے اور پیشین گوئیاں کرتے تھے ان کا ذریعۂ علم جنات اور شیاطین تھے، چنانچہ جب آپ کے قرب ولادت کا زمانہ آیا تو عموماً بتخانوں سے اور بتوں کے پیٹ سے آوازیں سنائی دیتی تھیں، کاہن مقفی اور مسجع فقروں میں، اور جنات شعروں میں یہ خبر سنایا کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدایش کا زمانہ قریب آگیا، یمن کے ایک بادشاہ کی طرف آپ کی منقبت میں پورا ایک قصیدہ منسوب کیا گیا، ملوکِ یمن، شاہانِ فارس اور قریش کے اکابر نے آپ کو خواب میں دیکھا، پتھروں پر اسم مبارک لوگوں کو منقوش نظر آتا تھا، قریش کا مورث اعلیٰ کعب بن لوئی، ہر جمعہ کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کو یکجا کر کے اُن کے سامنے خطبہ دیتا تھا جس میں مسجع فقروں اور شعروں میں آپ کے ظہور کی خوشخبری ہوتی تھی، مکہ کے لوگ احبار اور راہبوں کی زبان سے محمد آپ کا نام سن کر اپنے بچوں کا یہی نام رکھتے تھے کہ شاید یہی پیغمبر ہو جائے، مدینہ کے لوگوں کو ان ہی یہودیوں کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شہر یثرب آپ کا دار الہجرۃ ہوگا، اس لیے وہ آپ کے ورود کے منتظر تھے، سطیح کاہن کا آپ کی پیشنگوئی میں ایک طویل افسانہ ہے، لیکن اس دفتر کا بڑا حصہ موضوع اور جعلی ہے، اور باقی نہایت ضعیف اور کمزور، ان میں جو ایک آدھ صحیح ہے، وہ پہلے گذر چکا ہے،

شاعرانہ تخیل کو واقعہ سمجھ لینا

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش، عالم کی رحمت کا باعث تھی، اس لیے کائنات کا فخر و ناز اس پر بجا ہوسکتا ہے، اگلے واعظوں اور میلاد خوانوں نے اس واقعہ کو شاعرانہ انداز میں اس طرح ادا کیا کہ آمنہ کا کاشانہ نور سے معمور ہوگیا، جانور خوشی سے بولنے لگے، پرندے تہنیت کے گیت گانے لگے، مغرب کے چرندوں اور پرندوں نے مشرق کے چرندوں اور پرندوں کو مبارکباد دی، ملک کے سوکھے درختوں میں بہار آگئی، ستارے زمین پر جھک گئے، آسمانوں کے دروازے کھل گئے، فرشتوں نے ترانۂ مسرت بلند کیا، انبیاءؑ نے روے روشن کی زیارت کی، فرشتوں نے بچہ کو آسمان وزمین کی سیر کرائی، شیطانوں کی فوج پابہ زنجیر کی گئی، پہاڑ غرور سے اونچے ہوگئے، دریا کی موجیں خوشی سے اچھلنے لگیں، درختوں نے سبزی کے نئے جوڑے پہنے، بہشت و جنت کے ایوان نئے سروسامان سے سجائے گئے، وغیرہ، بعد کے واعظوں اور میلاد خوانوں نے اس شاعرانہ انداز بیان کو واقعہ سمجھ لیا، اور روایت تیار ہوگئی،

آیندہ واقعات کو اتفاقات میں ولادت کے موقع پر بیان کرنا

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت میں یا بعد کو جو واقعات ظہور پذیر ہوئے اُن کا وقوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے زمانہ میں تسلیم کرلیا گیا ہے، اور ان کو بحیثیت معجزہ کے آیندہ واقعات کا پیش خیمہ بنالیا گیا ہے، مثلاً آپ کے زمانہ میں بت پرستی کا استیصال ہوگیا، کسریٰ و قیصر کی سلطنتیں فنا ہوگئیں، ایران کی آتش پرستی کا خاتمہ ہوگیا، شام کا ملک فتح ہوا، ان واقعات کو معجزہ اس طرح بنایا گیا کہ جب آپ کی ولادت ہوئی تو کعبہ کے تمام بت سرنگوں ہوگئے، قصر کسریٰ کے کنگرے ہل گئے، آتشکدۂ فارس بجھ کر رہ گیا، نہر ساوہ خشک ہوگئی، ایک نور چمکا جس سے شام کے محل نظر آنے لگے.

۷۔ بعض واقعات ایسے ہیں جن کو کسی حیثیت سے معجزہ نہیں کہا جا سکتا لیکن تکثیرِ معجزات کے شوق میں ذرا سا بھی کسی بات میں اعجوبہ پن اُن کو نظر آیا، تو اس کو مستقل معجزہ بنا لیا، مثلاً حضرت عائشہؓ سے ایک روایت ہے، اور وہ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی مذکور ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی پالو جانور تھا، جب آپ اندر تشریف لاتے تو وہ نہایت سکون و اطمینان کیساتھ ایک جگہ بیٹھا رہتا تھا، جب آپ باہر چلے جاتے تو وہ ادھر اودھر دوڑنے لگتا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو بھی آپ کی جلالت قدر اور حفظ مراتب کا پاس تھا، اور آپ کی عظمت وشان سے واقف تھے لیکن درحقیقت یہ کوئی معجزہ نہیں، بلکہ عام لوگوں سے بھی بعض جانور اسی طرح ہل مل جاتے ہیں،

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت جابرؓ سخت بیمار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکی عیادت کو گئے تو وہ بیہوش تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کر کے انکے منھ پر پانی چھڑکا تو انکو ہوش آگیا، یہ ایک معمولی واقعہ ہے، مگر کتبِ دلائل کے مصنفین نے اس کو بھی معجزہ قرار دیا ہے،[1]

اسی طرح یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختون پیدا ہوئے تھے، یہ روایت متعدد طریقوں سے مروی ہے، مگر ان میں سے کوئی طریقہ بھی ضعف سے خالی نہیں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ آپ کا مختون پیدا ہونا متواتر روایتوں سے ثابت ہے، اس پر علامہ ذہبی نے تنقید کی ہے کہ تواتر تو کجا، صحیح طریقہ سے ثابت بھی نہیں (مستدرک ۲ باب اخبار النبیؐ)، اور بقول علامہ ابن قیم (زاد المعاد) اگر یہ ثابت بھی ہو تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی فضیلت نہیں ہے، کیونکہ

---

[1] خصائص کبریٰ سیوطی جلد دوم ص ۱۷، حیدرآباد دکن،

ایسے بچے اکثر پیدا ہوئے ہیں۔

روایاتِ صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے یا سجدہ میں جاتے تھے تو آپ کی بغل کی سپیدی نظر آتی تھی، یہ ایک معمولی بات ہے، مگر محبِ طبری قرطبی اور سیوطی وغیرہ نے اس کو بھی معجزہ اور آپ کا خاصہ قرار دیا ہے۔

معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں کتبِ دلائل کے مصنفین نے یہ بھی کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی روایت میں اگر مختلف سلسلۂ سند کے راویوں میں باہم موقع، مقام یا کسی اور بات میں ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا تو اس کو چند واقعہ قرار دیدیا، مثلاً ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک اونٹ جو دیوانہ ہو گیا تھا، یا بگڑ گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اسکے پاس گئے تو اس نے مطیعانہ سر ڈال دیا، صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! جب جانور آپکے سامنے سر جھکاتے ہیں تو ہم کو انسان ہو کر تو ضرور آپکے سامنے سربسجود ہونا چاہیے، آپ نے فرمایا "اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنا روا رکھتا تو بیوی کو کہتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے"، یہ ایک ہی واقعہ ہے، جو ذرا ذرا سے اختلافِ بیان کی بنا پر چودہ پندرہ واقعہ بن گیا ہے۔

۷۔ ان کتابوں میں بعض معجزات ایسے مذکور ہیں جن کی اصل صحاح میں مذکور ہے اور اس طرح مذکور ہے کہ وہ کوئی معجزہ نہیں، بلکہ معمولی واقعہ ہے، لیکن نیچے درجہ کی روایتوں میں بے احتیاط راویوں نے الفاظ کے ذرا الٹ پھیر سے اس کو معجزہ قرار دیدیا، صحاح کی متعدد روایتوں میں ہے کہ شانۂ مبارک پر ابھرا ہوا گوشت تھا جس کو "خاتمِ نبوت" کہتے تھے، اور آپ کی انگشتِ مبارک میں جو نقرئی خاتم (چاندی کی انگوٹھی) تھی، اس پر "محمد رسول اللہ" منقوش تھا،

بے احتیاط راویوں نے ان دونوں واقعوں کو ملا دیا، اور اس طرح واقعہ کی صورت حاکم کی تاریخ نیشاپور، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور ابو نعیم کی دلائل میں جاکر یوں ہو جاتی ہے کہ پشت مبارک کے گوشت کی خاتم نبوت پر کلمہ وغیرہ کی عبارتیں لکھی تھیں۔

مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت

دلائل و معجزات کے باب میں موضوع، منکر، ضعیف، غرض ہر قسم کی قابل اعتراض روایات کا اتنا بڑا انبار ہے کہ اگر ایک ایک کرکے اس کی جانچ پڑتال کیجائے تو ایک مستقل ضخیم جلد تیار ہو جائے لیکن یہاں اس کا موقع نہیں، اس لیے ہم صرف ان روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں، جو عام طور سے ہمارے ملک میں مشہور ہیں، اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بصد شوق و ذوق پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ روایت آتی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے لوح و قلم، عرش و کرسی، جن و انس غرض سب سے پہلے نور محمدیؐ کو پیدا کیا، اور پھر لوح و قلم، عرش و کرسی، آسمان و زمین، ارواح و ملائکہ، سب چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں"، اس کے متعلق اَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ یعنی سب سے پہلے خدا نے میرا نور پیدا کیا"، کی روایت عام طور سے زبانوں پر جاری ہے، مگر اس روایت کا پتہ احادیث کے دفتر میں مجھے نہیں ملا، البتہ ایک روایت مصنف عبدالرزاق میں ہے[1]

[1] بعض ارباب سیر نے اس بنا پر کہ فضائل میں ہر قسم کی روایات قبول کرلی جاتی ہیں، اور خصوصاً وہ جن کی تائید ان کے خیال میں دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے، اس روایت کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۴۳، مگر جو علماء ہر قسم کی روایت میں صحت کے پہلو کا خیال ضروری سمجھتے ہیں، اُن کو اس میں کلام ہے، البتہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیاء میں اول مخلوق ہونا ثابت ہے۔

یاجابر اول ماخلق اللہ نور نبیک من نورہ، اے جابر سب سے پہلے خدا نے تیرے پیغمبر کا نور اپنے نور سے پیدا کیا، اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصے ہوئے، اور ان ہی سے لوح و قلم، عرش و کرسی، آسمان و زمین اور جن و انس کی پیدایش ہوئی

زرقانی وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی سند نہیں لکھی، ہندوستان میں مصنف عبد الرزاق کی گو دوسری جلد ملتی ہے، مگر پہلی نہیں ملتی، دوسری جلد دیکھ لی گئی، اس میں یہ حدیث مذکور نہیں، اس لیے اس روایت کی تنقید نہ ہو سکی اور چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں، اور فضائل و مناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے، اس لیے اصولی حیثیت سے اس روایت کے تسلیم کرنے میں مجھے پس و پیش ہے، اس تردد کو قوت اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث میں مخلوقاتِ الٰہی میں سب سے پہلے "قلم تقدیر" کی پیدایش کا تصریحی بیان ہے کہ اول ماخلق اللہ القلم۔[1]

۲۔ روایتوں میں ہے کہ یہ نور پہلے ہزاروں برس سجدہ میں پڑا رہا، پھر حضرت آدمؑ کے تیرہ و تار جسم کا چراغ بنا، پھر آدمؑ نے مرتے وقت شیثؑ کو اپنا وصی بنا کر یہ نور ان کے سپرد کیا اسی طرح یہ درجہ بدرجہ ایک سے دوسرے پیغمبر کو سپرد ہوتا ہوا حضرت عبد اللہ کو سپرد ہوا، اور حضرت عبد اللہ سے حضرت آمنہ کو منتقل ہوا، نور کا سجدہ میں پڑا رہنا اور اس کا موجود ہونا بالکل

---

[1] جامع ترمذی کتاب القدر، ان علماء نے جنھوں نے اول ماخلق اللہ نوری کو قبول کرلیا ہے نور محمدی اور قلم کی اولیت پیدایش میں تطبیق کی کوشش کی ہے،

موضوع ہے اور نور کا ایک دوسرے وصی کو درجہ بدرجہ منتقل ہوتا رہنا بے سروپا ہے، طبقات ابن سعد اور طبرانی، ابونعیم اور بزار میں اس آیت پاک

الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَ	وہ خدا جو تجھکو دیکھتا ہے جب تو (تہجد کی
تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ	نماز میں) کھڑا ہوتا ہے، اور سجدہ کرنیوالوں
(شعراء)	میں تیرے الٹ پھیر کو بھی دیکھتا ہے

کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبروں کی پشت بہ پشت منتقل ہونا خدا دیکھ رہا تھا، لیکن اول تو پوری آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے اور دوسرے یہ روایت اعتبار کے قابل نہیں،

۳- روایت ہے کہ "یہ نور جب (بلوغ کے وقت) عبدالمطلب کو سپرد ہوا تو وہ ایک دن خانۂ کعبہ میں سوئے ہوئے تھے، سو کر اٹھے تو دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں سرمہ اور بالوں میں تیل لگا ہے، اور بدن پر جمال و رونق کا خلعت ہے، یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے آخر کار ان کے باپ ان کو قریش کے ایک کاہن کے پاس لے گئے، اوس نے کہا کہ آسمانوں کے خدا نے اجازت دی ہے کہ اس لڑکے کا نکاح کر دیا جائے، اس نور کے اثر سے عبدالمطلب کے بدن سے مشک کی خوشبو آتی تھی، اور وہ نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا، قریش پر قحط وغیرہ کی جب کوئی مصیبت آتی تھی، تو اس نور کے وسیلہ سے وہ دعا مانگتے تھے، تو قبول ہوتی تھی"

یہ روایت ابو سعد نیشاپوری المتوفی ۴۰۷ھ نے اپنی کتاب شرف المصطفے میں ابوبکر ابن ابی مریم کے واسطہ سے کعب احبار (نو مسلم یہودی) تابعی سے نقل کی ہے، اول تو یہ سلسلہ ایک تابعی تک موقوف ہے، آگے کی سند نہیں، علاوہ ازیں کعب احبار گو نو مسلم اسرائیلیوں میں سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں، تاہم امام بخاری ان کے کذب کا تجربہ بیان کرتے ہیں، اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب و غریب حوادث کی روایات کے سرچشمہ یہی ہیں، بیچ کا راوی ابوبکر ابن ابی مریم باتفاق محدثین ضعیف ہے، ان کا دماغ ایک حادثہ کے باعث ٹھیک نہیں رہا تھا

۴۔ ابونعیم، حاکم، بیہقی اور طبرانی میں ایک روایت ہے کہ "عبدالمطلب یمن گئے تھے، وہاں ایک کاہن اُن کے پاس آیا، اور ان کی اجازت سے ان کے دونوں نتھنوں کو دیکھکر بتایا کہ ایک ہاتھ میں نبوت اور دوسرے میں بادشاہی کی علامت ہے، تم بنو زہرہ کی کسی لڑکی سے جاکر شادی کرو، ان مصنفوں کا مشترک راوی عبدالعزیز بن عمران الزہری ہے، اس کی نسبت میزان میں ہے کہ امام بخاری نے کہا "اس کی حدیث نہ لکھی جائے" نسائی نے کہا "متروک ہے" یحییٰ نے کہا "یہ شعر و شاعری کا آدمی ہے، ثقہ نہ تھا" عبدالعزیز کے بعد کا راوی اس میں یعقوب بن زہری ہے، جس کی نسبت ابن معین کہتے ہیں کہ "اگر ثقات سے روایت کرے تو خیر لکھو"۔ ابوزرعہ نے کہا "وہ کچھ نہیں، وہ واقدی کے قریب ہے"۔ امام احمد نے کہا "وہ کچھ نہیں، اس کی حدیث لاشے کے برابر ہے"، ساجی نے کہا "وہ منکر الحدیث ہے"، علاوہ ازیں اس روایت میں بعض اور مجہول بھی ہیں، حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے، لیکن امام ذہبی نے نقد مستدرک میں یعقوب اور عبدالعزیز دونوں کو ضعیف کہا ہے،

۵۔ روایت ہے کہ "حضرت عبداللہ کی پیشانی میں جب یہ نور چمکا تو ایک عورت جو کاہنہ
تھی اس نے نور کو پہچانا اور چاہا کہ وہ خود عبداللہ سے ہمبستر ہو کر اس نور کی امین بن جائے، مگر
یہ سعادت اس کی قسمت میں نہ تھی، اس وقت عبداللہ نے عذر کیا، اور گھر چلے گئے، وہاں
یہ دولت آمنہ کو نصیب ہوئی، عبداللہ نے واپس آکر اس کاہنہ سے اب خود درخواست
کی تو اس نے رد کر دی کہ" اب وہ نور تمھاری پیشانی سے منتقل ہو چکا"،

یہ روایت الفاظ اور جزئیات کے اختلاف کے ساتھ ابن سعد، خرائطی، ابن عساکر
بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے، ابن سعد نے تین طریقوں سے اس کی روایت کی ہے، ایک طریقہ میں
پہلا راوی واقدی ہے، دوسرے میں کلبی ہے، یہ دونوں مشہور دروغگو ہیں، تیسرا طریقہ ابویزید
مدنی تابعی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، ابویزید مدنی کی اگرچہ بعض ائمہ نے توثیق کی ہے، مگر مدینہ
کے شیخ الکل امام مالک فرماتے ہیں کہ میں اس کو نہیں جانتا، ابوزرعہ نے کہا: "مجھے
نہیں معلوم، ابونعیم نے چار طریقوں سے اس کی روایت کی ہے، لیکن کوئی ان میں قابلِ
وثوق نہیں، ایک طریقہ میں نضر بن سلمہ اور احمد بن محمد بن عبدالعزیز بن عمرو الزہری، اور
یہ تینوں نامعتبر ہیں، تیسرے سلسلہ میں مسلم بن خالد الزنجی ہیں، جو ضعیف سمجھے جاتے ہیں،
اور متعدد مجاہیل ہیں، چوتھا طریقہ یزید بن شہاب الزہری پر ختم ہے، اور وہ اپنے آگے کا
سلسلہ نہیں بتاتے، اور ان کا حال بھی نہیں معلوم، بیہقی کا سلسلہ وہی تیسرا ہے، خرائطی،
اور ابن عساکر کا یوں بھی اعتبار نہیں،

۶۔ حضرت عباسؓ سے روایت کی گئی ہے کہ عبد مناف اور قبیلۂ مخزوم کی دوسو

عورتیں گنی گئیں جنھوں نے اس غم میں کہ عبد اللہ سے ان کو یہ دولت حاصل نہ ہوئی وہ مرگئیں؛ لیکن انھوں نے شادی نہ کی (یعنی عمر بھر کنواری رہیں) اور قریش کی کوئی عورت نہ تھی جو اس غم میں بیمار نہ پڑ گئی ہو" یہی حکایت ہے جس کا غلط ترجمہ اردو مولفینِ میلاد نے یہ کیا ہے کہ "اس رات دو سو عورتیں رشک و حسد سے مرگئیں یہ روایت سند کے بغیر زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں بصیغہ "رُوِی یعنی بیان کیا گیا ہے" مذکور ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود مصنف کو بھی اس کی صحت میں کلام ہے، یہ درحقیقت بالکل بے سند اور بے اصل روایت ہے، اور کسی معتبر کتاب میں اس کا پتہ نہیں،

۷۔ روایت ہے کہ اس رات کو کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑ گیا، اور اس کے چودہ کنگرے گر پڑے، اور ساوہ کی نہر (واقع فارس) اور بعض روایتوں میں طبریہ کی نہر (واقع شام) خشک ہوگئی، اور فارس کا آتشکدہ جو ہزاروں برس سے روشن تھا، بجھ گیا، اور کسریٰ نے ایک ہولناک خواب دیکھا جس کی تعبیر یمن کے ایک کاہن سطیح سے دریافت کی گئی؛ یہ قصہ بیہقی خرائطی، ابن عساکر اور ابونعیم میں سند اور سلسلۂ روایت کے ساتھ مذکور ہے، ان سب کا مرکزی راوی مخزوم ابن ہانی ہے، جو اپنے باپ ہانی مخزومی (قریشی) سے جس کی ڈیڑھ سو برس کی عمر تھی، بیان کرتا ہے، ہانی کے نام کا کوئی صحابی جو مخزومی قریشی ہو، اور جو ڈیڑھ سو برس کی عمر رکھتا ہو معلوم نہیں، اصابہ وغیرہ میں اسی روایت کے سلسلہ میں ان کا نام مشکوک طریقہ سے آیا ہے، ان کے صاحبزادہ مخزوم بن ہانی سے محدثین میں بھی کوئی شناسا نہیں، نیچے کے راویوں کا بھی یہی حال ہے، یہاں تک کہ ابن عساکر جیسے ضعیف روایتوں کے سرپرست بھی اس روایت

کو غریب کہنے کی جرأت کرتے ہیں، اور ابن حجر جیسے کمزور روایتوں کے سہارا اور پشت پناہ بھی اس کو مرسل ماننے کو تیار ہیں، ابونعیم کی روایت میں محمد بن جعفر بن اعین مشہور وضاع ہے،

۸- روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت عبد الرحمن بن عوف رضؓ کی ماں شفا بنت اوس ولادت کے وقت زچہ خانہ میں موجود تھیں، وہ کہتی ہیں کہ جب آپؐ پیدا ہوئے تو پہلے غیب سے ایک آواز آئی، پھر مشرق و مغرب کی ساری زمین میرے سامنے روشن ہوگئی، یہانتک کہ شام کے محل مجھ کو نظر آنے لگے، میں نے آپ کو کپڑا پہنا کر لٹا یا ہی تھا کہ اندھیرا چھا گیا، اور میں ڈر کر کانپنے لگی، پھر داہنی طرف سے کچھ روشنی نکلی، تو آواز سنی کہ "کہاں لے گئے تھے" جواب ملا کہ "مغرب کی سمت"۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی میں ڈر کر کانپی اور آواز آئی کہ کہاں لے گئے تھے، جواب ملا کہ "مشرق کی سمت"۔ یہ حکایت ابونعیم میں ہے، اس کے بیچ کا راوی احمد بن محمد بن عبد العزیز زہری نامعتبر ہے، اور اس کے دوسرے رواۃ مجہول الحال ہیں۔

۹- روایت ہے کہ حضرت آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے "اے آمنہ! تیرا بچہ تمام جہاں کا سردار ہوگا، جب پیدا ہو تو اس کا نام احمد اور محمد رکھنا، اور یہ تعویذ اس کے گلے میں ڈالنا،" جب وہ بیدار ہوئیں تو سونے کے پتر پر یہ اشعار لکھے ملے (اس کے بعد اشعار ہیں) یہ قصہ ابونعیم میں ہے جس کا راوی ابو غزیہ محمد بن موسیٰ انصاری ہے جس کی روایتوں کو امام بخاری منکر کہتے ہیں، ابن حبان کا بیان ہے کہ دوسروں کی حدیثیں چرایا کرتا تھا، اور ثقات سے موضوع روایتیں بنا کر بیان کیا کرتا تھا، متاخرین میں حافظ عراقی نے اس روایت کو بے اصل اور شامی نے بہت ہی ضعیف کہا ہے، ابن اسحاق نے بھی اس کو بے سند روایت کیا ہے، ابن سعد

ہیں یہ روایت واقدی کے حوالہ سے ہے جس کی دروغ گوئی محتاج بیان نہیں۔

۱۰۔ **روایت**: عثمان بن ابی العاصؓ صحابی کی ماں ولادت کے وقت موجود تھیں، وہ کہتی ہیں کہ جب آمنہ کو درد زہ ہوا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستارے زمین پر جھکے آتے ہیں، یہانتک کہ میں ڈری کہ کہیں زمین پر نہ گر پڑیں اور جب پیدا ہوئے، تو جدھر نظر جاتی تھی تمام گھر روشنی سے معمور تھا، یہ قصہ ابو نعیم، طبرانی اور بیہقی میں مذکور ہے، اس کے رواۃ میں یعقوب بن محمد زہری پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور عبد العزیز بن عمر بن عبد الرحمٰن بن عوف ایک محض داستان گو اور جھوٹا تھا۔

۱۱۔ **روایت**: حضرت آمنہؓ کہتی ہیں کہ مجھے ایام حمل میں حمل کی کوئی علامت معلوم نہ ہوئی اور عورتوں کو ان ایام میں جو گرانی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے، وہ بھی نہ ہوئی، بجز اس کے کہ معمول میں فرق آگیا تھا، قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اس قصہ کو ابن اسحٰق اور ابو نعیم کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ لیکن ابن اسحٰق کا جو نسخہ ابن ہشام کے نام سے مشہور اور چھپا ہوا ہے، اور نیز دلائل ابو نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں، قسطلانی کی پیروی میں دوسرے بے احتیاط متاخرین مثلاً صاحب سیرۃ حلبیہ اور مصنف خمیس نے بھی ابن اسحاق اور ابو نعیم ہی کی طرف اس روایت کی نسبت کی ہے لیکن ابن سید الناس نے عیون الاثر میں بجا طور سے اس روایت کے لیے واقدی کا حوالہ دیا ہے، دراصل یہ قصہ ابن سعد نے نقل کیا ہے، اور اس کی روایت کے دو سلسلے لکھے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کا سر سلسلہ **واقدی** ہے، اور اس کی نسبت محدثین کی رائے پوشیدہ نہیں علاوہ ازیں ان میں سے کوئی سلسلہ بھی مرفوع نہیں، پہلا سلسلہ عبد اللہ بن وہب پر ختم ہوتا ہے جو اپنی پھوپھی سے روایت کرتے ہیں، کہ وہ کہتی ہیں کہ ہم یہ سنا کرتے تھے، ......"

دوسرے سلسلہ کو واقدی زہری پر جاکر ختم کر دیتا ہے۔

۱۲۔ **ایک روایت** اس کے بالکل برخلاف ابن سعد میں یہ ہے کہ "غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت و عظمت کے باعث) حضرت آمنہ کو سخت گرانی اور بار محسوس ہوتا تھا، وہ کہا کرتی تھیں کہ "میرے پیٹ میں کئی بچے رہے، مگر اس بچہ سے زیادہ بھاری اور گراں مجھے کوئی نہیں معلوم ہوا، اول تو یہ روایت معروف اور مسلّم واقعہ کے خلاف ہے، حضرت آمنہ کے ایک کے سوا نہ کوئی اور بچہ ہوا، اور نہ حمل رہا، دوسرے یہ کہ اس روایت کا سلسلہ ناتمام ہے، اسی معنی کی ایک اور روایت شداد بن اوس صحابیؓ کی زبانی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "میں اپنے والدین کا پہلوٹا ہوں، جب میں شکم میں تھا تو میری ماں عام عورتوں سے بہت زیادہ گرانی محسوس کرتی تھی، (کنز العمال کتاب الفضائل) معافی بن زکریا القاضی نے اس روایت پر اتنی ہی جرح کی ہے کہ یہ منقطع ہے، یعنی شداد بن اوس اور ان کے بعد کے راوی مکحول میں ملاقات نہیں، اس لیے بیچ میں ایک راوی کم ہے، حالانکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کا پہلا راوی عمر بن صبیح، کذاب، وضاع اور متروک تھا،

۱۳۔ **روایت**: جب ولادت کا وقت آیا، خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمانوں اور بہشتوں کے دروازے کھول دو، فرشتے باہم بشارت دیتے پھرتے تھے، سورج نے نور کا نیا جوڑا پہنا، اس سال دنیا کی تمام عورتوں کو یہ رعایت ملی کہ سب فرزند نرینہ جنیں، درختوں میں پھل آ گئے، آسمان میں زبرجد و یاقوت کے ستون کھڑے کیے گئے، نہر کوثر کے کنارے مشک خالص کے درخت اگائے گئے، مکہ کے بت اوندھے ہو گئے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ حکایت مواہب لدنیہ اور خصائص کبریٰ میں ابونعیم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے لیکن ابونعیم کی دلائل النبوۃ کے مطبوعہ نسخہ میں جہاں اس کا موقع ہوسکتا تھا، وہاں یہ روایت مجھ کو نہیں ملی ممکن ہے کہ ابونعیم نے اپنی کسی اور کتاب میں یہ روایت لکھی ہو، یا یہ مطبوعہ نسخہ ناکمل ہو، بہرحال اس روایت کی بنا صرف اس قدر ہے کہ ابونعیم چوتھی صدی کے ایک راوی عمرو بن قتیبہ راوی سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے والد قتیبہ جو بڑے فاضل تھے، یہ بیان کرتے تھے قسطلانی نے مواہب میں اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے، کہ وہ "مطعون ہے"۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں اس کو منکر کہا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تمامتر بے سند اور موضوع ہے،

۱۴۔ روایت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حمل میں ہونے کی جو نشانیاں تھیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اس رات کو قریش کے سب جانور بولنے لگے، اور کہنے لگے کہ کعبہ کے خدا کی قسم! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شکم مادر میں آگئے، وہ دنیا جہان کی امان، اور اہلِ دنیا کے چراغ ہیں، قریش اور دیگر قبائل کی کاہنہ عورتوں میں کوئی عورت ایسی نہ تھی کہ اس کا جن اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا ہو، اور ان سے کہانت کا علم چھین لیا گیا، اور دنیا کے تمام بادشاہوں کے تخت اوندھے ہوگئے، اور سلاطین اس دن گونگے ہوگئے، مشرق کے وحشی جانوروں نے مغرب کے وحشی جانوروں کو جاکر بشارت دی، اسی طرح ایک دریا نے دوسرے دریا کو خوشخبری سنائی اور پورے ایام حمل میں ہر ماہ آسمان وزمین سے یہ ندا سنی جانے لگی کہ بشارت ہو کہ حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمین پر ظاہر ہونے کا زمانہ قریب آیا" حضرتؐ کی والدہ فرماتی تھیں کہ جب میرے حمل کے چھ مہینے گذر گئے تو خواب میں کسی نے مجھ کو پاؤں سے ٹھوکر دے کر کہا کہ

اے آمنہ! تمام جہان کا سردار تیرے پیٹ میں ہے، جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمدؐ رکھنا
اور اپنی حالت کو چھپائے رکھنا۔" کہتی ہیں کہ جب ولادت کا زمانہ آیا، تو عورتوں کو جو پیش آتا ہے
وہ مجھکو بھی پیش آیا، اور کسی کو میری اس حالت کی خبر نہ تھی، میں گھر میں تنہا تھی، عبدالمطلب خانہ کعبہ
کے طواف کو گئے تھے، تو میں نے ایک زور کی آواز سنی جس سے میں ڈر گئی، میں نے دیکھا کہ ایک
سپید مرغ ہے، جو اپنے بازو کو میرے دل پر مل رہا ہے، اُس سے میری تمام دہشت دور ہو گئی
اور درد کی تکلیف بھی جاتی رہی، پھر ایک طرف دیکھا کہ سپید شربت ہے، پیاسی تھی، دودھ
سمجھ کر اس کو پی گئی، اس کے پینے سے ایک نور مجھ سے نکل کر بلند ہوا، پھر میں نے دیکھا کہ
چند عورتیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں، گویا عبدالمطلب کی بیٹیاں ہیں، وہ مجھے غور سے دیکھ رہی
ہیں، میں تعجب کر رہی ہوں کہ ان کو کیسے میرا حال معلوم ہوا، (ایک اور روایت میں ہے
کہ ان عورتوں نے کہا کہ ہم فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم اور یہ حوریں ہیں)
میرا درد بڑھ گیا، اور ہر گھڑی آواز اور زیادہ بلند تھی، اور خوفناک ہوتی جاتی تھی، اتنے میں ایک
سپید دیبا کی چادر آسمان و زمین کے درمیان پھیلی نظر آئی، اور آواز آئی کہ "اس کو لوگوں کی نگاہوں
سے چھپا لو۔" میں نے دیکھا کہ چند مرد ہوا میں معلق ہیں، ان کے ہاتھوں میں چاندی کے آفتابے
ہیں، اور میرے بدن سے موتی کی طرح پسینہ کے قطرے ٹپک رہے تھے جس میں مشکِ خالص
سے بہتر خوشبو تھی، اور میں دل میں کہہ رہی تھی کہ کاش عبدالمطلب اس وقت پاس ہوتے،
پھر میں نے پرندوں کا ایک غول دیکھا، جو نہیں معلوم کدھر سے آئے وہ میرے کمرے میں گھس
آئے، ان کی منقاریں زمرد کی اور بازو یاقوت کے تھے، میری آنکھوں سے اس وقت پردے

اٹھا دیے گئے تو اُس وقت مشرق و مغرب سب میری نگاہوں کے سامنے تھے، تین جھنڈے نظر آئے، ایک مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک خانۂ کعبہ کی چھت پر، اب درد زیادہ بڑھ گیا، تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے کچھ عورتیں ٹیک لگائے بیٹھی ہیں، اور اتنی عورتیں بھر گئیں کہ مجھے گھر کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی، اسی اثنا میں بچہ پیدا ہوا، میں نے پھر کر دیکھا تو وہ سجدہ میں پڑا تھا، اور دو انگلیوں کو آسمان کی طرف دعا کی طرح اٹھائے تھا، پھر ایک سیاہ بادل نظر آیا جو آسمان سے اتر کر نیچے آیا، اور بچہ پر چھا گیا، اور بچہ میری نگاہ سے چھپ گیا، اتنے میں ایک منادی سنی کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے پورب اور پچھم گھما دو اور سمندروں کے اندر لیجاؤ کہ سب ان کے نام نامی اور شکل وصورت کو پہچان لیں، اور جان لیں کہ یہ مٹانے والے ہیں، یہ اپنے زمانہ میں شرک کا نام و نشان مٹا دیں گے" پھر تھوڑی ہی دیر میں بادل ہٹ گیا اور آپ دودھ سے زیادہ سفید کپڑے میں لپٹے نظر آئے جس کے نیچے سبز ریشم تھا، ہاتھوں میں سفید موتیوں کی تین کنجیاں تھیں، اور ایک آواز آئی کہ محمد کو فتح ونصرت اور نبوت کی کنجیاں دی گئی ہیں،

میں نے دل پر جبر کرکے یہ پوری حکایت نقل کی ہے، یہ اس لیے کہ میلاد کے عام جلسوں کی رونق ان ہی روایتوں سے ہے، یہ روایت ابونعیم میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے اور سند کا سلسلہ بھی ہر طرح درست ہے، مگر اگر کسی کو اسماء الرجال سے آگاہی نہ بھی ہو اور وہ صرف ادب عربی کا صحیح ذوق رکھتا ہو تو وہ فقط روایت کے الفاظ اور عبارت کو دیکھکر یہ فیصلہ کر دے گا کہ یہ تیسری چوتھی صدی کی بنائی ہوئی ہے، اس روایت میں یحیٰی بن عبد اللہ البابلتی اور ابوبکر بن ابی مریم ہیں، پہلا شخص بالکل ضعیف ہے اور دوسرا ناقابلِ حجت ہے، انکے آگے

راوی سعید بن عمرو الانصاری اور ان کے باپ عمرو الانصاری کا کوئی پتہ نہیں،

۱۵- اسی قسم کی ایک اور روایت حضرت عباسؓ سے نقل کیجاتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی عبداللہ جب پیدا ہوئے تو ان کے چہرے پر سورج کی سی روشنی تھی، اور والد نے ایک دفعہ خواب دیکھا، بنو مخزوم کی ایک کاہنہ نے یہ خواب سُنکر پیشینگوئی کی کہ "اس لڑکے کی پشت سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو تمام دنیا پر حکومت کریگا، جب آمنہ کے شکم سے بچہ پیدا ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ ولادت کے اثنا میں تم کو کیا کیا نظر آیا، انھوں نے کہا کہ جب مجھے درد ہونے لگا تو میں نے بڑے زور کی آواز سنی، جو انسانوں کی آواز کی طرح نہ تھی، اور سبز ریشم کا پھریرا یاقوت کے جھنڈے میں لگا ہوا آسمان وزمین کے بیچ میں گڑا نظر آیا، اور میں نے دیکھا کہ بچہ کے سر سے روشنی کی کرنیں نکل نکل کر آسمان تک جاتی ہیں، شام کے تمام محل آگ کا شعلہ معلوم ہوتے تھے، اور اپنے پاس مرغابیوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا جس نے بچہ کو سجدہ کیا، پھر اپنے پروں کو کھول دیا، اور سعیرۂ اسدیہ کو دیکھا کہ وہ کہتی ہوئی گذری کہ تیرے اس بچہ نے بتوں اور کاہنوں کو بڑا صدمہ پہنچایا، ہائے سعیرہ ہلاک ہوگئی، پھر ایک بلند بالا، سپید رنگ جوان نظر آیا، جس نے بچہ کو میرے ہاتھ سے لے لیا، اور اُس کے منہ میں اپنا لعاب دہن لگایا، اس کے ہاتھ میں سونے کا طشت تھا بچہ کے پیٹ کو پھاڑا، پھر اس کے دل کو نکالا، اس میں سے ایک سیاہ داغ نکال کر پھینک دیا، پھر سبز حریر کی ایک تھیلی کھولی، جس میں سپید کی طرح کوئی چیز تھی، اس کو سینہ میں بھرا پھر سپید حریر کی ایک تھیلی کھولی، اس میں سے ایک انگوٹھی نکال کر مونڈھے کے برابر مہر کی، اور اس کو ایک کرتہ پہنا دیا، اے عباس یہ میں نے دیکھا،

اس روایت کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کہ ناقلین نے اس کے ضعف کو خود تسلیم کیا ہے، اور حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ "اس روایت اور اس سے پہلے کی دو روایتوں (۱۳-۱۴) میں سخت نکارت ہے، اور میں نے اپنی اس کتاب (خصائص) میں ان تینوں سے زیادہ منکر کوئی روایت نقل نہیں کی، اور میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا، لیکن میں نے محض ابونعیم کی تقلید میں لکھ دیا ہے"، جن روایتوں کو حافظ سیوطی لکھنے کے قابل نہ سمجھیں آپ اُن کے ضعف کے درجہ کو سمجھ سکتے ہیں، سیوطی اس روایت کا ماخذ ابونعیم کو بتاتے ہیں، مگر یہ روایت دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملی، یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہی دو سال بڑے تھے، جب آمنہ نے وفات پائی تو وہ سات آٹھ برس کے بچہ ہوں گے،

۱۶- حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آمنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا قصہ بیان کر رہی تھیں کہ "میں حیرت میں تھی کہ تین آدمی دکھائی دیے جن کے چہرے سورج کی طرح چمک رہے تھے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ تھا جس سے مشک کی سی خوشبو آرہی تھی، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت تھا جس کے چار گوشے تھے، اور ہر گوشہ میں سپید موتی رکھا تھا، اور ایک آواز آئی "اے حبیب اللہ! یہ پوری دنیا، پورب پچھم، خشکی و تری سب مجتمع ہو کر آئی ہے، اس کے جس گوشہ کو چاہیے مٹھی میں لے لیجیے"، آمنہ کہتی ہیں کہ میں نے گھوم کر دیکھا کہ بچہ کہاں ہاتھ رکھتا ہے، میں نے دیکھا کہ اس نے بیچ میں ہاتھ رکھا تو کہنے والے کی آواز سنی کہ "محمدؐ نے کعبہ کے خدا کی قسم کعبہ پر قبضہ کر لیا، ہاں یہ کعبہ اس کا قبلہ اور اس کا مسکن بنے گا"

تیسرے کے ہاتھ میں سپید حریر لپٹا تھا۔ اس نے اُس کو کھولا، تو اس میں ایک انگوٹھی نکلی جس کو دیکھکر دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت کرتی تھیں، پھر وہ میرے پاس آیا، تو طشت والے نے اس انگوٹھی کو لے کر اُس آفتابہ سے سات بار اس کو دھویا، اور بچہ کے مونڈھے پر مہر کردی، اور حریر میں اس کو لپیٹ کر مشک خالص کے تاگے سے اس کو باندھ دیا۔ اور تھوڑی دیر تک اپنے بازوؤں میں لپٹائے رکھا، ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ رضوانِ جنت تھا، پھر بچہ کے کان میں کچھ کہا جس کو آمنہ کہتی ہیں کہ میں سمجھ نہ سکی، اور پھر اس نے کہا "اے محمدؐ بشارت ہو کہ کسی نبی کو کوئی ایسا علم عطا نہیں کیا گیا، جو تم کو نہیں بتایا گیا، تم سب پیغمبروں سے زیادہ شجاع بنائے گئے، تم کو فتح و نصرت کی کنجی دی گئی اور رعب و داب بخشا گیا، جو تمھارا نام سنے گا، اس نے تم کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو تو وہ کانپ جائے گا۔ اے خدا کے خلیفہ!"

اس روایت کا ماخذ یہ ہے کہ یحییٰ بن عائذ المتوفی ۳۷۶ھ نے اپنی کتاب میلاد میں اسکا ذکر کیا ہے، ابن دحیہ محدث نے بڑی جرأت کر کے اس خبر کو "غریب" کہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے، یہ تمامتر بے اصل اور بے بنیاد ہے۔

۱۷۔ روایت: آمنہ کہتی ہیں کہ جب ولادت ہوئی تو ایک بہت بڑا ابر کا ٹکڑا نظر آیا جس میں سے گھوڑے کے ہنہنانے اور پروں کے پھڑپھڑانے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں، وہ ابر کا ٹکڑا بچہ کے اوپر آکر چھا گیا، اور بچہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ البتہ منادی کی آواز سنائی دی، کہ محمد کو ملکوں ملکوں پھراؤ، اور سمندروں کی تہوں میں لے جاؤ، کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے، اور جن و انس، چرند و پرند، ملائکہ بلکہ ہر ذی رُوح

کے سامنے ان کو لے جاؤ، ان کو آدمؑ کا خلق، شیثؑ کی معرفت، نوحؑ کی شجاعت، ابراہیمؑ کی دوستی، اسمٰعیلؑ کی زبان، اسحاقؑ کی رضا، صالحؑ کی فصاحت، لوطؑ کی حکمت، موسیٰؑ کی سختی، ایوبؑ کا صبر، یونسؑ کی طاعت، یوشعؑ کا جہاد، داؤدؑ کی آواز، دانیالؑ کی محبت، الیاسؑ کا وقار، یحییٰؑ کی پاکدامنی، اور عیسیٰؑ کا زہد عطا کرو، اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں ان کو غوطہ دو، آمنہ کہتی ہیں، پھر یہ منظر ہٹ گیا، تو میں نے دیکھا کہ آپ سبز حریر میں لپٹے ہیں، اور اس کے اندر سے پانی ٹپک رہا ہے، آواز آئی "ہاں محمدؐ نے تمام دنیا پر قبضہ کر لیا، اور کوئی مخلوق ایسی نہ رہی جو ان کے حلقۂ اطاعت میں نہ آگئی ہو" کہتی ہیں کہ پھر میں نے دیکھا تو نظر آیا کہ آپ کا چہرہ چودہویں رات کے چاند کی طرح ہے، اور مشکِ خالص کی سی خوشبو آپ سے نکل رہی ہے، دفعۃً تین آدمی نظر آئے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ ہے، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت ہے، اور تیسرے کے ہاتھ میں سپید ریشم ہے، اس نے سپید ریشم کو کھول کر اس میں سے انگوٹھی جس کو دیکھکر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں، نکالی، پہلے اس نے انگوٹھی کو سات دفعہ اس آفتابہ کے پانی سے دھویا، پھر مونڈھے پر مہر کر کے بچہ کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا، اور پھر مجھے واپس کر دیا،

اس حکایت کی بنیاد یہ ہے کہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں السعادۃ والبشریٰ نامی ایک میلاد کی کتاب سے اس کو نقل کیا ہے، اور السعادۃ والبشریٰ کا مصنف کہتا ہے کہ اس نے خطیب سے اس کو لیا ہے، روایات کے لحاظ سے خطیب کی تاریخ کا جو درجہ ہے، وہ کس کو معلوم نہیں، قسطلانی نے اس روایت کو ابونعیم کی طرف بھی منسوب کیا ہے، مگر دلائل ابونعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس کا پتہ نہیں غنیمت ہے کہ حافظ قسطلانی نے خود تصریح کر دی ہے کہ "اس میں سخت نکارت ہے"

۱۸۔ روایت: آمنہ کہتی ہیں کہ "جب آپ پیدا ہوئے تو ایک روشنی چمکی جس سے تمام مشرق و مغرب روشن ہو گیا، اور آپ دونوں ہاتھ ٹیک کر زمین پر گر پڑے (شاید مقصود یہ کہنا ہے کہ آپ سجدہ میں گئے) پھر مٹھی سے مٹی اٹھائی (اہل میلاد اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ آپ نے روے زمین پر قبضہ کر لیا) اور آسمان کی طرف سر اٹھایا۔"

یہ حکایت ابن سعد میں متعدد طریقوں سے مذکور ہے، مگر ان میں سے کوئی قوی نہیں، اسی کے قریب قریب ابونعیم اور طبرانی میں روایتیں ہیں، اُن کا بھی یہی حال ہے،

۱۹۔ روایت: جس شب کو آپ پیدا ہوئے قریش کے بڑے بڑے سردار جلسہ جمائے بیٹھے تھے، ایک یہودی نے جو مکہ میں سوداگری کرتا تھا، ان سے آکر دریافت کیا کہ آج تمہارے یہاں کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے؟ سب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی، اُس نے کہا "اللہ اکبر! تم کو نہیں معلوم تو خیر، میں جو کہتا ہوں اس کو سن رکھو، آج شب کو اس پچھلی امت کا نبی پیدا ہو گیا، اس کے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں ایک نشانی ہے، اس میں گھوڑے کی ایال کی طرح کچھ اوپر تلے بال ہیں، وہ دو دن تک دودھ نہ پیے گا، کیونکہ ایک جن نے اس کے منہ میں انگلی ڈال دی ہے جس سے وہ دودھ نہیں پی سکتا" جب جلسہ چھوٹ گیا، اور لوگ گھروں کو لوٹے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے، لوگ اس یہودی کو آمنہ کے گھر لائے اس نے بچہ کی پیٹھ پر تل دیکھا تو غش کھا کر گر پڑا، جب ہوش آیا، لوگوں نے سبب پوچھا، اس نے کہا "خدا کی قسم اسرائیل کے گھرانے سے نبوت رخصت ہو گئی، اے قریش! تم اس کی پیدائش سے خوش ہو، ہشیار! خدا کی قسم ایک دن یہ تم پر ایسا حملہ کریگا جس کی خبر چار دانگ عالم میں پھیلے گی۔"

یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے، اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے، مگر اہل علم جانتے ہیں کہ حاکم کا کسی روایت کو صحیح کہنا ہمیشہ تنقید کا محتاج رہتا ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک (جلد ۲ ص ۶۰۲) میں حاکم کی تردید کی ہے، اس کا سلسلۂ روایت یہ ہے کہ یعقوب ابن سفیان فسوی ابوعنسان محمد یحییٰ کنانی سے اور یہ اپنے باپ (یحییٰ بن علی کنانی) سے، اور وہ محمد بن اسحاق (مصنف سیرت) سے روایت کرتے ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اسحاق نے خود اپنی سیرت میں یہ روایت نہیں لی ہے، ابوعنسان محمد بن یحییٰ کو گو بعض محدثین نے اچھا کہا ہے، مگر محدث سلیمانی نے ان کو منکر الحدیث (ایسی باتیں بیان کرنے والا جن کی تصدیق دیگر معتبر بیانات سے نہیں ہوتی) کہا ہے، ابن حزم نے ان کو مجہول کہا ہے، بہرحال اُن تک غنیمت ہے، مگر ان کے باپ یحییٰ بن علی کا کہیں کوئی ذکر نہیں کہ یہ کون تھے، اور کب تھے؟

اسی قسم کی ایک اور روایت عیص راہب کے متعلق ابوجعفر بن ابی شیبہ سے ہے، اور ابونعیم نے دلائل میں اور ابن عساکر نے تاریخ میں اس کو ذکر کیا ہے، لیکن زرقانی نے لکھ دیا ہے کہ ابوجعفر بن ابی شیبہ نامعتبر ہے،

۲۰- روایت: حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کرتے ہیں کہ "یارسول اللہ! مجھ کو جس نشانی نے آپ کے مذہب میں داخل ہونے کا خیال دلایا، وہ یہ ہے کہ جب آپ گہوارہ میں تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ چاند سے اور چاند آپ سے باتیں کرتا تھا، اور انگلی سے آپ اس کو جدھر اشارہ کرتے تھے، ادھر جھک جاتا تھا، فرمایا، ہاں میں اس سے اور وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا، اور رونے سے بہلاتا تھا، اور عرش کے نیچے جا کر جب وہ تسبیح کرتا تھا، تو میں اس کی آواز سنتا تھا"

یہ حکایت دلائل بیہقی، کتاب لمائتین صابونی، تاریخ خطیب اور تاریخ ابن عساکر میں ہے مگر خود بیہقی نے تصریح کردی ہے کہ یہ صرف احمد بن ابراہیم حبلی کی روایت ہے اور وہ مجہول ہے، صابونی نے روایت لکھکر کہا ہے کہ "یہ سند اور متن دونوں لحاظ سے غریب ہے" علاوہ ازیں حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شاید ایک ہی دو سال بڑے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شیرخوارگی کے عالم میں وہ خود شیرخوار ہوں گے۔

۲۱- حافظ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۶ ص ۳۴۴) میں واقدی کی سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے گہوارہ میں کلام کیا، ابن سبع المتوفی سنہ کی خصائص میں ہے کہ فرشتے آپ کا گہوارہ ہلاتے تھے، اور (پیدائش کے بعد) سب سے پہلا فقرہ زبان مبارک سے یہ نکلا الحمد للہ کبیرا والحمد للہ کثیرا، ابن عائذ وغیرہ میلاد کی بعض اور کتابوں میں اور فقرے بھی منسوب ہیں، مثلاً کہ آپ نے لا الہ الا اللہ یا جلال ربی الرفیع پڑھا۔

واقدی کی سیر سے مراد اگر واقدی کی مغازی ہے تو اس کا مطبوعہ کلکتہ نسخہ جو میرے پیش نظر ہے، اس میں یہ واقعہ مذکور نہیں، اور اگر ہوتا بھی تو واقدی کا اعتبار کیا ہے؟ ابن سبع اور ابن عائذ وغیرہ زمانۂ متاخر کے لوگ ہیں، اور قدماء سے روایات کی نقل میں بے احتیاط ہیں کسی قدیم ماخذ سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی، معلوم نہیں یہ روایتیں انھوں نے کہاں سے لیں،

۲۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت اور شیرخوارگی کے زمانہ کے فضائل اور معجزات جب آپ کو حلیمہ سعدیہؓ اپنے گھر لیجاتی ہیں۔ ابن اسحٰق، ابن راہویہ، ابویعلی، طبرانی، بیہقی، ابونعیم، ابن عساکر اور ابن سعد میں بہ تفصیل مذکور ہیں، حلیمہ سعدیہؓ کا آنا اور آپ کا ان کو دیکھکر مسکرانا، حلیمہؓ کے

خشک سینوں میں دودھ بھر آنا، آپ کا صرف ایک طرف کے سینہ سے سیر ہو جانا اور دوسری طرف کا اپنے رضاعی بھائی کے لیے بنظر انصاف چھوڑ دینا، آپ کے سوار ہوتے ہی حلیمہؓ کی کمزور اور دبلی پتلی گدھی کا تیز رو، طاقتور اور فربہ ہو جانا، اور حلیمہؓ کے قبیلہ کی قحط زدہ زمین کا سرسبز و شاداب اور ہرا بھرا ہو جانا، حلیمہؓ کی بکریوں کا موٹا ہونا اور سب سے زیادہ دودھ دینا، آپ کا غیر معمولی نشو ونما پانا۔ دو برس کے سن میں آپ کے سینہ کا چاک ہونا، حلیمہؓ کا اس واقعہ سے ڈر کر آپ کو آمنہ کے پاس واپس لانا، آمنہ کا حلیمہؓ کو تسلی دینا، یہ تمام واقعات ان کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ہیں،

یہ واقعات دو طریقوں سے مروی ہیں، ایک طریقہ کا مشترک راوی جہم بن ابی جہم ایک مجہول شخص ہے، اور دوسرے کا مشترک راوی واقدی ہے، جس کا کوئی اعتبار نہیں۔

پہلے طریقہ سے اس کو ابن اسحٰق، ابن راہویہ، ابو یعلی، طبرانی، اور ابو نعیم نے روایت کیا ہے، اس کا سلسلہ یہ ہے کہ ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے جہم بن ابی جہم مولی حارث بن حاطب جمحی نے کہا، اور وہ کہتا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نے خود بیان کیا، یا کسی ایسے شخص نے بیان کیا جس نے عبداللہ بن جعفر سے سنا، اور عبداللہ بن جعفر نے حلیمہ سعدیہ سے سنا؛

اس روایت میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جہم اس روایت کا خود عبداللہ بن جعفر سے سننا، یقینی نہیں بتاتا، بلکہ وہ کہتا ہے کہ "عبداللہ بن جعفر یا کسی نے ان سے سن کر مجھ سے کہا" معلوم نہیں وہ کون تھا؟ اور کیسا تھا؟ ابو نعیم وغیرہ متاخرین نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شک سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے، اگر بالفرض جہم نے عبداللہ بن جعفر سے سنا تو

عبداللہ بن جعفرؓ کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آٹھ نو برس کے تھے، اور ۷ھ کے بعد حبش کے ملک سے مدینہ آئے تھے، حلیمہؓ سے ملنا اور ان سے نقل روایت کرنا محتاجِ ثبوت ہے، بلکہ علماے سیر و رجال میں خود حلیمہؓ کے اسلام یا نبوت کے بعد آپ سے ملاقات میں اختلاف ہے صرف ایک دفعہ غزوۂ ہوازن کے موقع پر ان کا آنا کسی کسی نے بیان کیا ہے مگر اس موقع پر عبداللہ بن جعفر کا جو کمسن تھے، موجود ہونا اور ان سے ملنا مطلق ثابت نہیں، جہم بن ابی جہم جو اس روایت کا سرِ بنیاد ہے، ذہبی نے میزان الاعتدال میں اسی روایت کی تقریب سے اسکا نام لکھ کر لکھا ہے "لا یعرف یعنی معلوم نہیں یہ کون تھا"

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کا مرکزی راوی واقدی ہے، اس سلسلہ سے ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر نے اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ سلسلہ علاوہ ازیں کہ واقدی کے واسطہ سے ہے موقوف بھی ہے یعنی کسی صحابی تک وہ نہیں پہنچتا، اس کو واقدی زکریا بن یحییٰ بن یزید سعدی سے، اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن یزید سعدی سے نقل کرتا ہے، ابن سعد نے دوسری جگہ (جلد اول ص ۹۷) ایک اور سلسلہ سے اس کو واقدی سے روایت کیا ہے، اور واقدی عبداللہ بن زید بن اسلم سے اور عبداللہ اپنے باپ زید بن اسلم تابعی سے نقل کرتے ہیں، یہ سلسلہ بھی علاوہ ازیں کہ اسکا پہلا راوی وہی واقدی ہے، اور روایت بھی موقوف ہے، زید مذکور کی نسبت اہل مدینہ کلام کرتے تھے، اور ان کے بیٹے عبداللہ کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے، اس لیے یہ سلسلہ بھی استناد کے قابل نہیں ہے،

ابونعیم نے تیسری روایت میں واقدی کے واسطہ سے ان واقعات کو بے سند لکھا ہے،

۴۳- شقِ صدر یعنی سینۂ مبارک کے چاک ہونے کا واقعہ معراج میں پیش آنا مسلم ہے،

مگر بعض لوگوں نے بچپن کے زمانہ میں بھی اس واقعہ کا پیش آنا بیان کیا ہے، بچپن کے وقت کی تعیین میں ان روایتوں میں اختلاف ہے، اکثر روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت حلیمہؓ کے پاس قیام کے زمانہ میں یہ پیش آیا جب عمر شریف غالباً صرف چار برس کی تھی، ایک دو روایتوں میں ہے کہ اس وقت آپؐ دس برس کے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عہد طفولیت میں شق صدر کی جس قدر روایتیں ہیں، صحیح مسلم کی روایت کے علاوہ، وہ تمام تر ضعیف ہیں، صحیح مسلم کی روایت میں حماد بن سلمہ کی غلطی سے معراج کا واقعہ عہد طفولیت میں بیان ہوگیا ہے، اس بارہ میں میں نے اپنی تحقیق شرح صدر کی بحث میں مفصل بیان کی ہے۔

۲۴۔ حضرت حلیمہؓ کے پاس قیام کے زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی راویوں نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بعض یہودیوں نے یا عرب قیافہ شناسوں نے (روایت میں اختلاف ہے) یہ معلوم کرلیا کہ نبی آخر الزماں ہیں، اور یہی ہمارے آبائی کیش اور مذہب کو دنیا سے مٹائیں گے، یہ سمجھ کر انھوں نے آپ کو خود قتل کرنا چاہا، یا دوسروں کو آپؐ کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا، (روایت میں اختلاف ہے) ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا، جب حلیمہؓ آپؐ کو پہلے پہل مکہ معظمہ سے لیکر عکاظ کے میلہ میں آئیں، وہاں قبیلۂ ہذیل کا ایک قیافہ شناس بڈھا تھا، عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لیکر اس کے پاس آتی تھیں اور فال نکلواتی تھیں، اس کی نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو وہ چلا اٹھا کہ اس کو قتل کر ڈالو، مگر آپ لوگوں کی نظر سے غائب ہو چکے تھے، حلیمہؓ آپ کو لیکر چل دی تھیں، لوگوں نے بڈھے سے واقعہ پوچھا، تو اس نے کہا کہ میں نے ابھی وہ بچہ دیکھا جو تمہارے اہل مذہب کو قتل کریگا

اور تمہارے بتوں کو توڑے گا، اور وہ کامیاب ہوگا۔" اس کے بعد لوگوں نے آپ کو بہت ڈھونڈھا مگر آپ نہ ملے حضرت حلیمہؓ نے اس کے بعد آپ کو پھر کسی قیافہ شناس اور فال دیکھنے والے کے سامنے پیش نہ کیا، ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد اس بڈھے کی عقل جاتی رہی اور وہ کفرہی کی حالت میں مرگیا، دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت آمنہ نے حلیمہ کو کہدیا تھا کہ میرے بچہ کو یہودیوں سے بچائے رکھنا۔" اتفاق سے جب وہ آپ کو لیکر چلیں تو کچھ یہودی راستہ میں مل گئے، انھوں نے آپ کا حال سن کر ایک دوسرے سے کہاکہ" اس کو مار ڈالو" پھر انھوں نے دریافت کیاکہ کیا یہ بچہ یتیم ہے؟ حلیمہ نے کہا" نہیں، میں اس کی ماں ہوں اور اپنے شوہر کو بتایاکہ وہ اس کا باپ ہے، انھوں نے کہاکہ" اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اس کو قتل کرڈالتے (یعنی آخری پیغمبر کی ایک علامت یتیمی بھی تھی، اور چونکہ ان کو یہ معلوم ہواکہ یہ علامت بچہ میں پائی نہیں جاتی، اس سے ان کا یقین جاتا رہا۔)

یہ روایتیں ابن سعد جلد اول ص ۷۱ و ۰۰ ۹ میں ہیں، مگر حالت یہ ہے کہ پہلی روایتوں کا ماخذ واقدی کی داستانیں ہیں، اور اس پر بھی ان کے سلسلے ناتمام ہیں، آخری روایت کا سلسلہ یہ ہے: عمرو بن عاصم کلابی، ہمام بن یحییٰ، اسحاق بن عبداللہ، گو یہ تینوں عموماً ثقہ اصحاب ہیں، مگر انکی یہ روایت موقوف ہے یعنی آخری راوی اسحاق بن عبداللہؓ گو تابعی ہیں، مگر وہ کسی صحابی سے اس کا سننا ظاہر نہیں کرتے، معلوم نہیں یہ روایت ان کو کہاں سے پہنچی؟

تقریباً اسی واقعہ کو ابونعیم نے دلائل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ" حلیمہ جب آپ کو مکہ سے لیکر روانہ ہوئیں، تو ایک وادی میں پہنچکر ان کو حبش کے کچھ لوگ ملے (جو غالباً عیسائی ہوں گے) حلیمہ ان کے ساتھ ہوگئیں، انھوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کی نسبت کچھ دریافت کیا

اس کے بعد بہت غور سے انھوں نے آپ کو دیکھنا شروع کیا، دونوں مونڈھوں کے بیچ بیچ مہر نبوت تھی، وہ دیکھی، آپ کی آنکھوں میں تھوڑی سرخی تھی، اس کو دیکھتے رہے، پھر پوچھا کہ "کیا بچہ کی آنکھوں میں یہ سرخی کسی بیماری سے ہے"؟ حلیمہؓ نے کہا نہیں، یہ ہمیشہ سے اسی طرح ہے، انھوں نے کہا "خدا کی قسم یہ پیغمبر ہے"۔ یہ کہکر انھوں نے چاہا کہ بچہ کو حضرت حلیمہؓ سے چھین لیں، لیکن خدا نے آپ کی حفاظت کی"۔ ابونعیم کی اس روایت کا سلسلہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے، اور اس کے رواۃ مجہول الحال لوگ ہیں،

۲۵۔ کہتے ہیں کہ پیار اور محبت سے حضرت حلیمہؓ آپ کو دھوپ میں نکلنے نہیں دیتی تھیں، ایک دن آپ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ دھوپ میں نکل پڑے، حلیمہؓ نے دیکھا تو لڑکی پر خفا ہوئیں، کہ تم دھوپ میں کیوں لے گئیں، لڑکی نے کہا اماں جان میرے بھائی کو دھوپ نہیں لگتی ہیں نے دیکھا کہ اس پر بادل سایہ کیے تھے۔ جدھر وہ جاتا تھا، وہ بھی چلتے تھے، اور جہاں وہ رک جاتا تھا، وہ بھی رک جاتے تھے، اس کیفیت سے وہ یہاں تک پہنچا ہے"۔ ابن سعد نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، ایک میں تو صرف واقدی کا حوالہ ہے اور اسکے آگے کوئی نام نہیں دیا ہے (ص، جلد اول) اور دوسرے میں ہے کہ واقدی نے معاذ بن محمد سے اور اس نے عطاء سے، اور عطا نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا۔ ابن سعد کے علاوہ ابونعیم، ابن عساکر اور ابن طرماح نے بھی اسی سلسلہ سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، مگر اس سلسلہ میں واقدی کے علاوہ معاذ بن محمد مجہول اور نامعتبر ہے۔

یہاں تک تو ہم نے فضائل و معجزات کی غلط اور ضعیف روایتوں کی مسلسل تنقید کی ہے۔

اگر اسی طرح ہم آخر تک نبھانا چاہیں تو یہ دفتر ان اوراق میں نہیں سما سکتا، اس لیے ہم صرف مشہور ترین روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں،

۲۶۔ سب سے مشہور بحیرا راہب کا قصہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ "جب آپ ۱۲ برس کے تھے، تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کا سفر کیا، راہ میں ایک عیسائی خانقاہ ملی، جس میں بحیرا نام ایک راہب رہا کرتا تھا، اس نے آپ کو دیکھکر اور علامتوں سے پہچان کر یہ جان لیا کہ پیغمبر آخر الزماں اور سردار عالم یہی ہیں، اس نے دیکھا کہ ابر آپ سایہ افگن ہے، جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے ہیں، اس کی شاخیں آپ پر جھکی آتی ہیں، اس نے آپ کی خاطر قافلہ کی دعوت کی اور ابو طالب سے باصرار کہا کہ اس بچہ کو مکہ واپس لیجاؤ، ورنہ رومی اگر اس کو پہچان گئے تو اس کو قتل کرڈالیں گے، (شاید اس لیے کہ آپ کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوگا) ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ رومیوں کا ایک گروہ پہنچ گیا، دریافت سے ظاہر ہوا کہ رومیوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کا وقت آگیا ہے، اسلیے رومیوں نے تحقیق حال کے لیے ہر طرف اپنے دستے روانہ کیے ہیں، بحیرا نے ان سے کہا، کہ "خدا کی تقدیر ٹل نہیں سکتی، اس لیے بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ۔" وہ رک گیے، اور ادھر ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ واپس بھیج دیا، اور حضرت ابو بکرؓ نے حضرت بلالؓ کو آپ کے ساتھ کر دیا، اور بحیرا نے کیک اور ناشتہ آپ کے ساتھ کیا۔"

یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں بھی مذکور ہے، مگر ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں،

ان سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں، اس قصہ کا سب سے محفوظ طریقۂ سند وہ ہے جس میں
عبدالرحمان بن غزوان جو ابو نوح قراد کے نام سے مشہور ہے، یونس بن اسحاق سے، اور وہ
ابوبکر بن ابی موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابو موسیٰ اشعریؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں،
یہ قصہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل
بیہقی اور دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے، ترمذی نے اس کو حسن و غریب اور حاکم نے صحیح کہا ہے، استاذ
مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد (طبع اول ص ۱۳۰) وطبع دوم ص ۱۶۸) میں اس روایت پر پوری
تنقید کی ہے، اور عبدالرحمان بن غزوان کو اس سلسلہ میں مجروح قرار دیا ہے، اور حافظ
ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موضوع سمجھتے ہیں،

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ سند میں نہ صرف عبدالرحمٰن بن غزوان بلکہ دوسرے رواۃ
بھی جرح کے قابل ہیں،

(۱) سب سے اول یہ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ مسلمان ہو کر ۷ھ ہجری میں یمن سے مدینہ
آئے تھے، اور یہ واقعہ اس سے ۵۰ برس پہلے کا ہے، حضرت ابو موسیٰؓ نہ تو خود آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اور نہ کسی اور شریک واقعہ کی زبان سے اپنا سننا بیان کرتے
ہیں، اس لیے یہ روایت مرسل ہے،

(۲) اس واقعہ کو حضرت ابو موسیٰؓ سے ان کے صاحبزادے ابوبکر روایت کرتے ہیں،
مگر ان کی نسبت کلام ہے کہ انھوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے یا نہیں، چنانچہ ناقدین
فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے، امام ابن حنبلؒ نے تو اس سے قطعی انکار

کیا ہے، بنا بریں یہ روایت منقطع ہے۔ اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ "وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں"۔

(۳) ابو بکر سے یونس بن اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں، گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں یحیٰی کہتے ہیں کہ "ان میں سخت بے پروائی تھی، شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا ہے، امام احمد ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور ان کی عام روایتوں کو مضطرب اور "ایسی ویسی" کہتے ہیں، ابو حاتم کی رائے ہے کہ وہ راست گو ہیں لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں، ساجی کا قول ہے کہ "وہ سچے ہیں، اور بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے"، ابو حاکم کا بیان ہے کہ "اکثر ان کو اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا"۔

(۴) چوتھا راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے جس کا نام مستدرک اور ابو نعیم میں ابو نوح قراد ہے، اس کو اگرچہ بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے، تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے، ممالیک والی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے، ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ "اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے"، ابن حبان نے لکھا ہے کہ "وہ غلطیاں کرتا تھا، اور امام لیث اور مالک سے ممالیک والی حدیث نقل کرنے کی وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے"۔

(۵) حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ "عبدالرحمٰن بن غزوان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر بحیرا راہب کا قصہ ہے، اس قصے کے غلط ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں

یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے بلالؓ کو آپ کے ساتھ کر دیا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ اس وقت بچہ تھے، اور حضرت بلالؓ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

(۶) حاکم نے مستدرک میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کے شرط کے مطابق ہے، حافظ ذہبی مستدرک کی تلخیص میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "میں اس روایت کو بنایا ہوا خیال کرتا ہوں، کیونکہ اس میں بعض واقعات غلط ہیں"۔ (مستدرک جلد دوم ص ۶۱۵)

(۷) امام بیہقی اس کی صحت کو صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ "یہ قصہ اہل سیر میں مشہور ہے"۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے صحت کے قائل ہیں، اس لیے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کیے ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔

۲۷۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ دوسری دفعہ کے سفر شام میں جب آپ حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر بصریٰ تک تشریف لے گئے ہیں، بیان کیا جاتا ہے، آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی تھا، اس کی زبانی روایت ہے کہ ہر جگہ ابر آپ پر سایہ افگن رہتا، کبھی فرشتے اپنے پروں کا سایہ کرتے تھے، ایک عیسائی خانقاہ کے قریب جہاں نسطورا راہب رہتا تھا، آپ نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا، راہب نے یہ دیکھا تو میسرہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے، اس نے نام و نشان بتایا، راہب نے کہا کہ "اس درخت کے نیچے پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہرا ہے"، پھر دریافت کیا کہ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ یہ سرخی رہتی ہے، غلام نے اثبات میں جواب دیا، راہب نے کہا "تو یہ یقیناً آخر زمانہ کا پیغمبر ہے، تم کبھی اس کی رفاقت نہ چھوڑنا"۔

اسی درمیان میں ایک شخص سے خرید و فروخت میں کوئی جھگڑا پیش آیا، خریدار نے آپ سے کہا کہ "تم لات وعزیٰ کی قسم کھاؤ"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان کی قسم نہیں کھاتا، راہب نے میسرہ سے کہا خدا کی قسم یہ پیغمبر ہے، اس کی صفتیں ہماری کتابوں میں لکھی ہیں"۔ میسرہ کا بیان ہے کہ جب دوپہرہ کی سخت دھوپ پڑتی تو دو فرشتے آپ پر سایہ کر لیتے۔ جب آپ تجارت سے فارغ ہو کر مکہ آرہے تھے، اتفاق سے اس وقت حضرت خدیجہؓ چند سہیلیوں کے ساتھ کوٹھے پر بیٹھیں حضرت خدیجہؓ کی نظر آپ پر پڑی کہ آپ اونٹ پر سوار ہیں اور دو فرشتے آپ پر سایہ فگن ہیں، انھوں نے یہ منظر اپنی سہیلیوں کو دکھایا، اور میسرہ سے اس کا تذکرہ کیا، میسرہ نے کہا پورے سفر میں یہی تماشا دیکھتا آیا ہوں، اور اس کے بعد اس نے نسطورا راہب کی گفتگو بھی ان سے دہرائی،

یہ واقعہ ابن اسحاق، ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر میں ہے، ابن اسحاق میں اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے، بقیہ کتابوں میں اس کی سند یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین واقدی سے، اور واقدی موسیٰ بن شیبہ سے، اور وہ عمیرہ بنت عبداللہ بن کعب سے اور عمیرہ ام سعد بنت کعب سے، اور وہ یعلی بنؓ منیہ صحابی کی بہن نفیسہ بنتؓ منیہ سے جو صحابیہ تھیں، روایت کرتے ہیں، واقدی کی بے اعتباری تو محتاج بیان نہیں، اس کے علاوہ موسیٰ بن شیبہ کی نسبت امام ابن حنبل کہتے ہیں "احادیثہ مناکیر" اس کی حدیثیں منکر ہیں، عمیرہ بنت ابن کعب اور ام سعد کا حال نہیں معلوم"

ابن اسحاق، ابن سعد، بیہقی اور ابونعیم میں ہے کہ "قریش نے جب بنو ہاشم کا مقاطعہ

کر کے شعب ابی طالب میں محصور کیا، اور باہم ایک معاہدہ مرتب کر کے خانہ کعبہ میں رکھ دیا، تو چند سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے دیمک کو بھیجا، جس نے کاغذ کو کھا لیا، ایک روایت میں ہے کہ خدا کا نام چھوڑ کر باقی عبارت کو جس میں بنو ہاشم کے مقاطعہ کا عہد تھا، اس نے کھا لیا تھا، اور دوسری روایت میں ہے کہ خدا کا نام کھا لیا تھا، اور بقیہ عبارت چھوڑ دی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے مطلع فرمایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب سے اس کا ذکر کیا، ابو طالب نے قریش کو اس کی خبر کی، اور بالآخر اس واقعہ کے جھوٹ اور سچ ہونے پر معاہدہ باقی رہنے یا ٹوٹ جانے کا فیصلہ قرار پایا، کفار نے جب کاغذ کو اتار کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تصدیق ہو گئی۔

ابن اسحاق کی روایت بے سند ہے، بقیہ تمام روایتیں یا واقدی اور ابن لہیعہ سے ہیں، جن کا اعتبار نہیں، اور یا ثقات سے ہیں، تو وہ تمامتر مرسل ہیں، ان مرسل روایتوں میں اگر کوئی بہتر روایت ہے تو وہ بیہقی میں موسیٰ بن عقبہ کی ہے، جو امام زہری سے اس کو روایت کرتے ہیں، مگر وہ زہری تک پہنچ کر رہ جاتی ہے کسی صحابی تک نہیں پہنچتی۔

۲۹۔ مشہور ہے کہ ہجرت میں جب آپ نے غار ثور میں پناہ لی، تو خدا کے حکم سے فوراً غار کے منہ پر ببولے یا ببول کا درخت اُگ آیا جس کی ڈالیاں پھیل کر چھا گئیں، کبوتر کے ایک جوڑے نے آکر وہاں انڈے دیدیے، اور مکڑی نے جالے تن دیے، تاکہ مشرکین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کے اندر ہونے کا گمان نہ ہو، درخت کے اگنے، کبوتر کے انڈے دینے، مکڑی کے جالا تننے، ان تینوں کا ذکر صرف ابو مصعب مکی کی روایت میں ہے، بقیہ روایتوں میں

صرف کبوتروں کے انڈے دینے اور مکڑی کے جالا تننے کا بیان ہے، بہرحال یہ واقعہ کتب سیر میں ابن اسحاق، ابن سعد، دلائل بیہقی اور ابونعیم میں، اور کتب حدیث میں سے ابن مردویہ اور بزار میں ہے، ابن مردویہ، بزار اور بیہقی میں جو روایت ہے، نیز ابن سعد اور ابونعیم کی ایک ایک روایت ابومصعب مکی سے ہے، جو متعدد صحابہ سے اس واقعہ کا سننا ظاہر کرتا ہے، ابومصعب سے عون بن عمرو القیسی اس کی روایت کرتا ہے، لیکن یہ دونوں صاحب پایہ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں، ابومصعب مکی مجہول ہے، اور عون بن عمرو کی نسبت ابن معین کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں، امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ "منکرالحدیث اور مجہول ہے"، ابونعیم میں عون بن عمرو کے بجائے عوین بن عمرو القیسی لکھا ہے، یہ عوین بن عمرو بھی بے اعتبار ہے، عقیلی نے اس کا ضعفاء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اس کی روایتوں کی تصدیق نہیں ہوتی، اور اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ ابومصعب مجہول ہے"[1]

استاذ مرحوم نے سیرت جلد اول واقعۂ ہجرت میں صرف ابومصعب کی روایت پر تنقید کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ابومصعب کے علاوہ اور دوسرے سلسلوں سے بھی یہ مروی ہے، چنانچہ ابن سعد نے ایک اور طریقہ سے اس واقعہ کی روایت کی ہے، مگر اس روایت کا سرسلسلہ واقدی ہے، جس نے متعدد روایتوں کو یکجا کرکے ان کی ایک مشترک روایت ہجرت تیار کی ہے، اس واقعہ کی بہترین روایت وہ ہے جو مسند ابن حنبل میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں،

---

[1] دیکھو لسان المیزان ترجمہ ابومصعب مکی و عون بن عمرو، اور میزان الاعتدال ترجمہ عون بن عمرو اور عوین بن عمرو،

فمروا بالغار فرأوا على بابه	کفار آپ کی تلاش میں غار کے منہ تک
نسج العنکبوت فقالوا لو دخل	پہنچ گئے، دیکھا کہ منہ پر مکڑی کے جالے ہیں
ھٰھنا لم یکن نسج العنکبوت	تو انھوں نے کہا کہ اگر محمد اس کے
علیٰ بابه (جلد اول ص ۳۴۸)	اندر جاتے تو یہ جالے نہ ہوتے

لیکن ان الفاظ سے اس واقعہ کا غیر معمولی ہونا ظاہر نہیں ہوتا، البتہ اس روایت کی بنا پر اس کو تائیدات میں جگہ دی جا سکتی ہے، تاہم یہ روایت بھی قوی نہیں، اس کے راوی مقسم ہیں، جو اپنے کو مولی ابن عباسؓ کہتے ہیں، اور ان سے عثمان الجزری نام ایک شخص روایت کرتا ہے، مقسم کی اگرچہ متعدد محدثین نے توثیق کی ہے، اور امام بخاری نے صحیح میں ان سے حجامت کی روایت نقل کی ہے، مگر وہ خود کتاب الضعفاء میں ان کو ضعیف کہتے ہیں، ابن سعد نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے، ساجی نے لکھا ہے کہ لوگوں نے ان کی روایت میں کلام کیا ہے،" ابن حزم نے لکھا ہے کہ" وہ قوی نہیں"۔ اور عثمان الجزری جو عثمان بن عمرو بن ساج الجزری ہے، اور کہیں عثمان بن ساج کے نام سے مشہور ہے،" گو ابن حبان نے اپنے مشہور تساہل کی بنا پر اس کو ثقات میں داخل کیا ہے، مگر محدث ابو حاتم کہتے ہیں کہ" اسکی حدیث لکھی جائے، حجت میں پیش نہ کی جائے"، علامہ ذہبی میزان میں، اور حافظ ابن حجر نے لسان میں صرف ابو حاتم کا قول نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت محدثین کا آخری فیصلہ یہی ہے،

۳۰۔ روایتوں میں ہے کہ اسی سفر میں راہ میں ایک جگہ بکریوں کے ایک چرواہے

آپ نے دودھ طلب کیا، اس نے معذرت کی کہ کوئی دودھ والی بکری نہیں لیکن آپ نے اس کی اجازت سے ایک دودھ والی بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا، فوراً دودھ نکل آیا، چنانچہ سب نے دودھ پیا، چرواہا یہ دیکھکر مسلمان ہوگیا،

ایک روایت میں ہے کہ یہ چرواہا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ تھے، لیکن عام معجزات کے تحت میں ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا واقعہ زمانۂ ہجرت کا نہیں، بلکہ وہ کسی اور زمانہ کا ہے، عبد اللہ بن مسعودؓ کا واقعہ مسند طیالسی اور مسند احمد میں خود حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی زبانی صحیح روایات کے ساتھ مذکور ہے، مسند ابو یعلیٰ، مستدرک حاکم، اور طبرانی میں بجائے عبد اللہ بن مسعودؓ کے صرف "عبد" یعنی ایک غلام کا ذکر ہے، جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، صحابہ میں سے اس کے راوی قیسؓ بن نعمان سکونی ہیں، یہ صرف ایک دفعہ ایک وفد کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، اور ان سے صرف یہی ایک روایت مروی ہے، بعضوں نے ان سے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے، مگر ظاہر ہے کہ وہ شریکِ واقعہ نہ تھے، انھوں نے یہ واقعہ کس سے سنا؟ معلوم نہیں، اس لیے یہ روایت مرسل ہے، اس کے ایک راوی عبید اللہ ابن ایاد بن لقیط کی، گو اوروں نے توثیق کی ہے، مگر بزار نے لکھا ہے کہ "وہ قوی نہیں" تاہم ذہبی نے تلخیص مستدرک (جلد ۳ ص ۹) میں اور حافظ ابن حجر نے اصابہ (ترجمہ قیسؓ بن نعمان سکونی) میں اسکو صحیح کہا ہے، مگر یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ خود حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جو واقعہ ہجرت کی مفصل روایت صحیحین میں ہے، اس میں ایک غلام کے بکری کے دودھ پلانے کا واقعہ مذکور نہ

مگر اس معجزہ کا وہاں نام ونشان بھی نہیں ،

ہجرت کے موقع پر بے دودھ والی بکری کے تھنوں میں دودھ پیدا ہو جانے کا مشہور ترین معجزہ اُمّ معبد کے خیمہ کا ہے ، کہتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کی راہ میں قبیلۂ خزاعہ کے ایک خاندان کا میدان میں خیمہ تھا ، ام معبد اور ابو معبد میاں بیوی اس خیمہ میں رہتے تھے ، اور مسافروں کو آرام پہنچایا کرتے تھے ، بکریوں کی پرورش پر ان کا گذارہ تھا ، صبح کو ابو معبد تمام اچھی اور دودھ والی بکریاں لے کر چراگاہ کو نکل گیا تھا ، صرف بے دودھ والی دبلی بکریاں خیمہ میں رہ گئی تھیں ، اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا اُدھر سے گذر ہوا ، کھانے پینے کی کچھ چیزیں آپ نے بقیمت طلب کیں ، جو نہیں ملیں ، خیمہ کے ایک گوشہ میں ایک بکری نظر آئی ، آپ نے پوچھا کہ ام معبد یہ بکری کیسی ہے ؟ اس نے کہا یہ لاغری سے بکریوں کے ساتھ نہ جاسکی ، پھر فرمایا کہ اس کے کچھ دودھ ہے ؟ جواب دیا یہ دودھ سے معذور ہے ، راوی کا بیان ہے کہ امسال خشک سالی تھی ، اور لوگ قحط میں مبتلا تھے ، فرمایا کہ مجھے اس کے دوہنے کی اجازت ہے ؟ عرض کی میرے ماں باپ قربان اگر اسکے دودھ ہو تو دودھ لیجئے ، آپ نے دعا فرمائی اور پھر بسم اللہ کہکر تھن میں ہاتھ لگایا ، فوراً اس کے تھنوں میں دودھ اتر آیا ، دودھ سب نے پی لیا ، اور کچھ بچ گیا ، اور قافلۂ نبویؐ آگے روانہ ہوا کچھ دیر کے بعد ابو معبد آیا ، دیکھا کہ گھر میں دودھ رکھا ہے ، تعجب سے پوچھا ، یہ دودھ کہاں سے آیا بکریاں تو سب میرے ساتھ تھیں ، ام معبد نے سارا قصہ بیان کیا ، ابو معبد نے کہا ذرا اس شخص کی صورت وشکل بیان کرو ، ام معبد نے نہایت تفصیل سے آپ کے حسن وجمال اور شکل وشمائل کی تصویر کھینچی جس کو سن کر ابو معبد نے کہا یہ تو خدا کی قسم قریش والا آدمی معلوم ہوتا ہے جس کا کچھ حال

میں سن چکا ہوں میری آرزو ہے کہ مجھے اس کی صحبت میسر ہوتی، اور جب انشاء اللہ موقع مل گیا میں یہ کروں گا، اسی وقت مکہ میں کچھ اشعار غیب سے سنے گئے، یہ اشعار بھی روایت میں ہیں، ان اشعار میں ام معبد کے اسی واقعہ کا بیان ہے، حضرت حسانؓ نے جب ہاتف کی یہ آواز سنی تو ان اشعار کے جواب میں یہ اشعار کہے (یہ جوابی اشعار بھی روایت میں مذکور ہیں)

یہ روایت بغوی، ابن شاہین، ابن سکن، ابن مندہ، طبرانی، بیہقی، ابونعیم اور حاکم میں، ام معبد کے بھائی حبیش بن خالد کی زبانی مذکور ہے، اور حاکم نے نہ صرف یہ کہ اس کو صحیح کہا ہے بلکہ اور دیگر طریقوں سے بھی اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر معلوم ہے کہ حاکم کے صحیح کہنے کی علماء کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں، چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کردی ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کے شرائط کے مطابق نہیں" حافظ ذہبی نے مجملاً اسی قدر لکھا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت حاکم کے علاوہ اور کتابوں میں بھی اس سلسلۂ سند سے مذکور ہے، اور وہ یہ ہے کہ حزام اپنے باپ ہشام سے اور ہشام اپنے باپ حبیش بن خالد خزاعی سے ناقل ہیں، حزام مجہول ہیں، حبیش بن خالد سے صرف یہی ایک روایت تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، حبیش اصل واقعہ کے وقت موجود نہ تھے، معلوم نہیں انھوں نے کس سے سنا، اس لیے یہ روایت اگر ثابت بھی ہو تو مرسل ہے، حاکم نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، ایک انہی حزام اور ہشام بن حبیش کے ذریعہ سے اور دوسرے حر بن صباح سے اور وہ ام معبد کے شوہر ابو معبد سے راوی ہیں، پہلے طریقہ میں حاکم نے یہ کمال کیا ہے کہ حبیش کے بجائے خود ہشام ابن حبیش بن خویلد (بجائے خالد) کو اصل راوی اور صحابی قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ اس طریق

سے روایت کا ارسال اور بڑھ گیا، ہشام کا صحابی ہونا بھی مشکوک ہے، دوسرے طریقہ میں حر بن صباح گو ثقہ ہیں، مگر ابو معبد سے ان کی سماعت ثابت نہیں، چنانچہ ابن حجر نے تہذیب میں لکھا ہے کہ حر ابو معبد سے مرسل روایتیں کرتے ہیں، یہ تو ان تمام روایتوں کے اوپر کے راویوں کا حال ہے، نیچے کے راویوں میں اکثر مجہول لوگ ہیں، حر والی روایت میں نیچے ایک شخص محمد بن بشر سکری ہے، جس کو ازدی نے منکر الحدیث اور ابن عدی نے واہی کہا ہے[1]۔ ابو نعیم نے دلائل میں ایک اور صحابی سلیط ابو سلیمان انصاری بدری سے اس کی روایت کی ہے، سلیط سے ان کے بیٹے سلیمان اور ان سے ان کے بیٹے محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری روایت کرتے ہیں لیکن ان سلیط کا نام صرف اسی روایت کے راوی کی حیثیت سے بعض مؤلفین سیر صحابہ نے کیا ہے، ورنہ ان کا کوئی حال ہم کو معلوم نہیں، سلیط انصاری بدری جو مشہور ہیں، وہ سلیط بن قیس انصاری خزرجی بدری ہیں، ان کے بیٹے کا نام عبداللہ تھا جن سے کو نسل چلی نہیں، لیکن ان سے روایت نسائی میں موجود ہے، مگر سلیط ابو سلیمان انصاری بدری سے کوئی روایت اس کے سوا موجود نہیں، اسی لیے اسماء رجال صحابہ کے مؤلفین میں سے بعض نے ان کو اور سلیط بن قیس انصاری بدری کو ایک سمجھا ہے، اگر ایسا ہے تو سلیمان ان کے بیٹے اور محمد ان کے پوتے کا نام نہ تھا، اور اگر وہ نہیں تو اصحاب بدر کے نام سب گنے ہوئے ہیں، ان میں سلیط بن قیس خزرجی کے سوا کوئی دوسرا سلیط نام نہیں، پھر یہ مدینہ کے باشندہ تھے، اور ام معبد قبیلہ خزاعہ کی تھی، جو مکہ اور مدینہ کے بیچ میں آباد تھا معلوم نہیں کہ سلیط انصاری

[1] لسان المیزان ترجمہ محمد بن بشر بن ابان السکری

نے کس سے سنا؟ پھر اُن کے بیٹے سلیمان اور پوتے محمد سے ہم کو کوئی واقفیت نہیں،
حافظ ابن حجر لسان المیزان میں محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری کے تحت میں لکھتے ہیں:

قال العقیلی مجھول بالنقل رُوی عن ابیہ عن جدہ فذکر قصۃ
ام معبد..... وھو واہٍ وقال لیس ھذا الطریق محفوظاً فی
حدیث اُمّ معبد..... قال ابن مندہ مجھول۔"

علاوہ ازیں ان روایتوں کے الفاظ ام معبد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باہم طرز تخاطب اور اشعار کی زبان اور ابو معبد کی گفتگو میں ایک خاص غرابت ہے جس کو ناقدین حدیث اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہاتف غیب نے تو اشعار مکہ میں لوگوں کو سنائے، اور حسانؓ نے جو ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، مدینہ میں بیٹھے بیٹھے ان کا جواب کہا، ہجرت کے سال میں مکہ کے آس پاس قحط کا پڑنا اور خشک سالی ہونا بھی ثابت نہیں،

مجھے ہجرت کے موقع پر ان دودھ والی روایتوں کے تسلیم کرنے میں اس لیے بھی پس و پیش ہے کہ ہجرت کے رفیقِ سفر حضرت ابوبکرؓ سے واقعاتِ ہجرت کی جو روایت صحیح بخاری میں مذکور ہے، اس میں ایک جگہ ایک چرواہے سے دودھ مانگ کر پینے کا ذکر موجود ہے، مگر اس معجزہ کا مطلق ذکر نہیں ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرؓ کی زبانی یہ قصہ ان الفاظ میں مذکور ہے، "دفعۃً ایک چرواہا نظر آیا، جو اپنی بکریوں کو ہانکے لیے جا رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا تم کس کے غلام ہو؟ اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو میں جانتا تھا، پھر میں نے کہا تمہاری بکریوں کے دودھ ہے؟ اس نے کہا ہاں، میں نے کہا، اپنے ہاتھ اور بکری کے تھن جھاڑ کر

پیالہ میں دودھ تو دودھ، اس نے دوہا تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک برتن میں رکھکر اور تھوڑا پانی ملاکر کہ دودھ ٹھنڈا ہوجائے، آپ کے پاس لایا، آپ نے نوش فرمایا"[1]

مدینہ پہنچکر مسلمانوں کی ایک اجتماعی زندگی شروع ہوگئی تھی، اور خلوت وجلوت میں ہر موقع پر جان نثاروں کا ہجوم رہتا تھا، اس لیے آپ کے واقعات وسوانح کا ایک ایک حرف پہلے سے زیادہ روشن ہوجاتا ہے، اس بنا پر اس زمانہ کے دلائل ومعجزات زیادہ محفوظ طریقہ سے احادیث میں مذکور ہیں، اور اس عہد کے متعلق جو غلط اور مشتبہ روایات بعد کو پیدا ہوئی ہیں، محدثین نے موضوعات میں علانیہ ان کی پردہ دری کر دی ہے[2]، اس لیے فن موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ان کی تفصیل موجود ہے، مثلاً

۱- وہ تمام روایتیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ سے حضرت آمنہ یا کسی اور مردہ کے زندہ ہونے کا بیان ہے، وہ سب جھوٹی اور بنائی ہوئی ہیں،

۲- وہ معجزے جن میں گدہے، اونٹ، بکری، ہرن، گوہ، بھیڑیے شیر وغیرہ جانوروں کے انسانوں کی طرح بولنے یا کلمہ پڑھنے کا ذکر ہے، بروایت صحیحہ ثابت نہیں ہیں[3]

---

[1] صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین [2] علامہ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ کی پانچویں جلد میں ان روایتوں کو مع تنقید کے جمع کردیا ہے [3] یعنی ضعیف روایتوں میں گو یہ آیا ہے لیکن ان کو صحیح کا درجہ حاصل نہیں، ان روایتوں میں سے ایک بھیڑیے کے بولنے کا قصہ زیادہ مشہور ہے، جو دلائل بیہقی، مسند احمد، حاکم اور ترمذی میں بطرق متعددہ مذکور ہے، جن میں سب سے قوی حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے بشرط مسلم کہا ہے (مستدرک ج ۴ ص ۴۶۷) لیکن امام بخاری نے کہا ہے کہ اسکی سند قوی نہیں (زرقانی علی المواہب ج ۵ ص ۱۹۳)

۳۔ ایسی روایتیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آسمان سے خوانِ نعمت یا جنت سے میووں کے آنے کا ذکر ہے موضوع ہیں، یا ضعیف ہیں،[۱]

۴۔ وہ روایتیں جن میں حضرت خضرؑ یا الیاسؑ سے ملنے یا اُن کے سلام و پیام بھیجنے کا بیان ہے، صحت خالی ہیں،

۵۔ عوام میں مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا، لیکن یہ کسی روایت سے ثابت نہیں ہے،

۶۔ روایت ہے کہ آپ قضائے حاجت سے واپس آتے تھے تو وہاں کوئی نجاست باقی نہیں رہتی تھی، یہ سرتاپا موضوع ہے۔

۷۔ واعظوں میں مشہور ہے کہ ابوجہل کی فرمائش سے اس کے ہاتھ کی کنکریاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ سے کلمہ پڑھنے لگیں، لیکن یہ ثابت نہیں،

۸۔ وہ تمام حکایات جن سے ہماری زبان میں کتب **وفات نامہ** اور **مہر نبی نامہ** ترتیب پائی ہیں، تمام تر جھوٹی ہیں،

۹۔ ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ حضرت علیؓ کے زانو پر سر رکھکر آرام

---

[۱] اس قسم کی ایک روایت احمد ج ۴ ص ۱۰۳، دارمی ص ۱۲، نسائی، حاکم، بزار، ابویعلی اور طبرانی میں سلمہ بن نفیل سکونی سے مروی ہے، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے، لیکن ذہبی نے اس کے استدراک میں اس کو سند صحیح کہا ہے، لیکن غرائب صحاح میں قرار دیا ہے (مستدرک حاکم ج ۴ ص ۴۴۷ و ۸۰۴ و خصائص کبریٰ سیوطی ج ۲ ص ۵۶ حیدرآباد)

فرمارہے تھے، آفتاب ڈوب رہا تھا، اور نمازِ عصر کا وقت ختم ہورہا تھا، لیکن حضرت علیؓ نے ادباً آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا، جب آفتاب ڈوب گیا تو دفعۃً آپ بیدار ہوئے اور دریافت فرمایا کہ تم نے نماز پڑھی، عرض کی نہیں، آپ نے دعا کی، فوراً آفتاب لوٹ کر نکل آیا، یہ روایت بھی صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے،[1]

۱۰- ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک اس قدر روشن تھا کہ اندھیرے میں آپؐ جاتے تھے تو اجالا ہوجاتا، چنانچہ ایک دفعہ رات کو حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے سوئی گر گئی، تلاش کی نہیں ملی، دفعۃً آپ تشریف لے آئے تو چہرۂ مبارک کی روشنی میں سوئی چمک اٹھی اور مل گئی، یہ بالکل جھوٹ ہے،

گو ان میں سے بعض روایتوں کو اہل سیر اور مصنفین نے فضائل نبوی میں اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، مگر اس سے ان کی صحت ثابت نہیں ہوتی، اور اگر ان میں کوئی روایت سنداً صحیح ثابت ہوجائے، تو اس خاکسار ہیچمدان کو اس کے قبول میں کوئی عذر نہیں، وفوق کل ذی علم علیم

---

[1] بعض علمائے اہل سنت مثلاً قاضی عیاض، ابو حفص طحاوی اور عام علمائے روافض نے اس روایت کے ضعف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، مگر عام ائمہ رجال کا رجحان اس روایت کے موضوع یا کم از کم ضعیف ہونے کی طرف ہے، ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ حافظ مزی اور امام ذہبی نے بھی اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے (البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۲۸۲)

ان روایتوں کی تنقید سے غرض نعوذ باللہ فضائل نبویؐ میں کلام نہیں ہے بلکہ یہ اعتقاد ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی طرف جو بات منسوب کیجائے وہ ہر طرح صحیح ہو۔[1]

---

[1] اس کتاب کی تصنیف کے برسوں بعد حافظ ابن کثیر کی کتاب البدایہ والنہایہ مصر سے چھپ کر آئی ہے جو سیرت پر بڑی مفصل کتاب ہے، اس کی چھٹی جلد میں حافظ موصوف نے معجزات نبویہ کی ہر قسم کی روایتوں کو جمع کر دیا ہے، اور ان پر کلام بھی کیا ہے، اور اُن کے اسناد کی جرح و تعدیل بھی کی ہے، اہل تحقیق حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں۔

بشارات

يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ (اعراف)

جس پیغمبر کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ میں یہ خیال ہے کہ کسی پیغمبر کا دعوائے نبوت اُس وقت تک مسلّم نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ پہلے پیغمبروں نے اس کی آمد کی پیشنگوئی کی ہے، اور جو اس کی نشانیاں بتائی ہیں، وہ مدعیِ نبوت میں پائی جاتی ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی وہ اسی معیار پر پرکھتے تھے، اور بہت سے یہود و نصاریٰ جن کو اس معیار سے تشفی کی دولت حاصل ہوئی، وہ علی الاعلان ایمان لائے، اور جو اپنی کمزوری سے اپنے ایمان کا اعلان نہ کر سکے، انھوں نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا، لیکن جن کے قلوب عناد و تعصب کے گرد و غبار سے تیرہ و تار تھے، وہ اس ظلمات سے باہر نہ آسکے، اور آبِ حیات کا سرچشمہ ان کے ہاتھ نہ آسکا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے جواب میں فرمایا ہے کہ "میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت ہوں[1]"۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ فضائل نبوی و ابن سعد جزء اول [2] صفحات ذیل میں صرف ان ہی بشارات سے بحث ہے جن کے حوالے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔

جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پائی تو مقدس باپ بیٹوں نے مل کر دعا مانگی کہ ہماری اولاد میں ایک پیغمبر اس سرزمین میں مبعوث ہو۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ
فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ
اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ
عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۞ وَاِذْ جَعَلْنَا
الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَ
اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى
وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ
الْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاِذْ
قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا
بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ
الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ
قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ

اور یاد کرو جب ابراہیم کے پروردگار نے ابراہیم
کا چند باتوں میں امتحان لیا پس ابراہیم نے
ان کو پورا کیا۔ خدا نے کہا کہ اے ابراہیم میں تم کو
لوگوں کا پیشوا بناؤں گا، ابراہیم نے کہا اور
میری اولاد میں سے، خدا نے کہا میرا وعدہ
گنہگار نہ پائیں گے، اور یاد کرو، جب ہم نے
کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا، اور
حکم دیا کہ ابراہیم کے قیام گاہ کو نماز کی جگہ
مقرر کرو اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو فرمایا کہ میرے
گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع سجدہ
کرنے والوں کے لیے پاک صاف کرو، اور یاد
کرو جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار!
اس (مکہ) کو امن کا شہر بنا، اور اس کے رہنے والوں
میں سے جو خدا اور آخرت پر یقین رکھتے تھے
ان کو پھل روزی دے، خدا نے کہا جو ان میں سے

الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ
مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا
وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

(بقرہ - ۱۵)

خدا کا منکر ہوگا، اس کو بھی ہم دنیا کی چند روزہ
زندگی میں بہرہ مند کرینگے، پھر اسکو مجبور کر کے
عذاب دوزخ میں لیجائیں گے، اور بہت برا
ٹھکانا ہی، اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل
خانہ کعبہ کی بنیاد رکھ رہے تھے تو انھوں نے دعا کی
خداوندا ہماری یہ خدمت قبول کر، تو ہی دعا کا
سننے والا ہی، نیتوں کا جاننے والا ہے خداوندا!
ہم کو اپنا فرماں بردار بنا، اور ہماری نسل
میں بھی ایک گروہ اپنے فرمانبرداروں کا
پیدا کر اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے سکھا ہم سے
درگذر کر، تو ہی بڑا درگذر کرنے والا اور مہربان
ہے، خداوندا! ان ہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کر
جو انکو تیری آیتیں پڑھکر سنائے اور کتاب اور حکمت
سکھائے اور انکا تزکیہ کرے، تو غالب و حکمت والا ہے،

ان آیات میں بتصریح یہ بتایا گیا ہی کہ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل نے مل کر خدا کے حضور میں دعا
کی کہ اس شہر میں ہماری نسل سے ایک پیغمبر مبعوث فرما، چونکہ مقام بعثت مکہ مقرر کیا گیا اور دعا
میں حضرت اسمٰعیلؑ کی بھی شرکت تھی، اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دعا کا مقصود

یہ تھا کہ یہ پیغمبر نسلِ اسمٰعیلؑ سے ہوگا، اور مکہ میں اس کی بعثت ہوگی،

موجودہ توراۃ کی کتاب پیدائش باب ۱۶ کے آخر اور باب ۱۷ کے اول میں بھی کچھ اس کے اشارات پائے جاتے ہیں،

اور ہاجرہ ابرام کے لیے بیٹا جنی، اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیل (خدانے دعا سنی) رکھا، (پید: ۱۶: ۱۵)

جب ابراہیم ننانوے برس کا ہوا، تب خداوند ابرام کو نظر آیا، اور اس نے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں، تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو، اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے نہایت بڑھاؤں گا، تب ابرام منہ کے بل گرا، اور خدا اس سے ہمکلام ہوکر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں ہوں، تیرا عہد ہے، میرے ساتھ ہے، اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا، اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائیگا، بلکہ تیرا نام ابراہام ہوگا، کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا، اور میں تجھے بہت پھلدار کروں گا اور قومیں تجھ سے پیدا ہوں گی، اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے، اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان، ان کے پشت در پشت کے لیے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے کرتا ہوں، کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوں گا، اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے ملک ہو، اور میں ان کا خدا ہوں گا" (پید: ۱۷: ۱ تا ۸)

خدا کا حضرت ابراہیمؑ سے یہ عہد حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے بعد ہی اور حضرت اسحٰقؑ

کی ولادت سے پہلے ہوتا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بشارت اسمٰعیلؑ کے لیے ہے، اسحٰقؑ کے لیے نہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحٰقؑ کی بشارت دی، حضرت ابراہیمؑ کو وہم ہوا کہ اس نئی بشارت سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ اسمٰعیلؑ زندہ نہ رہیں گے اور وہ عہد اسحٰق کے ساتھ پورا ہوگا، فوراً بارگاہ الٰہی میں عرض کی،

"کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔" (پیدائش ۱۷-۱۸)

خدا نے جواب دیا:-

"اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اُسے برکت دوں گا اور اسے بارور کروں گا، اور اسے بہت بڑھاؤں گا، اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے۔ اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔" (پید ۱۷: ۲۰)

حضرت ہاجرہؑ جب حاملہ ہونے کے بعد حضرت سارہؑ سے خفا ہو کر بیر سبع چلی گئیں تو فرشتہ نے آواز دی" میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سن لیا۔" (پید ۱۶: ۱۰)

حضرت ابراہیمؑ نے جب حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو فاران (مکہ) کے بیابان میں رخصت کیا اور مشکیزہ کا پانی چک گیا، اور حضرت ہاجرہؑ نے گریہ وزاری شروع کی۔

"تب خدا نے اس لڑکے (اسمٰعیل) کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے،

خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا، اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کریں اس کو ایک
بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں، اور اس نے پانی کا ایک کنوا اں
(بیرزمزم) دیکھا..... خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑھا اور بیابان (عرب[1])
میں رہا.... اور وہ فاران کے بیابان[2] میں رہا۔" (پیدائش ۲۱، ۱۷ تا ۲۱)

موجودہ توراۃ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش اور ان کی نسل کی برومندی، کثرت اور برکت، اور ان کی نسل کے بارہ سرداروں کے پیدا ہونے کی بشارتیں مذکور ہیں، اور ان سے قرآن مجید کے بیان کردہ دعاء ابراہیمی اور عہد الٰہی کی تائید ہوتی ہے، الغرض اسی لیے روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "میں تمھیں بتاؤں کیا ہوں؟ "انا دعوة ابی ابراهیم" میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں[3]۔"

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی نسل میں جس رسول کے پیدا ہونے کی دعا مانگی تھی، اسکے اوصاف یہ گنائے تھے،

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا	اے ہمارے خداوند! ان میں (یعنی اسمٰعیل کی
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ	اولاد میں) ایک پیغمبر کو مبعوث کر جو ان کو
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	تیرے احکام پڑھکر سنائے اور انکو کتاب و حکمت
وَيُزَكِّيهِمْ (بقرہ - ۱۵)	کی تعلیم دے اور ان کو پاک و صاف کردے،

[1] عرب کے لفظی معنی بیابان کے ہیں [2] قرآن مجید نے اس کو "وادِ غیرذی زرع" بن کھیتی کے میدان سے تعبیر لیا ہے [3] طبقات ابن سعد و مستدرک حاکم۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی اوصاف ظاہر کیے ہیں،

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	اُسی خدا نے ان پڑھوں میں ان ہی کی قوم
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ	سے ایک پیغمبر مبعوث کیا، جو ان کو خدا کے
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	احکام پڑھکر سناتا ہے، اور انکو پاک صاف کرتا ہے،
وَالْحِكْمَةَ (جمعه)	اور انکو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے،
لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ	خدا نے مومنوں پر یقیناً یہ احسان کیا کہ ان
إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ	میں ایک پیغمبر خود ان ہی کی قوم سے مبعوث
أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ	کیا، جو ان کو خدا کے احکام سناتا ہے،
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	اور ان کو پاک کرتا ہے، اور ان کو کتاب
وَالْحِكْمَةَ (آل عمران)	وحکمت کی تعلیم دیتا ہے،

اس سے یہ اشارہ صاف واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا مظہر ہے،

حضرت عیسیٰؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بشارت دی ہے، وہ اس سے بھی زیادہ صاف ہے،

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي	اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل!
إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم	میں تمھارے پاس خدا کا قاصد بن کر، اور مجھ
مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ	سے پہلے جو توراۃ آئی، میں اس کی تصدیق

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (صف) — کرتا ہوا، اور اپنے بعد احمد نام ایک پیغمبر کی خوشخبری لے کر آیا ہوں،

انجیل یوحنا باب ۱۴ میں ایک آنے والے کی بشارت ان الفاظ میں ہے :-

"اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا، اور وہ تمھیں دوسرا "فارقلیط" بخشے گا کہ ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے۔" (۱۴-۱۶)

آگے بڑھ کر پھر ہے :-

"لیکن وہ "فارقلیط" جو روح القدس ہے، جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب چیزیں سکھائیگا، اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے کہی ہیں تمھیں یاد دلائیگا۔" (۱۴-۲۶)

اسی انجیل کے باب ۱۵-۲۶ میں ہے،

"پر جب وہ "فارقلیط" جسے میں تمھارے لیے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی روح جو باپ سے نکلتی ہے، تو وہ میرے لیے گواہی دے گا۔"

اسی انجیل کے باب ۱۶-۷ میں ہے :-

"لیکن میں تمھیں سچ کہتا ہوں کہ تمھارے لیے میرا جانا ہی فائدہ ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو "فارقلیط" تمھارے پاس نہ آئے گا، پر اگر میں جاؤں تو میں اُسے تمھارے پاس بھیج دوں گا، اور وہ آن کر دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے قصوروار ٹھیرائے گا۔ گناہ سے اسلیے کہ اس جہان کے سردار پر حکم کیا گیا ہے کہ میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمھیں کہوں، پر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن

جب وہ سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمھیں ساری سچائی کی بات بتائیگی، اسلیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنیگی سو کہے گی، اور تمھیں آیندہ کی خبر دے گی، وہ میری بزرگی کرے گی، اس لیے کہ وہ میری چیزوں سے پائیگی اور تمھیں دکھائے گی"۔

انجیل کی ان آیتوں میں حضرت عیسیٰؑ نے جس آنے والے پیغمبر کی بشارت بار بار دی ہے اس کو لفظ "فارقلیط" سے تعبیر کیا ہے، یہ لفظ عبرانی یا سریانی ہے جس کے لفظی معنی ٹھیک محمد اور احمد کے ہیں، یونانی کے قدیم تراجم میں اس کا ترجمہ "پیریکلیو طاس" کیا گیا تھا جو بعینہٖ فارقلیط اور احمد کا ہم معنی ہے، مگر یہ دیکھکر کہ اس سے اسلام کی تصدیق ہوتی ہے، ذرا سے تغیر سے "پیریکلیو طاس" کے بجائے "پیریکلیطاس" کر دیا گیا ہے جس کا ترجمہ اب عام طور "تسلی دہندہ" کیا جاتا ہے، عیسائی اور مسلمان علما کے درمیان اس لفظ کی تحقیق پر سینکڑوں برس سے مناظرہ قائم ہے، اور مسلمان علمانے خود قدیم عیسائی علما کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح لفظ "پیریکلیو طاس" ہے، سب سے زیادہ سیدھی بات یہ ہے کہ یہ فقرے حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے نکلے تھے، اُن کی زبان سریانی آمیز عبرانی تھی، یونانی نہ تھی، اس لیے جو لفظ انکی زبان سے نکلا ہوگا، وہ عبرانی یا سریانی ہوگا، اس لیے یہ بالکل صاف ہے کہ انھوں نے فارقلیط کا لفظ کہا ہوگا، جو احمد یا محمد کا مرادف ہے، جیسا کہ اوپر کی آیت میں قرآن کا دعوی ہے،[1]

گذشتہ صفحات میں یہ کہیں ثابت کیا جاچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ و انجیل کی انسانی تعلیم سے قطعاً ناآشنا تھے، بااین ہمہ یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے

[1] خطبات احمدیہ، خطبۂ بشارات محمدی، منقول از گاڈفری ہیگنس صاحب،

اس آنے والے پیغمبر کی جو صفتیں گنائی ہیں، وہ حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں

"لیکن وہ فارقلیط (احمد) جو روح القدس (پاکیزگی کی روح) ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب چیزیں سکھائے گا، اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمھیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا ۱۴-۲۶)

"وہ فارقلیط (احمد.... جو باپ (خدا) سے نکلتی ہے، آئے تو میرے لیے گواہی دے گا۔" (یوحنا ۱۵-۲۶)

"اور وہ (فارقلیط) آن کر دنیا کو گناہ سے، راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائیگا۔ گناہ سے اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے.... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح جب آئے گی تو وہ تمھیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی، اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سنے گی سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔" (یوحنا ۱۶-۸)

انجیل کے ان فقروں میں آنے والے پیغمبر کی یہ صفات گنائی گئی ہیں:۔

۱۔ مسیح کی اصلی تعلیم لوگ بھول جائیں گے، اسلیے وہ پیغمبر آکر اس کو یاد دلائے گا،

۲۔ وہ مسیح کی ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا، اور وہ ساری سچائی کی باتیں بتائیگا اور سب باتوں کی خبر دے گا،

۳۔ مسیح کی عظمت کو دنیا میں قائم کرے گا، اور اُن کی گواہی دے گا، اور ان پر ایمان نہ لانے پر دنیا کو گنہگار ٹھہرائے گا۔"

۴۔ اس کی باتیں خود اس کی نہ ہوں گی، بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے اس کو سنایا جائے گا، وہی کہے گا"

اس صداقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مسیحؑ کی اصلی تعلیم عیسائی بھلا چکے تھے، توحید کی جگہ تثلیث تھی، حضرت عیسیٰؑ کے تعلیمات صادقہ میں ابنیت، الوہیت مسیحؑ، مجسمہ پرستی اور بیسیوں عقائد فاسدہ کا اضافہ کردیا گیا تھا، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات مبارک ہے، جس نے حضرت عیسیٰؑ کی بھلائی باتوں کو پھر یاد دلایا، اور بتایا کہ اُن کی اصلی تعلیم کیا تھی؟ قرآن مجید نے پورے واشگاف طریق سے نصاریٰ کے عقائد فاسدہ اور غلط تعلیمات کی تشریح کی، اور دنیا میں تثلیث کے بجائے توحید کا علم نصب کیا، اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی الوہیت کی تردید کی، اور حضرت عیسیٰؑ کی ابنیت اور انکی حیات و موت کے مسئلہ کو صاف کیا،

اس کے بعد حضرت مسیحؑ نے کہا کہ "وہ میری ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا، یہ خصوصیت بھی خاتم النبیینؐ کے سوا اور کسی پر صادق نہیں آسکتی، مسیح کے اس فقرہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مسیحؑ تک دین الٰہی ناتمام ہے، اور دوسری یہ کہ آیندہ آنے والے پیغمبر کے ہاتھ سے اس کی تکمیل ہوگی، اور وہ سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا، اور ساری باتوں کی خبر دے گا، یہ پیشینگوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے پوری ہوئی، آپ کی ذات سے دین الٰہی تکمیل کو پہنچا، اور آپ نے عقائد، عبادات، اخلاق، احکام، آثار قیامت، جنت، دوزخ، سزا، جزا وغیرہ تمام باتوں کو اس تفصیل، تشریح اور تکمیل کے ساتھ بتایا جس کی مثال دنیا کے کسی پیغمبر

کی تعلیم میں نہیں ملتی، اسی لیے آپ کو خاتم النبیین کا لقب دیا گیا،

حضرت عیسیٰؑ نے اس پیغمبر کی تیسری نشانی یہ بتائی کہ "وہ دنیا میں میری عظمت کو قائم کرے گا، اور میرے لیے گواہی دے گا"۔ یہ نشانی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے سوا کسی اور پر صادق نہیں ہو سکی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنھوں نے آنحضرت عیسیٰ کی اصلی شخصیت اور عظمت کو دنیا میں آشکارا کیا، اور دوستوں اور دشمنوں کی طرف سے اُن پر جو غلط اتہامات قائم کیے گئے تھے، اُن کی پردہ دری کی، اور ان کی نبوت اور رسالت کی گواہی دی، اور ان کی صداقت کو تسلیم کرنا اسلام کا ضروری رکن قرار دیا، ان کے حقیقی اوصاف و محامد کی تصویر کو جسے یہود نے دشمنی سے اور نصاریٰ نے محبت سے دھندلی کر دیا تھا، اپنی روشنی سے اجاگر کر دیا، یہودیوں نے ان پر اور ان کی ماں حضرت مریمؑ پر جو بہتان باندھے تھے، ان کی علی رؤس الاشہاد تردید کر دی، اور نصاریٰ نے اُن کی ولادت، وفات، ابنیت، الوہیت اور تعلیمات پر، وہمی مشرکانہ اعمال و عقائد کا جو پردہ ڈال رکھا تھا، اُس کو چاک کر دیا، اور قرآن کی بیسیوں آیتوں میں نہایت صفائی کے ساتھ اُن امور کی تشریح کی گئی، اور اب کروروں دلوں میں انکی اصلی عظمت اور حقیقی بزرگی کا نقش کندہ ہے،

چوتھی نشانی حضرت مسیحؑ نے یہ بتائی کہ "وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہے گا، بلکہ وہی کہے گا جو اس کو اوپر سنایا جائے گا"۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص وصف ہے، قرآن نے کہا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ ۔۔۔ اور وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا، بلکہ

هُوَى اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى — وہ جو کچھ بولتا ہے، وہی بولتا ہے جو

(نجم - ۱) — اس پر وحی کیجاتی ہے،

حضرت عبداللہ بن عمرؓو بن العاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ارشاد فرماتے تھے، اُس کو لکھ لیا کرتے تھے، لوگوں نے کہا آپ کبھی غصہ میں کچھ کہہ دیتے ہیں، ان کو نہ لکھا کرو، حضرت عبداللہ بن عمرؓو نے جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، آپ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس سے رضامندی اور نارضامندی دونوں حالتوں میں حق اور سچائی کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا، قرآن مجید نے اپنی نسبت بارہا کہا کہ وہ سچائی کی روح ہے، وہ حق ہے، وہ تذکرہ ہے، وہ ہدایت ہے، اور اس کا پیغمبر چراغِ ہدایت ہے، رہنمائے عالم ہے، مذکر (یاد دلانے والا) ہے، اس تفصیل کے بعد کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ حضرت مسیح کی پیشینگوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے حرف بحرف پوری نہیں ہوئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور ہستی نہیں جس پر یہ اوصاف صادق آسکیں، قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشینگوئی توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور ہے، اور یہود و نصاریٰ دونوں اس پیشینگوئی کو جانتے ہیں،

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ — جو لوگ اُس ان پڑھ پیغام رساں قاصد

الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا (اعراف ۱۹) — کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس

عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ — توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں،

انجیل میں گذشتہ بشارت فارقلیط کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو اور بھی

پیشینگوئیاں مذکور ہیں، انجیلِ لوقا میں ہے، حضرت مسیحؑ نے آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے فرمایا:

"دیکھو میں اپنے باپ خدا کے اس موعود کو تم پر بھیجتا ہوں لیکن جب تک عالمِ بالا سے تم کو قوت عطا نہ کی جائے، یروشلم میں ٹھہرو (لوقا ۲۴۔ ۴۹)

اسکی چند سطروں کے بعد لوقا کی انجیل ختم ہو گئی ہے، اور اس موعود کے ظہور کا کوئی ذکر نہیں، وہ رسول موعود کون تھا ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی پیغمبر نہیں ہوا، انجیل کے اس فقرہ میں یہ الفاظ غور کے قابل ہیں کہ حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ اس قوتِ آسمانی کے ظاہر ہونے کے وقت تک شہر یروشلم میں ٹھہرو، اس سے مقصود اس قوتِ آسمانی کے ظہور تک شہر یروشلم محض اقامت نہیں ہے بلکہ یہ مقصود ہے کہ اس رسولِ موعود کے ظہور تک تمھارا کعبہ اور قبلہ بیت المقدس رہے گا لیکن جب وہ آئے گا تو رخ شہر مکہ کی طرف بدل جائے گا، اسی لیے قرآن مجید نے تحویل قبلہ کے موقع پر یہ کہا ہے:۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ	تو تو اپنا منہ مسجد حرام (کعبہ) کی طرف
الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا	پھیر، اور تم جہاں بھی ہو اسی کی طرف
وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ، وَإِنَّ	اپنے منہ پھیرو، اور جو اہل کتاب ہیں
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ	وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے، انکے پروردگار
أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (بقرہ ۱۷)	کی جانب سے ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عیسیٰؑ نے آپؐ کی آمد کی بشارت کس قدر کھلے لفظوں میں دی تھی، اسی لیے احادیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "میں اپنے بھائی عیسیٰ کی بشارت ہوں"۔ انجیل کی دوسری بشارت حضرت یحییٰؑ کے ظہور کے موقع پر مذکور ہے، حضرت یحییٰؑ جب ظاہر ہوتے ہیں، تو لوگ اُن سے پوچھتے ہیں کہ تین آنے والے پیغمبروں میں سے تم کون ہو،

"یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اُس سے پوچھیں کہ تو کون ہے؟ اور اُس نے اقرار کیا، اور انکار نہ کیا، بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انھوں نے اُس سے پوچھا تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ اُس نے کہا میں نہیں ہوں، پس آیا تو "وہ نبی" ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں ...... اور انھوں نے اس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ الیاس اور نہ "وہ نبی" تو کیوں بتپسمہ دیتا ہے"۔ (یوحنا - ۱ - ۱۹)

اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ توراۃ کی پیشینگوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام الیاسؑ اور مسیحؑ تھے، لیکن تیسرے کا نام صرف "وہ نبی" لیا گیا ہے، یہ تیسرا نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون ہے؟ کہ یہود و نصاریٰ دونوں یقین رکھتے ہیں کہ اب مسیحؑ کے سوا کوئی اور آنے والا نہیں۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے، جو نبی اور پیغمبر کے مطلق نام سے دنیا میں مشہور ہے، مسلمان آپ کو "آنحضرت"، وہ حضرت یعنی پیغمبر کہتے ہیں، اور مسیحیوں میں آپ کا نام "دی پرافٹ"

وہ پیغمبر مشہور ہو گیا ہے۔

صحابۂ کرامؓ اور تابعین میں جن لوگوں کو توراۃ سے واقفیت تھی، یا علماے یہود میں سے جو لوگ اسلام لائے تھے ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت گذشتہ صحفِ انبیاءؑ میں مذکور ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کمسن تھے، مگر وہ مطالعۂ کتب کے شائق تھے، اور وہ توراۃ پڑھا کرتے تھے، سورۂ فتح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے:

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا	ہم نے تجھکو گواہ، خوشخبری سنانے والا، اور
وَّنَذِيْرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ خدا اور اس کے
وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ	رسول پر ایمان لاؤ، اور اسکی مدد کرو، اور
بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (فتح - ۱)	اسکی عظمت کرو، اور صبح وشام اسکی تسبیح کرو،

سورۂ احزاب میں کچھ اوصاف اور زیادہ مذکور ہیں،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے پیغمبر! ہم نے تجھکو گواہ، خوشخبری
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا	دینے والا، ڈرانے والا، اور اللہ کی طرف
اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا	اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن
مُّنِيْرًا (احزاب ۶)	چراغ بنا کر بھیجا ہے،

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف گنائے گئے ہیں وہ بعینہٖ توراۃ میں ہیں،

عن عبد اللہ بن عمرو ان ھذہ	عبد اللہ بن عمرو نے کہا کہ قرآن کی یہ آیت کہ اے پیغمبر!
الآیۃ التی فی القرآن یا ایھا النبی	میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا،
انا ارسلنٰک شاھدا و مبشرا	اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا، توراۃ میں یونہی ہو کر
و نذیرا ہ قال فی التوراۃ یا ایھا	اے نبی! میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا
النبی انا ارسلنٰک شاھدا	اور امیوں کا حامی و ملجا بنا کر بھیجا، تو میرا بندہ
و مبشرا و حرزا للامیین انت	ہے اور میرا رسول ہے اور میں نے تیرا نام خدا پر
عبدی و رسولی و سمیتک المتوکل	بھروسہ رکھنے والا رکھا، وہ سخت اور سنگدل
لیس بفظ و لا غلیظ و لا سخاب	نہ ہوگا، اور بازاروں میں وہ شور نہ کرے گا،
بالاسواق و لا یدفع السیئۃ	وہ برائی کا بدلہ برائی نہ کریگا، بلکہ عفو اور
بالسیئۃ و لکن یعفو و یصفح	درگذر کرے گا، اور اس وقت تک خدا
و لن یقبضہ اللہ حتی یقیم	اس کی روح قبض نہ کرے گا جب تک
بہ الملۃ العوجاء بان یقولوا	اس کے ذریعہ سے وہ کج دین کو سیدھا نہ کریگا،
لا الہ الا اللہ فیفتح بھا	کہ لوگ کہنے لگیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا
اعینا عمیا و اذانا صما	کوئی خدا نہیں، پس وہ اس دین سے
و قلوبا غلفا	اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور نافہم
(بخاری تفسیر سورۃ فتح)	دلوں کو کھول دے گا۔

صحابہؓ کے زمانہ میں کعبؓ ایک مشہور یہودی عالم تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے۔ تفسیر

طبری میں ہے کہ حضرت عطا تابعی نے ان سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بشارت توراۃ میں مذکور ہے، انھوں نے کہا ہاں ہے، اور اس کے بعد انھوں نے توراۃ کی اسی عبارت کا ترجمہ پڑھا، چنانچہ اس وقت توراۃ کے جو نسخے موجود ہیں، ان میں اشعیا نبی کی کتاب میں کسی قدر الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ پیشینگوئی اب تک موجود ہے، اور جس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو اور حضرت کعب نے اسی پیشینگوئی کو اختصار اور اجمال کے ساتھ اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے، اشعیا نبی کی پیشینگوئی یہ ہے:۔

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے، میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا، وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا نہ بلند کرے گا، اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا، وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا، اور دھکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا، وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے، اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اسکی شریعت کی راہ تکیں، خداوند خدا جو آسمانوں کو خلق کرتا اور انھیں تانتا جو زمین کو اور انھیں جو اس سے نکلتے ہیں پھیلاتا، اور ان لوگوں کو جو اس پر ہیں سانس دیتا، اور ان کو جو اس پر چلتے ہیں، روح بخشتا ہے، یوں فرماتا ہے، میں خداوند نے تجھے صداقت کے لیے بلایا، میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا، اور میں تجھکو لوگوں کے لیے عہد اور قوموں کے لیے نور[1] بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور بندھوؤں

---

[1] اس فقرہ کا اردو ترجمہ میرے پیش نظر اردو نسخہ میں صحیح نہ تھا، میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۹۹ء سے درست کیا ہے،

قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں، قید خانہ سے چھڑائے، یہوواہ میں ہوں،
یہ میرا نام ہے، اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا، اور وہ ستایش جو میرے لیے ہوتی
کھودی ہوئی مورتوں کے لیے ہونے نہ دوں گا، دیکھو تو سابق پیشینگوئیاں برآئیں،
اور میں نئی باتیں بتاتا ہوں، اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں،
خداوند کے لیے ایک نیا گیت گاؤ، اے تم جو سمندر پر گذرتے ہو، اور تم جو اس میں بستے ہو،
اے بحری ممالک اور ان کے باشندو تم زمین پر سرتاسر اسی کی ستایش کرو، بیابان اور
اس کی بستیاں قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے، سلع کے بسنے والے ایک
گیت گائیں گے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے، وہ خداوند کا جلال ظاہر
کریں گے، اور بحری ممالک میں اس کی ثناخوانی کریں گے، خداوند ایک بہادر کے مانند
نکلے گا، وہ جنگی مرد کے مانند اپنی غیرت کو اسکائے گا، وہ چلائیگا، ہاں، وہ جنگ کے لیے
بلائے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا، میں بہت مدت سے چپ رہا، میں خاموش ہو رہا،
اور آپ کو روکتا گیا، پر اب میں اس عورت کی طرح جسے دردِ زہ ہو، چلاؤں گا،
اور ہانپوں گا، اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لوں گا، میں پہاڑوں اور ٹیلوں کو
ویران کر ڈالوں گا، اور ان کے سبزہ زاروں کو خشک کروں گا، اور ان کی ندیاں
بسنے کے لائق زمین بناؤں گا، اور تالابوں کو سکھا دوں گا، اور اندھوں کو اس راہ سے
کہ جسے وہ نہیں جانتے لیجاؤں گا، میں انھیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لیجاؤنگا
میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی اور اونچی نیچی جگہوں کو میدان کردونگا، میں ان سے

یہ سلوک کروں گا، اور انھیں ترک نہ کروں گا، وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں
جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں، اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم
ہمارے الٰہ ہو، سنو، اے بہرو! اور تاکو اے اندھو، تاکہ تم دیکھو اندھا کون ہے، مگر میرا
بندہ؟ اور کون ایسا بہرہ ہے جیسا میرا رسول جسے میں بھیجوں گا، اندھا کون ہے،
جیسا کہ وہ جو کامل ہے، اور خداوند کے خادم کی مانند اندھا کون ہے؟ تو نے بہت
چیزیں دیکھی ہیں، پر اُن پر لحاظ نہیں رکھا، اور کان تو کھلے ہیں، پر کچھ نہیں سنتا،
خداوند اپنی صداقت کے سبب راضی ہوا، اور وہ شریعت کو بزرگی دیگا،
اور اُسے عزت بخشے گا۔" (باب ۴۲)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت کعبؓ کی پیش کردہ بشارت میں جو الفاظ ہیں،
وہ حرف حرف اس میں موجود ہیں، پہلا لفظ اس بشارت میں "شاھدا" ہے یعنی خدا کی طرف
سے وہ قوموں کے درمیان گواہ اور شاہد ہوگا، اشعیاء میں ہے، "وہ قوموں کے درمیان عدالت
جاری کرائے گا، اور اُس عدالت کا وہ گواہ ہوگا" اس کے بعد "مبشرا" کی صفت ہے یعنی
وہ نیکوکاروں کو خدا کی بادشاہی کی خوشخبری سنائے گا، اشعیاء کے اس پورے باب میں اس
آنے والے پیغمبر کے یہی اوصاف بیان ہوئے ہیں، بعد ازیں "حرزا للامیین" امیوں کا ماویٰ
اور پناہ ہے، "امی وہ ہیں جن کو اب تک کوئی شریعت نہیں ملی تھی، چنانچہ اشعیاؑ میں ہے
کہ "اس رسول کے ذریعہ سے اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لیجاؤں گا میں
ان ہی رستوں (شریعت) پر جن سے وہ آگاہ نہیں، لے چلوں گا،" (انت عبدی ورسولی

یعنی تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے، اشعیا، کے شروع میں ہے "دیکھو میرا بندہ" اور آخر میں ہے میرا بندہ میرا رسول جسے میں بھیجوں گا"۔ سمّیتک بالمتوکل میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ کرنیوالا رکھا، اشعیا میں ہے "میرا بندہ جس کو میں سنبھالتا ہوں، . . . میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا، اور تیری حفاظت کروں گا"۔ لیس بفظٍ ولا غلیظٍ ولا یدفع السیئۃ بالسیئۃ ولکن یعفوا ویصفح" وہ سنگدل اور سخت نہ ہوگا یعنی کمزوروں اور ضعیفوں کو نہ ستائے گا، اور برائی کا بدلہ برائی نہ دے گا، بلکہ معاف کرے گا، اشعیا تمثیل و استعارہ میں کہتے ہیں" وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا، اور دھیمی بتی کو نہ بجھائے گا، وہ عدالت کو جاری کرائیگا"، ولا صخاب بالاسواق" وہ بازاروں میں نہ چلا جائے گا یعنی وہ متین اور سنجیدہ ہوگا، اشعیا نے کہا" وہ نہ چلائے گا، اپنی صدا نہ بلند کرے گا، اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا، ولن یقبضہ اللّٰہ حتی یقیم بہ الملۃ العوجاء خدا اس وقت تک اس کی روح قبض نہ کرے گا جب تک اسکے ذریعہ سے وہ کج دین کو سیدھا نہ کرالے گا"۔ اشعیا میں ہے اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا، اور نہ مسلا جائے گا، جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا"۔ فیقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تو لوگ کہیں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں"۔ اشعیا، کہتے ہیں" میں خدا (یہوا) اپنی شوکت دوسرے معبودان باطل کو نہ دوں گا، اور وہ ستایش جو میرے لیے ہوتی ہے، کھودی ہوئی مورتوں کے لیے ہونے نہ دوں گا، . . . وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں، جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں، اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو"، فیفتح بہ اعینا عمیا واذانا صما وقلوبا غلفا- وہ اس کے ذریعہ سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں

اور زیر پردہ دلوں کو کھول دیگا"۔ اشعیا کہتے ہیں "لوگوں کے عہد اور قوموں کی روشنی کے لیے تجھے دوں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے، جو بند ہیں، ان کو قید سے نکالے، اور ان کو جو اندھیرے میں ہیں، قید سے نکالے، ...... سنو اے بہرو، تاکو اے اندھو"

حضرت اشعیار کی یہ بشارت حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے حضرت اشعیار نے ان فقروں میں جس نبی کی پیشینگوئی کی ہے، وہ یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں، کہ نہ تو وہ عیسائیوں میں خدا کے "بندہ اور رسول" کی حیثیت سے تسلیم ہوتے ہیں اور نہ وہ ایک جنگی مرد کی طرح دنیا میں آئے، نہ انھوں نے توحید کو دنیا میں قائم کیا اور نہ بت پرستی کا استیصال کیا، علاوہ ازیں اس پیشینگوئی میں اس کی طرف بھی خاص اشارہ ہے کہ وہ آنے والا نبی قیدار بن اسمٰعیل کی نسل سے اور قیدار کے دیہاتوں میں پیدا ہوگا، قیدار بن اسمٰعیل کا مشہور خاندان قریش تھا، اور قیدار کا دیہات مکہ معظمہ ہے، اس باب ۴۲ سے پہلے جس میں یہ بشارت ہے، باب ۴۱ میں بھی اس بشارت کا ایک حصہ مذکور ہے۔

"کس نے اس راست باز کو پورب کی طرف سے برپا کیا، اور اپنے پاؤں کے پاس بلایا اور امتوں کو اس کے آگے دھر دیا، اور اسے بادشاہوں پر مسلط کیا کس نے انھیں (کافروں) خاک کے مانند اس کی تلوار کے، اور اڑتی بھوسی کے مانند اس کی تلوار کے حوالہ کیا"

اس درس میں یہ تصریح ہے کہ وہ راستباز "پورب کی طرف سے مبعوث ہوگا"۔ توراۃ کے محاورہ میں پورب کی سرزمین سے عموماً عرب مراد ہوتا ہے[1] اس سے ثابت ہوا کہ وہ راستباز

[1] میں نے اپنی تصنیف ارض القرآن جلد اول میں جغرافیۂ عرب میں توراۃ کے حوالوں سے اسکو بہ تفصیل دکھایا ہے،

بندہ اور رسول ملکِ عرب میں مبعوث ہوگا،

اس بشارت میں آنے والے پیغمبر کے سب سے پہلے وصف کا ترجمہ "برگزیدہ" کیا گیا ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب **مصطفیٰ** کا ترجمہ ہے، دوسرا وصف "راستباز" ہے، یہ **امین** کا وہ لقب ہے جو نبوت سے پہلے اہل مکہ کی زبان سے آپ کو ملا تھا،

اب حضرت اشعیا کی بشارت کے ایک ایک لفظ پر غور کرو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وحالات سے اس کی عجیب مطابقت ہوتی ہے،

سب سے پہلے یہ کہ اس پیغمبر کو بندہ اور رسول کے وصف سے یاد کیا ہے، یہ وہ وصف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی پیغمبر اس وصفِ خاص کے ساتھ شہرت نہیں رکھتا، یہ اسلام ہی کا پیغمبر ہے جس کا طغرائے فخر صرف عبدیت اور رسالت ہے، اُس نے دنیا میں اپنے نام کا اعلان ہی ان الفاظ کے ساتھ کیا کہ عبدہ ورسولہ، کسی مسلمان کی کوئی نماز اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک وہ اپنی زبان سے تشہد میں یہ نہیں ادا کرلیتا "وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندہ اور اس کے رسول ہیں"، اس موقع پر ایک خاص نکتہ بیان کے لائق ہے کہ دیگر انبیاء جس طرح خلیل اللہ، کلیم اللہ، روح اللہ وغیرہ کے خطابات سے مشرف ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا خطاب "عبد اللہ" خدا کا بندہ ہے، معراج میں جو تقرب الٰہی کی آخری منزل اور انسانی رتبہ کی آخری شرف یابی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی لقب خاص سے پکارے گئے،

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ	پاک ہے وہ خدا جو معراج میں اپنے
(بنی اسرائیل)	"بندہ" کو لے گیا،

اس کے علاوہ اور متعدد آیتوں میں آپ کو اس خطاب سے تعبیر کیا گیا ہے،

فَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا	اگر تم کو اس میں شک ہو جو ہم نے
عَلٰی عَبْدِنَا (بقرہ)	اپنے "بندہ" پر اتارا،
تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ	با برکت ہے وہ خدا جس نے اپنے "بندہ"
عَلٰی عَبْدِہٖ (فرقان)	پر قرآن اتارا
وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ	اور جب خدا کا "بندہ" اس کو پکارتے
(جن)	ہوئے کھڑا ہوا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں زانوں کھڑے کرکے کھانا تناول فرماتے تھے، اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ "میں خدا کا بندہ ہوں، اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھاتا ہے"

دوسرا وصف رسول ہے، گو دنیا میں پیغمبر ہزاروں آئے، مگر لفظ رسول سے ان کے نام کو شہرت نہیں، یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا وصف ہے، جو تمام مسلمانوں کی زبانوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ملقب ہیں، یہانتک کہ عیسائیوں میں بھی "دی پرافٹ" یعنی پیغمبر مخصوص آپ کا نام ہے، قرآن نے بتصریح کہا،

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (فتح)	محمد خدا کا رسول
یَسْتَغْفِرْ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ (منافقون)	خدا کا رسول تمھاری مغفرت چاہے،

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (توبہ)	تمھارے پاس خود تمھاری قوم کا رسول آیا
اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ (حجرات)	تم میں خدا کا رسول ہے،
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ	تمھارے لیے خدا کے رسول کے اندر اچھی
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب)	پیروی ہے،
يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ	اے رسول تجھ پر جو کچھ اتارا گیا ہے اس کو
اِلَيْكَ (مائدہ)	لوگوں تک پہنچا دے،

ان مقامات کے علاوہ اور بیسیوں جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ نے جو بشارت دی ہے وہ بھی اسی رسول کے لفظ کے ساتھ دی ہے، مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ "میرے بعد احمد نام ایک رسول آنے والا ہے"۔

حضرت اشعیاؑ نے آنے والے پیغمبر کا تیسرا وصف "برگزیدہ" بتایا ہے، کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم **مصطفیٰ** (برگزیدہ) کے لقب سے عام طور پر مشہور ہیں، حدیث صحیح میں ہے،

ان اللّٰہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد	بیشک خدا نے اولاد اسمٰعیل میں سے کنانہ کو
اسمٰعیل واصطفیٰ قریشا من کنانۃ	برگزیدہ کیا، اور کنانہ میں سے قریش کو برگزیدہ
واصطفیٰ بنی ھاشم من قریش	کیا، اور قریش میں سے بنی ہاشم کو برگزیدہ کیا
واصطفانی من بنی ھاشم [1]	اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو برگزیدہ کیا،

[1] جامع ترمذی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

چوتھی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ "جس سے میرا جی راضی ہوا"، یہ صفت : صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بلکہ آپ کے وسیلہ سے تمام پیروانِ محمدی میں عام ہے،

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ	محمد خدا کا رسول اور جو اس کے ساتھ ہیں
مَعَهٗ.... يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ	.... وہ خدا کی مہربانی اور رضا
اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (فتح)	کو ڈھونڈتے ہیں۔
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ	خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے
(مائدہ، توبہ، مجادلہ، بینہ)	راضی ہوئے،
لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (فتح)	بیشک خدا مومنوں سے راضی ہوا،

تمام انبیاءؑ کی امتوں سے یہ مخصوص وصف امتِ محمدی ہی کا ہے، اس کے پیرو رضی اللہ عنہ کی دعا سے ہمیشہ مخاطب ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اشعیا، اس پیغمبر کا وصف یہ بتاتے ہیں کہ خدا اُس سے کہتا ہے "میں نے اپنی روح اس پر رکھی"۔ قرآن نے اس وصف سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متصف کیا ہے،

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا	ہم نے تیری طرف اپنی شان کی ایک روح
مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ)	وحی کی
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (شعراء)	امانتدار روح اس کو لے کر اتری،
قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ (نحل)	کہدے کہ روح القدس نے اس کو اتارا ہے

پانچواں وصف یہ بتایا گیا کہ "وہ نہ چلائے گا، اور نہ اپنی صدا بلند نہ کرے گا، اور اپنی

آواز بازاروں میں نہ سنائے گا، صحابہؓ نے آپ کی سیرت کے خط و خال کی بھی تصویر کھینچی ہے، متعدد صحابہؓ سے روایت ہے کہ آپ کبھی زور سے نہیں ہنستے تھے، بلکہ صرف مسکراتے تھے، شمائل ترمذی[1] میں حضرت ہندؓ سے روایت ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر چپ رہتے، بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے"

حضرت عائشہؓ سے ایک شخص نے آپ کے اخلاق پوچھے، انھوں نے جواب دیا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدگو نہ تھے، اور نہ بازاروں میں شور کرتے تھے"، حضرت علیؓ سے حضرت حسینؓ نے دریافت کیا کہ آپ کے اوصاف کیا تھے؟ فرمایا "آپ شور و غل نہیں کرتے تھے[2]"

سفر اشعیا میں اس کے بعد ہے "وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا، اور دھکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا، مسکینوں، غریبوں اور کمزوروں کو نہ ستائے گا، وہ نرم دل اور نیک خو ہوگا" قرآن مجید نے آپ کے اس وصف کو نمایاں طریق سے بتایا ہے،

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (ن)	اور بے شک تو بڑے خلق پر ہے،
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ	خدا کی رحمت کے سبب سے تو اُن کے ساتھ نرم
وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ	ہے، اگر تو کڑا، اور دل کا سخت ہوتا تو
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۱۷)	یہ تیرے ارد گرد سے ہٹ جاتے،
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	تمھاری قوم سے تمھارے پاس ایک پیغمبر آیا،

[1] جامع ترمذی باب ما جاء فی صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] یہ دونوں روایتیں شمائل ترمذی باب خلق النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں، حضرت عائشہؓ والی روایت مسند ابو داؤد طیالسی ص ۲۱۴، اور مستدرک حاکم میں بھی ہے،

عَزِیزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ — جس کو تمھاری تکلیف شاق ہوتی ہے،

عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ — تمھاری بہی خواہی کا حریص ہے اور مسلمانوں

(توبہ - ۱۶) — پر مہربان اور رحمت والا ہے،

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم برائی کے بدلہ برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ معاف کرتے تھے، اور درگذر فرماتے تھے، آپ نے کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ "آپ خندہ جبیں، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے"، ہند بن ابی ہالہؓ جو گویا آپ کے آغوش پروردہ تھے، بیان کرتے ہیں کہ "آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، خود اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی غصہ نہ فرماتے اور نہ کسی سے انتقام لیتے"[1]

حضرت انسؓ خادمِ خاص کہتے ہیں کہ "میں نے دس برس آپ کی خدمت کی، مگر آپ نے کبھی کسی معاملہ کی مجھ سے بازپرس نہ فرمائی"[2] مالک بن حویرثؓ جو ۲۰ دن تک آپ کی صحبت میں رہے تھے، کہتے ہیں کہ "آپ رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے"[3]

حضرت اشعیاؑ اس کے بعد کہتے ہیں کہ "وہ عدالت کو قائم کرے گا کہ دائم رہے"۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، اور نہ آپ کی شریعت منسوخ ہوگی، آپ آخری دین لے کر آئے جو قیامت تک دائم رہیگا، پھر کہتے ہیں کہ "اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ ملا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے" یعنی جب تک

---

[1] یہ تمام روایات شمائل ترمذی میں مذکور ہیں [2] صحیح مسلم و ابو داؤد کتاب الادب [3] صحیح بخاری باب رحمۃ الناس،

اس کی شریعت اور تعلیم قائم نہ ہو جائے گی، اس کو موت نہ آئے گی، ظاہر ہے کہ یہ وصف حضرت عیسیٰؑ پر صادق نہیں آتا کہ وہ اپنی تعلیم و شریعت کے استحکام سے پہلے اس دنیا سے اٹھ گئے، یہ مخصوص وصف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، جو اس وقت تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے جب تک آپؐ کی تعلیم و شریعت نے ظہور تام اور استحکامات کامل نہیں حاصل کر لیا، چنانچہ جب یہ بات حاصل ہو گئی تو آپؐ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے کی اجازت ملی، حضرت اشعیاؑ کی یہ پیشینگوئی قرآن مجید کے اس سورہ کے مطابق ہے،

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَ	جب خدا کی نصرت اور فتح آچکی اور تو نے لوگوں
رَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي	کو گروہ در گروہ دین الٰہی میں آتے دیکھ لیا
دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ	(تو تیرا فرض انجام پاچکا) اور اس دنیا سے تیری
رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا	رخصت کے دن قریب آگئے) اب خدا کے حمد و
(نصر - ۱)	استغفار میں مصروف ہو کہ وہ رحم کرنے والا ہے،

جب یہ سورہ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ "خدا کے ایک بندہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہے وہ اس دنیا کو قبول کرے یا دوسری دنیا کا سفر اختیار کرے، مگر اس بندہ نے آخرت کو پسند کیا" حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر رو پڑے، وہ سمجھ گئے کہ "یہ بندہ کون ہے،" حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے امتحاناً اس سورہ کا مطلب پوچھا، انھوں نے جواب دیا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اشارہ ہے، حضرت عمرؓ نے بھی اس کی تصدیق کی[1]

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مذکور

اس کے بعد اشعیا کہتے ہیں کہ "تمام بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں"۔ یہ اسلام ہی تھا جس کی شریعت نہر سیحون اور جیحون سے دجلہ و فرات ہو کر بحر روم تک اور بحر ہند سے بحر ظلمات تک پھیل گئی، اور بڑے بڑے جزیرے اس کے نور سے منور ہو گئے، بعد ازیں اشعیا خدا کا وعدہ سناتے ہیں کہ "میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا، اور تیری حفاظت کروں گا"۔ یہ وعدہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پورا ہوا، آپ نے یکہ و تنہا دعوتِ توحید کی اس وقت اشاعت کی جب ملک عرب کا ذرہ ذرہ آپ کے خون کا پیاسا تھا، اور خدا کے سوا کوئی آپ کا دوسرا دستگیر نہ تھا اس نے دشمنوں کے نرغہ میں نازک سے نازک اور خطرناک سے خطرناک حملوں سے آپؐ کی ذاتِ گرامی کو محفوظ رکھا۔ اور سفر اشعیا کے وعدہ کو قرآن کے ذریعہ سے دوبارہ دہرایا اور مکہ میں عین اس وقت جب دشمنوں کی عداوت کا آفتاب پوری تمازت پر تھا، یہ آیت اتری،

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۚ (اسراء)	اور یاد کرو اے محمدؐ! جب ہم نے تم سے فرمایا کہ تمہارے پروردگار نے لوگوں کو ہر طرف سے روک رکھا ہے کہ تم پر ہاتھ ڈالیں،
وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (طور)	اپنے رب کے حکم کا صبر کے ساتھ انتظار کر کر تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

مدینہ میں آکر یہ وعدہ مکرر دہرایا گیا،

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ)	اور خدا لوگوں سے تیری حفاظت کریگا۔

صحابہؓ اپنی جان نثاری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کے گرد پہرا دیا کرتے تھے،

جب یہ آیت اتری تو آپ نے خیمہ سے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا "لوگو! واپس جاؤ کہ خدا نے میری حفاظت کا خود وعدہ کیا ہے"۔ اس وصف کے مستحق حضرت عیسیٰؑ نہیں ہوسکتے، جو عیسائیوں کے اقرار کے مطابق رومیوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر سولی پر لٹکائے گئے،

بشاراتِ اشعیاؑ میں اس کے بعد ہے "میں تجھکو لوگوں کے لیے عہد اور قوموں کے لیے نور بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھوں کو کھولے، اور بندھے ہوؤں کو قید سے نکالے' اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں، قید سے نکالے"۔ تاریخ گواہ ہے کہ بشارت کا یہ حصہ بھی پیغمبر اسلامؐ کے وجود سے کس خوبی سے پورا ہوا ہے، قرآن مجید نے بھی بشارت کے اس حصہ کو ان الفاظ میں مکمل کیا،

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ	وہ لوگ جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ	توراۃ و انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انکو
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ	نیکی کا حکم کرتا ہے، اور برائی سے روکتا ہے'
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ	اور اچھی چیزیں ان کے لیے حلال کرتا ہے
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ	اور بری چیزیں ان پر حرام کرتا ہے اور ان سے
عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ	ان کی ان پابندیوں اور زنجیروں کو جو ان
كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	پر تھیں، ہلکا کرتا ہے، تو جن لوگوں نے اسکو
بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا	مانا اور اس کی مدد اور نصرت کی اور اس

النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا،

(اعراف ۱۹)

روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے، وہی کامیاب ہوں گے، کہدے (اے پیغمبر!) اے لوگو! میں تم سب کے پاس خدا کا بھیجا ہوا ہوں،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا

(احزاب)

اے پیغمبر! ہم نے تجھکو گواہ، خوشخبری دینے والا ہشیار کرنے والا، اور خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا (نساء)

اے لوگو! تمھارے پاس خدا کی طرف سے دلیل آچکی، ہم نے تمھاری طرف وہ نور اتارا جو ہر چیز کو روشن کرتا ہے،

وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا (تغابن)

اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتارا،

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ (انبیاء)

اے محمد! ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے،

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ٥ (ابراهیم)

یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تیری طرف اتارا ہے، تاکہ تو لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لائے،

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ	لیکن ہم نے اُس کو نور بنایا ہو تاکہ ہم اپنے
نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ	بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ دکھائیں،
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ)	اور تو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے،

اس کے بعد اس بشارت میں ہے کہ آنے والا پیغمبر توحید کامل کا مبلغ، بت شکن، اور باطل پرستی کا دشمن ہوگا، اور بت پرست کفار و مشرکین کو وہ شکستِ عظیم دے گا،

"یہوا (اللہ) میرا نام ہے، اور اپنی شوکت دوسرے (معبودانِ باطل) کو نہ دوں گا،
اور وہ ستایش جو میرے لیے ہوتی ہے، کھودی ہوئی مورتوں کے لیے نہ دوں گا۔۔۔۔۔ وہ
پیچھے ہٹیں، اور نہایت پشیمان ہوں، جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں،
اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو"

حضرت اشعیاؑ کے بعد دنیا میں وہ کون پیغمبر آیا جس نے توحیدِ کامل کی تعلیم پیغمبر اسلام سے واضح تر اور کامل تر دی ہو، جس نے بت پرستی کی بیخ کنی کی ہو، جس نے بتخانوں کو منہدم کیا ہو، جس نے مشرکین کی صفوں کو درہم برہم کیا ہو، اور باطل پرستی کے علم کو ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا ہو، قرآن اور آپؐ کی تعلیمات کا بڑا حصہ شرک و بت پرستی کے خلاف جہادِ عظیم ہے اور تمام دنیا کو اعتراف ہے کہ اس فرض کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خوبی اور تکمیل کے ساتھ ادا کیا، وہ کسی اور سے نہ ہو سکا،

بعد ازیں حضرت اشعیاؑ بتلاتے ہیں کہ وہ آنے والا پیغمبر مجاہد اور تیغ زن ہوگا اور وہ باطل پرستیوں کے خلاف اپنی تلوار اٹھائے گا۔

"خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی طرح اپنی غیرت کو اکسائے گا،
وہ چلائیگا، ہاں وہ جنگ کے لیے بلائیگا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا"
یہ حضرت عیسیٰؑ کی صفت نہیں ہوسکتی، یہ صرف بدر و احد اور حنین و خندق کے سپہ سالار پیغمبرؐ کی شان ہے،

"بیابان (عرب) اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے"
اس فقرہ میں آنے والے پیغمبر کا وطن (بیابانِ عرب) اور خاندانِ (قیدار بن اسمٰعیل) بھی بتادیا گیا ہے، آخر میں ہے،

"اور اندھوں کو اس راہ سے جسے وہ نہیں جانتے لیجاؤں گا، میں انھیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا"
اس فقرہ میں یہ ارشاد ہے کہ وہ امیوں کا پیغمبر اور اُس قوم کا داعی ہوگا جس کو کبھی راہ راست کی ہدایت نہیں ملی، یہ صفت اہل عرب کی ہے، جن کو آپؐ سے پہلے کوئی صاحبِ شریعت پیغمبر نہیں ملا، حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے، جن کو شریعت مل چکی تھی، اس لیے یہ ان کی صفت نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ صرف پیغمبر عربؐ کا وصف خاص ہے، چنانچہ قرآن مجید نے صاف کہا:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا اَتَاهُمْ مِنْ	تاکہ ان کو ہشیار کرے جن کے پاس تجھ سے
نَذِيْرٍ مِنْ قَبْلِكَ (قصص)	پہلے کوئی ہوشیار کرنیوالا نہیں آیا،
اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى	تو یقیناً پیغمبروں میں سے ہے اور سیدھی راہ

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ
الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ
اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یٰسٓ)
هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (جمعہ)
وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ
فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ
اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ
عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ
كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ
اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ
جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۔
(انعام - ۲۰)

پر ہے، اور یہ غالب مہربان خدا کی طرف سے
اترا ہے تاکہ تو ان کو ہشیار کرے جن کے باپ
دادا ہشیار نہیں کیے گئے تو وہ غفلت میں ہیں،
وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں پیغمبر بنا کر
ان ہی میں سے کھڑا کیا، جو ان کو خدا کی
آیتیں پڑھ کر سناتا اور کتاب اور دانائی
سکھاتا ہے، اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے،
یہ کتاب ہے جس کو ہم نے اتارا ہے جو برکت والی
ہے تو اسکی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار
کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے (یہ کتاب تم کو
اس لیے دی گئی) تاکہ یہ نہ کہو کہ کتاب تو
ہم سے پہلے یہود اور نصاریٰ دو قوموں
کو عطا ہوئی اور ہم اس کے پڑھنے سے
غافل تھے، یہ کہو کہ اگر خاص ہم پر کوئی
کتاب اترتی تو ہم ان سے زیادہ راہ راست
پر ہوتے، تو لو تمہارے پاس خدا کی طرف سے
کھلی دلیل، ہدایت اور رحمت آچکی۔

وَمَا اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ کُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَھَا	اور ہم نے ان کو نہ تو کتابیں دیں، جن کو
وَمَا اَرْسَلْنَا اِلَیْھِمْ قَبْلَکَ مِنْ نَّذِیْرٍ	پڑھیں اور نہ تجھ سے پہلے اُن کے پاس کوئی
(سبا)	ڈرانے والا بھیجا،

اس بشارت کے تمام فقروں پر جو شخص اس تفصیل سے نظر ڈالے گا، اور اس کے ایک ایک فقرہ کی قرآن پاک، احادیث شریف اور سوانح نبوی کے ساتھ حرف حرف تطبیق پر غور کرے گا، وہ اس یقین کے پیدا کرنے پر مجبور ہو گا کہ اس بشارت کا مصداق محمد بن عبداللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا،

ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖ	وہی جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے
اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ	تاکہ وہ تم کو اندھیرے سے نکال کر روشنی
اِلَی النُّوْرِ (حدید ۱)	میں لے جائے،

سورۂ فتح میں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کی بشارت دی گئی ہے، تورات اور انجیل کی ایک اور پیشینگوئی کا حوالہ دیا گیا ہے،

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ	محمد خدا کا بھیجا ہوا، اور جو لوگ اس کے ساتھ
اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ	ہیں، وہ کافروں پر بھاری، آپس میں
تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا	مہربان ہیں، دیکھتے ہو، تم انکو (خدا کے
مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ	سامنے) رکوع اور سجدہ میں گرے رہتے ہیں
فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ	اور خدا کی رحمت اور خوشنودی کے جویاں

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰاةِ — رہتے ہیں ان کے چہروں میں سجدہ کے اثر سے

(فتح - ۱) — نور ہے، انکی حالت کا بیان توراۃ میں ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا یہ مجموعی وصف فتح مکہ کے موقع پر بیان کیا گیا ہے، جو اسلام کی دعوت کی تکمیل، توحید الٰہی کے انجام، خانۂ خلیل کی کامل آزادی اور معبودانِ باطل کی دائمی شکست کا دن ہے، اور اس کے بعد کوئی نیا پیغام سنانے والا دنیا میں آنے والا نہ تھا، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر ان کی توراۃ اور ان کے صحیفۂ حیات دونوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے، بنی اسرائیل کو یہ فرمائی :-

"یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا، اور سعیر سے اُن پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا، اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی، ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے، اس کے سارے مقدس (ہمراہی) تیرے ہاتھ میں ہیں، اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں، اور تیری باتوں کو مانیں گے۔" (استثناء، ۳۳ - ۱ و ۲ و ۳)

یہ حضرت موسیٰؑ کا آخری کلام ہے جس میں آخری پیغمبر کی بعثت کی خبر دی ہے، اس بشارت میں کوہ فاران سے نورِ الٰہی کے طلوع ہونے کی خوشخبری ہے، اس میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں، جو قرآن مجید کے بیان کے عین مطابق ہیں،

(۱) وہ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا،

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ ‏ مَعَهٗٓ (فتح - ۴) — محمد خدا کے فرستادہ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں،

(۲) اس کے ہاتھ میں ان کے لیے آتشیں شریعت ہوگی،

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ، (فتح - ۴) — وہ خدا کے منکروں پر سخت ہوں گے

(۳) وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا،

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح - ۴) — آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہوں گے،

(۴) (اے خدا) اس (آنے والے پیغمبر) کے سارے مقدس لوگ (یعنی صحابہؓ) تیرے ہاتھ میں ہیں، اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں، اور تیری باتوں کو مانیں گے،

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ‏ سِيْمَاهُمْ فِىْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (فتح - ۴) — دیکھتے ہو تم ان کو خدا کے آگے رکوع اور سجود میں جھکے ہوئے خدا کی مہربانی اور خوشنودی کے طلبگار ہیں، اطاعت و عبادت کے اثر سے ان کے چہروں میں نورانیت ہے،

ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس آنے والے پیغمبر کے مقدس ساتھیوں کی تعداد دس ہزار فرماتے ہیں، فتح مکہ کے دن بعینہٖ یہی دس ہزار مقدسین تھے، جو اس فاران سے آنے والے نورانی پیکر کے ساتھ شہر خلیل (مکہ) کے دروازے میں داخل ہوئے، اور اس طرح حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہوا،

سورۂ فتح میں اس کے بعد ہے:۔

وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ	اور انکی مثال انجیل میں مثل کھیت کے ہے،
أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ	جس نے سُٹی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا،
فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ	پھر موٹا ہوا، پھر اپنی ٹہنیوں پر کھڑا ہوا،
الزُّرَّاعَ (فتح - ۴)	کھیت والوں کو خوش اور مسرور کر رہا ہے،

حضرت عیسیٰؑ نے یہ تمثیل آسمانی بادشاہی کی دی ہے، چنانچہ انجیل کے مختلف نسخوں میں یہ تمثیل ان مختلف الفاظ میں مذکور ہے،

"آسمان کی بادشاہت رائی کے دانہ کے مانند ہے، جسے ایک شخص نے لے کے اپنے کھیت میں بویا، وہ سب بیجوں میں چھوٹا ہے، پر جب اگتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے، اور ایسا پیڑ ہوتا ہے کہ ہوا کی چڑیاں آکے اس کی ڈالیوں میں بسیرا کریں" (متی ۱۳-۳۱، مرقس ۴، ۳۰)

"خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسا ایک شخص جو زمین میں بیج بوئے اور رات دن وہ سوئے، اٹھے، اور بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، اس لیے کہ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے، پہلے سبزی، پھر بال، بعد اس کے بال میں تیار دانے، اور جب دانا پک چکا تو وہ فی الفور ہنسوا بھیجتا ہے، کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا ہے" (مرقس ۴، ۲۶)

حضرت عیسیٰؑ نے آسمانی بادشاہت کی جو تمثیل دی ہے، قرآن مجید نے اس کو سورۂ فتح میں دہرایا ہے، کون نہیں جانتا کہ اسلام کی جسمانی اور روحانی، ظاہری و باطنی دونوں بادشاہیوں کے جلوس و موکب کا دن فتح مکہ کا دن ہے، اور آسمانی بادشاہی کی یہ تمثیل

پوری ہوئی کہ محمد نام ایک کاشتکار نے ایک بیج زمین میں ڈالا اور اُس سے سیکڑوں ہزاروں خوشے پیدا ہو گئے، اور اس نے آسمانی بادشاہی کی منادی کی،

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو نصیحت کرتے ہیں،

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھرو" (استثنا ۱۸-۱۵)

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا، وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کے کہیگا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا، لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائیگا، اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈرو" (استثنا ۱۸-۱۹)

عیسائیوں نے اس بشارت کو حضرت عیسیٰؑ کے حق میں ثابت کرنا چاہا ہے اگرظاہر ہے کہ اس کے مصداق حضرت عیسیٰؑ نہیں ہو سکتے، اس بشارت میں ہے کہ "یہ نبی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے مبعوث ہوگا" بنی اسرائیل کے بھائی بنو اسمٰعیل تھے، اس سے یہ مفہوم ہوا کہ

وہ پیغمبر نسلِ اسمٰعیلؑ سے ہوگا حضرت عیسیٰؑ اسمٰعیلی نہ تھے، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو نبی نہیں مانتے، حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ "وہ آیندہ نبی میرے مانند ہوگا" حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ میں کوئی وجہ مماثلت نہیں ہے، حضرت موسیٰؑ صاحب شریعت تھے، حضرت عیسیٰؑ نہ تھے، حضرت موسیٰؑ جنگجو اور مجاہد تھے حضرت عیسیٰؑ نہ تھے، حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو غلامی سے نکال کر بادشاہی تک پہنچایا، حضرت عیسیٰؑ نے ایسا نہیں کیا، حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ظاہری ومعنوی دونوں معنوں میں بادشاہ تھے، حضرت عیسیٰؑ نہ تھے، حضرت موسیٰؑ صرف واعظ نہ تھے، عمل فرما اور کارپرداز بھی تھے، حضرت عیسیٰؑ صرف واعظ تھے، حضرت موسیٰؑ قوموں اور ملکوں کے فاتح تھے، اور حضرت عیسیٰؑ ایک چپہ زمین پر بھی قابض نہ تھے، برخلاف اس کے حضرت موسیٰؑ اور محمد رسول اللہ علیہما السلام میں یہ تمام اوصاف مشترک ہیں، اس لیے وہ موعود نبی جو حضرت موسیٰؑ کے مانند پیدا ہونے والا تھا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اس بشارت میں جو کچھ فرمایا ہے، قرآن مجید نے اس کی حرف حرف تصدیق کی ہے، قرآن مجید کا بیان ہو کہ خدا نے روزِ ازل تمام انبیاءؑ سے یہ عہد لیا تھا کہ ہر نبی دوسرے نبی کی تائید کرتا جائے اور اپنی امت کو یہ نصیحت کر جائے کہ جب کوئی پیغمبر ان کے پاس آئے تو وہ اس کی تصدیق کرے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ	اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے
لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ	عہد لیا کہ ہم جو تم کو کتاب اور دانائی دیں
ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ	اور پھر کوئی پیغمبر تمہارے پاس آئے جو کتاب
لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ	اور شریعت تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق

قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی
ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا
قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ
مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝
(آل عمران ۹)

کرنا ہو تو ضرور اس کو ماننا اور اسکی مدد کرنا،
اور فرمایا کہ کیا تم نے اس کا اقرار کر لیا اور ان
باتوں پر جو ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا ہے، اسکو
تسلیم کیا؟ پیغمبروں نے عرض کیا کہ ہاں ہم
اقرار کرتے ہیں، فرمایا تو تم گواہ رہو اور تمھارے
ساتھ ہم بھی ایک گواہ ہیں،

حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو آنے والے پیغمبر کی اطاعت کی جو نصیحت فرمائی
وہ اُسی ازلی عہد و پیمان کا ایفا تھا،

حضرت موسیٰؑ نے آنے والے پیغمبر کی نسبت ارشاد فرمایا کہ "وہ میرے مانند ہوگا"۔ قرآن مجید
نے بھی اس کی تصدیق کی،

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا
شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی
فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمّل)

ہم نے تمھارے پاس ایک پیغمبر کو بھیجا ہے، جو
تم پر گواہ ہے، جس طرح کہ ہم نے فرعون
کے پاس ایک پیغمبر بھیجا تھا،

اس پیغمبر کا وصف یہ ہوگا کہ "خدا اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالے گا"۔ قرآن مجید نے
اپنے پیغمبر کی نسبت کہا،

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ
اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (نجم - ۱)

اور وہ اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ
وہی کہتا ہے جو اس سے خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے،

توراۃ میں ہے :-

"اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا، تو میں اس کا حساب لوں گا۔"

قرآن مجید نے بھی یہی اعلان کیا کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے منکر ہوگا، اس کو اپنے حساب کے لیے تیار رہنا چاہیے،

وَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْنَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَآ عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ

(رعد-۶)

اور اے پیغمبر عذاب غیرہ کے جو وعدے (ان کفار سے) ہم کرتے ہیں، ان میں سے بعض تو تمھاری زندگی ہی میں تم کو پورا کر کے دکھائیں گے یا ان کے پورا ہونے سے پہلے تم کو دنیا سے اٹھا لینگے، تمھارا کام ہمارے احکام کو ان تک پہنچا دینا تھا اور ان کا حساب لینا میرا کام ہے۔

توراۃ نے حضرت موسیٰ کی زبانی اس بشارت میں یہ کہا :

"لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے، جسے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔"

قرآن مجید نے بھی اس فرمان کی صداقت پر اپنی مہر ثبت کر دی :

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا

اگر پیغمبر (محمد) کچھ جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر کہتا تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور

مِنْهُ الْوَتِيْنَ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ — اس کی گردن کی شہرگ کاٹ ڈالتے پھر

اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ (حاقہ۔۲) — تم میں سے کوئی اس کو مجھ سے نہ بچا سکتا،

توراۃ نے اُس آنے والے پیغمبر کی نشانی یہ بتائی کہ "اس کی تمام پیشینگوئیاں سچی ہونگی" سیرۃ نبوی کے تمام ابواب تمھارے سامنے ہیں، دیکھو کہ اس نشانی کی صداقت میں ایک ذرہ بھی کبھی کمی ہوئی، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رویا میں جو کچھ آپ دیکھتے تھے وہ سپیدۂ صبح کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔[1] مسلمان، تو مسلمان خود کفار تک کو اس پر یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی پیشینگوئی غلط نہیں ہوتی، یاد ہوگا کہ غزوۂ بدر سے پہلے ایک صحابی عمرہ ادا کرنے مکہ گئے تھے، انھوں نے قریش کے رئیس امیہ سے کہا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے کہ تو قتل ہوگا"۔ اس پیشینگوئی کا یہ اثر اُس پر ہوا کہ کانپ گیا، معرکۂ بدر میں وہ گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتا تھا، جاتے ہوئے اس کی بیوی نے دامن پکڑ لیا کہ "کہاں جاتے ہو، تم کو اس مدینہ والے کی پیشینگوئی یاد نہیں"۔[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیکڑوں پیشینگوئیاں کیں اور ان میں سے ایک ایک سچائی کے معیار پر اتری،

صحیح بخاری میں ہے کہ ابن ناطور جو قیصر روم کا محرم راز اور شام کا اسقف (بشپ) تھا، اس نے بیان کیا کہ ہرقل قیصر روم منجم تھا، ایک دن وہ دربار میں آیا تو چہرہ متغیر تھا، کسی درباری نے سبب دریافت کیا، تو اس نے کہا رات ستاروں کو دیکھ کر یہ نظر آیا کہ "ملک الختان" (ختنہ کا بادشاہ یا فرشتہ) ظاہر ہوگیا، تو تحقیق کرو کہ ختنہ کس قوم میں رائج ہے، درباریوں

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی [2] صحیح بخاری مغازی

نے کہا کہ ختنہ تو صرف یہود کرتے ہیں، اس لیے آپ مضطرب نہ ہوں صوبوں میں حکم جاری کردیجئے کہ امسال یہودیوں کے یہاں جس قدر بچے پیدا ہوں سب قتل کردیے جائیں، اسی اثنا میں حدود شام کے عرب رئیس غسان نے یہ خبر پہنچائی کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے قیصر نے کہا دریافت کرو کہ کیا عرب ختنہ کرتے ہیں؟" اس کا جواب جب اس کو اثبات میں ملا تو اس نے کہا "ہاں یہ اس امت کا مَلِک (بادشاہ یا فرشتہ) ہے"۔ اور اس کے بعد اہل دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اگر تم کو اپنی سلطنت بچانی منظور ہے تو اس پر ایمان لاؤ" درباریوں نے قیصر کی اس گفتگو کو سخت ناپسند کیا، مگر رومیہ میں قیصر کا ایک اور صاحبِ علم دوست تھا، قیصر نے اس کو لکھا تو اس نے بھی قیصر کی رائے کی تائید کی،

ہمارے محدثین اس خبر کی صحیح حقیقت نہیں سمجھ سکے ہیں، اور اسی لیے ملک الختان کا تلفظ نہ مَلِک (بادشاہ) ہے اور نہ مَلَک (فرشتہ) ہے، بلکہ ملاک ہے جس کے معنی "فرستادہ" اور پیغامبر" کے ہیں جس کی اصل عربی میں الوکۃ بمعنی پیغام ہے، اگر یہ لفظ عربی تلفظ میں ملک پڑھا جائے تو یہ لفظ اس موقع پر "فرشتہ" کے اصطلاحی معنی میں نہیں، بلکہ فرستادہ کے لغوی معنوں میں مستعمل ہوا ہے، قیصر کا یہ لفظ ملاک الختان (ختنہ کا پیغامبر) استعمال کرنا درحقیقت توراۃ کی ایک پیشینگوئی کی طرف اشارہ ہے، ملاخیا نبی کی کتاب میں یہ پیشینگوئی ان الفاظ میں مذکور ہے،

> دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا، اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کریگا، اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو، ہاں "ختنہ کا رسول" جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آئیگا، ربّ الافواج فرماتا ہے، "پر اس کے آنے کے دن کو کون ٹھہر سکے گا،

اور جب وہ ظاہر ہوگا، کون ہے جو کھڑا رہ سکیگا، کیونکہ وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابن کے مانند ہے، اور وہ روپیہ کا میل کاٹتا ہوا اور اسے خالص کرتا ہوا بیٹھے گا۔" (باب ۳)

آج کل کے ترجموں میں "ختنہ کے رسول" کے بجائے "عہد کا رسول" لکھا ہے، یہ ترجمہ صحیح بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے جواب میں جس رسول کی بعثت کا وعدہ فرمایا تھا، اس کے متعلق یہ بشارت ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ توراۃ کی زبان میں "ختنہ" نسلِ ابراہیمی کے جسم پر خدا اور ابراہیمؑ کے باہمی "عہد و میثاق" کی مہر کا نام ہے، توراۃ میں جہاں ختنہ کا حکم ہے، مذکور ہے:-

"اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، جسے تم یاد رکھو یہ ہے کہ تم میں ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے، اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو، اور یہ اس عہد کا نشان ہے جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔" (پیدائش ۱۷-۱۰)

اس بناء پر "ختنہ" کے بجائے مترجمین نے "عہد" کا لفظ رکھ دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قربِ مولد کے زمانہ میں اس پیشنگوئی کے مطابق اس "رسول الختان" کا یہود و نصاریٰ دونوں کو انتظار تھا، اور قیصرِ روم اسی پیشنگوئی کے پورا ہونے کا منتظر تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰؑ کے حق میں نہ تھی، کیونکہ اگر ان کے حق میں ہوتی تو عیسائی قیصر اس کی آمد کا منتظر نہ ہوتا، "رسول الختان" کے لفظ سے اس بات کا اشارہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مختون قوم میں ظاہر ہوگا اور عیسائی مذہب نے اس رسم کو باطل قرار دیا ہے، یہودیت کے بعد اسلام ہی ہے جس نے نسلِ ابراہیمؑ کے اس عہد کو دنیا میں ہمیشہ برقرار رکھا ہے،

توراۃ میں ایک اور بشارت ہے،

"خداوند سینا سے آیا، اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا" (استثنا، ۳۳-۲)

اس بشارت کا ایک ٹکڑا حضرت حیقوق نبی کے صحیفہ میں پھر دہرایا گیا ہے،

"خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا، اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا، اور اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی"۔ (۳-۳)

صحیفۂ استثنا، کی بشارت میں خداوند کا مظہر تین پہاڑوں کو قرار دیا گیا ہے، کوہ سینا کوہ سعیر اور کوہ فاران، یہ درحقیقت خورشید نبوت کے تین مطلع ہیں، ان میں یہ ترتیب کوہ سینا سے حضرت موسیٰؑ، کوہ سعیر سے حضرت عیسیٰؑ اور کوہ فاران سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں کہ وہ مکہ کی پہاڑیوں کا نام ہے، حضرت حیقوقؑ اس بشارت میں کہتے ہیں کہ وہ تیمان سے آیا، تیمان کے لغوی معنی جنوب کے ہیں، اور استعمال میں ملک یمن کو کہتے ہیں اور یہاں یہ دونوں معنی ٹھیک ہیں، پھر کہتے ہیں" اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا"۔ یہ معراج آسمانی کی تشریح ہے، پھر کہتے ہیں" اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی"۔ زمین کا کون گوشہ ہے جو محمد کے حمد سے معمور نہیں، لفظ حمد، کہ محمد کا مادہ اور عبادتِ اسلامی کا آغاز (الحمد الخ) ہی محمد رسول اللہ کی تلمیح سے لبریز ہے،

توراۃ کی اس بشارت کو قرآن مجید نے سورۂ والتین کے ان الفاظ میں ادا کیا،

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ — قسم ہے انجیر اور زیتون کی، طور سینا کی

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (تین) اور اس امن والے شہر کی

سب کو معلوم ہے کہ انجیر اور زیتون والا ملک **شام** ہے جو حضرت عیسٰیؑ کا مولد اور کوہ سعیر کا میدہ رہے۔ **طور سینا** حضرت موسٰیؑ سے عبارت ہے اور **بلد امین** یعنی مکہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے،

علمائے اسلام نے توراۃ اور انجیل کی اور بھی بشارتوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ہم نے صرف ان ہی بشارتوں کا ذکر کیا ہے جن کی طرف قرآن مجید اور احادیث میں اشارے پائے جاتے ہیں، کتب سیر و دلائل میں بہت سی پیشینگوئیاں عرب کے کاہنوں اور بتخانوں کے پوجاریوں سے منقول ہیں، لیکن چونکہ ان کا بڑا حصہ اصول روایت کی رو سے کمزور ہے، اس لیے ہم ان کی تفصیل غیر ضروری سمجھتے ہیں، تاہم ان روایات کا قدر مشترک اسقدر ضرور نکلتا ہے کہ عرب بھی ایک پیغمبر کے وجود کا تشنہ تھا، روم و فارس کی دہ سالہ جنگ نے مشرق و مغرب کی سرزمین لالہ زار بنا دیا تھا، اور خیالات میں تلاش امن کی شورش برپا کر دی تھی، اور عرب میں اصحاب الفیل کا واقعہ دلوں میں لرزش پیدا کرنے کے لیے کافی تھا، اور عین یہی موسم دنیا میں روح اعظم کے ظہور کا ہوتا ہے، اس لیے مولد نبی کے قریب زمانہ میں عرب، روم اور یہود و نصاریٰ سب کو توراۃ اور انجیل کی بشارتوں کے مطابق ایک آنے والے کا انتظار تھا، صحیح بخاری میں حضرت ابوسفیانؓ کی زبانی مروی ہے کہ جب قاصد نبوی دعوت نامۂ اسلام لیکر قیصر کے دربار میں پہنچا ہے، اور قیصر نے ابوسفیان کو بلا کر جو اُس وقت تک کافر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند استفسارات کیے ہیں اور ابوسفیان نے ان کے جو جوابات دیے ہیں ان کو سن کر

اُس نے بھرے دربار میں کہا "تم نے جو کچھ بیان کیا اگر وہ سچ ہے تو ایک دن یہ میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اُس کے قبضہ میں ہوگی، مجھکو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، اگر ممکن ہوتا میں خود جاکر اس کی زیارت کرتا اور اگر وہاں ہوتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا"[1]

قیصر کے محرم راز، اور شام کے بشپ ابن ناطور کا بیان اوپر پڑھ چکے ہو کہ قیصر کا خیال تھا کہ ختنہ والے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے، اور رومیہ کے ایک مسیحی عارف نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی، مقوقس شاہ مصر کے دربار میں جو قاصد نبوی خط لیکر گیا تھا، وہ بھی یہ جواب لایا کہ "ہاں ہم کو بھی یقین تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوگا"[2] حبش کے عیسائی بادشاہ نے لکھا کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ سچے پیغمبر ہیں"[3] یاد ہوگا کہ یمن کے شہر نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد حاضر خدمت ہوا تھا، اور فیصلۂ حق کے لیے یہ قرار پایا تھا کہ دونوں فریق مباہلہ کریں، لیکن وفد کے سمجھدار عیسائیوں نے وفد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مباہلہ سے منع کیا، اور کہا کہ "خدا کی قسم اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم ہمیشہ کے لیے تباہ ہوجائینگے"[3] اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی پیغمبر کی آمد کا گمان تھا، اسلام سے پہلے زید ایک عرب موحد تلاش حق میں مدتوں سے سرگرداں رہے، وہ پہلے یثرب (مدینہ کا پہلا نام) گئے، دیکھا تو وہاں کے یہودی بھی توحید کامل پر قائم نہ تھے، یہاں سے نکل کر خیبر کے یہودیوں کے پاس گئے، اور ان کا بھی یہی حال پایا، وہاں سے شام کے عیسائیوں

---

[1] صحیح بخاری کیف کان بدء الوحی [2] سیرۃ نبوی جلد اول [3] سیرۃ نبوی جلد دوم،

میں گئے، دیکھا کہ وہ بھی مشرک ہیں، آخر شام کے ایک راہب نے کہا کہ اگر تمھیں دینِ حق کی تلاش ہے تو عراق جاؤ، وہاں ایک بزرگ ہیں، زید جب ان کے پاس پہنچے اور لب سوال وا کیا تو دریافت کیا کہ تم کہاں سے آتے ہو، زید نے کہا حرم مکہ سے۔ ان بزرگ نے کہا جاؤ تم اپنے وطن کو لوٹ جاؤ، دینِ حق کا وہیں ظہور ہونے والا ہے، وہ لوٹ کر مکہ آئے، لیکن اسلام سے پہلے ان کی وفات ہو گئی،[1] ورقہ بن نوفل کا واقعہ تم سیرۃ جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیجہؓ آپ کو لے کر ورقہ کے پاس گئی ہیں تو ورقہ نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی، اور آرزو ظاہر کی کہ کاش میں آپ کی ہجرت تک رہتا، تو آپ کی مدد کرتا، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا اس وقت انتظار تھا،

ابن سعد، ابن اسحٰق، مسند احمد، تاریخ بخاری، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی، معجم طبرانی، دلائل ابونعیم وغیرہ میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں بھی ایک آنے والے پیغمبر کے جلد ظاہر ہونے کے چرچے رہا کرتے تھے اور ان ہی سے سن سن کر اوس و خزرج کے کانوں میں پیغمبر کی بعثت کی خبر پڑی ہوئی تھی، اور اکثروں کے لیے یہ خبر ہدایت کا باعث بنی چنانچہ ابن سعد کے علاوہ دیگر کتب مذکورہ میں ایک نوجوان انصاری کا واقعہ بسند صحیح مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ "میں چھوٹا تھا، تو مدینہ میں ایک یہودی واعظ تھا، اثنائے وعظ میں اس نے

[1] مسند ابوزرعہ،

ایک پیغمبر کے ظہور کی بشارت دی، لوگوں نے پوچھا کہ وہ کب تک ظاہر ہوگا، اُس نے ان انصاری کی طرف جو اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے، اشارہ کرکے کہا کہ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو وہ اس کا زمانہ پائے گا"۔ انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا آپ کی خدمت میں رہا کرتا تھا، اتفاق سے وہ بیمار پڑا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو گئے اور اُس کے باپ سے پوچھا کہ کیا میرا ذکر تم توراۃ میں پاتے ہو؟ اُس نے کہا نہیں، لڑکے نے فوراً جواب دیا، ہاں یارسول اللہ آپ کا ذکر ہم نے توراۃ میں پڑھا ہے"، اور یہ کہکر اُس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا[1]، عربوں اور یہودیوں میں جب لڑائی ہوتی تو یہودی کہا کرتے تھے کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں، اُن کے عہد میں ہم کو کامل فتح ہوگی، قرآن مجید نے ان کے اسی عقیدہ کو دہرا کر ان کے عدم اسلام پر ملامت کی ہے،

وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى	اس سے پہلے کافروں پر اسی آنے والے پیغمبر
الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم	کا نام لے کر فتح چاہا کرتے تھے، پس جب وہ
مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ	سامنے آگیا جس کو انھوں نے پہچان لیا تو
عَلَى الْكَافِرِينَ (بقرہ ۶-۱۱)	انکار کردیا، کافروں پر خدا کی لعنت ہو،

قرآن مجید نے اس کے علاوہ اور بھی متعدد مقامات پر یہودیوں کو اُن کے اس سابق یقین کے خلاف ان کے موجودہ اظہار کفر پر اُن کی سرزنش کی ہے،

[1] بیہقی باسناد صحیح، مگر یہ روایت صحیح بخاری (کتاب الجنائز) سے کسی قدر مختلف ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ وہ لڑکا اپنے باپ کے مشورہ سے مسلمان ہوگیا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ	جنکو کتاب پہلے دیجا چکی ہو وہ یقیناً (ان نشانیوں کی بنا پر جو اس کتاب میں مذکور ہیں)
(بقرہ ۱۷)	جانتے ہیں کہ یہ حق ہو ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے،
اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ	جنکو ہم پہلے کتاب دیچکے ہیں، اسلام کی صداقت کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں لیکن ان میں سے
(بقرہ ۱۷-۱۷)	ایک فریق جان کر حق کو چھپاتا ہے،
اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (انعام ۲)	جنکو ہم پہلے کتاب دیچکے ہیں وہ اسکو اسیطرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو،

یہ ان ہی بشارتوں اور پیشینگوئیوں کا اثر تھا کہ علماء یہود آنے والے نبی کے متعلق توراۃ کی بیان کردہ مختلف علامات اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حاضر خدمت ہوتے تھے، اور سوالات کرتے تھے، اور آپ کا امتحان لیتے تھے، اور جب ان کی تشفی ہو جاتی تھی تو وہ مسلمان ہو جاتے تھے،

نجاشی کے دربار میں جب حضرت جعفر طیارؓ نے اسلام پر تقریر کی اور سورۂ مریم کی آیتیں پڑھکر سنائیں تو نجاشی پر رقت طاری ہوگئی، اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"، اور

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی نسبت اسلام کا جو عقیدہ سنا تو نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا "واللہ جو تم نے کہا عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں"[1]

کفارِ عرب کو مخاطب کرکے قرآن مجید نے کہا کہ اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں،

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَکَفَرْتُمْ بِہٖ وَشَہِدَ شَاھِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِہٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَکْبَرْتُمْ۔ (احقاف - ۱)	اے پیغمبر! ان سے کہو کہ غور کرو، اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس سے منکر ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اس طرح کی ایک کتاب نازل ہونے کی گواہی بھی دی اور ایمان بھی لایا اور تم مغرور بنے رہے تو ایسی صورت میں تمہارا کیا انجام ہوگا،
اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَۃً اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (شعراء - ۱۱)	کیا ان کفار کو یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں،

[1] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲

خصائصِ محمدیؐ

خصائص وہ امور ہیں جو کسی کی ذات کے ساتھ خاص ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی چیزیں ایسی دی گئی تھیں، جو اوروں کو نہیں ملی تھیں، یہ خصائصِ محمدی دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو صرف آپؐ کے لیے تھے، اور آپؐ کی امت میں سے کسی اور کے لیے نہ تھے، دوسرے وہ جو صرف آپؐ کو عطا ہوئے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو مرحمت نہیں ہوئے، غرض پہلی خصوصیتیں امت کے مقابلہ میں اور دوسری انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں تھیں، ہم نے پہلے کا نام "خصائصِ ذاتی" اور دوسرے کا "خصائصِ نبوی" رکھا ہے،

ارباب سیر نے ان خصائص کی توسیع اور کثرت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا بڑا معیار قرار دیا ہے، کہ اس سے بارگاہِ الٰہی میں آپ کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، چنانچہ انھوں نے معمولی سی باتوں کو خصوصیات میں شمار کرکے خصائص نبوی کا ایک بڑا انبار لگا دیا ہے، مثلاً حافظ ابو سعید نیشاپوری نے شرف المصطفیٰ میں آپ کے خصائص کی تعداد ساٹھ لکھی ہے، حافظ سیوطی نے خصائص کبری میں اس پر سیکڑوں کا

اور اضافہ کیا ہے، حالانکہ ان میں اکثر کا ماخذ، تاویل بعید، نکتہ آفرینی، اور ضعیف روایتیں ہیں، بعض ایسی باتیں بھی خصائص میں شمار کر لی گئی ہیں، جو گو عام افرادِ امت کے لیے نہیں لیکن امراء اور خلفاے اسلام کا اُن سے اتصاف یا تعلق جائز ہے،

محدثین نے خصائصِ ذاتی کو یہ وسعت دی ہے کہ انھوں نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ حدیث قولی اور عملی میں اگر تصادم ہو تو حدیثِ قولی کو حدیثِ عملی پر ترجیح ہوگی یعنی اگر ایک امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت ہو اور اس کے مخالف دوسرا امر آپ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے، تو عام امت کو آپ کے ذاتی عمل کی تقلید کے مقابلہ میں آپ کے قول کی تعمیل کرنی چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ عمل محض آپ کے لیے مخصوص، اور آپ کے خصائصِ ذاتی میں ہو لیکن ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اپنی امت کے لیے نمونہ اور عملی مثال ہی بن کر آتے ہیں، خصوصاً حضرت مقتداے اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کہ ان کے متعلق فرمانِ الٰہی نے اعلان کر دیا ہے،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ	اور تمھارے لیے (اے مسلمانو!) رسول اللہ
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب)	میں بہترین اقتدا ہے

تو جب آپ مقتداے عالم اور امام اعظم بن کر آئے اور تمام لوگوں کو آپ کی تقلید اور پیروی کا حکم دیا گیا تو ایسی حالت میں آپ کا ہر فعل ہمارے لیے قابلِ تقلید اور لائقِ پیروی ہے بے شبہ بعض امور ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جو بحیثیت پیغمبر آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوں لیکن ضرورت ہے کہ دفعِ التباس اور رفعِ شک کے لیے ان تمام مخصوص امور

کے متعلق ساتھ ساتھ یہ اعلانِ عام بھی کردیا جائے کہ یہ مخصوصاتِ نبوی ہیں، اور یہ عام امت کے لیے نہیں ہیں، اس بنا پر اس کے تسلیم کر لینے سے چارہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قدر خصائصِ ذاتی تھے، شریعت نے اُن کو برملا واضح کر دیا ہے، اور بتا دیا ہو کہ یہ صرف آپ کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لیے جن امور کے متعلق یہ تصریح موجود نہیں کہ یہ مخصوصاتِ نبوی میں ہیں، اُن کو ہرگز خصائص کے باب میں جگہ نہیں دیجا سکتی، اور اس طرح یہ معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو خصائص ذاتی ہیں، وہ چند محدود امور ہیں، اور کتاب و سنت نے ان کا مخصوص ہونا عالم آشکارا کر دیا ہے،

خصائصِ ذاتی

نبوت اور لوازمِ نبوت — سب سے پہلی چیز جو آپ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ مخصوص تھی، اور جس کا کوئی حصہ افرادِ امت کو نہیں ملا، وہ نبوت اور اس کے لوازم وحی، تشریع، آمدِ الٰہی، نزولِ جبریل، نسخِ احکام وغیرہ ہیں یعنی آپ کے سوا نہ تو کسی فردِ امت پر کوئی وحی آئی اور نہ آسکتی ہے، نہ کسی کو کوئی شریعت لانے اور نئے مذہبی قانون وضع کرنے کا اختیار رہے، نہ وہ بے گناہ اور معصوم ہے، نہ اللہ تعالیٰ سے سن کر وہ خبر دے سکتا ہے، نہ اس کے پاس قاصدِ الٰہی آسکتا ہے، وہ نہ احکامِ شرعی کو منسوخ کر سکتا ہے وغیرہ، صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو افرادِ امت کے لیے باقی ہیں، اور وہ رویائے صادقہ اور کشف و الہام ہیں،

امور متعلقہ نکاح — مسئلۂ نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چند امور مخصوص کر دیے گئے ہیں، جن کی رخصت عام امت کے لیے نہیں،

۱۔ عام مسلمان بشرطِ عدل صرف چار بیویاں ایک وقت میں رکھ سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار سے زیادہ رکھ سکتے تھے،

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کی رخصت تھی کہ اگر کوئی عورت اپنی خوشی سے مہر کے بغیر آپ کی زوجیت میں آنا چاہتی اور آپ اس کو قبول کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے، گو

ایسا واقع نہیں ہوا لیکن افرادِ امت کے لیے بغیر نکاح ممکن ہی نہیں،

یہ وہ رخصتیں تھیں لیکن اُن کے مقابلہ میں اس باب میں آپ پر کچھ قیدیں بھی تھیں جو عام افرادِ امت پر نہیں،

۱۔ آپ پر وہی عورتیں حلال تھیں جن کو ادائے مہر یا بغیر مہر کے آپ اپنی زوجیت میں دستک لے چکے تھے، اور رشتہ کی بہنوں میں سے صرف وہی عورتیں آپ کی زوجیت میں رہ سکتی تھیں جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی تھی، عام مسلمانوں پر قید نہ تھی،

۲۔ عام مسلمان اہل کتاب کی عورتوں سے جنھوں نے گو اسلام نہ قبول کیا ہو نکاح کر سکتے تھے اور کر سکتے ہیں، مگر آپ کو اس کی اجازت نہ تھی

۳۔ جو بیویاں آپ کے پاس تھیں اُن میں سے اب کسی کو نہ آپ طلاق دے سکتے تھے اور نہ ان کے بعد آپ اور کسی سے اب نکاح کر سکتے تھے،

۴۔ آپ کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ ان بیویوں میں سے چند کو اپنے قریب کرلیں اور باقی کو پیچھے کر دیں، چنانچہ آپ نے چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حفصہؓ، زینبؓ اور ام سلمہؓ کو پاس رکھ لیا تھا، اور بقیہ کو شرف زوجیت بخشنے کے ساتھ اپنے سے علیحدہ رکھا تھا، اور ان میں آپ ردوبدل بھی کر سکتے تھے،

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو آپ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کے نکاح میں جانے کی اجازت نہ تھی،

وَلَاۤ اَنۡ تَنۡكِحُوۡۤا اَزۡوَاجَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ ۔ اور نہ یہ مناسب ہے کہ اپنے پیغمبر کی بیویوں سے

اَبَدًاؕ (احزاب) اُس کے بعد کبھی نکاح کرو۔

یہ تمام احکام سورۂ احزاب میں بتصریح تمام مذکور ہیں، اور ان کے خاص وجوہ و مصالح ہیں، اصل یہ ہے کہ عرب میں نکاح کی تعداد متعین نہ تھی، بلکہ بنی اسرائیل میں بھی اس کی تحدید نہ تھی، توراۃ میں ایسے انبیاءؑ اور بزرگوں کے نام بھی ہیں، جن کی متعدد بلکہ سیکڑوں بیویاں تھیں، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پورے عہد شباب میں یعنی ۲۵ سال سے ۵۰ برس کی عمر تک صرف ایک بی بی (حضرت خدیجہؓ) پر کفایت کی، حضرت خدیجہؓ کے بعد ایک ساتھ دو نکاح کیے، حضرت سودہؓ سے جو کبیر السن تھیں، اور حضرت عائشہؓ سے جو صرف ۶ برس کی تھیں، اتنی چھوٹی لڑکی سے نکاح ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف دو خاندانوں میں محبت اور یکجہتی کی ترقی ہی کے لیے ہو سکتا تھا، مدینہ آکر آپ نے چند نکاح کیے، ان نکاحوں پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں دو قسم کی عورتیں تھیں، ایک وہ جو رؤسائے قبائل کی لڑکیاں تھیں، اور جن سے نکاح کا مقصد اسلام کی بہتری کے لیے تعلقات کی توسیع اور اضافہ تھا، حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی اور حضرت حفصہؓ فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت ام حبیبہؓ ابو سفیان رئیس بنی امیہ کی بیٹی تھیں، حضرت جویریہؓ قبیلہ بنی المصطلق کی رئیسہ تھیں، حضرت صفیہؓ رئیس خیبر کی دختر تھیں۔

ازواجِ مطہرات میں دوسری وہ بیوہ عورتیں تھیں جن کا سن زیادہ تھا، اور گویا اس طرح اُن کی کفالت کا بار آپ نے اٹھایا تھا، چنانچہ حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ ام المساکین، یہ سب بیوائیں تھیں، ایک اور بیوی حضرت زینب بنت جحشؓ

تھیں، جو گو بیوہ نہ تھیں، لیکن مطلقہ تھیں، اُن کے شوہر نے ان کو طلاق دیدی تھی، اس تفصیل سے آپ کی کثرتِ ازواج کے اسباب منکشف ہوئے ہوں گے،

اس کی تصریح نہیں ملتی کہ سورۂ احزاب میں یہ مخصوص احکام کب نازل ہوئے، لیکن اس بنا پر کہ آپ نے آخری سے آخری نکاح حضرت میمونہ رض سے ۷ھ میں اداے عمرہ کے زمانہ میں کیا ہے، اور اس کے بعد[1] آپ کا کوئی نکاح ثابت نہیں، اس لیے ان احکام کے نزول کی تاریخ اسی ۷ھ کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ ۸ھ میں اسلام کی طاقت اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی، اور خیبر، طائف اور مکہ معظمہ فتح ہو چکا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تعلقات کے ذریعہ سے کسی نئے قبیلہ کو مطیع کرنے کی ضرورت نہ تھی، اور غریب سن رسیدہ مسلمان بیواؤں کی کفالت کی حاجت تھی،

اس تمہید کے بعد یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ازواج مطہرات رض کو وقارِ نبوت کے برقرار رکھنے اور ان کو تمامتر احکام اسلامی کے نشر و اشاعت میں مصروف رہنے کا حکم دے کر ان کا آیندہ نکاح ناجائز قرار دیا، اور اُن کو تمام مسلمانوں کی ماؤں کا رتبہ دیا، وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمْ (سورۂ احزاب) اب ایسی حالت میں چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت کا حکم نازل ہوتا ہے، اب جناب رسالت مآبؐ کے لیے اس کے سوا چارۂ کار کیا ہوتا کہ وہ اپنی موجودہ بیویوں پر محدود رہیں کہ اگر اُن میں سے کچھ کو طلاق دیدیجائے تو چونکہ وہ دوسرے مسلمانوں کے نکاح میں نہیں آسکتیں، اس لیے یہ ان پر صریح ظلم ہوتا، بنا بریں

---

[1] طبقات ابن سعد، جزء نسا، ص ۹۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موجودہ بیویوں کو آپ کی زوجیت میں رکھنے کی اجازت ہوتی ہے، اور طلاق کی رخصت آپ سے سلب کر لی جاتی ہے، اور اُن محدود ازواج میں سے بھی چند کو قریب رکھنے اور بقیہ کو شرفِ زوجیت کے ساتھ علیحدگی (ارجا) کا حکم دیا جاتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، زینبؓ کو اختیار کرتے ہیں، اور حضرت سودہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، اور حضرت ام حبیبہؓ سے ارجا کرتے ہیں[1]۔

کتابیہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی کہ نبوت محمدیؐ پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے امور دین میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اور نہ اس کو محرم راز ہونے کا شرف بخشا جا سکتا تھا۔

نمازِ شبانہ شروع میں جب نماز پنجگانہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے مسلمانوں پر رات کی نماز (تہجد) فرض تھی، اس کے بعد معراج میں جب پانچ وقت کی نماز فرض ہو گئی تو تہجد کی نماز عام امت پر فرض نہیں رہی بلکہ صرف مستحب رہ گئی لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ نماز شبانہ فرضِ مزید کے طور پر باقی رہی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوری پابندی کیسا تھ اس کو ادا کرتے تھے، یہی وہ نماز تھی جس میں دیر تک کھڑے رہنے سے پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا، سورۂ بنی اسرائیل جو معراج کی سورہ ہے، اس میں نماز پنجگانہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً	اور رات کے حصہ میں بیدار ہو کر نماز پڑھ
لَّكَ عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ	یہ تیرے لیے مزید ہے، قریب ہے کہ تیرا پروردگار

[1] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر سورۂ احزاب جلد ۲۲ ص ۱۶ (مصر)

مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل ۹) تجھ کو مقام محمود (مرتبہ شفاعت) میں اٹھائے۔

| نماز چاشت اور قربانی | اسی طرح چاشت کے وقت نماز عام مسلمانوں کے لیے نفل ہے، مگر احادیث میں ہے کہ یہ نماز آپ پر بمنزلۂ فرض کے تھی، اور اسی کے ساتھ قربانی کا حکم بھی، غالباً یہ حدیث سورۂ کوثر کی تفسیر میں ہیں،

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ (کوثر) اے محمد! ہم نے تجھے کوثر عطا کیا تو تو (اسکے شکرانے میں) اپنے رب کی نماز (چاشت) پڑھ اور قربانی کر۔

مگر یہ بطریق صحاح ہم کو نہیں، اسی لیے ہمیں ان کو خصائص نبوی میں شمار کرنے میں تامل بھی تامل ہے۔

| عصر کے بعد نماز دوگانہ | عام امت کے لیے نماز عصر کے بعد سے غروب تک نماز پڑھنا ممنوع ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر میں بعض ازواج مطہرات نے عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا، دریافت کیا تو فرمایا کہ ایک وفد کی ملاقات میں ظہر کے بعد کی دو رکعتیں مجھ سے رہ گئی تھیں، یہ میں انکی قضا پڑھتا ہوں۔[۲] عام امت کے لیے تو اس کی قضا واجب بھی نہ تھی، اگر ہوتی بھی تو ایک دفعہ قضا پڑھ لینا کافی تھا، مگر آپ نے اپنے لیے ایک نماز سنت کے ترک عمد کی تلافی کی شاید آخر عمر تک کوشش کرتے رہے۔

| صوم وصال | یعنی کئی کئی دن کا متصل افطار کیے بغیر روزہ رکھنا عام امت کے لیے ممنوع ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی دن کا روزہ رکھتے تھے، اور بیچ میں افطار کے وقت کچھ

---

[۱] بحوالہ خصائص کبریٰ سیوطی جلد دوم طبع حیدرآباد [۲] ابوداؤد و ترمذی باب الصلوٰۃ بعد العصر

کھاتے پیتے۔ تھے بعض صحابہؓ نے آپ کی پیروی میں اس طرح کا روزہ رکھنا چاہا تو آپ نے روک دیا، اور فرمایا "تم میں کون میری طرح ہے، مجھ کو تو میرا پروردگار کھلاتا اور سیراب کرتا ہے"[۱]

صدقہ وزکوٰۃ کھانے کی حرمت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت پر کئی کئی دن کے فاقے گذر جاتے تھے، عام مسلمان غربت اور تنگدستی کی حالت میں اس سرمایہ سے فائدہ اٹھاتے تھے، مگر آپ نے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے اس مد کی ہر شے حرام کردی اور کبھی صدقہ کا مال ذاتی صرف میں لانا گوارا نہ فرمایا، یہاں تک کہ اگر حسنین علیہما السلام لڑکپن کے اقتضا سے صدقہ وزکوٰۃ کی کوئی کھجور بھی اپنے منہ میں ڈال لیتے تھے تو آپؐ اگلوا دیتے تھے۔[۲] اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ لوگوں کے مال ودولت کا میل ہے، اس کا لینا اہل بیت نبوت کو روا نہیں"[۳] چنانچہ سادات کے لیے قیامت تک اس قسم کے صدقات کا لینا جائز نہیں، آپ کے پاس جب کوئی ناواقف شخص کوئی چیز لے کر جاتا تھا کہ اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرے تو آپ دریافت فرمالیا کرتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا تحفہ؟ اگر تحفہ کہتا قبول فرماتے، اور اگر معلوم ہوتا کہ صدقہ ہے تو اجتناب فرماتے[۴]

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفین کی اس بدگمانی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا کہ پیغمبر اسلام کی صدقہ وخیرات کی اس تاکید کا مقصود (نعوذ باللہ) اپنی اور اپنے خاندان کی دائمی پرورش کا سامان تھا۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الاعتصام [۲] صحیح بخاری ومسلم کتاب الزکوٰۃ [۳] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ [۴] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ وصحیح بخاری کتاب الہدایا۔

خصائصِ نبوی

دیگر انبیاءؑ کے مقابلہ میں جس قدر خصائص آپؐ کو عطا ہوئے ہیں، وہ متعدد معتبر حدیثوں میں مختلف تعدادوں میں تمام بنام خود زبان اقدس سے ادا ہوئے ہیں۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں، مجھے رعبؑ اور دھاک کے ذریعہ سے فتح و نصرت دی گئی، میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی، غنیمت کا مال میرے لیے حلال کیا گیا، اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لیے حلال نہ تھا، مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا، مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، اور میں تمام دنیا کے لیے مبعوث ہوا[1]۔" صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی چھ باتیں گنائی ہیں، مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے، رعب و داب سے نصرت دی گئی، مالِ غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا، تمام روئے زمین میرے لیے مسجد بنی۔ میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی، انبیاءؑ کا سلسلہ میری ذات پر ختم ہوا[2]۔"

احادیث کی دیگر روایتوں میں بعض اور خصائص بھی زبان اقدس سے بیان ہوئے ہیں،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب جعلت لی الارض کلہا مسجداً و کتاب التیمم و صحیح مسلم باب المساجد و نسائی باب التیمم [2] صحیح مسلم باب المساجد، ترمذی کتاب السیر و نسائی،

بتلایا کہ میرا معجزہ وحی قیامت تک کے لیے ہے، میرے پیرو تمام انبیاء سے زیادہ ہیں، میری نبوت دلیل ہے، مجھ کو فلاں فلاں سورتیں دی گئیں جو کسی اور کو نہیں ملیں، فلاں فلاں وقت کی نمازیں خاص میری امت کے لیے فرض ہوئیں، مگر حقیقت میں ان میں بعض جزئیات ایسی ہیں جو ان ہی چھ عنوانوں کے تحت میں کسی نہ کسی حیثیت سے مندرج ہیں، سورتوں کی خصوصیت جوامع الکلم میں داخل ہے، بعض نمازوں کے اوقات کا اضافہ ختم نبوت کے مدارج کے اندر ہے، قرآن مجید میں آپ کی دو خصوصیتیں مذکور ہوئی ہیں، وہ ان سب کو جامع ہیں، یعنی تکمیل دین اور ختم نبوت، بہر حال اجمال کو چھوڑ کر ذیل میں ہم کو نمایاں خصوصیات پر قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ایک تفصیلی نظر ڈالنا ہے۔

بعثت نصرت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء دنیا میں آئے وہ دو قسم کے تھے، یا وہ بیلن کمزور اور بے یار و مددگار تھے، اور ان کو دنیاوی طاقت کا کوئی حصہ عطا نہیں ہوا تھا، پیغمبروں کی بڑی تعداد ایسی ہی تھی، دوسرے وہ انبیاء ہیں جن کو دنیا کی ظاہری طاقت بھی ملی تھی اور وہ صرف چند ہیں، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، مگر ان میں سے کسی کو بھی نام نامی کے رعب اور ہیبت کا انعام عطا نہیں ہوا، اور تاریخ اس بیان پر شاہد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز گو ایلیا بیچارگی اور مسیحی غربت سے ہوا، مگر انجام موسوی طاقت داؤدی سلطنت اور سلیمانی شان و شکوہ پر ہوا، اور ان سب سے مافوق یہ تھا کہ آپ کی تمام تر قوت، طاقت، رعب و ہیبت سب خدا کی راہ میں صرف ہوئی، اس سے گم گشتوں نے راستہ پایا، بھولوں نے یاد کیا، سننے والوں نے آواز دی، اور یہ پیدا ہوا کہ آپ جس راستہ

ہے نکل جاتے ، گنہگار ، دور مجرم طوعاً اطاعت ختم کر دیتے اور اپنی بدکاریوں پر ندامت کا اظہار کرتے تھے ،
متعدد حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے فتح و نصرت ، رعب و ہیبت کے ذریعہ بخشی گئی
یہاں تک کہ میری دھاک ایک مہینہ کی مسافت تک پر کام کرتی ہے[۱] "علامہ ابن خلدون
نے مقدمہ میں فنون جنگ پر بحث کرتے ہوئے نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ لڑائیوں میں کسی
ایک فریق کو جو فتح ہوتی ہے ، وہ اسی وقت ہوتی ہے جب دوسرے فریق پر پہلے کی خداداد
مرعوبیت چھا جاتی ہے ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو یہ شرف اس لیے عطا ہوا تاکہ مزید خونریزی کے بغیر
ملک میں امن و امان اور سکون و اطمینان پیدا ہو جائے اور صدائے حق کے لیے راستہ صاف ہو
قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس وصف کے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا ،

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (انفال)	عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا ،

چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور قرآن نے شہادت دی ،

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب و حشر)	اور خدا نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ،

چنانچہ بڑے بڑے دل گردہ کے بہادر زرہیں تلواریں بجھا بجھا کر آئے مگر جب روئے روشن
پر نظر پڑی ، کانپ کر رہ گئے ، بڑے بڑے سرکش قبائل آپ کا نام سن کر دم بخود ہو جاتے تھے ،
مدینہ کے آس پاس کے یہود جو بڑے بڑے قلعوں میں بیٹھ کر فرمانروائی کرتے تھے اور جن کو

---

[۱] صحیح بخاری و مسلم عن ابی ہریرہ و احمد و ابن ابی شیبہ و بیہقی و بزار عن علی ،

اپنی فوجی قوت اور جنگی سامانوں پر ناز تھا، جب انھوں نے سرتابی کی، بے لڑے بھڑے آپ کے سامنے اطاعت کی گردن ڈال دی، خیبر کے قلعہ نشین یہود جو سب سے زیادہ مضبوط تھے، جب ایک صبح کو ان کے قلعوں کے سامنے دفعۃً کوکبۂ اسلام طلوع ہوا تو اُن کے منہ سے چیخ نکل گئی کہ "محمد کا لشکر"! ابوسفیان جو بار ہا ایک فریق مقابل کی حیثیت سے میدان جنگ میں فوجوں کے پرے لگاتا رہا، فتح مکہ کے دن جب حضرت عباسؓ اس کو لے کر اسلام کے موجزن دریائے الٰہی کا نظارہ دکھا رہے تھے، اور رنگ برنگ کے علم نگاہوں کے سامنے سے گذر رہے تھے، تو ہر نئے دستہ اور نئے علم کو دیکھ کر کانپ کانپ جاتا تھا۔

باایں ہمہ اس مجسمۂ ہیبت کا حال کیا تھا، ناآشنا ڈرتے تھے اور وہ ان کو تسکین دیتا تھا، بےخبر اس سے رعب کھاتے تھے، اور آگاہ پروانہ تھے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ	محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی کافروں
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ	پر بھاری اور آپس میں رحم دل ہیں،

ایک بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جیسے ہی چہرۂ مبارک پر نظر پڑی، کانپ گیا، فرمایا ڈرو نہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی[1]۔ حضرت مخرمہ صحابیؓ نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زنانخانہ میں ہیں، آپ کو آواز دو، وہ ہچکچانے لگے، باپ نے کہا جان پدر! محمد صلی اللہ علیہ وسلم جبار نہیں[2]۔ یہ ہیبت، یہ وقار، یہ دبدبہ، یہ رعب، تیغ و سنان کی چمک، فوج و عسکر کے

---

[1] شمائل ترمذی [2] صحیح بخاری جلد دوم ص ۸۶۱۔

تلاطم، جلادوں کی صف بندی اور تیغ بکف سپاہیوں کی نمایش سے نہیں پیدا ہوا بلکہ

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست　　　ہیبت ایں مردِ صاحب دلق نیست (رومی)

سجدہ گاہ عام | اسلام کے علاوہ جس قدر مذاہب ہیں، وہ اپنے مراسم عبادت کے ادا کرنے کے لیے چند گھری ہوئی چار دیواریوں کے محتاج ہیں، گویا ان کا خدا ان ہی کے اندر بستا ہے، یہود اپنے صومعوں اور قربان گاہوں سے باہر نہ خدا کو پکار سکتے ہیں اور نہ قربانی کے نذرانے پیش کر سکتے ہیں، عیسائی اپنے کنیسوں کے بغیر خدا کے آگے نہیں جھک سکتے، یہاں تک کہ بت پرست قومیں بھی اپنے بتخانوں ہی کی چہار دیواریوں کے اندر اپنے دیوتاؤں کو خوش کر سکتی ہیں، لیکن اسلام کے عالمگیر مذہب کا خدا اس آب و گل اور سنگ و خشت کی چہار دیواریوں میں محدود نہیں، وہ ہر جگہ ہے اور ہر جگہ سے پکارا جا سکتا ہے، کوہ و صحرا، خشکی و تری، مسجد و کنشت[1] ہر جگہ اس کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے، وہ جس طرح مسجدوں کے اندر ہے، مسجدوں کے باہر بھی ہے، اس کی قربانی مشرق و مغرب ہر جگہ گذرانی جا سکتی ہے،

اَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ　　جدھر منہ پھیرو، اُدھر ہی خدا کا منہ ہے۔ ع

ہر جا کنیم سجدہ بآں آستاں رسد

آپ نے فرمایا کہ "میرے لیے تمام روے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی[2]" یہ مسئلہ ہر چند ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے اندر وہ صداقت پنہاں ہے جو اسلام کی عالمگیری اور

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیع میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ان گرجاؤں میں جن میں تصویریں نہ ہوتیں نماز پڑھ لیتے [2] صحیح بخاری و مسلم و نسائی و ترمذی باب المساجد،

اس کے آخری مذہب ہونے کا اعلان عام کرتی ہے۔

پیرووں کی کثرت | دنیا میں لاکھوں پیغمبر آئے، مگر آج دنیا میں ان کی تعلیم و ہدایت کی ایک یادگار باقی نہیں یہاں تک کہ تاریخ کے اوراق میں بھی ان کا نام و نشان نہیں، وہ انبیاء جن کے صرف حالات معلوم ہیں ان کی نسبت وہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنے والے چند سے آگے نہ بڑھ سکے، حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک ایک ایک پیغمبر کا کارنامہ دیکھ جاؤ، حضرت موسیٰؑ کے سوا ایک بھی ایسا نہ ملے گا جس کے ماننے والے ستو بھی ہوں، حضرت موسیٰؑ کی کوششوں کے جولانگاہ صرف بنی اسرائیل کے چند ہزار نفوس تھے، جو قدم قدم پر راہ حق سے ہٹ ہٹ جاتے ہیں، کہیں گوسالے کو پوجتے ہیں کہیں خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں کہیں سرفروشی اور جانبازی سے گھبرا کر میدان جنگ میں جانے سے انکار کر بیٹھتے ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے معجزانہ کارنامے صرف اسی قدر اثر دکھاتے ہیں کہ چند دہقانی انسان ان کی شیریں گفتاری کا دم بھرتے ہیں، مگر اس سے پہلے کہ مرغ بانگ دے، ابن آدم کو دشمنوں کے پنجہ میں اسیر کردیتے ہیں، اور تین دفعہ اس کے پہچاننے سے منکر ہوتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال ہے کہ مکہ کی گلیوں میں آپ نے تن تنہا بے یارو مددگار تشنہ لبان حق کو صدائے توحید دی، جواب میں ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی لیکن ابھی تیرہ سال نہ گذرنے پائے تھے کہ ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ سے پُرشور ہوگیا، اور جب آپ نے اسی مکہ کی سرزمین کے لیے حجۃ الوداع کا اعلان کیا، تو کم و بیش ایک لاکھ جان نثار و فدا کار داہنے بائیں کھڑے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس قدر میری نبوت کی سچائی کا اعتراف کیا گیا، کسی اور پیغمبر کی سچائی کا نہیں کیا گیا کہ بعض انبیاء ایسے بھی ہیں جن کو سچا کہنے والا ان کی امت میں صرف ایک ہی نکلا[۱]۔ صحیحین میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ایک دفعہ مجھ پر (عالم مثال میں) قومیں پیش کی گئیں بعض پیغمبر ایسے تھے کہ ان کے پیچھے صرف ایک ہی دو آدمی تھے، بعض تنہا ہی تھے، اُن کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ اتنے میں ایک بڑی بھیڑ نظر آئی، خیال ہوا کہ یہ میری امت ہوگی، تو بتایا گیا کہ یہ موسیٰؑ اور ان کی قوم ہے، پھر کہا گیا کہ دوسرے کنارہ کی طرف دیکھو! تو اتنا سواد عظیم نظر آیا کہ اس سے افق چھپ گیا، پھر کہا گیا، اسی طرح ادھر دیکھو، بڑی تعداد کثیر دکھائی دی، کہا گیا کہ یہ سب تیری امت ہے[۲]"۔

دعوت عام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں اور حلقہ بگوشوں کی کثرت تعداد کا ایک اور سبب یہ ہے کہ آپؐ سے پہلے جس قدر انبیاء آئے، وہ خاص خاص قوموں اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے، ان کی دعوت عام نہ تھی، یہانتک کہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی گلہ بانی تک محدود رکھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم اور ہر جنس کی طرف ہوئی، کالے، گورے، رومی، حبشی، عرب عجم ترک، تاتار، چینی، ہندی، سب آپ میں برابر کے حقدار ہیں، قرآن نے کہا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا) — اے محمد! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بھیجا ہے۔

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان وبخاری کتاب الطب باب وفاۃ موسیٰ وکتاب الرقاق۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان)

بابرکت ہو وہ جس نے اپنے بندہ پر قرآن اتارا تاکہ وہ تمام دنیا کو ہشیار کرے۔

صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے پہلے نبی خاص اپنی قوم میں بھیجا جاتا تھا، اور میں تمام دنیا کے لیے بھیجا گیا ہوں[1]"۔ اس معنی کی بکثرت روایتیں حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں، اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھ جاؤ۔ سب کے پیرودں کو اس کی زندگی میں خود اسی کے قوم وملک کے اندر محدود پاؤ گے لیکن آپ کے حلقہ بگوشوں میں خود آپ کی زندگی میں عرب کے علاوہ سلمان عجمیؓ، صہیب رومیؓ، بلال حبشیؓ سب کو پاؤ گے، سلاطینِ عالم کے نام آپ کا دعوت نامہ بھی اسی تعمیم دعوت کی مستحکم عملی دلیل ہے۔

جوامع الکلم | دنیا میں کئی آسمانی صحیفے اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں، مگر ان میں ایک کے سوا وصفِ جامعیت سے سب محروم ہیں، توراۃ اقوام کی تاریخ اور احکام وقوانین کا مجموعہ ہے، عقیدۂ توحید ورسالت کے سوا تمام دیگر ضروری عقائد سے، اور رسم قربانی کے علاوہ تمام دیگر مسائلِ عبادات سے اور چند معمولی باتوں کو چھوڑ کر تمام دقائقِ اخلاق سے یکسر خالی ہے، زبور صرف دعاؤں اور مناجاتوں کا ذخیرہ ہے، سفرایوبؑ میں صرف عقیدۂ تقدیر ورضا کی تعلیم ہے، امثالِ سلیمان صرف مواعظ وحکم ہیں، دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفے صرف توبہ وندامت، پیشنگوئی اور ماتم ہیں، انجیل کا صحیفہ حضرت مسیحؑ کی سرگذشت اور تعلیمات اخلاقی کا مجموعہ ہے لیکن محمد رسول اللہ کو جو صحیفہ ملا، وہ جوامع الکلم ہے، یعنی وہ تمام باتوں کی جامع ہے، وہ توراۃ بھی ہے

[1] بخاری ومسلم کتاب المساجد۔

زبور بھی اور انجیل بھی، اور کچھ ان سے زیادہ بھی، اس لیے آپ نے اپنے خصائص میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے۔[1] بیہقی میں حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "مجھے توراۃ کی جگہ سبع طوال (سات بڑی سورتیں)، اور زبور کی جگہ مئین (تقریباً سو آیتوں والی سورتیں) انجیل کے قائم مقام مثانی دی گئیں، اور سور مفصلات زیادہ ملیں"[2] ابونعیم میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے کہ مجھے مثانی، توراۃ کی جگہ مئین انجیل کی جگہ، حوامیم زبور کی جگہ، اور مفصلات علاوہ بریں ملیں"[3]

اس لیے قرآن مجید، توراۃ، زبور اور انجیل کو جامع ہے، اور ان کے سوا کچھ اور بھی ہے، وہ تاریخ اقوام بھی ہے، اخلاق و مواعظ بھی ہے، دعا و مناجات بھی ہے، اس میں دین کامل کے تمام عقائد ہیں، تمام مراسم عبادات ہیں، تمام معاملات کے احکام و قوانین ہیں، اس میں ایک مسلمان کی زندگی کے ہر دور اور ہر شعبہ کے لیے کامل ہدایات اور صحیح تعلیمات

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتصام و باب التعبیر و مسلم کتاب المساجد [2] بحوالہ خصائص کبریٰ جلد ۲ ص ۱۹۰ [3] سبع طوال مئین اور مفصلات، قرآن مجید کی کئی کئی سورتوں کے مختلف مجموعوں کے نام ہیں۔ [4] ابونعیم عن ابی عباس بحوالہ خصائص سیوطی جلد ۲ ص ۲۲۴، دوسری روایت کے الفاظ پہلے سے زیادہ قرین قیاس ہیں، کیونکہ مثانی اور سبع طوال ہماری تحقیق میں ایک ہی ہیں، اور پہلی روایت میں ان کو دو بتایا گیا ہے، حالانکہ خود قرآن نے سَبْعًا مِنَ المَثَانِی (مثانی کی سات سورتیں) کہا ہے، حوامیم وہ سورتیں ہیں جن کے شروع میں حٰم ہے، سبعاً من المثانی کی تفصیل میں روایات اور علماء کی تشریحات میں بہت سے اختلافات ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سبعاً من المثانی سورہ فاتحہ کو کہا گیا ہے جس میں سات آیتیں ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔
"س"

موجود ہیں، صرف توراۃ کے اسفار خمسہ یہود کی مذہبی زندگی کا کامل مجموعہ نہیں، صرف انجیل عیسائیوں کی مذہبی حیات کا مکمل سرمایہ نہیں، یہاں تک کہ اُن کے عقائد و عبادات بھی اُن کے صحیفوں کے رہینِ منت نہیں، اور وہ اُن کی صحیح تعلیم سے یکسر خاموش ہیں، لیکن اسلام قرآن سے باہر کچھ نہیں، باہر جو کچھ ہے (احادیث) اُس کی عملی توضیح و تفسیر ہے، وہی تنہا مسلمانوں کی ہر ضرورت کا کفیل، اور ہر سوال کا مجیب ہے اور اسی لیے اس کے پیرو کامل حَسْبُنَا کتاب اللّٰہ[1] (ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے) کا نعرۂ فخر بلند کرتے ہیں۔

قرآن جوامع الکلم ہے کہ اس کی ایک ایک آیت کے اندر سیکڑوں لطائف ہیں، اس کے ایک ایک لفظ سے متکلمین اور فقہاء نے چند در چند مسائل نکالے ہیں، اور صوفیہ اور اربابِ حال نے متعدد نکتے پیدا کیے ہیں، تاہم اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کا خاتمہ نہیں ہوا، اور اس کی جوامع الکلمی کا حصر نہ ہو سکا۔

تکمیل دین | اسلام کا صحیفہ جب ایسا جامع ہے تو یقیناً وہ دین بھی جس کو لے کر وہ آیا، کامل ہوگا، قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب عین مسلمانوں کے اجتماعِ عظیم کے دن (حجۃ الوداع) یہ اعلان عام کیا،

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ	دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت

[1] صحیح بخاری ذکر مرضہ ووفاتہ صلی اللہ علیہ وسلم و مسلم کتاب الوصیۃ۔

لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا پوری کردی اور اسلام کو دین کی حیثیت

(مائدہ) سے میں نے تمہارے لیے پسند کیا۔

اسلام قرآن کے عقیدہ کے مطابق اُس صحیح مذہب کا نام ہے جو اپنے اپنے وقت میں ہر پیغمبر کو عطا ہوا، اور وہ عہد بعہد دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف پیغمبروں کے ہاتھوں سے تکمیل کو پہنچتا رہا، یہانتک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کی تکمیل پر وہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچکر تمام ہو گیا، اور یہ منصب خاص صرف آپ کی ذاتِ پاک کے لیے روز ازل سے مقدر ہو چکا تھا، آپ نے فرمایا انا خاتم النبیین وآدم منجدل فی طینتہ[1] میں پیغمبر آخر تھا، اور آدم ابھی آب گل میں پڑے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بلیغ تمثیل میں اسلام کی تکمیل دین کی تشریح فرمائی ہے، فرمایا "میری اور دوسرے انبیا کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی، لوگ اس کے اندر جاتے ہیں، اور اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، لیکن دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے تو میں وہ آخری اینٹ ہوں[2]"۔ عمارت دین و نبوت ہے، اس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک پیغمبر کا وجود اور اس کا دین و شریعت ہے، اور اس کی تکمیل کا آخری پتھر نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود اقدس ہے،

دائمی معجزہ وہ دین جو مختلف انبیاء علیہم السلام کی وساطتوں سے دنیا میں آتا رہا چونکہ وہ محدود زمانوں کے لیے آیا کیا اس لیے اُن کے معجزے بھی محدود الوقت تھے، یعنی ایک

---

[1] مستدرک حاکم تفسیر سورۂ احزاب [2] صحیح بخاری ومسلم و ترمذی باب خاتم النبیین،

خاص وقت میں پیدا ہوئے، اور مٹ گئے، اب عصائے موسیٰؑ، لحن داؤدؑ، تعبیر یوسفؑ، ناقہ ہودؑ، نفس عیسیٰؑ کا کہاں پتہ ہے، لیکن جو دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آیا کامل تھا، اور قیامت تک کے لیے آیا تھا، بنابریں اس کے لیے ایک دائمی اور مستقل معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ خود صحیفۂ اسلام ہے، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر نبی کو وہ معجزہ ملا جس پر اس کی امت ایمان لائی، لیکن جو مجھے ملا وہ وحی ہے، جو خدا نے بھیجی، تو مجھے امید ہے کہ میرے پیرو تمام انبیاء سے زیادہ ہوں گے۔"[1] یہ خیال مبارک اسی لیے تھا کہ آپ کا معجزہ وحی قیامت کے لیے ہے، اس لیے اس کو دیکھنے والے اور اس پر ایمان لانے والے سب سے زیادہ ہوں گے، دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفے بجائے خود معجزہ نہ تھے، اسی لیے وہ تحریف و تغیر سے پاک نہیں رہے۔ اور قرآن دین کا کامل صحیفہ، خاتم الانبیاء کی وحی اور دائمی معجزہ بن کر آیا، اسی لیے وہ ہمیشہ کے لیے اپنی حفاظت کا سامان اپنے ساتھ لایا، وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر) اور ہم ہیں اس کے محافظ۔"

ختم نبوت یہ رعب و نصرت، یہ پیرووں کی کثرت، یہ سجدہ گاہی عام، یہ اعجاز دوام، یہ جوامع الکلم، یہ دعوت عمومی، یہ تکمیل دین، یہ آیات مبین خود اس بات کے دلائل ہیں کہ آپ کے وجود اقدس ؐ پر تمام پیغمبرانہ نعمتوں کا خاتمہ ہوگیا، اور نبوت اور رسالت کا سلسلہ منتہی ہوگیا، اور اب دنیا کسی نئے آنے والے وجود سے مستغنی ہوگئی۔ اسی لیے قرآن پاک نے عہد نبوت کے سب سے بڑے مجمع میں یہ اعلان عام کیا کہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتصام و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ	آج میں نے تمھارا دین کامل کر دیا اور
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمھارے لیے
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ)	دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا،

یہ آیت جو ۹ ذیحجہ سنہ ۱۰ھ کو نازل ہوئی، اس بات کی بشارت تھی کہ نبوت جس کا مقصد دین کی عمارت میں کسی نہ کسی اینٹ کا اضافہ تھا، وہ آج تکمیل کو پہنچ گئی، لیکن اُس سے پہلے ۵ھ میں بھی یہ بشارت ان الفاظ میں گوش گذار ہو چکی تھی،

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ	محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے
رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ	باپ نہیں، لیکن خدا کے پیغمبر اور
وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (احزاب)	تمام نبیوں کے خاتم ہیں،

ختم کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ اُس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اُس کے اندر جا سکے"[۱] اسی سے اس کے دوسرے معنی کسی شے کو بند کر کے اس پر مہر کرنے کے ہیں" جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر سے نہ کوئی چیز باہر نکلی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر گئی ہے، اور چونکہ یہ عمل مہر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے، اس کے معنی انتہا اور ختم کرنے کے بھی آتے ہیں، قرآن مجید میں یہ معنی مستعمل ہوئے ہیں، مثلاً

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى	آج (قیامت کے دن) اُن کے منہ

---

[۱] دیکھو لسان العرب و صحاح جوہری و اساس البلاغہ" زمخشری،

اَفْوَاهِهِمْ (یٰسٓ)	پر مہر لگا دینگے (یعنی بند کر دینگے کہ بول نہ سکیں)

یہاں ختم کے معنی "بند کر دینے" کے بالکل ظاہر ہیں،

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ	خدا نے ان (کافروں) کے دلوں پر مہر لگا دی
(بقرہ)	ہے (یعنی اُنکے دلوں کے دروازے بند کر دیئے)

کہ باہر سے جو نصیحت اور ہدایت کی باتیں وہ سنتے ہیں، وہ اُن کے دلوں کے اندر نہیں گھستیں اور بے اثر رہتی ہیں۔

وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ	اور خدا نے اسکے کان پر اور دل پر مہر لگا دی
(جاثیہ)	(یعنی اسکے کان اور دل بند کر دیے)

کہ اُس کے کان کے اندر دعوتِ رسول کی آواز، اور اس کے دل کے اندر اس آواز کا اثر نہیں جاتا،

یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ	اہلِ جنت پلائے جائیں گے وہ شراب
(مطففین)	جس پر مہر لگی ہوگی

وہ مہر بمعنی بند ہوگی جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ خالص شراب ہے، یہ کھلی نہیں کہ اُس کے اندر کی خوشبو باہر نکل گئی ہو، اور نہ اس کے اندر باہر سے کوئی چیز کسی نے ملا دی ہے جس سے اس کی تیزی کم ہوگئی ہو، اسی کے بعد یہ آیت ہے:

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ	اس کی مہر مشک ہوگی (یا) اس شراب
(مطففین)	کا آخر مشک ہوگا۔

یعنی اس کے ہر گھونٹ کے پینے کے بعد مشک کی بو اُس میں سے نکلے گی، یا یہ معنی کہ بوتل یا صراحی کا منہ غایتِ صفائی اور نزاہت کی غرض سے دنیا کی طرح مٹی، لاکھ یا موم کے بجائے مشکِ خالص سے بند ہوگا،

بہرحال ان تمام استعمالات سے یہ بالیقین معلوم ہوگا کہ اس لفظ کے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کے بند کرنے کے ہیں، لفظ خاتم کی دو قرائتیں ہیں، مشہور قرأت[۱] تو خاتم (بکسر تا) کی ہے جس کے معنی ختم کرنے والے اور بند کرنے والے" کے ہوئے، اور دوسری قرأت خاتَم کی ہے، جس کے معنی ہیں" وہ شے جس کے ذریعہ سے کوئی شے بند کی جائے اور اس پر مہر لگائی جائے تاکہ وہ کھولی نہ جاسکے، اور نہ اس کے اندر کوئی چیز باہر سے جاسکے" الغرض دونوں حالتوں میں آیت پاک کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا کہ آپ کا وجود پیغمبروں کے سلسلہ کو بند کرنے والا اور اُن پر مہر لگا دینے والا ہے کہ پھر آیندہ کوئی نیا شخص اس جماعت میں داخل نہ ہوسکے

آیتِ پاک کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے وہ ظاہری باپ نہیں ہیں جس کے رشتہ کی بنا پر وراثت اور حرمتِ نکاح وغیرہ کے احکام جاری ہوتے ہیں، بلکہ وہ روحانی باپ (رسول اللہ) اور سب سے آخری روحانی باپ (خاتم النبیین) ہیں، اس لیے باپ ہونے کے ظاہری احکام کے بغیر آپ سے وہی پدرانہ محبت رکھنی چاہیے، اور اسی طرح آپ کی پدرانہ اطاعت کرنی چاہیے،

احادیث صحیحہ میں لفظ خاتم النبیین کی تشریح بالکل صاف اور واضح ہے مسند احمد

---

[۱] تفسیر ابن جریر طبری و تفسیر ابن حبان اندلسی، تفسیر آیت مذکور،

میں حضرت ثوبانؓ[1] اور حضرت حذیفہؓ[2] اور ترمذی میں صرف حضرت ثوبانؓ[3] سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے بعد تیس کے قریب جھوٹے نبی پیدا ہوں گے،

وانی خاتم النبیین لا نبی بعدی	بتحقیق میں نبیوں کا خاتم ہوں میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا،

لا نبی بعدی خاتم النبیین کی تفسیر و تشریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاتم النبیین کے یہی معنی ہیں کہ آپ کے بعد پھر کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ نے تکمیل دین اور ختم نبوت کی جو مشہور تمثیل بیان کی ہے اور جس کو ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں، اس سے بھی لفظ خاتم النبیین کی پوری تفسیر ہوتی ہے، آپ نے فرمایا کہ "میری اور دیگر انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی عمدہ محل بنوایا ہو۔ لوگ اس کو آ آ کر دیکھتے ہیں، اور اسکی عمدگی اور خوبصورتی پر عش عش کرتے ہیں لیکن اس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے، تو کہتے ہیں کہ اگر یہ اتنا ناتمام رہ جاتا تو خوب ہوتا"۔ اس کے بعد مختلف روایتوں میں حسب ذیل الفاظ ہیں،

فانا تلک اللبنة[4]	تو میں وہی آخری اینٹ ہوں،
فانا اللبنة وانا خاتم النبیین[5]	تو میں وہی آخری اینٹ ہوں اور سب پیغمبروں کا خاتم ہوں،
فانا موضع اللبنة جئت فختمت الانبیاء[6]	تو اسی آخری اینٹ کی جگہ ہوں، میں آیا تو پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا،

[1] جلد ۵ ص ۲۷۸ [2] جلد ۵ ص ۳۹۶، اس روایت میں ۲۷ تعداد لکھی ہے جن میں ۴ عورتیں ہوں گی، [3] کتاب الفتن حدیث حسن صحیح [4] بخاری و مسلم باب خاتم النبیین [5] بخاری باب خاتم النبیین و صحیح مسلم عن ابی ہریرہ و عن ابی سعید الخدریؓ باب خاتم النبیین [6] صحیح مسلم باب مذکور عن جابرؓ،

وانا فی النبیین موضع تلک اللبنۃ[1] | میں پیغمبروں میں اسی آخری اینٹ کی جگہ ہوں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر انبیاء کے مقابلہ میں اپنے جو مخصوص فضائل گنائے ہیں، اُن میں ایک ختمِ نبوت بھی ہے، چنانچہ صحیح مسلم (کتاب المساجد) ترمذی (کتاب السیر باب الغنیمہ) اور نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا،

وَخُتِمَ بِیَ النبیون | اور انبیاء مجھ سے ختم کیے گئے،

سنن دارمی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا،

وانا خاتم النبیین ولا فخر (باب ما اکرم اللہ نبیہ ص ۱۲) | اور پیغمبروں کا خاتم ہوں، اور اس پر فخر نہیں،

آپ کا خاتمِ نبوت ہونا کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ یہ آپ کی وہ خصوصیت تھی جو آپ کے لیے روزِ ازل سے مقرر ہو چکی تھی، آپ نے ارشاد فرمایا،[2]

انی عبد اللہ لخاتم النبیین و ان آدم لمنجدل فی طینتہ | میں خدا کا بندہ اور خاتم انبیاء تھا اور آدم ہنوز اپنے عنصرِ خاکی میں پڑے تھے،

---

[1] باب فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترمذی عن ابی بن کعبؓ [2] یہ حدیث حسب ذیل کتابوں میں ہے مستدرک حاکم تفسیر سورۂ احزاب جلد ۲ ص ۴۱۸، حاکم اور ذہبی نے اس کی تصحیح کی ہے، وتاریخ امام بخاری (بحوالہ فتح الباری جلد ۶ ص ۴۰۷) و حلیۃ الاولیاء ابی نعیم وشعب الایمان بیہقی (بحوالہ کنز العمال جلد ۶ ص ۱۰۴ حیدرآباد) و مسند احمد ص ۱۲۷ و ۱۲۸

حضرت علیؓ کو جب آپ نے اہل بیت کی نگرانی کے لیے مدینہ چھوڑ کر تبوک جانا چاہا،
اور حضرت علیؓ نے ہمرکاب نہ ہونے پر ملال خاطر ظاہر کیا، تو آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا،

الا ترضی ان تکون منی بمنزلة — کیا تم اس پر خوش نہیں کہ تم میں اور مجھ میں
ھارون من موسی الا انه — وہ نسبت ہو جو ہارون اور موسی میں تھی،
لیس نبی بعدی (صحیح بخاری غزوۂ تبوک) — لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں،

صحیح مسلم (مناقب علی) میں یہ الفاظ ہیں،

غیر انه لا نبی بعدی — لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں،
الا انه لا نبوة بعدی — لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبوت نہیں،

صحیح بخاری (کتاب الانبیاء) اور صحیح مسلم (کتاب الامارة) میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بنو اسرائیل
کی نگرانی اور سیاست انبیاء کرتے تھے، ایک نبی جب مرتا تھا تو دوسرا نبی پیدا ہوتا تھا،

وانه لا نبی بعدی — اور بہ تحقیق میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا"

جامع ترمذی[1] اور مستدرک[2] حاکم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی مدح میں فرمایا

لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب — اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو وہ خطاب کے بیٹے عمر ہوتے،

عربی زبان جاننے والے کو معلوم ہے کہ "لو" امر محال کے لیے آتا ہے، اس سے معلوم ہوا
کہ آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کا آنا محال ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پانچ نام ہیں، میں محمد ہوں، میں احمد ہوں،

---

[1] مناقب عمر، حدیث غریب حسن [2] مناقب عمر جلد ۳ ص ۸۵ حیدر آباد، حدیث صحیح، صحیح الذہبی،

میں ماحی ہوں کہ خدا میرے ذریعہ سے کفر کو محو کریگا، میں حاشر ہوں کہ خدا میرے پیچھے سب کو جمع کرے گا، اور میں عاقب (آخری) ہوں، الذی لیس بعدہ نبی جس کے بعد کوئی نبی نہو گا۔[1]

جامع ترمذی اور بعض دوسری کتابوں میں آخری فقرہ ان الفاظ میں ہے: الذی لیس بعدی نبی یعنی "میں وہ عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔"[2]

صحیح بخاری میں آپ کا ارشاد ہے کہ "خوشخبریوں کے سوا نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا" صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! خوشخبریاں کیا ہیں؟ فرمایا "رویائے[3] صالحہ" (یعنی سچے خواب) پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ کو اپنے امورِ غیب سے مطلع کرنے کے متعدد ذریعے مقرر کیے ہیں، منجملہ ان کے ایک رویائے صالحہ بھی ہے، اسی لیے احادیث میں آیا ہے کہ "نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جزء مومن کا رویائے صالحہ ہے"[4] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "تم سے پہلے قوموں میں محدثین (بات کیے گئے) ہوا کرتے تھے، اگر میری امت میں کوئی محدث ہوگا تو وہ عمرؓ ہیں،[5] ائمۂ حدیث نے محدث کے معنی مُلْهَم کے لکھے ہیں۔

غرض ختمِ نبوت کے بعد اب جو نعمت اہلِ ایمان کے لیے باقی رہ گئی ہے، وہ صرف دو ہیں، رویائے صالحہ اور الہام، لیکن چونکہ نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں اور

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اسما، النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحیح بخاری میں عاقب کی تفسیر مذکور نہیں مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۸۴ میں یہ حدیث اور عاقب کی یہ تفسیر امام زہری سے مذکور ہے،
[2] فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ ص ۴۰۶ [3] صحیح بخاری کتاب التعبیر [4] صحیح بخاری کتاب التعبیر و صحیح مسلم کتاب الرویا و مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۴۹ عن انس [5] بخاری و مسلم و ترمذی، مناقب عمرؓ،

نہ اس کی سچائی کی کوئی قطعی شہادت موجود ہے، اس لیے کسی مومن کے، رویائے صالحہ اور الہامات کسی دوسرے شخص پر بلکہ خود اُس پر بھی حجت نہیں، اور ان کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل کرنا، اور ان کی اطاعت و پیروی کرنا اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دینا، اور ان کی صداقت پر تحدی کرنا ضلالت و گمراہی ہے، ان رویائے صالحہ اور الہامات کے ذریعہ سے جو چیز مومن کو دیجاتی ہے، وہ احکام نہیں ہوتے، بلکہ صرف خوشخبریاں ہوتی ہیں، یعنی امرِ غیب اور مستقبل کے کچھ اطلاعات اور مناظر!

مسند ابن حنبل میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے مرض الموت میں حجرۂ مبارک کا پردہ اٹھایا، حضرت ابوبکرؓ امام تھے، اور صحابۂ کرام صف بستہ پیچھے، اُس وقت یہ آخری اعلان فرمایا،

یاایھا الناس لم یبق من مبشرات	اے لوگو! نبوت کی خوشخبریوں (غیبی ذرائع
النبوۃ الا الرؤیا الصالحۃ یراھا	علم وخبر) میں سے اب کوئی چیز باقی نہیں رہی'
المسلم او ترٰی لہ،	لیکن ایک رویائے صالحہ جو مسلمان اپنے متعلق
(جلد ۱ ص ۲۱۹)	آپ دیکھے یا کوئی دوسرا اس کے متعلق دیکھے،

اس سے صاف ہوگیا کہ رویائے صالحہ شخصی احوال و مناظر سے متعلق ہیں، اسی کتاب میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہمارے مقصد کے اثبات کے لیے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن مجلسِ نبویؐ میں خدام حاضر تھے، آپ نے فرمایا

ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت	رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو

فلا رسول بعدی ولا نبی | میرے بعد کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی

صحابہ پر یہ بات سخت گذری تو آپ نے فرمایا ولکن المبشرات لیکن خوشخبریاں باقی ہیں، لوگوں نے عرض کی، یا رسول اللہ خوشخبریاں کیا ہیں؟ فرمایا مرد مومن کی رویاے صالحہ وہ نبوت کے اجزا میں سے ایک جزء ہے [۱]

یہ تمام حدیثیں حقیقت میں جیسا کہ ترمذی [۲] و حاکم میں ہی، اس آیت کی تفسیر ہیں،

الا ان اولیاء اللہ لا خوف	ہاں! اولیاے الٰہی کو کوئی خوف اور
علیہم ولا ہم یحزنون الذین	غم نہیں، جو ایمان لائے اور تقویٰ
آمنوا وکانوا یتقون لہم البشریٰ	کرتے تھے، اُن کو دنیا اور آخرت
فی الحیوۃ الدنیا وفی الآخرۃ	میں بشارت ہے۔

صحابہ نے پوچھا کہ دنیا میں اُن کے لیے بشارت کیا ہے؟ فرمایا "رویاے صالحہ"! اس آیت پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ ان مبشرات کے حصول کا ذریعہ ایمان اور تقوی کی تکمیل ہے، اور دوسری یہ کہ ایسے لوگوں کا نام جن کو یہ مرتبہ حاصل ہوا، اولیاء اللہ ہے، اور اس لیے ان کے اس رتبہ کا نام ولایت ہوگا، اس کو جزئی نبوت، لغوی نبوت، مجازی نبوت، نبوتِ ناقصہ وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرنا ایسی لفظی گمراہی ہی جو معنوی گمراہی کی طرف مفضی ہے اور اس سے شرک فی النبوۃ کی اُسی طرح برائیاں پیدا ہوں گی، بلکہ ہوئیں اور ہورہی ہیں جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو مجازی معنوں میں ابن اللہ کہکر حقیقی معنوں

[۱] مسند ابن حنبل عن انس جلد ۳ و ترمذی کتاب الرویاء [۲] تفسیر سورہ یونس وکتاب الرویاء و مستدرک حاکم تفسیر یونس (صحیح)

میں عیسائی شرک فی التوحید میں مبتلا ہو گئے، کیونکہ ہر قسم کی نبوتوں کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کی تکمیل ہو چکی، دنیا میں خدا کا آخری پیغام دعوتِ محمدیؐ کے ذریعہ سامعہ نواز ہو چکا، معمارِ قدرت اپنی عمارت میں اس آخری پتھر کو اپنی جگہ پر رکھکر اپنی تعمیر پوری کر چکا، درجہ بدرجہ ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشید انور طالع ہوا جس کے لیے غروب نہیں، طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد باغ کائنات میں وہ سدا بہار موسم آگیا جس کے بعد پھر خزاں نہیں۔

شفاعتِ اولین | عرصۂ دار و گیر محشر میں جب جلالِ الٰہی کا آفتاب پوری تمازت پر ہوگا، اور گنہگار انسانوں کو امن کا کوئی سایہ نہیں ملے گا۔ اس وقت سب سے پہلے فخرِ موجودات، باعثِ خلقِ کائنات، سیدِ اولادِ آدمؑ، خاتم الانبیاء، و رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں میں لوائے حمد لے کر اور فرقِ مبارک پر تاجِ شفاعت رکھکر گنہگاروں کی دستگیری فرمائیں گے۔

لفظ "شفاعت" اصل لغت میں شفع سے نکلا ہے جس کے معنی جوڑا بننے، ایک کے ساتھ دوسرے کے ہونے کے ہیں، چونکہ شفاعت اصل میں یہی ہے کہ "کسی درخواست کنندہ اور عریضہ گذار کے ہم آہنگ ہو کر کسی بڑے کے سامنے اُس کی عرض و درخواست کو قبول کر لینے کی خواہش کا اظہار کرنا" آپ کی شفاعت بھی یہی ہوگی کہ آپ گنہگاروں کی زبان بن کر ان کی طرف سے خداوند ذوالجلال کے اذن سے اُس کے سامنے ان کی بخشایش و مغفرت کی درخواست پیش کریں گے، سورۂ اسرا میں ہے:

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا — قریب ہے کہ خدا تجھے مقام محمود میں اٹھائے،

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں تمام صحیح روایتوں میں متعدد صحابۂ کبارؓ سے منقول ہے کہ

مقام محمود" سے مراد "رتبہ شفاعت" ہے۔[1] صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انسؓ نے شفاعت کے تمام واقعات بیان کر کے یہ آیتِ بالا تلاوت کی، پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا "یہی وہ مقام محمود ہے جس کا تمھارے پیغمبر سے وعدہ کیا گیا ہے۔[2]" صحیح مسلم میں ہے کہ بصرہ کے کچھ خوارج جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو دائمی جہنمی سمجھتے ہیں یعنی اُن کے حق میں شفاعت کے اثر کے قائل نہیں، مدینہ منورہ آئے، یہاں مسجد نبویؐ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ صحابی قیامت کے واقعات بیان کر رہے تھے، ان میں سے ایک صاحب نے بڑھ کر کہا "اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں! خدا تو قرآن میں یہ کہہ رہا ہے" یہ کہکر قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی جس کا یہ مطلب ہے کہ دوزخی جب دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو پھر اُسی میں ڈال دیے جائیں گے، كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا۔ حضرت جابرؓ نے پوچھا "تم نے قرآن پڑھا ہے۔" اُس نے جواب دیا "ہاں" فرمایا تم نے اس "مقام محمود" کا حال سنا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمھارے پیغمبر کو مبعوث کرے گا، اُس نے کہا ہاں سنا ہے۔ فرمایا تو یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام محمود ہے جس کے ذریعہ سے خدا دوزخ سے جس کو نکالنا چاہے گا نکالے گا۔" یہ سن کر ایک کے سوا باقی سب اپنے اپنے عقیدۂ باطل سے تائب ہو گئے اور بولے کہ "کیا یہ بوڑھا صحابیؓ رسول پر جھوٹ بولے گا؟"[3]

بخاری[4] میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "قیامت کے روز ہر امت اپنے اپنے پیغمبر

---

[1] صحیح بخاری وجامع ترمذی ومستدرک تفسیر آیت مذکورہ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعۃ [3] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ ص ۱۱۰۰ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعۃ [4] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ

کے پیچھے چلے گی، اور کہے گی کہ "اے وہ! خدا کی درگاہ میں ہماری شفاعت کیجئے" یہاں تک کہ شفاعت کا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گا، یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالے آپ کو مقام محمود میں اٹھائے گا، جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "جو شخص اذان سن کر یہ دعا مانگے گا کہ اے خدا جو پوری دعا اور کھڑی ہونے والی نماز کا مالک ہے، محمدؐ کو وسیلہ اور فضیلت اور وہ مقام محمود عطا فرما جس کا تو نے وعدہ فرمایا تو قیامت کے دن اسکے لیے میری شفاعت اترے گی"[1] آپ نے فرمایا کہ "ہر نبی کو کوئی نہ کوئی مستجاب دعا دی گئی، میں نے اپنی اس دعا کو اپنی امت کے لیے چھپا رکھا ہے"[2] پھر فرمایا ہے کہ "مجھکو دیگر انبیاء پر چند فضیلتیں عطا ہوئیں، ان میں سے ایک یہ کہ مجھے شفاعت عطا کی گئی"[3] (یعنی شفاعت اولین) موطا امام مالک اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے متعدد تابعیوں نے یہ متفق روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "ہر نبی کو ایک مقبول دعا مانگنے کا موقع عطا کیا گیا تو انھوں نے وہ دعا مانگ لی اور وہ قبول کرلی گئی، لیکن میں نے اپنی دعا کا یہ موقع قیامت کے دن کے لیے چھپا رکھا ہے اور وہ اپنی امت کی شفاعت ہے"[4] فرمایا کہ "میں سب سے پہلا شفیع ہوں گا اور سب سے پہلا وہ شخص جس کی شفاعت قبول کیجائیگی"[5] اور فرمایا کہ "میں پہلا ہونگا جو جنت کی شفاعت کریگا"[6] اُس دن جب دنیا کی گنہگاریاں اپنی عریاں صورت میں نظر آئیں گی، اور آدم کی اولاد

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور و باب الدعاء عند النداء۔ [2] صحیح بخاری کتاب التوحید و کتاب الدعوات و صحیح مسلم باب الشفاعۃ۔ [3] صحیح بخاری و مسلم کتاب المساجد [4] صحیح بخاری کتاب التوحید و کتاب الدعوات و صحیح مسلم باب الشفاعۃ [5] صحیح مسلم کتاب فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ [6] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعۃ۔

ترساں ولرزاں کسی شفیع کی تلاش میں ہو گی کبھی آدم علیہ السلام کا سہارا ڈھونڈھے گی کبھی نوحؑ
وابراہیمؑ کو یاد کرے گی، کبھی موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی طرف بیتابانہ لپکے گی، مگر ہر جگہ نفسی نفسی کی آواز بلند ہوگی
بالآخر شفیع المذنبین سید الاولین والآخرینؐ آگے بڑھیں گے اور تسکین کا پیام سنائیں گے،

حدیث کی اکثر کتابوں میں خصوصاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ حضرت
انسؓ بن مالک، حضرت جابرؓ بن عبد اللہ، حضرت حذیفہؓ سے متعدد طریقوں سے روایت ہے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ "قیامت کے ہولناک میدان میں
لوگوں کو ایک شفیع کی تلاش ہو گی، لوگ پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے اور
کہیں گے کہ "آپ ہمارے باپ ہیں، خدا نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اور آپ میں
اپنی روح پھونکی، اور فرشتوں کو آپ کے سجدہ کا حکم دیا، آپ خدا کے حضور میں ہماری سفارش
کیجئے"، وہ جواب دیں گے کہ میرا یہ رتبہ نہیں، میں نے خدا کی نافرمانی کی تھی، آج خدا کا وہ غضب ہے
جو کبھی نہ ہوا تھا اور نہ ہو گا، نفسی نفسی! (اے میری جان! اے میری جان!!) لوگ حضرت
نوحؑ کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ روے زمین کے پہلے پیغمبر ہیں، خدا نے آپ کو
شکرگذار بندہ کا خطاب دیا ہے، آج خدا کے حضور ہماری سفارش کیجئے، وہ کہیں گے کہ
ہمارا یہ رتبہ نہیں، آج خدا کا وہ غضب ہے جو کبھی ہوا تھا اور نہ کبھی ہو گا، مجھ کو ایک مستجاب دعا کا
موقع عنایت ہوا تھا، وہ اپنی قوم کی تباہی کے لیے مانگ چکا، نفسی نفسی!! تم ابراہیمؑ کے پاس
جاؤ۔" مخلوق ان کے پاس جائیگی اور اپنی وہی درخواست پیش کرے گی کہ "آپ تمام انسانوں
میں خدا کے دوست ہوئے، اپنے پروردگار سے شفاعت کیجئے"، وہ بھی کہیں گے "میرا یہ رتبہ

نہیں، آج خدا کا وہ غضب ہے جو نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا، نفسی نفسی! تم موسیٰؑ کے پاس جاؤ، لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے، اور کہیں گے کہ اے موسیٰ! آپ خدا کے پیغمبر ہیں، خدا نے اپنے پیغام و کلام سے آپ کو لوگوں پر برتری بخشی ہے، اپنے خدا سے ہمارے لیے سفارش کیجیے، کیا آپ ہماری مصیبتوں کو نہیں دیکھتے" حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے کہیں گے کہ "آج خدا کا وہ غضب ہے جو کبھی نہیں ہوا اور نہ ہوگا، میں نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا، نفسی نفسی! تم لوگ عیسیٰؑ کے پاس جاؤ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جا کر لوگ کہیں گے کہ اے عیسیٰ! آپ خدا کے وہ رسول ہیں جس نے گہوارہ میں کلام کیا اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں، اپنے، پروردگار سے ہماری سفارش کیجیے، وہ بھی کہیں گے "یہ میرا رتبہ نہیں، آج خدا کا وہ غضب ہے جو نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا، نفسی نفسی! تم محمد کے پاس جاؤ" مخلوق آپؐ کے پاس آئے گی اور کہے گی" اے محمدؐ! آپ خدا کے رسول اور خاتم الانبیا ہیں اور وہ ہیں جس کے اگلے اور پچھلے سب گناہ معاف ہیں، آپ اپنے پروردگار سے ہماری شفاعت کیجیے"۔ آپؐ اٹھ کر عرش کے پاس آئیں گے اور اذن طلب کریں گے، اذن ہوگا تو سجدہ میں گر پڑیں گے، آپؐ کے سامنے وہ کچھ کھول دیا جائے گا، جو کسی اور کے لیے نہیں کھولا گیا، اللہ تعالیٰ اپنے محامد اور تعریفوں کے وہ معنی اور وہ الفاظ آپ کے دل میں القا فرمائے گا جو اس سے پہلے کسی کو القا نہ ہوئے آپ دیر تک سربسجود رہیں گے، پھر آواز آئے گی" اے محمدؐ! سر اٹھاؤ، کہو سنا جائیگا، مانگو دیا جائے گا، شفاعت کرو قبول کی جائے گی" عرض کریں گے" الٰہی! امتی امتی! خداوندا میری امت، میری امت"۔ حکم ہوگا" جاؤ جس کے دل میں جو کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوگا

اُس کو نجات ہے"۔ آپ خوش خوش جائیں گے، اور اس کی تعمیل کرکے اور پھر حمد و ثنا کرکے عرض پرداز ہوں گے، اور سجدہ میں گر پڑیں گے، پھر صدائے غیب آئے گی کہ "اے محمد سر اٹھاؤ، کہو سنا جائے گا، مانگو دیا جائے گا، شفاعت کرو قبول ہوگی"۔ عرض کریں گے الٰہی امتی امتی! حکم ہوگا جاؤ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو، وہ بخشا گیا، حضور جائیں گے اور پھر واپس آکر عرض گذار ہوں گے، حمد و ثنا کریں گے اور سر بسجود ہوں گے، آواز آئے گی، جاؤ جس کے دل میں چھوٹی سی چھوٹی رائی کے برابر ایمان ہو، اس کو بھی دوزخ سے نکالو ن گا"۔ آپ پھر جاکر واپس آئیں گے اور گذارش کریں گے، اور حمد و ثنا کرکے سجدہ میں گر پڑینگے، پھر ندا آئے گی "اے محمد! سر اٹھاؤ، کہو سنا جائے گا، مانگو دیا جائے گا، شفاعت کرو قبول ہوگی"۔ عرض کریں گے جس نے بھی تیری یکتائی کی گواہی دی اس کی شفاعت کا اذن عطا ہو"۔ صدا آئے گی اس کا اختیار تم کو نہیں، لیکن مجھے اپنی عزت و کبریائی اور اپنی عظمت و جبروت کی قسم ہے، میں دوزخ سے ہر اُس شخص کو نکالوں گا جس نے مجھے ایک کہا اور اپنے لیے دوسرا معبود نہیں بنایا، مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ[1]

کمزور انسانوں کو تسکین کا یہ پیام محمد رسول اللہ کے سوا کس نے سنایا،

فضائلِ اخروی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ خصائص تھے، جو آپ کو پیغمبر، مبلغ دین، صاحبِ مذہب اور پیشوائے امت ہونے کی حیثیت سے عطا ہوئے تھے، علاوہ بریں آپ کو آخرت کی دنیا میں

---

[1] یہ پوری حدیث صحیح بخاری باب تفسیر بنی اسرائیل کتاب الانبیا، ذکر نوح و صحیح مسلم باب الشفاعہ میں مختلف صحابیوں سے تھوڑے تھوڑے الفاظ کے تغیر سے مروی ہے، ہم نے سب کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

بھی مزید فضائل عنایت ہوئے ہیں، چنانچہ آپ نے فرمایا "قیامت میں میں پیغمبروں کا نمایندہ اور امام اور ان کی شفاعت کا پیروکار ہوں گا اور اس پر فخر نہیں"[1]، پھر فرمایا ہے "میں قیامت کے دن تمام بنی آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں، اور میرے ہی ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا اور اس پر فخر نہیں، اور قیامت کے دن آدمؑ وغیرہ تمام پیغمبر میرے علم کے نیچے ہوں گے، اور اس پر فخر نہیں، اور سب سے پہلے میں ہی قبر سے باہر آؤں گا"[2]۔ نیز ارشاد ہے "لوگ قبروں سے جب اٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلا اٹھنے والا میں ہوں گا، جب وہ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے تو ان کی طرف سے بولنے والا میں ہوں گا، جب وہ ناامید ہوں گے تو ان کو خوشخبری سنانے والا میں ہوں گا۔ اس دن خدا کی حمد کا علم میرے ہاتھ میں ہوگا"[3]۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وسلم

تم الجزء الثالث من السیرۃ النبویۃ

علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ

۱۳۴۳ھ

یکم جمادی الاولیٰ

سید سلیمان ندوی

---

[1] ترمذی، مناقب نبوی، حدیث حسن، صحیح غریب [2] حوالہ مذکور حدیث حسن [3] حوالہ مذکور حدیث حسن غریب

مکتبۂ دارالمصنفین

سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حصۂ اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے
لیکر فتح مکہ تک کے حالات غزوات کا ذکر مع مقدمہ قیمت سے
حصۂ دوم اقامت امن، تاسیس خلافت، تکمیل شریعت، آنحضرت
صلعم کی وفات، اخلاق و عادات کا مفصل بیان، قیمت سے
حصۂ سوم خصائص نبوت، معجزات، وحی، معراج،
نزول ملائکہ وغیرہ کی تفصیل، قیمت: للعہ
حصۂ چہارم منصب نبوت کی تشریح، آنحضرت
کا پیغمبرانہ کام، اسلام اور اس کے عقائد پر مفصل و
حکیمانہ بحث، قیمت: عللہ
حصۂ پنجم حصۂ عبادات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج،
جہاد پر سیر حاصل بحث، قیمت: معہ
حصۂ ششم حصۂ اخلاق، اسلامی و اخلاقی تعلیمات،
فضائل، رذائل، اور اسلامی آداب کی تفصیل قیمت لعہ
رحمت عالم مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت پر مشہور رسالہ قیمت ۱۲؍
خطبات مدراس سیرت نبوی سے متعلق مولانا
سید سلیمان ندوی کے آٹھ خطبات (زیر طبع)

جدید مطبوعات

تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ اول، پیش لفظ اور مقدمہ
کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز سے لیکر مولانا جلال الدین
رومی تک کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل،
تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ دوم، مشہور عالم و مصلح
شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے سوانح حیات، اُن کے
صفات و کمالات اُن کی علمی و تصنیفی خصوصیات، اُن کا
تجدیدی و اصلاحی کام اور مقام اور اُن کی اہم تصنیفات
کا مفصل تعارف اور اُن کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات،
(مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

اسلام کا سیاسی نظام نظریۂ خلافت، مجلس تشریعی،
حقوق رعایا، حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ
قریب قریب اسلامی دستور کے تمام اصولی اور سیاسی
پہلوؤں پر تفصیلی مباحث، اور موجودہ دور کے سیاسی
نظریات شخصیت، آمریت، جمہوریت، پر مختصر، اور
جامع بحث،
(مرتبہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی) قیمت صہ "غیر مجلد"

(طابع و ناشر صدیق احمد)